PAKISTANIPOINT
WWW.PAKISTANIPOINT.COM

دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ

جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

اکتوبر 2020ء

بانی

معراج رسول

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

صفحات 290

قیمت 100 روپے

ماہنامہ دوشیزہ ڈائجسٹ
MEMBER APNS
CPNE

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

مدیر : لبنیٰ خیال
نائب مدیر : ڈاکٹر نعیم اختر

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269

06
چینی نکتہ چینی
مدیر اعلیٰ
قارئین کی کرم فرمائیاں اور کج ادائیاں
نامہ و پیام، محبتیں، عنایتیں اور شکایتیں

12
روپ بہروپ
زویا اعجاز
اپنی ذات کے اندھیروں میں چھپے
روپ بہروپ چھلاوے کی تباہ کاریاں

61
کڑوا سچ
تنویر ریاض
زندگی میں کڑواہٹ گھول دینے
والے سچ کا دردناک انکشاف

71
خوف گزیدہ
انعم سجیل
بیٹی کی بے وقت موت نے باپ کو
ہولناک خطرات سے دوچار کر دیا تھا

84
انصاف
حسنین چوہدری
انصاف کی طلب گار...... جس
پر محبوب کے قتل کا الزام تھا

91
بساط
عمران قریشی
ایک ہی شطرنج کی ایسی بازی
جو جیت سے ہار میں بدل گئی

100
الاؤ
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
انسان نما درندوں کی داستان وہ جیتے جاگتے
ہم نفسوں کو بھی بازار کی جنس بنا دیتے ہیں

131
محبت کی طاقت
منظر امام
ایک خوب صورت دوشیزہ کے
جذباتی و احساساتی معاملات دل

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

جلد 50 • شمارہ 10 • اکتوبر 2020 • زرِ سالانہ 1500 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 100 روپے •

خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون 35895313 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

137
شبِ آزما
حسام بٹ

را[illegible] [illegible] میں گم ہو جانے والے [illegible]

149
پہلی محبت
سیریناناز

ہجر و فراق اور وصال کے مراحل سے گزرتی محبت کا انجام......

168
انا لیر
امجد جاوید

صحرا کے سرابوں سے ایک دیدہ ور دل فگار نوجوان کی ہنگامہ خیزیاں

195
جھوٹا
سرور اکرام

اس جھوٹے کا فسانہ جو عمل کی سچائی میں کھرا تھا

200
سازش
طاہر جاوید مغل

جانے پہچانے کرداروں کے معمولات...... بیتے ہوئے خوشگوار لمحوں کی سوغات......

211
راہ نجات
کبیر عباسی

آپ کے پسندیدہ کردار کا ایک اور کارنامہ وفا اور جفا کا شاخسانہ......

228
چہرہ در چہرہ
احمد بلال امجد

قانون اور مجرموں کے درمیان جاری آنکھ مچولی کا سنسنی خیز اختتام

261
سازِ مرگ
ماہ رخ ارباب

یارانِ جہاں کو پیش آنے والے طلسماتی و تحیر انگیز واقعات......سرورق کی تیکھی کہانی

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

مدیراعلیٰ

چینی نکتہ چینی

عزیزانِ من...... السلام علیکم

اکتوبر 2020ء کا شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ گر قبول افتد زہے عزّ و شرف۔ آپ کا جاسوسی تیاری کے آخری مراحل میں تھا کہ لاہور کے نواح میں، موٹروے پر پیش آنے والے جگر خراش واقعے کی خبریں آنا شروع ہو گئیں۔ اس شرمناک واقعے نے ہر دردمند پاکستانی کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ کچھ عرصے سے خواتین، بچوں اور بچیوں کے ساتھ بہیمانہ جنسی تشدد اور قتل کے واقعات تسلسل کے ساتھ سامنے آ رہے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے ان انسان نما درندوں کو آبادیوں میں ہانک دیا ہے اور یہ نہایت دیدہ دلیری اور بے خوفی سے اپنے وحشیانہ جذبوں کی تہذیب و تمدن کے خون سے آبیاری کرتے پھر رہے ہیں۔ نہ جانے کتنے واقعات ایسے ہوں گے جو بدنامی، دباؤ، بدمعاشی اور طریقہ کار کے خوف سے سامنے ہی نہیں آتے...... مظلوم رو پیٹ کر خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کے پاس وکیلوں کی فیس ہوتی ہے نہ تھانوں اور عدالتوں کے چکر لگانے کی فرصت...... معاشرتی بگاڑ اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ مایوسی ہونے لگی ہے۔ ایک اسلامی جمہوریہ میں معاشرے کے کمزور طبقات کی یہ بے توقیری اور تذلیل اب اس درجے پر پہنچ چکی ہے کہ ایسے جرائم کی تفتیش اور سزاؤں کے قانون میں تبدیلی ناگزیر ہو گئی ہے۔ ملزموں کو اعترافِ جرم کے ساتھ یا مصدقہ شواہد ملتے ہی سرسری سماعت کے بعد عبرت ناک سزا دی جانی چاہیے تاکہ وہ قانونی باریکیوں اور نکتوں کا سہارا لے کر بے گناہی کی سند حاصل نہ کر سکیں۔ ہمارا مذہب انفرادی اصلاح کے ساتھ معاشرے کی اصلاح پر زیادہ زور دیتا ہے اسی لیے سنگین جرائم کی سخت سزائیں مقرر ہیں...... چند درندے سرِعام پھندے پر لٹکائے جائیں گے تو ان کے ہم نفس درندوں کا اشتعال خود بخود سرد ہو جائے گا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اسمبلیوں اور سینیٹ میں بیٹھے ہوئے اراکین اس نازک صورتِ حال کا فوری ادراک کریں اور اپنے جماعتی اختلافات کو پسِ پشت ڈال کر ایسی قانون سازی کریں کہ ہماری مائیں، بہنیں اور بیٹیاں بے خوفی سے نقل و حرکت کر سکیں اور کسی اعلیٰ پولیس افسر کو انہیں یہ بتانے کی ضرورت پیش نہ آئے کہ انہیں کب، کہاں اور کس کے ساتھ گھر سے نکلنا چاہیے۔ امید کی جانی چاہیے کہ تازہ ترین واقعے کے بعد اس سمت میں تیزی سے پیش رفت ہوگی...... فی الحال ہم اپنی محفلِ ہاؤ ہو کا رخ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ یہاں کون کون پیش قدمی کر رہا ہے۔

راولپنڈی سے نگاہِ حسیب کی نگاہِ کرم ''جاسوسی ستمبر 2020ء میں سب سے پہلی تحریر جناب اعتراز سلیم کی شیطان پڑھی۔ پاپا تمہیں ڈھونڈ لیں گے...... یہ جملہ پوری تحریر پڑھنے کے بعد بار بار میرے ذہن میں گونجتا رہا۔ سیریل کلرز کے حوالے سے لکھی گئی ایک بہترین تحریر۔ جاندار پلاٹ، سسپنس کا عنصر شروع سے آخر تک غالب رہا۔ امجد رئیس صاحب کے قلم سے خونی ہیرے پڑھ کے ہمیشہ کی طرح اچھا لگا...... بہترین ترجمہ۔ ریڈ کارڈ بقلم محمد سلیم کرد اپنے نام کی طرح دلچسپ رہی۔ سراغ رسانی کے کام کی مہین تفصیلات اور چھان بین نے شرلاک ہومز کی یاد دلا دی۔ دہرے قتل کا مقدمہ جس میں آلہ قتل اور ریڈ کارڈ دونوں ہی اپنی نوعیت کی منفرد چیزیں تھیں۔ یہ بات کچھ عجیب لگی کہ دوسرا ریڈ کارڈ دینے کی ضرورت کیوں کر پیش آئی۔ نارمل پلاننگ کے مطابق ایک ہی کارڈ کافی ہوتا کیونکہ قتل ایک ہی تھا۔ بہرحال کافی دلچسپ تحریر رہی۔ سرورق کے رنگوں میں شامل پہلی تحریر مظلوم رفاقت بقلم روبینہ رشید بہت خوب کہانی رہی۔ ایک لڑکی کے گھناؤنے قتل کے مقدمے سے شروع ہوتی یہ تحریر جیسے جیسے آگے بڑھتی رہی، تجسس اور دلچسپی بھی بڑھتی گئی۔ کہانی آخر تک قاری کی دلچسپی کا مرکز بنی رہی۔ وکلاء کی زندگی آسان نہیں ہوا کرتی یہ تو سب کو پتا ہے مگر سارہ کی زندگی کا یہ کیس انوکھی نوعیت کا تھا۔ جرائم کی دنیا میں یہ بہت عام سی بات ہے کہ کسی پیارے کو یرغمال بنا کے اسے اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے مگر سارہ یہ سب کرنے کے بعد بھی اصل قاتل تک نہ پہنچ سکی۔ مجموعی طور پر ایک زبردست کہانی رہی۔ عائشہ احمد کی تحریر آزادی نے بہت متاثر کیا۔ جو لوگ خود کسی تکلیف سے گزرے ہوں، وہ ہی اس کے درد کا صحیح طور پر اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کئی برس گزرنے کے بعد جب تاریخ خود کو دہرانے لگی تو پھر آگے کیا انہونی ہوئی۔ زبردست۔ شاکر لطیف کی تحریر قاتل وصیت بھی خوب رہی۔ حسام بٹ کی اجل گرفتہ پڑھی۔ شروع میں ندیدے چوروں کی حرکات پڑھ کے ہنسی بھی آئی۔ آگے چل کے ایسا لگا جیسے چوروں کو مور پڑنے والے ہیں مگر یہ کیا چور یہاں بھی ہاتھ کر گئے۔ ارے جناب کچھ جرائم کی سزا قدرت خود بھی تو دیتی ہے۔ بہت زبردست کہانی۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی تحریر ہنگامی شادی شمارے کے حسن میں مزید اضافہ کر گئی۔ ہنگامی شادی گو ایک ہلکے پھلکے پیرائے میں لکھی گئی تحریر تھی لیکن عمران دانش کے کردار کو ایک بار پھر سامنے دیکھ کر ایک خوشگوار احساس ہوا۔ مظہر سلیم ہاشمی کی تحریر بے گھر پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ دوسری تحریر ہے جو میں نے ان کی پڑھی۔ کبھی ہوتا ہے نا ایسا کہ نیکی گلے پڑ جاتی ہے، اور پھر اگلی بار انسان سو بار سوچتا ہے کہ یہ

Nadar Azeem www.pakistanipoint.com

غلطی دوبارہ نہیں کرنی، بس کچھ ایسا ہی ہوا تھا جیک کے ساتھ۔ ایک ہڈی توڑ انسان کو لفٹ دینے کے بعد کیا کیا اندوہناک انکشافات جیک پر ہوئے، یہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ارے ہاں، تحریر پڑھنے کے بعد سے مجھے اپنے گھٹنے کا بہت خیال ہو رہا ہے، تصور کر رہی ہوں کہ ہڈی توڑ کے گھٹنا دبانے کے بعد گھٹنے کی حالت کیا ہوئی ہوگی۔ اچھی تحریر رہی۔ سرورق کی دوسری کہانی مقدر کا سکندر بقلم غلام قادر صاحب کچھ خاص متاثر نہ کر سکی۔ کہانی میں بہت دیر تک پلاٹ واضح ہی نہ ہو سکا اور جب واضح ہوا تب بھی کسی انہونی کے ہونے کا آخر تک انتظار رہا۔ کہانی اپنے عنوان پہ پوری اترتی ہے مگر پڑھنے کے بعد بالکل ہی سپاٹ سی لگی۔ خودنمائی بقلم تنویر ریاض صاحب تھوڑی سی بوریت کا شکار رہی مگر بہر حال اچھی تحریر تھی۔ تمام لکھنے والوں کے لیے نیک خواہشات۔''

اسلام آباد سے ایمانے زارا شاہ کے نرالے انداز'' سرورق سے نظریں چُراتے ہوئے ہم خراماں خراماں چلتے ہوئے فہرست کی طرف بڑھے۔ نظریں کیوں چرانی پڑیں؟ اس کے لیے آپ خود ہی اپنی اداؤں پر غور کیجیے، ہم عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔ بہت عرصے بعد جاسوسی ڈائجسٹ کو دل سے پڑھا۔ دل سے پڑھنے کی سب سے بڑی وجہ ثابت ہوئی ہنگامی شادی از مغل صاحب۔ مغل صاحب کا نام شمارے میں ہونا ہی شمارہ وقت سے بھی پہلے ملنے کی وجہ بنا۔ مغل صاحب نے عمران دانش کی جھلک دکھلا کر اچھا نہیں کیا۔ ہم بمشکل تو اسے بھولے تھے۔ پھر دوبارہ دیکھ کر بھی ہمارا تجسس تاحال اتنا ہی باقی ہے، جتنا تابش کا۔ ہلکی پھلکی کہانی تھی لیکن ہماری توجہ تو عمران کے گال کے کھڈے، دلکش انداز اور حرکات وسکنات پر مرکوز رہی۔ آپ کے بعد ہر گھڑی ہم نے آپ کے ساتھ ہی گزاری ہے عمران دانش۔ ہنگامی شادی سے فرصت پاتے ہی بے گھر کی طرف چلے۔ جیک کے ساتھ جو ہاتھ ہوا، وہ کم نہیں تھا۔ اچھے بھلے نیکی کرنے والوں کو ایسے ہی بریک بون، بریک ہارٹ، بریک سول بر گردن افتادن ٹکر جاتے ہیں جو انہیں نیک مقصد سے بھی دور کر دیتے ہیں۔ اچھی سبق آموز کہانی رہی۔ شیطان، کہانی کا ٹائٹل ہی آ[illegible] ہے۔ جیسے اسم گرامی شیریں رکھ کر کوئی خوش مزاج نہیں ہو سکتا، اسی طرح ڈیول نام والا کچھ اور نکلا۔ ہمارا ڈیول محترم یعنی مارلن سے سوال ہے کہ آپ کو مائیکل کے ٹھکانے کا ایک دم درست اندازہ کیسے ہوا کہ آپ بنا کچھ کہے سیدھا چلتے بنے۔ ایسی تو سیکڑوں پہاڑیاں وجنگل ہو سکتے ہیں جو مجرم کی پناہ گاہ ثابت ہو سکتی تھیں اور اتنی مہذب بیوی نعمت ہی ہے جو آپ کا صیغہ استعمال کرے۔ (ولایتی کہانی میں) بڑی دیسی فیلنگز آئی پڑھ کر (خوامخواہ ہی) کہانی میں ٹویسٹ تو ضرور تھا مگر کہانی ایسی بھی نہ تھی کہ 20 ویں صدی کے ہم جیسے شارپ قارئین چونک جاتے۔ فٹ بال او[illegible] کو انکا[illegible] کر کے سراغ رساں کی ذہانت پر مبنی ریڈ کارڈ میں سب کچھ تھا۔ اگر کچھ نہیں تھا، تو تجسس نہیں تھا۔ حسام بٹ کی اجل گرفتہ نے [illegible] شادی ہال میں کھانا [illegible] نے ہمیں ورطہ حیرت میں ڈال دیا، کیا ایسا بھی ہوتا ہے؟ یہ تو ناممکن سی بات لگتی [illegible] صرف روبینہ رشید کے رنگ کا ہی مزہ آیا، جو حقیقی معنوں [illegible] وہ کیا ہے نا ہم نہایت کائیاں واقع ہوئے ہیں۔ میم [illegible] کیا ایسا نہیں ممکن [illegible] دوسرے رنگ نے ہمیں بالکل مایوس کر دیا۔ غلام قادر صاحب کہانی شروع تو کر دیتے ہیں لیکن اس کو کلائمکس پر لے جانا اور پھر واپس ریزولیشن کی طرف لانا یکسر بھول جاتے ہیں۔ آزادی انتہائی پُراثر، ایموشنل کر دینے والی تحریر ثابت ہوئی۔ گر سمجھیں تو بہت کچھ تھا سمجھنے کو۔ آخر میں، ہم نے سرورق کی ابتدائی کہانی اپنے فیورٹ امجد رئیس کی خونی ہیرے پڑھی۔ سنسنی سے بھرپور ناول رہا۔ بینن اور گھوسٹ کے گھن چکر نے کافی انگیجڈ رکھا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہیپی اینڈ پڑھنے پر ایسی ہی فیلنگز آئیں جیسے کھانے کے بعد مزید ارڈیزرٹ مل جائے۔ ویری ویل ڈن! اب بات کرتے ہوئے نکتہ چینی پر۔ کافی عرصے سے نکتہ چینی سے دوری کی بنا پر خطوط میں سب نئے نئے لوگ نظر آئے۔ ہاں طلعت۔ یہ بیوٹی پارلر کا طعنہ وہ لوگ دیں گے، جن کی اپنی پروفائل پکچر میں یہ فرق کرنا مشکل ہے کہ لاک ڈاؤن نے ان کے بالوں کے گھونسلے کو عابدہ پروین سا بنا دیا ہے یا ابھی بھی کچھ مردانہ باقیات موجود ہیں۔ ویسے بھی آپ مرد باتوں میں خواتین کی بھی کمی پوری کر دیتے ہیں، ہم معصوم نہ بھی آئیں تو بھی کیا۔ ریاست خان بھرپور تبصرے کے ساتھ ٹاپ پوزیشن پر براجمان رہے۔ نعیم تلوکر مرچوں کا تو معلوم نہیں، البتہ اتنے چنے منے تبصرے کا غیاب ہونا بنتا تو نہیں۔ اور محفل پر بھی ایک نظر ڈال لیا کریں نا۔ اتنی بھی کا ہے کی جلدی۔ نورین مبارک آپ کی دوست نے بھی سوچا ہوگا، نیکی گلے پڑ گئی لیکن بہر حال آپ کو جاسوسی وقت پر دستیاب ہو گیا۔ تبصرہ جاندار تھا۔ منصور کامران صحت یابی مبارک۔ راحیلہ بھٹی آپ نے جو سرورق کا پوسٹ مارٹم کیا، اس سے اتفاق نہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔''

داؤدخیل، میانوالی سے ریاست خان کی مسرت'' اس بار جاسوسی نے بہت دیر کر دی۔ ہم تو انتظار کر کر کے نڈھال ہو گئے۔ آخر اللہ اللہ کر کے 29 تاریخ کو موصول ہو گیا۔ سب سے پہلے اپنے تبصرے کو دیکھا اور دل ہی دل میں خوشی کے لڈو پھوٹے۔ سرورق ہمیشہ کی طرح شاندار تھا۔ خوب صورت حسینہ ہماری طرف ہی دیکھ رہی تھی اور یہ بات منصور کامران اور طلعت مسعود کو کہاں ہضم ہونی تھی نیچے وہ مہ جبین کو جیتنے کے لیے لڑ رہے تھے۔ چینی نکتہ چینی میں پہنچے۔ اس بار تبصرہ نگار کم تھے ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ محمد عثمان نئے شامل تھے اور تبصرہ شائع ہونے پر خوش نظر آ رہے تھے۔ میرے پڑوسی نعیم اپنا خط شائع نہ ہونے کا رونا رو رہے تھے۔ تلوکر بھائی چلتا ہے خیر ہے کوئی بات نہیں۔ منصور بھائی اللہ

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

پائے آپ کو صحت عطا فرمائے، اپنا خیال رکھا کریں۔ یہ وائرس کسی کو معاف نہیں کر رہا۔ تبصرہ آپ کا لاجواب تھا صدارت کی کرسی پر آپ کو ہونا چاہیے تھا۔ ممتاز احمد سرورق کو اتنے غور سے دیکھتے ہیں، ٹائٹل گرل کو کھانا ہوتا ہے کیا۔ طلعت مسعود آپ کو کیا لگتا ہے پارلر بند ہو گئے تو کیا منحہ صاحب، نورین صاحبہ، ایمانے صاحبہ اور باقی لڑکیاں بنا میک اپ کے تبصرے پر آتی ہوں گی ناممکن۔ راحیلہ صاحبہ کو تو ٹائٹل گرل ہی پسند نہیں آ رہی تھی ہائی خدا جانے کچھ پسند آئے گا بھی کہ نہیں، آپ کو ہمارا تبصرہ پسند آ گیا شکریہ۔ کہانیوں کی بات کی جائے تو سب سے پہلے موسٹ ایوارڈ مغل صاحب کو پڑھا۔ شادی ہنگامہ بلاشبہ للکار کی مختصر جھلک تھی تابش۔ اور عمران بہت زبردست اسٹوری تھی لیکن بہت سے سوالات چھوڑ گئی نہ عمران کا پتا چل سکا نہ شائلہ کی معاذ سے شادی ہو سکی بہرحال اسٹوری کمال تھی۔ امجد رئیس، یہ ہمیں سارے کام چھڑا کر اپنی تحریر پڑھنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ خونی ہیرے بہت زبردست ناول گوسٹ یعنی میتھیو بینن کا مقابلہ خود سے والٹر سے شکوف سے اور کرال سے ہے۔ ہیرے حاصل کر کے وہ خود امیر ہو جاتا ہے اور خود کنٹریکٹ کلربن کے ان کو خوب زچ کرتا ہے کیا زبردست ناول تھا کمال۔ الاؤ میں اب واضح طور پر آوارہ گرد کی جھلک آنا شروع ہو گئی ہے کافی عرصے بعد حمیرا کا ذکر آیا اب اسے واپس لے آئیں۔ اناگیر بھی ٹریک پر بہت تیزی سے سفر کر رہی ہے۔ ریگستان سے شروع ہوئی کہانی نے بڑی تیزی سے پلٹا کھایا۔ مظلوم رفاقت کافی عرصے بعد سرورق پر بہترین کہانی پڑھنے کو ملی سارہ کے بلند حوصلے نے بہت مزہ دیا، کہانی کی ہیروئن میں سوچ رہا تھا کہ ابھی تک ہیرو نہیں نظر آیا اور پھر وہ آخر میں نظر آ ہی گیا سلیمان جو پہلی ہی نظر میں اسے پسند آ گیا۔ حیرت ہوئی اتنی تیزی سے بھی کچھ ہوتا ہے بھلا بہرحال مراد اور فواد شہزاد کے انجام کی بہت خوشی ہوئی زبردست۔ اور آخر میں بات کی جائے مقدر کے سکندر کی تو یقین کریں مجھے اسٹوری نے بہت زیادہ مایوس کیا مطلب اتنا اچھا لکھنے والے رائٹر ایسا لکھیں گے تو باقی کا کیا ہوگا۔ کہانی کا شروع سے لے کر آخر تک کوئی سر پیر نہیں تھا۔''

منڈی بہاؤالدین سے منصور کامران کی درخواست ''پچیس تاریخ کو اتفاقاً ایک اسٹال پر جاسوسی کی جھلک نظر آئی تو خاصی حیرت ہوئی۔ اس بار ڈائجسٹ بڑی جلدی آ گیا۔ سرورق کی حسینہ زیادہ خوب صورت تو نہ تھی تاہم خون آلود ہتھکڑی، گولی، لاک اپ میں محبوس شخص اور دولڑتے ہوئے آدمیوں نے کسر پوری کر دی۔ ریاست خان، کرسی صدارت کی مبارک باد قبول کیجیے۔ آپ کے تبصرے کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ راحیلہ بھٹی، ہر ایک کی اپنی پسند ناپسند ہوتی ہے۔ کسی کی پسند ناپسند پر اعتراض کرنا میرے خیال میں مناسب نہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے امجد رئیس کی خونی ہیرے کا انتخاب کیا۔ اس موضوع پر لاتعداد مختصر اور طویل کہانیاں پڑھ چکے ہیں جن میں ایک غیر متعلق شخص کے ہاتھ کسی مجرم تنظیم کے پیسے، ہیرے یا کوئی راز لگ جاتا ہے اور وہ اس شخص کو مارنے کے درپے ہو جاتے ہیں، اور پھر سلسلہ آخر میں ہیرو کی جیت پر منتج ہوتا ہے مگر اس کے باوجود اس کہانی میں اس غیر متعلق آدمی کا گھوسٹ ہونا دلچسپی کا باعث بنا۔ دلچسپ تحریر تھی لیکن امجد صاحب سے ہم منفرد موضوعات کی توقعات رکھتے ہیں۔ حسام بٹ کی اجل گرفتہ شاہکار تحریر تھی۔ بہت لطف آیا تحریر پڑھ کے۔ اختتام پر کی گئی لفاظی نے ہلا دیا۔ اعتزاز سلیم، شیطان نامی دلچسپ تحریر کے ساتھ آئے اور اختتام میں چونکانے میں کامیاب رہے۔ عائشہ احمد کی آزادی اچھی تحریر تھی لیکن کچھ الجھی ہوئی سی تھی۔ کسی عنصر کی کمی سی محسوس ہوئی۔ بہرحال موضوع اچھا تھا۔ الاؤ بس ٹھیک ہی چل رہی ہے۔ تنویر ریاض کی خودنمائی، سراغ رسی پر مبنی عام سی تحریر رہی۔ طاہر جاوید اس بار للکار کے کرداروں کو واپس لے کے آئے۔ ایسا لگا جیسے ان کی قسط وار کہانی کا کوئی حصہ ہی پڑھ رہے ہیں۔ کہانی عام سی تھی لیکن للکار کے کرداروں کو دوبارہ پڑھ کے بہت اچھا لگا۔ مظہر سلیم ہاشمی کی بے گھر دلچسپ رہی گو کہ ہائی وے پر لفٹ دے کے مصیبت میں پھنسنے پر لاتعداد تحریریں پڑھ چکے ہیں لیکن اس کے باوجود لطف آیا یہ تحریر پڑھ کے۔ امجد جاوید کی ایکشن سے بھرپور اناگیر اچھی چل رہی ہے۔ ان کی منظر نگاری شاندار ہے۔ سلیم کرد کی ریڈ کارڈ بھی اچھی رہی۔ شاکر لطیف کی قاتل وصیت بھی متاثر کرنے میں کامیاب رہی۔ روبینہ رشید کی مظلوم رفاقت میں بہت سی باتیں وضاحت طلب رہ گئیں۔ جیسے، ونبا احمد کو لے پالک بیٹی کے طور پر لینا اور اسے روشا مراد سے تبدیل کر لینا۔ یہ لکھتی بہت اچھا ہیں لیکن ان کی کہانیاں بری طرح سے یکسانیت کا شکار ہو چکی ہیں۔ ہر بار ایک جیسے کرداروں پر مبنی کہانی لکھتی ہیں۔ غلام قادر کا مقدر کا سکندر بس ٹھیک ہی رہی۔ ہر اجنبی کردار پہلے ہی جملے میں ایک دوسرے سے ایسے بے تکلف ہو گیا، جیسے برسوں سے شناسائی ہو۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس شمارے میں مختصر تحریریں اچھی رہیں جبکہ طویل میں اولین صفحات کا ناول ہی پسند آ سکا۔ میرا آنکھوں کا آپریشن کرانے کا ارادہ ہے اس لیے شاید کچھ عرصہ حاضر نہ ہو پاؤں۔ احباب سے دعاؤں کی درخواست ہے۔''

گوجر خان سے عرفان راجہ کی نپی تلی تبصرہ نگاری ''ستمبر کا جاسوسی بارش کی رم جھم میں ملا۔ سرورق جاسوسی کے روایتی لوازمات سے مزین تھا۔ فہرست کا انداز اچھا لگا۔ اداریہ میں آپ کی باتوں سے اتفاق کیا۔ ریاست خان کی حسرت پوری ہو گئی، مبارک باد۔ عثمان ذوالفقار کی حاضری خوب رہی۔ نعیم تلوکر کا تجزیہ بھی ٹھیک رہا۔ نورین مبارک نے بھی اپنے انداز میں الفاظ بکھیرے۔ منصور کامران کا تبصرہ بھرپور تھا۔ ممتاز احمد فیروز پوری اور طلعت مسعود کی آمد دیکھ کر خوشی ہوئی۔ جاسوسی کے دیرینہ ساتھی انور یوسف زئی بھی اختصاریے کے ساتھ موجود تھے۔ راحیلہ بھٹی کی حاضری خوب رہی۔ خونی ہیرے، امجد رئیس کے قلم کی کرشمہ سازی۔ سطر سطر تجسس، سسپنس، ایکشن کا مجموعہ عمدہ تحفہ رہا۔ گھوسٹ

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

کا کردار جاندار تھا۔ امجد صاحب واقعی ترجمہ نگاری کے میدان کے رئیس ہیں۔ اجل گرفتہ کے ساتھ حسام بٹ کافی عرصے بعد آئے۔ معاشرتی مجرموں کا انجام عبرت ناک ہوا۔ شیطان کے عنوان سے اعتزاز سلیم بھی سسپنس فل تحریر لے کر آئے۔ کہانی بہتر تھی۔ آزادی از عائشہ احمد۔ واقعی ہم ابھی تک بہت ساری معاشرتی برائیوں کے غلام ہیں۔ الاؤ کی 11 ویں قسط بھی تیز رفتار رہی۔ ایک دشمن جیل میں پہنچ گیا۔ اب دیکھیں گوہر شاہ کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ خودنمائی کوئی خاص نہیں لگی۔ واہ جی، اس بار مغل اعظم آئے ہیں اور سرپرائز کے طور پر للکار سے کردار لائے ہیں۔ اچھا خیال ہے۔ اگر یہ سرورق کے رنگ میں لکھیں تو مزہ آجائے۔ بے گھر کہانی کا سبق کہ کبھی کبھی انجان بندے کے ساتھ کی گئی نیکی گلے بھی پڑ جاتی ہے۔ اناگیر کی 5 ویں قسط بھی سنسنی خیز رہی۔ امجد صاحب نے ہیرو صاحب کے ماضی کی ہلکی سی جھلک دکھائی ہے جس سے سسپنس اور بڑھ گیا ہے۔ ریڈ کارڈ، واہ بہت عمدہ کہانی۔ دیسی سراغرساں کی جاسوسی پسند آئی۔ سلیم کرد صاحب آتے رہا کریں۔ قاتل وصیت از شاکر لطیف۔ ہوسِ زر میں خون سفید ہو گیا۔ مظلوم رفاقت کہانی کا آغاز جاندار رہا لیکن مراد شہزاد اور فواد شہزاد کے بارے میں وضاحت ہو جاتی تو الجھن دور ہو جاتی۔ البتہ مکالمے جاندار تھے۔ مقدر کا سکندر، مناسب رہی۔ اگر اس میں دیسی ناموں کی جگہ مغربی نام لکھ دیں تو ساری کہانی احمد اقبال کی بن جائے گی۔ وہ بھی ایسا ہی لکھتے ہیں۔ مجموعی طور پر شمارہ اچھا رہا۔“

سکھر سے نورین مبارک کی حاضری ”ایک بات تو بتائیں یہ سرورق اتنے دھندلے سے کیوں بننے لگے ہیں؟ اس بار بھینگی سی خاتون تو پسند نہ آئی لیکن سرورق بہرحال جاسوسی کے مزاج کا تھا۔ بس دھندلا نہ ہوتا تو دیکھنے میں بھی اچھا لگتا۔ ریاست پر ترس کھا کے آپ نے کرسیِ صدارت سے نواز دیا۔ کیا مجھے بھی یہ کرسی لینے کے لیے آہ و زاری کرنی ہوگی؟ (کوشش کرلیں اگر ہم پگھل گئے تو) عثمان ذوالفقار کو میری طرف سے [illegible] پہنچا دیجیے گا کہ انہیں جانے کیوں میٹھے سے زیادہ کھٹا پسند ہے۔ نعیم تلوکر مختصر لکھتے ہیں مگر اچھا لکھتے ہیں۔ نورین مبارک کا تبصرہ [illegible] پسند آیا۔ آخر لکھا کس نے تھا۔ منصور انکل لگتا ہے کہانیاں پڑھتے نہیں گھول کے پیتے ہیں۔ (لگتا ہے) ممتاز فیروز پوری کو بھی ایم [illegible]۔ [illegible] انکل، بڑے شریر ہیں آپ۔ ویسے آپ خواتین کو کیوں مس کرتے ہیں؟ ہماری آنٹی نے آپ کا تبصرہ پڑھ لیا تو آپ بھی بنا [illegible] آپ [illegible] کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ راحیلہ آنٹی نے بھی بھرپور تبصرہ لکھا۔ روبینہ رشید کی کہانی بہت زبردست تھی۔ مجھے ایسی کہانیاں بہت اچھی لگتی ہیں جن میں خواتین کو بہادر اور ہر مشکل کے سامنے ڈٹ جانے والی دکھایا جاتا ہے۔ حسام بٹ کی اجل گرفتہ میں کچھ ایسے اردو [illegible] الفاظ پڑھنے کو ملے جو ایم اے اردو میں بھی پڑھنے کو نہ ملے۔ (یہی تو وہ چاہتے ہیں کہ آپ لغت کھول کے بیٹھیں) بہت مزیدار [illegible] میں [illegible] کو شادی پر کھانا پوری کرتے دیکھ چکی ہوں۔ عائشہ احمد کی آزادی، بہت اچھی تحریر تھی۔ پڑھ کے دل افسردہ ہو گیا۔ [illegible] (کیوں بھئی، سیدھی سادی تھی) سلیم کرد کی ریڈ کارڈ [illegible] بہرحال اچھی تحریر تھی۔ [illegible] نے تو رونگٹے کھڑے کر دیے۔ سنسنی سے بھرپور تحریر [illegible] اعتزاز سلیم شیطان کو ساتھ لے کے آئے۔ پہلے تو میں نے سوچا شیطان کو کیا منہ لگاؤں مگر کہانی کا آغاز کیا تو ختم کر کے ہی چھوڑی [illegible]۔ امجد رئیس کا ناول خونی ہیرے انتہائی شاندار ہے۔ ان کی تحریروں میں زبان و بیان کی جو چاشنی ہوتی ہے، وہ بیان سے باہر ہے۔ فی الحال میں اتنا ہی پڑھ سکی ہوں۔“

اسلام آباد سے انعم سجیل کی آمدِ بہار ”بہت سی مشکلات سے نبرد آزما ہوتے، جاسوسی ستمبر کا شمارہ حاصل کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی تو دلکش سرِورق پر براجمان حسینہ کی نشیلی آنکھوں سے آنکھیں چار ہوئیں جس کے سلکی بالوں سے دور لٹکتی ہتھکڑیاں اور ان سے رستا خون کوئی اور ہی داستان سنانے کو تیار تھا۔ نیچے کوئی سورما دوسرے کو پچھاڑنے کے چکروں میں نظر آ رہا تھا۔ وقت ضائع کیے بنا فہرست کی طرف لپک جھپک کر پہنچے اور ابتدائی صفحات پر براجمان امجد رئیس کا نام دیکھتے ہی دل باغ و بہار ہو گیا۔ صفحے پلٹتے ہم خونی ہیرے تک کیا پہنچے گویا کسی طلسم ہوش ربا میں قدم رکھ دیا ہو۔ کہانی کا پہلا حصہ تجسس اور آخری حصہ سنسنی سے بھرپور رہا۔ منظر نگاری نے کہانی کے حسن کو دوآتشہ کیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے تمام مناظر آنکھوں کے سامنے کسی فلم کی صورت چل رہے ہوں۔ گھوسٹ کے تھرل سے بھرپور مار دھاڑ کے مناظر نے جہاں رونگٹے کھڑے کیے وہیں میتھیو کے کیتھرائن کے لیے محبت جیسے لطیف جذبے کی بہترین عکاسی پر خفیف مسکراہٹ بھی لبوں پر رینگتی رہی۔ اگلے صفحات پر حسام بٹ اپنی کہانی اجل گرفتہ کے ساتھ اس شمارے کی شان بڑھانے کو موجود تھے۔ عام سے انداز میں شروع ہوئی کہانی کو اس کے انجام نے بہترین بنایا...... بے شک اجل سے بچنا کسی کے لیے ممکن نہیں، اور ہم انسانوں کا وہی حال ہے کہ سامان سو برس کا، پل کی خبر نہیں۔ اعتزاز سلیم وصلی کی شیطان پڑھتے ہوئے دل ہولتا رہا۔ کیسا سنگدل اور شیطان صفت درندہ تھا مائیکل مگر اچھا ہوا اپنے بُرے انجام کو پہنچ گیا۔ سیریل کلنگ پر مبنی اس کہانی کا آغاز اچھا جبکہ اختتام قدرے پھسپھسا اور فینٹ لگا جس کی ایک وجہ تو یہ محسوس ہوئی کہ کہانی کو اچانک ہی ڈرامائی انداز میں بیانیہ طرز پہ بتا کر نمٹا دیا گیا اور دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ شاید سسپنس اور چونکا دینے والا اینڈ دکھانے کے چکر میں مارین کو بے گناہ ثابت کیا گیا۔ آزادی کے ساتھ عائشہ احمد کو جاسوسی میں انٹری حاصل کرنے پر بے حد مبارک ہو...... حب الوطنی کے جذبے سے لبریز اس کہانی میں کچھ

Waqar Azeem www.paksitanipoint.com

...نیا تو نظر نہیں آیا مگر عائشہ احمد کا اندازِ تحریر پختہ اور رواں لگا۔ کرائم سین پر مشتمل خودنمائی کا شکار لوگوں کی کہانی بدیسی پس منظر کے ساتھ ویسی ہی تھی جیسی تنویر ریاض کی دیگر کہانیاں ہوتی ہیں...... یعنی کہ دلچسپ اور مزیدار۔ ہنگامی شادی میں طاہر جاوید مغل نے عمران دانش سے ملاقات کروائی بھی تو شگفتگی برقرار رہی۔ ہلکے پھلکے انداز میں لکھی اس تحریر کو پڑھتے وقت مسکراہٹ ہونٹوں سے جدا نہ ہوسکی اور کہانی کا لطف برقرار رہا۔ مظہر سلیم ہاشمی کی بے گھر ایک عمدہ کہانی تھی جبکہ محمد سلیم کردکی ریڈ کارڈ نے بھی گہرا تاثر چھوڑا۔ دونوں کہانیاں پسند آئیں۔ سرورق کی پہلی کہانی مظلوم رفاقت نے اس بار کی محفل لوٹ لی۔ بے حد شاندار اور جاندار کہانی یقیناً دیگر قارئین کے لیے بھی ٹریٹ ثابت ہوئی ہوگی۔ اب نہ جانے مظلوم رفاقت کی رفاقت کا اثر تھا یا واقعی قصور مقدر کے سکندر کا تھا...... سب سے پہلے تو مجھے سرورق کی دوسری کہانی کا سرورق سے کوئی تعلق ہی نظر نہیں آیا۔ پھر بھی خود پر جبر کرتے کہانی پڑھی مگر بے تکے جملوں اور مختصری کہانی میں کرداروں کی بھرمار نے جی بھر کر بدمزہ کیا۔ غلام قادر صاحب سے بے حد معذرت کے ساتھ یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اپنی کہانی کے ہیرو کو تو آپ نے مقدر کا سکندر بنا دیا مگر یہ کہانی ہمارے دلوں کو فتح کرنے میں ناکام رہی۔‘‘

بہاولپور سے کھوئی بشریٰ افضل کی بازیابی ’’26 اگست کو جاسوسی ہمارے خوب صورت ہاتھوں میں تھا، جاسوسی کی لمبی جدائی بہت گراں گزری۔ ٹائٹل کی صنفِ نازک تینوں صنفِ کرخت کو دیکھ کر محظوظ ہو رہی ہے بہرحال ایکشن سے بھرپور شاہکار تھا اور ہر رنگ نمایاں تھا، اپنی محفل میں داخل ہوئے۔ السلام علیکم تمام ساتھیوں کو میری حاضری کیسی لگی۔ (غیر حاضری کی وجہ بتائیں) نئے لکھنے والوں کو خوش آمدید۔ ریاست خان کو کرسیٔ صدارت پر براجمان پایا۔ ارے، ارے گرنہ جانا خوشی میں کیا حرکتیں کر رہے ہیں۔ بہرحال مبارکاں۔ بھائی ہمدانی نیو انٹری خوش آمدید۔ چینی نکتہ چینی میں صرف ایک صنفِ نازک ہے۔ باقی خطوط صنفِ کرخت کے ہیں میری ہم جولیوں جلدی سے اس محفل کو اپنی آمد سے مزید نکھارو۔ میں نے تو حاضری لگا دی دیکھو، دیکھو کتنی پذیرائی ملتی ہے اگلے ماہ پورے جاسوسی کا تجزیہ کروں گی۔ (جی ضرور انتظار رہے گا) اس دفعہ اتنا ہی کافی ہے۔‘‘

فیصل آباد سے منیحہ رمشا کا تفصیلی تبصرہ ’’لاک ڈاؤن کی وجہ سے جاسوسی ڈائجسٹ کے بند ہونے کا بہت افسوس ہوا اور ہم جی بھر کے بور ہوئے۔ جولائی میں بک اسٹال سے پتا چلا کہ جاسوسی ڈائجسٹ آیا تھا لیکن فروخت ہو گیا۔ اس طرح ہم جولائی کے جاسوسی ڈائجسٹ سے محروم رہے اور پھر 15 تاریخ کے بعد نیٹ پر اپ لوڈ ہونے پر نیٹ سے پڑھا سو سب سے پہلے جولائی کے ماہ کا تبصرہ کیا جائے گا۔ راحیلہ بھٹی کو جے ڈی گروپ میں ویلکم۔ ایمانے زارا شاہ کا تبصرہ دیکھ کے دل خوش ہوا۔ ایمانے کون سی کلاس میں پڑھتی ہو تم؟ مومنہ کشف کا تبصرہ بھی زوردار تھا۔ مومنہ تم نے مس کیا لو میں حاضر ہوگئی۔ نورین مبارک اور باقی سب کے تبصرے بھی عمدہ رہے۔ اپنا تبصرہ شامل دیکھ کر دل خوش ہوا۔ امجد رئیس کی جڑ کی تلاش بہت عمدہ انگلش کہانی رہی۔ تنویر ریاض کی بری عادت نے کچھ متاثر نہیں کیا۔ جمال دستی کی انوکھی محبت بھی کچھ رنگ نہ جما سکی۔ کیٹ اور مولی کی موت کا راز نہ کھل سکا۔ انا گیر کی اس بار کی قسط بہت عمدہ رہی۔ کبیر عباسی کی درحقیقت میں حقیقت میں تو مجھے سبحان مجرم ہی لگا۔ عمران قریشی کی ریگ ماہی بہت اچھی سنسنی خیز کہانی رہی۔ بس ماہی کے کردار کی سمجھ نہیں آئی۔ اعتزاز سلیم وصلی کی جبرِ مسلسل بہت شاندار کہانی رہی معصوم بچے کی موت پر بہت رونا آیا۔ احمد بلال امجد کی سرورق کی پہلی کہانی اندھا انتقام عجیب سی لگی۔ شویتا اور راج ویر کا ریلیشن عجیب تھا۔ فلم بناہٹ ہوتا سب ڈرامائی سین لگے۔ رویندر پرکاش اتنے بڑے ڈان نے آسانی سے راج ویر کی بات مان لی۔ کچھ ہضم نہیں ہوا۔ سرورق کی دوسری کہانی فہمی فردوس کی سفاک قاتل لاجواب رہی۔ اب آتی ہوں اگست کے تبصرے کی جانب۔ ایمانے زارا اس ماہ غائب تھیں۔ مومنہ تھینکس۔ تم بھی مزے مزے کی باتیں کرتی ہو۔ ایچ اقبال کی سائبانی دہشت گرد اچھی تھرل کافی تھی لیکن کچھ خامیاں بھی تھیں۔ جمال دستی کی حق بجانب اچھی رہی۔ تنویر ریاض کی ناقص منصوبہ میں واقعی ناقص منصوبہ ہی ثابت ہوا۔ جولیس نے اس کے سارے خواب چکنا چور کر دیے۔ عکس فاطمہ کی حقیقت بہت امیزنگ کہانی رہی۔ ماہ رخ ارباب کی ہر کہانی لاجواب ہوتی ہے۔ اس بار بھی منتظر لاجواب رہی۔ شان کی موت پر افسوس ہوا۔ وہ معصوم تھی۔ مہتاب کو خوشیاں مل گئی تھیں۔ زویا اعجاز کی ولن نے اس بار کچھ خاص متاثر نہیں کیا۔ یوسف شفیع ایک نہایت شقی حیوان نکلا۔ وہ واقعی ولن تھا۔ سرورق کی پہلی کہانی فتنہ دگیر غلام قادر کی بہترین رہی۔ بس اس عمر میں بھی نانی کے قاتل ہونے پر اچنبھا ہوا۔ سرورق کی دوسری کہانی غیبی انصاف نجمہ مودی نے بہت امیزنگ لکھی۔ بے چاری ثنا کی زندگی میں خوشیوں کا بہت کم عرصہ آیا۔ ریحان کی زندگی پر روشنی نہیں ڈالی گئی کہ وہ کیوں ایسا بنا؟ خیر ریحان کی موت پر افسوس ہوا۔ رشید ملک، ثنا کے لیے غیبی مدد ثابت ہوئے۔ جاسوسی بہت بہترین رہا۔‘‘

کھاریاں سے بابر عباس کی دل داریاں ’’جاسوسی کا نیا شمارہ 26 اگست کو کھاریاں شہر میں جلوہ افروز ہوا۔ اس بار جاسوسی کا سرورق عین جاسوسی کے مطابق تھا۔ سر جی بارش اللہ کی رحمت ہے اور اس بار شہر کراچی پر اللہ کی یہ رحمت خوب برسی، اللہ کی ہر بات میں کوئی نہ کوئی راز پوشیدہ ہے اور وہ بہتر جاننے والا ہے۔ اس بار کی بارشیں کراچی والوں کے لیے آزمائش ہیں۔ سر جی جولائی کے شمارے میں عرصہ دراز بعد خط شائع ہوا تھا اور آپ نے میرے محبت بھرے خط کے ساتھ وہ سلوک کیا جو آج کل انڈیا کشمیر کے ساتھ کر رہا ہے۔ (آپ ہی ہمارا کچھ خیال

www.pakistanipoint.com

پہنچیہ، ایک خط کے علاوہ بھی دوسرے خطوط شامل کرنے ہوتے ہیں۔آپ کا یہ خط بھی 5 صفحات پر مشتمل ہے۔اِدھر اُدھر کی باتوں سے بچتے ہوئے جاسوسی پر فوکس کیا کیجیے پھر ہم سے شکایت نہ ہوگی) اس بار کرسیِ صدارت پر ریاست خان آف میاں والی تشریف فرما تھے۔مبارک ہو۔محمد عثمان ذوالفقار بھائی میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں بہت سے پرانے ساتھی غائب ہیں بس ادارے کی مہربانی ہے (جی ہم تو مہربانی کرتے ہیں۔جو خط آتا ہے اسے شائع کرتے ہیں۔اب آپ خط ہی نہ لکھیں تو ادارہ کیسے مہربانی کرے؟) بعض ساتھی آثارِ قدیمہ کی طرح ہیں۔نعیم تلوکر صاحب آنکھوں کا علاج کروائیں نظر ٹھیک ہوگی تو سب صحیح ہوجائے گا۔حسینہ دل نواز کا تعلق ایمانے زارا شاہ سے ہے۔کامران صاحب اپنا، اپنا نظریہ ہے اپنی اپنی سوچ ہے۔آپ کی سوچ اور نظریے کے مطابق ایچ اقبال اور غلام قادر کے معاملے میں گنگا اُلٹی بہہ رہی ہے۔ایچ اقبال صاحب، غلام قادر صاحب کا اپنا، اپنا مقام ہے میں آپ سے ایگری نہیں کرتا۔ارے واہ، واہ طلعت مسعود صاحب بھی تشریف لائے ہیں۔مسعود بھائی پرانے، پرانے ہوتے ہیں اور نئے، نئے۔نئے آنے والے پرانے لوگوں کو نہیں جانتے اب یہی دیکھ لیں نئے آنے والے میرے نام سے بھی واقف نہ ہوں گے یہ سب جاسوسی والوں کی مہربانی ہے۔(کیوں ہماری کیوں؟) واہ انور یوسف زئی صاحب کیا زبردست اور مختصر خط لکھا ہے دل خوش کردیا۔میرے سسرالی شہر لاہور سے تعلق رکھنے والی راحیلہ بھٹی نے اس بار انٹری دی ہے اور کچھ جلنے کی بُو آرہی ہے ارے بھئی یہ کیا ایک صنفِ نازک دوسری صنفِ نازک کی برائی کررہی ہے راحیلہ صاحبہ نے غالباً صبح اُٹھتے ہی آئینہ دیکھ لیا تھا۔راحیلہ بھٹی صاحبہ بائی داوے آپ کی عمر کیا ہے صحیح، صحیح بتانا..... ویسے آپ کا خط کسی لطیفے سے کم نہیں تھا۔سر جی یہ تو تھا چند خطوط پر تبصرہ اب ذرا کہانیوں پر تبصرہ ہوجائے ..... پہلے کاشف بھائی کی اور ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی مشترکہ کاوش الاؤ پڑھی۔ہر کسی نے اپنی اپنی سوچ کے مطابق الاؤ کے بارے میں لکھا ہے مگر میرے مطابق جس طرح کی کہانی تھی اور جیسا آغاز تھا، میں سمجھتا ہوں ڈاکٹر صاحب کے علاوہ اس کو کوئی ہینڈل نہیں کرسکتا تھا ڈاکٹر صاحب کوئی نئے رائٹر نہیں ہیں کہ کہانی کا بیڑا غرق کردیں، وہ ایک تجربہ کار رائٹر ہیں۔بڑے اچھے اور احسن طریقے سے کہانی کو آگے لے کر جارہے ہیں ویل ڈن ڈاکٹر صاحب۔اناگیر کی یہ 5ویں قسط تھی مگر امجد جاوید صاحب نے ابھی تک علی کا بیک گراؤنڈ صحیح نہیں بتایا۔بہتر ہوتا اگر امجد صاحب علی کی موجودہ کہانی کے ساتھ ساتھ اس کے بچپن کو بھی لے کر چلتے۔امجد رئیس صاحب جب بھی کوئی چیز لاتے ہیں خاصی زبردست قسم کی لاتے ہیں۔اس بار وہ خونی ہیرے لے کر آئے شروع سے آخر تک خونی ہیرے کی خوب صورت کہانی نے اپنے اندر جکڑے رکھا۔جاسوسی کا پہلا رنگ روبینہ رشید کا پیش کردہ مظلوم رفاقت تھا۔کہانی کا پلاٹ اچھا تھا اس پر مکان بنایا جاسکتا تھا۔دوسرا رنگ اپنے غلام کا میرا مطلب ہے غلام قادر صاحب کا مقدر کا سکندر پہلی بار ایسا ہوا کہ غلام قادر صاحب کا جاسوسی کے لیے [illegible] لکھا [illegible] کیا کہنا چاہتے ہیں وضاحت کریں گے آپ۔حسام بٹ صاحب کی اجل گرفتہ دو [illegible] کی نہیں چلتی۔حسام بٹ صاحب کی یہ تحریر اچھی تھی۔[illegible] ایک باپ کی محبت کی کہانی [illegible] اپنے اندر بہت سا اتار چڑھاؤ لیے ایک سنسنی خیز کہانی ثابت ہوئی [illegible] ہیں۔عائشہ احمد کی آزادی واقعی عائشہ جی ہم ابھی تک آزاد ہو کر بھی آزاد نہیں ہمارے اردگرد بہت سی گندو بکھری پڑی ہیں عائشہ بی آپ کی آزادی نے صحیح معنوں میں اداس کردیا ہے۔تنویر ریاض صاحب خودنمائی بہت بری چیز ہے اور آپ کی مغرب سے درآمد شدہ خودنمائی نے رونمائی کی صورت اختیار کرلی تھی۔لاش کی رونمائی اسی لیے بڑے بوڑھے کہہ گئے ہیں خودنمائی بری بات ہے۔مظہر سلیم ہاشمی صاحب کی بے گھر نے بور کیا۔مظہر سلیم ہاشمی صاحب آپ صرف طبع زاد کہانی لکھا کریں۔محمد سلیم کرد کی کارکردگی یعنی ریڈ کارڈ ایک فری لانسر سراغ رساں کی کہانی پولیس کی کارکردگی کا پول کھولنے والی۔کہانی حسد بری چیز ہے یہی اس کہانی کا بنیادی نقطہ بھی تھا سلیم کرد صاحب نے بڑی محنت سے ریڈ کارڈ کو جاری کیا اور کامیاب رہے، ویل ڈن سلیم کرد صاحب۔شاکر لطیف صاحب کی قاتل وصیت بس ایویں ہی لگی۔“

اسلام آباد سے انور یوسف کی شمولیت ”جاسوسی اس ماہ خلافِ توقع جلدی 24 تاریخ کو ہی مل گیا۔شاید آپ کے جرائد کے شیڈول تبدیل ہوگئے ہیں جو سسپنس ڈائجسٹ کے بجائے جاسوسی اشاعت پذیر ہوگیا۔(جی ہاں) خطوط کی محفل میں اس بار پرانے ساتھی ریاست خان سرِفہرست رہے، مبارک۔ویسے بھی پرانے لکھنے والے زیادہ نظر آئے۔سلسلہ وار کہانی الاؤ میں کافی تیزی آگئی ہے غالباً قارئین کی شکایات پر۔یہ کہانی اب اگلی دو یا تین اقساط میں ختم ہوتی نظر آرہی ہے۔دوسری کہانی اناگیر بہت سنسنی خیز اور دلچسپ ہوگئی ہے۔سرورق کی دونوں کہانیاں مظلوم رفاقت اور مقدر کا سکندر بے حد روکھی پھیکی رہیں۔مغربی کہانیوں میں شاکر لطیف کی قاتل وصیت اور دیسی کہانیوں میں مغل صاحب کی ہنگامی شادی اچھی تھیں۔اس شمارے کی بہترین کہانی امجد رئیس کی خونی ہیرے تھی جو بار بار پڑھنے لائق ہے۔“

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہوسکے۔

بدرالسلام بدر، آزاد کشمیر۔راحیلہ بھٹی، لاہور۔نوید ظفر، رحیم یار خان۔مومنہ کشف، بہاولپور۔محمد احسن زمان، وزیر آباد۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

روپ بہروپ

زویا اعجاز

دوستی کے ذریعے ہی محبت اور عداوت پیدا ہوتی ہے اور پھر نئے نصاب اور نئی داستاں جنم لیتی ہے... طبیعت کا تضاد عجیب و غریب کیفیات کو اُجاگر کرتا ہے... کبھی الجھاؤ... کبھی عقل و ہوش سے یکسر آزاد... انگ انگ میں ترنگ... ہر واقعے میں واردات کا رنگ، آواز و انداز... لمس اور احساس جداگانہ ہوتا ہے... شکستہ بام اور دریچوں میں قیام پذیر ایسی ہستی کی داستانِ تحیر... جس کا عکس ہر بار مختلف ہوتا تھا... شخصیت کی دہری پرتوں میں مقید... اس کا کردار، مزاج اور سایہ... کبھی ستارہ... کبھی تہمت تھا... ہر دن اس کے لیے ایک امتحان تھا... ملال و رنج... خوف و خطر... ذہنی انتشار مسلسل اس کے ہم رکاب تھے... جذباتی لغزشیں اور انتقامی جنون نے اسے ہر میدان کا ماہر کھلاڑی بنا دیا تھا...

اپنی ذات کے اندھیروں میں چھپے روپ بہروپ چھلاوے کی تباہ کاریاں.....

''سنو! مجھے تم سے ایک بات کہنی ہے۔'' اُس نے ہچکچاتے ہوئے بات کا آغاز کیا۔

''ہاں کہو! سن رہی ہوں۔''

''ڈرتا ہوں کہیں تم مجھ سے ناراض نہ ہو جاؤ۔''

''اتنے بزدل لگتے تو نہیں تم۔'' فوری جواب ملا۔

''یہ معاملہ ہی ایسا ہے کہ مجھ جیسا شیر دل انسان بھی ڈر محسوس کرنے لگا ہے۔'' اس نے صاف گوئی سے بتایا۔

''ٹھیک ہے! مت بتاؤ۔ جیسے تمہاری مرضی۔'' وہ بھی بے نیاز تھی۔

''سنو!''

''اب کیا ہے بھئی؟'' اس نے بیزاری سے کہا۔

''محبت ہوگئی ہے مجھے تم سے!'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

''محبت؟ وہ کس چڑیا کا نام ہے بھلا؟ ابھی دو روز پہلے تو میں چڑیا گھر دیکھ کر آئی ہوں۔ مجھے تو وہاں ایسی کوئی چیز نظر نہیں آئی۔'' اس کے انداز میں تمسخر نمایاں تھا۔

''ایسا کہہ کر میرے جذبوں کی توہین تو نہ کرو۔'' وہ بلبلا اٹھا۔

www.paksociety.com

''جس چیز سے میں واقف ہی نہیں اس کی توہین کیا کرنی؟ اب انسان اپنی لاعلمی کا اظہار بھی نہ کرے کیا؟''

''محبت اس کائنات کا سب سے دلکش اور خوبصورت جذبہ ہے۔'' اس نے اپنے تئیں ایک انکشاف کیا۔

''لیکن میں تو ایسا نہیں سمجھتی۔''

''تو پھر مجھے بتاؤ ناں کہ تم کیا سمجھتی ہو؟'' وہ بے تابی سے بولا۔

''کائنات کا سب سے بڑا، خوبصورت اور نفیس جذبہ محبت نہیں ہوتا۔'' اس نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

''تو پھر..... پھر کیا ہوتا ہے؟'' وہ اپنا دل ڈوبتا محسوس کرنے لگا۔

''عزت..... صرف اور صرف عزت۔''

اُس کی زبان سے نکلنے والے یہ الفاظ کوئی تیز دھار خنجر تھے۔ ایک سند یافتہ شرابی، کبابی اور قانون شکن شخص ایسی ہستی کو اپنی 'عزت' کا یقین کیسے دلاتا؟ صوفے پر بیٹھے ہوئے اس نے سر جھکایا اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم پیوست کیے اپنا کیس لڑنے کے لیے مزید دلائل تلاش کرنے لگا۔ ایک 'مجرم' پر یہ کیسا وقت آن پڑا تھا۔ اسے ایسی عورت کو اپنی محبت کا یقین دلانا تھا جس کی طلب صرف اور صرف عزت تھی۔ مجرم کے پاس محبت، شہرت، طاقت، دولت، ہمت اور غیرت سمیت بھی 'ت' ہوتے ہیں لیکن عزت کا 'ت' سب سے پہلے ہی اس سے قطع تعلق کر لیتا ہے۔

اس نے اپنے اعصاب پُرسکون کیے اور مقابل کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہنے لگا۔

''دیکھو! میری بات ذرا غور سے سنو۔''

☆☆☆

اوائل نومبر کی نرم، میٹھی دھوپ میں جون، جولائی کا سا حبس و چبھن تھی۔

''اندھا ہو گیا ہے کیا؟ دیکھ کر نہیں چل سکتا؟'' ایک غراہٹ نما آواز رشی کی سماعت میں پڑی۔

''اندھا..... میں..... نہیں..... ہاں..... شاید..... نہیں.....'' وہ رک گیا۔

''ابے سٹھیا گیا ہے کیا پاگل؟''

''سیٹھ؟ نہیں میں کوئی سیٹھ نہیں ہوں۔'' وہ بے دھیانی سے بولا اور غیر متوازن چال چلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اس کا ذہن بالکل بھی قابو میں نہ تھا۔

''او بھائی! دھیان کدھر ہے تیرا؟ اندھوں کی طرح کیوں ٹکرا رہا ہے ہر ایک سے؟'' چند قدم چلتے ہی ایک نئی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی اسے اپنے دائیں کندھے پر ہلکے سے درد کا احساس ہوا۔ شاید وہ اپنی روانی میں پھر کسی سے ٹکرا گیا تھا۔

''سوری! غلطی سے مسٹیک ہو گئی۔'' رشی نے جان چھڑانی چاہی۔

''تیرا دماغ واقعی ٹھکانے نہیں ہے۔ غلطی سے مسٹیک۔'' چالیس بیالیس سالہ اس شخص نے ہنستے ہوئے کہا۔ رشی الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ کر خاموش ہی رہا۔ اسے اس شہر کا یہ مزاج سمجھ نہیں آتا تھا۔ ایک پل میں آنکھیں پیشانی پر سجا کر اکھڑ اور تند جوابات ملتے تو اگلے ہی پل یہ ساری تندی، خوش مزاجی اور ہنسی مذاق میں ڈھل جایا کرتی۔ رشی اکثر اس تضاد پر حیران ہوا کرتا تھا لیکن اس وقت وہ ایسی اُلجھن میں تھا کہ کسی بھی غیر معمولی بات کو سوچنے کی بھی فرصت نہ تھی۔ اس نے کنی کترا کر گزر جانے میں ہی عافیت سمجھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ اس پُرہجوم سڑک سے کافی آگے نکل آیا۔ رشی کا یہ سفر بالکل بے سمت تھا۔ اسے اپنی منزل کا بالکل اندازہ نہ تھا۔ وہ سڑک پر پڑے کنکر جوتے کی نوک سے آگے بڑھاتا جا رہا تھا۔ اسے اس منظر سے بہت مانوسیت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کنکر اس کی اپنی ذات جیسے ہی تو تھے جو کسی بھی ٹھوکر کا وزن بالکل بھی برداشت نہیں کر پاتے تھے اور ٹھوکر ہی کی سمت میں اِدھر اُدھر لڑھکتے جا رہے تھے۔

سوچ اور قدموں کا یہ سفر کچھ دیر مزید یونہی جاری رہا۔ چلتے چلتے اسے سانس لینے میں دشواری ہونے لگی۔ پیٹ میں کوئی گولا پھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے اپنی یونیفارم شرٹ دبوچ لی۔ کچھ لمحے بعد گردن کے پاس کوئی شکنجہ سخت تر ہونے لگا۔

''کیا مصیبت ہے بھئی؟'' اس نے اپنی ہتھیلی گردن کے گرد زور سے رگڑی۔ نتیجہ صفر بٹا صفر۔ اس نے ٹائی کی گرہ بالکل ڈھیلی کر دی۔ اس سے بھی افاقہ نہ ہوا تو شرٹ کے اوپری بٹن کھول دیے۔ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا گردن سے ٹکراتے ہی فرحت کا احساس تو ہوا لیکن سینے میں گھٹن مزید بڑھ گئی۔ اس نے شرٹ کے باقی بٹن بھی کھول دیے۔ ٹھنڈک کا وہ احساس بہت سکون بخش تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد حواس نے درختوں کی مخصوص مہک اور پانی کی موجودگی محسوس کی تو وہ وہیں رک گیا۔ ہلکی ہوا میں درختوں کی دھیمی سرسراہٹ اس کے اعصاب کو سکون دینے لگی۔ اس نے اپنے پاؤں جوتوں، جرابوں کی قید سے آزاد کیے اور یونیفارم کی پروا کیے بغیر گھاس پر ہی بیٹھ گیا۔ درختوں سے چھن کر آتی دھوپ پانی کا سنہری

سیال کا روپ دے رہی تھی۔ یہاں چھائی خاموشی بے حد بھلی تھی لیکن یہ کیفیت بھی بہرحال مستقل نہیں تھی۔ عقب میں سڑک پر زناٹے سے دوڑتی گاڑیاں فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتیں۔ رشی پیٹھ موڑے ہونے کے باوجود گاڑی کی 'چال' سے ہی بتا سکتا تھا کہ ان کے سوار کس مزاج کے مالک تھے۔ اہلِ خانہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے ڈرائیور بہت دھیمے اور سہج انداز میں گاڑی چلاتے۔ ہم عمر اور ہم جنس افراد کی سواری میں دھماچوکڑی مچی ہوتی تھی۔ تیز رفتاری کے علاوہ میوزک سسٹم کی 'بیس' اس قدر طوفانی ہوتی کہ ضربات براہِ راست دل پر پڑتی محسوس ہوتیں۔ سبک خرامی اور ہلکے پھلکے سُروں میں بجتے میوزک والی گاڑیوں میں کوئی نہ کوئی 'خود ساختہ جوڑا' موجود ہوتا تھا جنہوں نے اپنے مزاج کی رومانویت کے تحت گانوں کا انتخاب کیا ہوتا تاہم توجہ ان سے زیادہ باہمی گفتگو پر ہی ہوا کرتی۔ اپنی سوچ میں مگن اس شہر کے ان جیسے مزید تضادات پر غور کرتے ہوئے وہ اپنے 'اصل مسئلے' سے دھیان ہٹانے کی دانستہ کوششیں کر رہا تھا لیکن وہ مسئلہ اور اس سے وابستہ خدشات جوں کے توں برقرار تھے۔ رشی نے اپنے پاؤں نہر میں لٹکا دیے۔ سرد پانی تیز دھار برچھی کی طرح جلد میں اترتا محسوس ہوا۔ اس کے اندر بھڑکتی آگ کے لیے یہ برفاب بہت ضروری تھا۔

''یہ سب کیسے ہوگیا؟ آخر کیسے؟'' اس نے بائیں ہاتھ سے گھاس نوچی۔ ''اتنی دور آنے کے بعد مجھے تو لگتا تھا کہ سب کچھ پیچھے رہ جائے گا۔ وہ آسیب میرا تعاقب نہیں کرے گا۔ لیکن یہ سب ہو کیسے گیا؟'' اس نے مٹی والے ہاتھ بے دھیانی میں اپنے بالوں میں پھیر لیے۔ تصور میں کسی کے الفاظ، آنکھوں کا انداز، زہریلا لہجہ اور چہرے پر چھائی سردمہری اُجاگر ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی گھٹن کا وہ احساس بھی نئے سرے سے اعصاب شکستہ کرنے لگا۔

''یہ کیسا شہر ہے؟ کیسے لوگ ہیں یہ؟'' رشی نے نہر سے پاؤں نکال کر ایک بار چھپاکے سے ڈبوئے۔ ''ہر روپ میں ایک نیا بہروپ ہے یہاں۔ روپ اصل ہے کہ بہروپ؟ میں کس چہرے کا اعتبار کروں؟ پتا ہی نہیں چلتا کہ یہاں روپ اصل ہے کہ بہروپ۔ اچھے خاصے چہرے کے عقب سے اتنا مکروہ بہروپ جھانکنے لگتا ہے کہ انسانیت سے اعتبار ہی اٹھ جاتا ہے۔'' رشی نے اپنی آستینوں کے بٹن کھول کر کہنیوں تک موڑ لیا۔

روپ بہروپ کے اس گھن چکر میں اُلجھتے ہوئے اَن گنت لمحے بیت گئے۔ دھوپ نے اپنا سنہری آنچل مٹیالے پانی سے سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے وقت کا اندازہ کرنے کے لیے پتلون کی جیب سے موبائل نکالا تو بتیس 'مسڈ کالز' اور 'پندرہ' پیغامات دیکھ کر اداسی سے مسکرا کر رہ گیا۔

''یہ نہیں سدھر سکتی کبھی۔'' وہ پیغامات کو کھولے بغیر ان کا متن بخوبی جانتا تھا۔

کالج میں فون کی گھنٹی کا گلا گھونٹنے کے بعد اسے دوبارہ اصل حالت میں واپس لانے کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ فون ہاتھ میں تھامتے ہی اسکرین ایک بار پھر جگمگا اٹھی۔ رشی نے دل کڑا کر کے سبز بٹن دبا دیا۔

''وڈے لوگ...... وڈی وڈی باتیں...... اب تو فون بھی نہیں اٹھاتے ہمارا......'' موبائل کان سے لگاتے ہی ایک خفگی بھری آواز نے گلہ کیا۔

''فون سائلنٹ پر تھا یار! نہیں پتا لگا بالکل بھی۔ سوری!''

''ہاں بھئی! یہ اچھا لفظ ایجاد کر رکھا ہے انگریزوں نے۔ اگلے کو چاہے قتل کر دو اور پھر کہہ دو...... سوری! اونہہ! میں تو کہتی ہوں کہ سوری کہنے والے کو ایک تھپڑ لگاؤ اور کہو...... ویری سوری!'' وہ حسبِ عادت بلاتکان بولتی چلی گئی۔

''ٹھیک ہے! تم لگا لو تھپڑ۔ میں ہنس کر اپنا دوسرا گال بھی تمہارے سامنے کردوں گا۔'' رشی نے بھی حسبِ عادت سرِ تسلیم خم کیا۔

''اونہہ! اتنے تم اہنسا کے پجاری۔''

''لگتا ہے آج ہمسایوں کی کوئی نئی فلم یا ڈراما دیکھ لیا ہے اسی لیے زبان پھسل رہی ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''نہیں بھئی! ان کے میلوں ڈراموں پر پابندی کے بعد بڑا سکون ہے لیکن تم اس طرح بات گھما کر میرا غصہ ٹھنڈا نہیں کر سکتے۔ کہاں غائب تھے اتنی دیر سے؟'' اس نے رعب سے پوچھا۔

''طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ بڑی گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے کینٹ والی سائڈ پر چلا آیا ہوں۔'' رشی کے انداز میں تھکاوٹ نمایاں تھی۔

''اوکے! وہیں رکو پھر! میں آرہی ہوں تمہیں دھکا دینے وہاں۔'' مناہل نے غصے سے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ اس کے بے ساختہ انداز اور اس بے وقت آمد پر رشی مزید مضطرب ہو گیا۔ وہ اس وقت کسی کا بھی سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن مناہل کو سمجھانا یا روکنا بھی کہاں ممکن تھا۔ وہ اس کی ضدی طبیعت سے واقف تھا اس لیے بحث کرنے یا سمجھانے کا کوئی فائدہ ہی نہیں تھا۔ وہ موسمی بخار اور نزلہ زکام کی وجہ سے تین

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

روز سے کالج نہیں آرہی تھی۔ چھٹی ہوتے ہی رشی سے دن بھر کی اپڈیٹس لینا اس کی عادت تھی۔ رشی کی تو قع کے عین مطابق وہ اگلے پندرہ منٹ میں اس کے سامنے موجود تھی۔

''کیا کرنے آئے ہو یہاں؟'' وہ آتے ہی چڑھ دوڑی۔

''فکر نہ کرو! خودکشی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے میرا۔''

''کالج سے واپسی پر گھر نہیں گئے کیا؟'' اس نے رشی کے یونیفارم، ٹائی اور بکھرے بالوں کو غور سے دیکھا۔

''نہیں! اس وقت سے یہیں پر ہوں۔'' وہ نظریں چُراتے ہوئے بولا۔

''ایسی کیا آفت آن پڑی تھی؟ تمہیں اچھی طرح پتا ہے کہ مجھے اپنے اپسمنٹ ہونے پر تمہاری واپسی کا کتنا انتظار ہوتا ہے۔'' منا ہل نے شکوہ کیا۔

''کہا تو ہے طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔'' وہ ہلکا سا جھنجلایا اور دوسرے ہی پل خفت زدہ ہو گیا۔ منا ہل سے بے تکلفی کے باوجود وہ ایسے کسی بھی اندازِ تکلم سے گریز ہی کرتا تھا۔

''رشی!'' منا ہل نے بہت پیار سے اسے پکارا۔ ''اِدھر دیکھو میری طرف! کیا پریشانی ہے؟''

''میں اور میرا وجود بذاتِ خود بہت بڑی پریشانی ہیں۔ اس سے زیادہ میں کیا کہوں؟'' اس کی یاسیت نے منا ہل کو ٹھٹکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ گہری نظروں سے اسے دیکھتی ہوئی گھاس پر اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''کیا کر رہی ہو؟ کپڑے خراب ہو جائیں گے تمہارے۔'' رشی نے اس کی مہنگی جینز، ٹاپ اور جیکٹ کی طرف دیکھا۔

''تو ہو جائیں، کیا فرق پڑتا ہے؟'' منا ہل نے بے نیازی سے جواب دیا۔ رشی خاموش رہ گیا۔

''تو پھر مجھے بتا رہے ہو یا نہیں کہ آخر مسئلہ کیا ہے؟''

''کچھ نہیں ہے۔ کتنی بار کہوں تمہیں؟'' وہ ایک بار پھر جھنجلایا۔

''سمسٹر کی فیس تو لاسٹ ویک ہی پے ہو گئی تھی۔ ٹیسٹ سیشن کا رزلٹ بھی سکسٹی پرسنٹ سے زیادہ ہی تھا۔ گھر میں کوئی ٹینشن بھی سامنے نہیں آئی۔ تو پھر ایسا کیا ہوا ہے جو تم کالج سے یہاں آکر الٹی سیدھی حرکتیں کر رہے ہو؟'' منا ہل نے سنجیدگی سے تجزیہ کیا۔ رشی خاموش رہا۔ اس کی نظر سامنے دکھائی دینے والے چند لڑکوں پر تھی جو انہیں یہاں بیٹھے دیکھ کر ایک دوسرے کو معنی خیز اشارے کر رہے تھے۔

''تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ شام ہو رہی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ گھر چلی جاؤ۔''

''اور اگر نہ جاؤں تو؟'' اس نے خودسری سے کہا۔

''ہر وقت اپنی من مانی مت کیا کرو منا ہل میڈم! اتنی ڈھٹائی کسی دن بہت نقصان پہنچائے گی تمہیں۔ اپنے آپ کو عقل کل سمجھنا چھوڑ دو۔'' وہ یکدم اپنا ضبط کھو بیٹھا۔ ان لڑکوں کے اشارے اور ہنسی ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے طیش اور برہم انداز نے منا ہل کو ساکت کر دیا۔ وہ ایسے اندازِ تخاطب کی کبھی عادی ہی نہیں رہی تھی۔

''او کے فائن، گو ٹو ہیل!'' اس نے بھی غصے سے جواب دیا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر واپسی کے لیے مڑی۔ رشی نے کوئی ردِعمل دینے سے گریز کیا۔ وہ جانتا تھا کہ منا ہل کو سر سے ٹالنے کا اس سے بہتر طریقہ اور کوئی نہیں تھا۔ اس کے جاتے ہی وہاں منڈلاتے لڑکے بھی غائب ہو گئے۔

رشی کے پاؤں سرد پانی کی وجہ سے شل ہو چکے تھے لیکن اسے کسی بھی بات کی پروا نہ تھی۔ شام کے سائے گہرے ہوتے ہی پرندوں کی آوازیں اعصاب کے لیے نیا امتحان ثابت ہونے لگیں۔ رشی کو کچھ اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ یہاں کب تک بیٹھا رہے گا۔ اسی وقت موبائل پر کسی نئے پیغام کی وصولی کا اشارہ ملا۔ اس کے پیٹ میں زبردست مروڑ اٹھی۔ یہ پیغام منا ہل کی طرف سے نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ جس طرح ناراض ہو کر رخصت ہوئی تھی اس کے بعد کم از کم آٹھ گھنٹے تک کوئی رابطہ نہیں ہو سکتا تھا۔

''کہیں یہ 'اسی' کا میسج تو نہیں؟'' مروڑ کی شدت میں اضافہ ہوا۔

''نن نہیں..... موبائل کمپنی کا بھی تو ہو سکتا ہے..... میں خواہ مخواہ ڈر رہا ہوں۔'' رشی نے خود کو بہلانا چاہا۔ اس کے پاس جو موبائل نیٹ ورک تھا، وہ کسی باتونی مزاج اہلیہ کی طرح وقت بے وقت اپنے ہی راگ الاپتا رہتا تھا۔ رشی نے دل کڑا کر کے فون جیب سے نکالا اور دیکھے بغیر ہی دوبارہ واپس رکھ دیا۔ اسے اپنا موبائل کوئی آسیب یا سانپ محسوس ہو رہا تھا۔

دس منٹ اسی ذہنی کشمکش اور اضطراب میں گزر گئے۔ ان کیفیات کا خاتمہ موبائل پر آنے والی کال سے ہوا۔ رشی کے پاس اب فون اٹھا لینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

''تمہیں دیا گیا وقت ختم ہو چکا ہے۔ کوئی فیصلہ تو کر ہی لیا ہو گا اب تک؟'' رشی کے کچھ بھی کہنے سے پہلے ایک فقرہ سماعت میں پڑا۔

''نہیں! میں نے ابھی کچھ نہیں سوچا۔'' اس نے اعتراف کیا۔

www.pakistanipoint.com

"لگتا ہے تم میری باتوں کو مذاق سمجھ رہے ہو۔" مخاطب نے تیکھے تیوروں سے کہا۔

"نہیں! وہ سب کچھ دیکھ لینے کے بعد مذاق کیسے سمجھا جا سکتا ہے؟" رشی کے انداز میں شگفتگی واضح تھی۔

"گڈ! بہت سمجھدار ہو تم۔ ایسے ہی سمجھداری کا مظاہرہ کرتے رہے تو کبھی نقصان نہیں اٹھاؤ گے۔" اس نے لفظ سمجھداری اور نقصان پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"چھوڑیں بس! کوئی اور بات کریں۔" رشی خوف زدہ ہوا۔

"میں تمہیں چھوڑ ہی تو نہیں سکتی میرے پرنس! کوئی اور بات ہمارے درمیان اسی صورت میں ہوگی جب تم کسی نتیجے پر پہنچو گے۔" وہ بے باک ہوئی۔

"میں تیار ہوں۔" یہ سہ حرفی فقرہ ادا کرتے ہوئے رشی کے وجود پر ایک قیامت گزری تھی۔

"گریٹ! مجھے علم تھا تم یہی فیصلہ کرو گے۔" وہ خوشی سے جھوم اٹھی۔

"میں آنا چاہتا ہوں۔" رشی نے ایک اور مشکل فقرہ ادا کیا۔

"اور میں تمہیں جانے دینا ہی نہیں چاہتی۔"

"کس ہوٹل کا کمرا بک کرواؤ گی؟" رشی نے ذہنی دباؤ کے تحت انداز تخاطب تبدیل کیا جس کا مقابل پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس کی بے باکی اور سرشاری اس ذرا سی تبدیلی سے ہی مزید بڑھ گئی تھی۔

"ہوٹل نہیں۔ تمہیں میرے گھر آنا ہوگا۔" وہ اطمینان سے بولی۔ رشی بوکھلا گیا۔

"کیا بات ہے؟ اب کیا ٹینشن ہے تمہیں؟" اس نے کڑے تیوروں سے پوچھا۔

"کچھ نہیں...... ٹینشن تو کوئی نہیں...... آپ اپنا ایڈریس سینڈ کر دیں...... میں پہنچ جاؤں گا تھوڑی دیر میں۔" رشی نے ہتھیار ڈال دیے۔

"اس طرح نہیں سوئٹ ہارٹ! اسی ٹون میں بولو نا جس طرح ہوٹل روم بک کروانے کا پوچھا تھا۔" اس کی نئی فرمائش پر رشی پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس کی بے بسی سے مکمل طور پر محظوظ ہو رہی ہے۔

"اپنا ایڈریس بھیجو مجھے...... میں تھوڑی دیر تک تمہارے گھر پہنچ جاؤں گا۔"

"ہاں! اب آیا نا مزہ! تمہاری زبان سے آپ جناب بہت اوپرا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا شوخ لہجہ رشی کو نہایت زہر لگ رہا تھا۔ اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ فضا میں خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔ پانی میں لٹکائے گئے پاؤں شل ہونے کے بعد اب جسم کا حصہ ہی معلوم نہ ہو رہے تھے۔ رشی نے پانی خشک ہونے پر... شرٹ اور آستین کے بٹن بند کیے اور جرابیں، جوتے پہن لینے کے بعد سڑک پر آ گیا۔ اسے اپنی بے بسی پر تاؤ آ رہا تھا لیکن وہ عملی طور پر کوئی قدم اٹھانے کے قابل ہی نہیں تھا۔ پرانے زمانے کی کہانیوں کے کسی جن کی طرح اس کی جان بھی ایک طوطے میں بندھی اور بدقسمتی کی انتہا یہ تھی کہ یہ طوطا شازیہ کی گرفت میں جانے کیسے جا پہنچا تھا؟ انہی خیالات میں غرق رشی نے ایک رکشے کو ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا اور مطلوبہ پتا سمجھا کر اندر بیٹھ گیا۔ اس کی بائیک خراب تھی اور ابھی تک مکینک کے پاس ہی موجود تھی۔

"اب جانے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو اس سے ایک دفعہ پوچھوں گا ضرور کہ یہ سب اس نے کہاں سے حاصل کیا تھا؟" اس نے رکشے کی سیٹ سے پشت ٹکاتے ہوئے سوچا۔ "اتنی آسانی سے بتائے گی تو نہیں لیکن پوچھ کر ہی رہوں گا۔"

پندرہ، بیس منٹ بعد رکشا ایک پُرہجوم علاقے میں داخل ہو گیا۔ یہاں سڑک پر غیر تکمیل شدہ تعمیری منصوبے کا ملبا، سریے اور کھدائی کی وجہ سے جا بجا کھڈے موجود تھے۔ رکشے کو لگنے والے جھٹکے رشی کو خیالات کی دنیا سے باہر لے آئے۔

"آرام سے چلاؤ یار!" اس نے سر پر لگنے والے ڈنڈے کی چوٹ سہلاتے ہوئے کہا۔

"میں تو آرام سے ہی چلا رہا ہوں صاحب جی!" ڈرائیور نے منہ بناتے ہوئے تعمیری منصوبے، سڑک کی خستہ حالت اور حکومتی اہلکاروں کی شان میں بے مثال فصاحت کا مظاہرہ کیا۔

"اتنا غصہ کیوں کر رہے ہو استاد؟ وقتی تنگی ہے۔ جلد ہی دور ہو جائے گی۔ پھر اس منصوبے کے فائدے بھی ہم ہی اٹھائیں گے۔" رشی نے اپنی چوٹ سے دھیان ہٹانے کے لیے بات کو طول دیا۔

"اس شہر میں نئے لگتے ہو باؤ!" ڈرائیور نے بیک ویو مرر سے رشی کا بھرپور جائزہ لیا۔

"ہاں! کچھ ایسا ہی سمجھ لو۔"

"اسی لیے نہیں جانتے کہ اس شہر اور یہاں کے باسیوں کو اپنے قابو میں رکھنے کے لیے ہماری حکومت یہ ڈرامے کرتی رہتی ہے۔" اس نے بائیں سمت گہرے کھڈے اور سریوں سے بچتے ہوئے بڑی مہارت سے موڑ کاٹا۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

"ڈرامے کیسے؟ تم لوگ تو خوش قسمت ہو جو یہاں اتنے پراجیکٹس ہوتے رہتے ہیں۔" اس نے ستائشی نظروں سے بڑے بڑے ستونوں اور آدھے تعمیر شدہ پل کو دیکھا۔

"او باؤ جی! دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔ مجھے پتا ہے کہ چھوٹے شہروں اور دوسرے علاقوں کے رہنے والے لوگ ہمیں حکومت کا سگا سمجھتے ہیں۔ ان ترقیاتی کاموں کی وجہ سے حکومت کی بلے بلے بھی کرتے ہیں۔ لیکن کوئی یہ نہیں جانتا کہ ان کاموں کے بدلے ہمارے ساتھ کیا کیا ہوتا ہے؟ کتنی دکانیں اور ٹھیلے ختم ہو جاتے ہیں۔" وہ ڈرائیور خاصا جلا بھنا بیٹھا تھا۔ اس کی باتوں میں محو ہو کر رشی وقتی طور پر ہی سہی لیکن دوپہر سے طاری جمود میں بہتری محسوس کرنے لگا۔ رکشا اب دائیں ہاتھ کی دو رویہ سڑک پر آچکا تھا۔ یہاں ٹریفک اور عوام کا ازدحام اور بھی زیادہ تھا۔ گاڑیوں، موٹر سائیکلوں، رکشوں اور موٹر سائیکل نما رکشوں کی طویل قطاریں ٹریفک میں پھنسی تھیں۔ ڈرائیور نے ایندھن بچانے کے لیے رکشے کا انجن بند کر دیا۔ رشی کی نظریں بیرونی مناظر پر بھٹکنے لگیں۔ دائیں جانب فرنیچر والی دکانوں کی بھرمار تھی تو بائیں سمت میں بنے بنائے کپڑوں، شادی بیاہ میں استعمال ہونے والے سامان، مختلف مالیت کے نوٹوں کے ہار اور جوتیاں اپنی بہار دکھا رہی تھیں۔

"مجھے لگتا ہے اس علاقے میں بھی پہلی بار ہی آئے ہو باؤ جی!" ڈرائیور نے اس کی محویت، حیرانی اور دلچسپی دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"ہاں! صحیح اندازہ ہے استاد تمہارا۔" رشی نے ذرا فاصلے پر موجود بس اسٹینڈ کے آس پاس نظر آتی کھانے پینے کی دکانوں سے نظریں چرائیں۔ اسے یکدم ہی یاد آیا کہ صبح ناشتے کے بعد اس نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ رکشا ڈرائیور سے باتیں کرتے اور اس پُرہجوم علاقے کی رونقیں دیکھتے ہوئے اسے احساس ہوا تھا کہ تنہا وقت گزاری کے بعد اس نے اپنا ذہنی تناؤ بڑھانے کے سوا کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ اسے کسی ایسے ہی مقام کی طرف نکل آنا چاہیے تھا، کسی سے بات چیت کر لینی چاہیے تھی۔ بات چیت کے تصور سے ہی اس کے ذہن میں مناہل کا سراپا گھوم گیا۔

"اس مسئلے سے نمٹ کر اُسے بھی منانا ہوگا۔" رشی نے اپنی انگلیاں چٹخائیں۔ اسی پل موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ حسبِ توقع دوسری جانب شازیہ ہی تھی۔

"کدھر رہ گئے ہو میرے پرنس؟ آدھا گھنٹا ہو چکا ہے تمہارا انتظار کرتے ہوئے۔"

"اس وقت ذرا دور تھا میں۔ اب آتے ہوئے تھوڑا وقت تو لگ جائے گا۔" رشی نے ضبط سے جواب دیا۔

"ہائے...... دور...... بڑے ہی 'وہ' ہو تم...... دوریاں تو شروع دن سے ہی بنا رکھی ہیں۔ تمہیں دیکھ کر کتنی بار دل کہتا رہا کہ کیوں دور دور رہندے او حضور میرے کولوں؟ مینوں دس دیو ہویا کیہہ قصور میرے کولوں؟" وہ اپنے حواس میں محسوس نہ ہو رہی تھی۔ باریک آواز میں گائے اس گانے نے رشی کا بدن سنسنا دیا۔

"جلدی آجاؤ میرے پرنس! آجا تینوں اکھیاں اُڈیک دیاں۔" شازیہ کی جانب سے ایک اور گانا شروع ہو گیا۔

"ٹریفک میں پھنسا ہوں۔ اب اُڑ کے تو آنے سے رہا۔" رشی نے غصے سے جواب دیا اور مزید کسی بھی ذومعنی گانے سے بچنے کے لیے رابطہ منقطع کر دیا۔ غصے اور جھنجلاہٹ میں اسے اندازہ ہی نہ ہوا کہ بیک ویو مرر سے ڈرائیور اسے بہت غور سے دیکھ رہا ہے۔

ٹریفک کا یہ بہاؤ اگلے پندرہ منٹ تک یونہی تعطل کا شکار رہا۔ اس دوران میں شازیہ نے ایک بار پھر فون کر کے اسے کئی ذومعنی پنجابی گانوں سے اپنی بے تابیوں کا اظہار کیا۔ رشی کے لیے طیش ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ ٹریفک رواں ہوتے ہی دس منٹ میں وہ مطلوبہ مقام تک پہنچ گئے۔

"لو باؤ! آگئی تمہاری منزل۔" ڈرائیور کی آواز نے اسے چونکایا۔ بس اسٹینڈ سے آگے وہ ایک لمبی سی گلی کے دہانے پر کھڑے تھے۔

"اندر خود ہی جانا ہوگا باؤ! یہاں رکشا یا گاڑی نہیں جا سکتی۔" ڈرائیور نے کرائے کی رقم بتاتے ہوئے کہا۔

"اچھا! چلو میں ڈھونڈ لوں گا خود ہی ایڈریس۔" اس نے پیسے تھمائے۔

"باؤ! تم مجھے اچھے بندے لگے ہو۔ چھوٹا ویر سمجھ کر مشورہ دے رہا ہوں۔ زیادہ دیر نہ رکنا یہاں!"

"ایسا کیوں استاد؟" رشی بے نیازی سے بولا۔ اس کے دل میں قدرتی طور پر یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ شاید واپسی کا کرایہ بھی بنانا چاہ رہا ہے۔

"اس جگہ کی شہرت کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے۔" ڈرائیور نے انکشاف کیا۔

"اچھا! کیسے لوگ رہتے ہیں یہاں؟" وہ چونکا۔

"مکس آبادی ہے باؤ! پرانے گھروں والے مکان کرائے پر چڑھا کر باہر نئی آبادیوں کی طرف نکل گئے......

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

ہاں۔ اب کسی کو کیا پتا کس ٹائپ کے لوگ گھر لے رہے ہیں۔ فیملیز نہیں رہتی ہیں یہاں۔ اکثر دو، چار لڑکے یا لڑکیوں کا گروپ اکٹھے ہو کر کرایہ بانٹ لیتے ہیں یا سستی عیاشی والے اپنا اڈا بنا لیتے ہیں۔ ابھی دو ہفتے پہلے یہاں ایک قتل بھی ہوا ہے۔ کوئی لڑکا شادی شدہ عورت کے گھر آیا کرتا تھا۔ ایک روز شوہر پہنچ گیا اور دونوں کو موقع پر ہی قتل کر کے فرار ہو گیا۔‘‘

’’یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو بھئی؟‘‘ رشی اس لمبی وضاحت سے اُلجھا۔

’’باؤ! سارا دن سواریاں اٹھاتا ہوں۔ چہرہ اور آنکھیں دیکھ کر اندر کا حال بتا دیتا ہوں۔ تو مجھے کسی اچھے ماں پیو کا لگتا ہے لیکن تجھے جس کا فون آیا تھا ناں! اس کے ارادے نیک نہیں لگتے۔ اسپیکر سے باہر ساری آوازیں آرہی تھیں۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ بھیڑ کے روپ میں کوئی لومڑی ہے۔ بظاہر کسی مقدس پیشے سے جڑی ہے مگر باطن کی سیاہی اب بھی کہیں نہ کہیں جھلک جاتی ہے۔ بس ذرا ہاتھ پیر بچا کر ملاقات کرنا۔‘‘ اس نے رشی کا کندھا تھپتھپایا اور رکشا واپس موڑ لیا۔ رشی اس نیم تعلیم یافتہ، سادہ مزاج اور بے لوث شخص کو حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔ اس نے کس قدر آسانی سے شازیہ کے بارے میں اندازہ لگا لیا تھا۔ رشی اپنے ہونٹ کچلتے ہوئے گلی میں داخل ہو گیا۔

☆☆☆

شازیہ اپنے گھر میں جلے پاؤں کی بلی کی مانند بار بار دروازے تک منڈلا رہی تھی۔ اس کی عمر انتالیس سال تھی۔ جسامت چھریری، رنگت صاف اور نقوش تیکھے تھے۔ معاشیات اور سیاسیات میں ماسٹرز کی ڈگریاں لے کر وہ اس وقت ایک نجی کالج میں روزانہ دو لیکچرز دینے کے علاوہ کوآرڈی نیٹر کی نوکری سے معقول تنخواہ حاصل کر رہی تھی۔ شازیہ فطرتاً عجلت پسند واقع ہوئی تھی۔ اس کی یہی بے تابی اس وقت بھی چہرے سے جھلک رہی تھی۔ وہ بار بار موبائل کی جانب دیکھنے لگتی۔ تنگ آکر اس نے رشی کا نمبر ملا لیا۔ دوسری جانب چوتھی گھنٹی پر فون اٹھا لیا گیا۔

’’اب تم میرے صبر کا امتحان لے رہے ہو پرنس!‘‘ وہ اس بار قدرے سختی سے بولی۔

’’گلی میں داخل ہو چکا ہوں لیکن یہاں کافی اندھیرا ہے اور گٹروں کا پانی بھی کھڑا ہے۔‘‘

’’تو اس میں اتنا گھبرانے کی کیا بات ہے؟ موبائل کی ٹارچ آن کرلو اور سائڈ سے ہو کر سیدھے چلے آؤ۔ اس گلی کے بالکل نکڑ پر گرے کلر کا دروازہ ہوگا۔ بیل دینے یا ناکنگ کی ضرورت نہیں۔ دروازہ کھلا ہی ہوگا۔ آجاؤ! میں انتظار کر رہی ہوں۔‘‘ اس نے فون بند کیا اور سیلفی کیمرے سے اپنے میک اَپ کا جائزہ لینے لگی۔ تین منٹ بعد دروازہ بند ہونے کی آواز اس کے احساسِ تفاخر میں اضافہ کر گئی۔ وہ اٹھ کر خود اس کا استقبال کرنا چاہتی تھی لیکن اپنی پوزیشن کے خیال نے رکنے پر مجبور کر دیا۔ رشی کے قدموں کی چاپ کمرے کے بالکل قریب آگئی تھی۔

’’مے آئی کم اِن میم؟‘‘ اس نے غیر ارادی طور پر دستک دے کر پوچھ لیا۔ شازیہ اس کی حرکت پر بے ساختہ ہنس دی۔

’’سوری! وہ میں اچانک ہی بس......‘‘ رشی نے خفت سے سر جھکا لیا۔

’’کوئی بات نہیں۔ اِٹس نیچرل۔‘‘ وہ پُرشوق نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ رشی نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی اور کوشش کے باوجود نظریں نہ چُرا سکا۔ شازیہ کا میک اَپ، کھلے بال، انتہائی چست لباس اس کے لیے کوئی نیا منظر نہ تھا۔ وہ کالج بھی اسی حلیے میں آیا کرتی تھی لیکن اس وقت اپنے مزاج میں یہ اچانک تبدیلی اسے ہولا رہی تھی۔ اس نے اپنا دھیان ہٹانے کی غرض سے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ دیوار کی دائیں سمت ایک سنگل بیڈ رکھا تھا جس کے ساتھ پلاسٹک کی دو کرسیاں اور شیشے کی تپائی بھی موجود تھی۔ بائیں دیوار کے ساتھ ڈبل بیڈ تھا جس کے بالکل سامنے نیم وا چوبی الماری سے کپڑے اور جوتیاں خاصی بے ترتیب حالت میں نظر آرہے تھے۔ مجموعی طور پر کمرے میں بے ترتیبی اور بدسلیقگی ہی نمایاں تھی۔

’’لگتا ہے کالج سے ابھی گھر نہیں گئے تم؟‘‘

’’نہیں!‘‘ وہ مختصراً بولا۔

’’اب کیا مادام تساؤ میوزیم کے مجسمے کی طرح یہیں کھڑے رہو گے؟ آگئے ہو تو بیٹھ بھی جاؤ!‘‘ شازیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ اس کی ہر ایک ادا سے خمار اور سرشاری جھلک رہی تھی۔ رشی خاموشی سے پلاسٹک کی اس نیلی کرسی پر بیٹھ گیا۔

’’چائے پیو گے یا ٹھنڈا؟‘‘

’’کچھ بھی نہیں! آپ بس جلدی بات کیجیے۔ مجھے کسی ضروری کام سے جانا ہے۔‘‘

’’چلے جانا بھئی! گھر کون سا کہیں بھاگا جا رہا ہے؟‘‘ وہ بے نیازی سے بولی۔ رشی بادلِ ناخواستہ خاموش ہو گیا۔ شازیہ نے پُرشوق نظروں سے دیکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

’’اب ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں میم؟‘‘ وہ اکتا کر بولا۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

پچھلی بار کی طرح اب بھی اس نے واہیات گانا گنگنایا۔ اسے اپنے سامنے بیٹھی اس عورت سے وحشت محسوس ہو رہی تھی۔

شازیہ کے متعلق کالج میں طلبہ کی رائے بالکل اچھی نہ تھی۔ وہ اس کے لباس، رنگ برنگے بالوں اور زیورات کے انتخاب کا خاصا مذاق اُڑایا کرتے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ طنزیہ فقرے اور تضحیک پر مبنی یہ باتیں صرف اپنے واٹس ایپ گروپس اور فری پیریڈز میں ہونے والی بات چیت تک ہی محدود تھیں۔

''اب تم کس سوچ میں پڑ گئے ہو ہیرو؟'' شازیہ نے چٹکی بجا کر اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

''کچھ نہیں! بس آپ کے سامنے ہی ہوں۔'' وہ اسے بتا ہی نہیں سکتا تھا کہ کالج کے لڑکے، لڑکیوں میں اس کے بارے شرطیں لگا کرتی تھیں کہ آج کل کون سا اسٹاف ممبر اس کا منظورِ نظر ہے۔

''کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔'' وہ لچکتی ہوئی اٹھی اور اس کے مقابل کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے وجود سے اٹھتی پرفیوم کی خوشبو بہت مسحور کن تھی۔

''یہاں اکیلی رہتی ہیں آپ؟ فیملی نہیں رہتی ساتھ؟'' رشی نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''اکیلی ہوتی ہوں اور نہیں بھی۔'' شازیہ نے اس کے کندھے سے کاج بیگ اتار کر ایک جانب اچھال دیا۔ رشی یکدم تڑپ گیا۔

''بیگ ایسے تو نہ پھینکیے میم! اس میں اسلامیات کی بک بھی رکھی ہے۔''

اس کے بے ساختہ انداز پر شازیہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ رشی نے فوراً اٹھ کر بیگ تپائی پر رکھا اور واپس کرسی پر آبیٹھی۔

''آپ نے بتایا نہیں میم؟ اکیلی ہی رہتی ہیں کیا آپ؟''

''میم کیوں کہہ رہے ہو مجھے؟ اور یہ آپ جناب بھی تمہاری زبان سے بالکل اچھا نہیں لگتا۔'' اس نے رشی کی ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے کہا۔ وہ جھرجھرا کر رہ گیا۔

''نام لے کر بات کرو نا مجھ سے؟'' اس کے بظاہر شیریں لہجے میں بھی تحکم کا عنصر واضح تھا۔ رشی اس لمحہ بیک وقت سنسنی اور بے بسی کے متضاد جذبات میں گھر گیا۔ ایسی کیفیات اسے پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھیں۔

''آپ نے مجھے یہاں کس لیے بلوایا ہے شازیہ؟'' وہ تھوک سے حلق تر کرتے ہوئے بولا۔

''اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے۔'' اس نے ٹائی مزید ڈھیلی کی۔

''تمہاری فیملی کہاں ہوتی ہے؟ اگر اس وقت یہاں کوئی آ گیا تو میری موجودگی کس طرح جسٹی فائی کرو گی؟'' رشی نے اندازِ تخاطب تبدیل کیا۔

''میں اکیلی رہتی ہوں یہاں۔ فیملی میں کوئی قریبی رشتے دار نہیں۔ وہ آؤٹ آف سٹی ہیں۔''

''لیکن یہ بیڈ اور سامان؟'' رشی نے ڈبل بیڈ اور کچھ سامان کی طرف اشارہ کیا۔

''میری روم میٹس ہیں۔ ہم سب نے مل کر یہ گھر کرائے پر لے رکھا ہے۔ اب تمہارا اگلا سوال یقیناً یہ ہوگا کہ وہ دونوں کہاں ہیں؟ یہاں آ گئیں تو کیا ہوگا؟ ہے نا؟''

''جی! یہی پوچھنا تھا۔''

''ویل! وہ دونوں چھٹیوں پر اپنے گھر چلی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک قریبی اسپتال میں نرس اور دوسری کسی ہوٹل میں ریسپشنسٹ ہے۔ اگر وہ یہاں موجود بھی ہوتیں تو کرنسی دکھاتے ہوئے باہر صحن میں ہی موجود رہتیں یا مارکیٹ میں کہیں چلی جاتیں۔ ان کے مہمان آتے تو میں بھی یونہی اسپیس دیتی انہیں۔ سمپل۔'' شازیہ نے ٹائی کا مشغلہ ترک کر کے اس کے بال سہلانے شروع کر دیے۔ اس کا لمس رشی کو مزید مضطرب کرنے لگا۔

''شادی کیوں نہیں کی تم نے ابھی تک؟ اس طرح زندگی تو نہیں گزرتی نا۔'' وہ خواہش کے باوجود اس کا ہاتھ اپنے بالوں سے نہ ہٹا سکا۔

''کس نے کہا کہ نہیں کی تھی شادی؟'' وہ ہنسی۔ ''ایک بار بھی نہیں دو مرتبہ کر چکی ہوں۔ پر میری اُن سے نبھی ہی نہیں۔ ایک نے مجھے چھوڑ دیا اور دوسرے کو میں نے چھوڑ دیا۔ اس وقت سے آج تک بہت پُرسکون زندگی گزار رہی ہوں۔''

رشی یہ جواب سن کر خاموش ہو گیا۔ سناٹا، تنہائی اور شازیہ کی قربت اس کی سنسنی بڑھاتی ہی چلی جا رہی تھی۔ حیران کن طور پر اسے یہ بات بھی بھول گئی تھی کہ وہ یہاں کس ذہنی اذیت سے گزر کر آیا ہے۔

''کر لینی چاہیے تھی تمہیں شادی۔'' اس سے سانس لینا دشوار ہونے لگا۔

''کر لوں گی۔ جب دل کیا یا جب کوئی اس قابل ملا۔'' شازیہ کی حرکات شائستگی کی حدود پار کرنے لگی تھیں۔

''تم نے مجھے یہاں کیوں بلوایا تھا؟'' رشی کے ذہن میں یہ سوال مچلا لیکن زبان کی نوک پر آنے سے پہلے ہی دم توڑ

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

آیا۔ شازیہ کی پیش قدمی یکدم ہی وحشیانہ حد تک جارحانہ ہوگئی تھی۔ جذبات کی ایک تند لہر نے رشی کو بھی بے قابو کر دیا۔ شوریدہ سری کا یہ طوفان تھما تو اسے اپنے وجود سے بھی کراہت محسوس ہونے لگی۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ شازیہ کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ اور فاتحانہ چمک اسے اپنی ہی نظروں میں گرا رہی تھی۔

''میرے اندازے سے کہیں زیادہ آسان شکار ثابت ہوئے تم تو!'' وہ طنزیہ ہنسی۔ ''ورنہ کالج میں جس طرح ریزروڈ رہتے تھے مجھے تو لگا تھا بڑی محنت کرنی پڑے گی تمہیں یہاں تک لانے میں۔''

''کیا چاہتی ہو مجھ سے؟'' وہ اپنے بال نوچتے ہوئے بولا۔

''محبت..... اس کے سوا کچھ بھی نہیں میرے پرنس!'' اس کی معصومیت دیدنی تھی۔

''یہ زبردستی کا سودا نہیں ہوتا۔'' وہ تلخی سے بولا۔

''یعنی مانتے ہو کہ ہوتا یہ سودا ہی ہے۔ تو پھر مجھ سے کرلو سودا۔'' شازیہ محظوظ ہوئی۔

''خدا کا واسطہ ہے میری جان چھوڑ دو۔'' رشی زچ ہوا۔

''چھوڑ دوں؟ کیا بچ مچ؟'' اس نے سرہانے کے پاس رکھا موبائل اٹھایا اور اسے اپنے 'فنگر لاک' سے کھولنے کے بعد ایک ویڈیو نکال لی۔ موبائل کے اسپیکر سے نکلنے والی آوازیں سن کر رشی نے اذیت سے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

''بند کردو اسے! فار گاڈ سیک! بند کردو اسے۔ یہ آخر مل کہاں سے گئی تمہیں؟''

''بس مل گئی۔ تم سے پہلے جو مہمان یہاں آیا تھا اسی نے یہ موبائل گفٹ کیا تھا۔ میں نے تو یونہی رواداری میں تعریف کردی تھی۔ وہ حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہوئے مجھے گفٹ دے گیا۔'' شازیہ کا انداز واضح بتا رہا تھا کہ وہ دانستہ طور پر رشی کی بے بسی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اتنی جزئیات بیان کر رہی ہے۔ ''اس کا موبائل سیل اینڈ پر چیز کا بھی کام ہے۔ میں نے یونہی ٹائم پاس کے لیے گیلری کھولی تو بہت سی 'چٹخارے دار' ویڈیوز کے علاوہ یہ بھی مل گئی۔ یقین کرو! میں نے تو پہلے پہچانا ہی نہیں کہ یہ تم ہو۔ دو روز بعد کالج میں کسی سے بات کرتے نظر آئے تو فوراً دماغ کی بتی روشن ہوگئی۔ بس اس کے بعد تمہارا نمبر ڈھونڈ کر یہ 'گفٹ' تمہیں بھی سینڈ کر دیا۔'' وہ تفصیل بتا کر اس کی ہر ایک کیفیت سے محظوظ ہو رہی تھی۔ رشی کا ذہن دو جمع دو چار کی طرح ساری صورتِ حال سمجھ گیا تھا۔

''کہاں رہتا تھا تمہارا یہ مہمان؟'' اس نے پوچھا۔

''ویل! اس سوال کا جواب اتنی آسانی سے دے دوں کیا؟'' شازیہ نے بڑی معصومیت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔ رشی اس کا عندیہ بھانپ کر ایک عجیب دیوانگی میں مبتلا ہوگیا۔ اس کا غصہ، بے بسی اور وحشت ہی شازیہ کا اصل مطلوب تھی۔

''کون تھا وہ جس نے تمہیں یہ ویڈیو دی؟'' دیوانگی کا وہ طوفان تھمتے ہی رشی گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔ شازیہ نے معنی خیز ہنسی کے سُر بکھیرے اور ایک نام بتا کر رشی کے بدترین خدشات کی تصدیق کردی۔

''یہ ویڈیو ڈیلیٹ کردو شازیہ! تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔ اپنے ماں باپ کی قسم ہے۔ اسے ڈیلیٹ کردو۔'' اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''کردی نا احمقوں والی بات؟'' شازیہ ایک بار پھر ہنسی۔ ''میں جانتی ہوں کہ اس جن میں ہی تمہاری زندگی قید ہے۔ جب تک یہ ویڈیو میرے پاس رہے گی تم میری مٹھی میں رہو گے۔'' اس کا اطمینان رشی کے وجود میں زلزلہ برپا کرنے لگا۔

''ایک عرصے بعد تو مجھے کوئی من پسند پارٹنر ملا ہے۔ اب میں جب اور جس وقت بھی کہوں تمہیں یہاں میرے پاس آنا ہوگا۔'' وہ بالواسطہ طور پر اس کی 'حیثیت' کا تعین کر رہی تھی۔ رشی کی آنکھوں اور چہرے پر سرخی اتر آئی۔

''اور اگر میں نہ آؤں تو؟'' اس کا دماغ کھولنے لگا۔

''تم انکار کی پوزیشن میں کہاں ہو مائی ڈیئر؟ یہ ویڈیو اگر میں کسی بھی فیک آئی ڈی سے تمہارے کسی کلاس فیلو کو سینڈ کر دوں تو سوچو کیا ہوگا؟ تمہاری شہرت کو چار چاند ہی نہیں بلکہ چھ مشتری، آٹھ زحل، بارہ مریخ اور بتیسوں زہرہ بھی لگ جائیں گے۔ کس کس کو وضاحت دیتے پھرو گے کہ اس کا اصل بیک گراؤنڈ کیا تھا؟ پورا کالج تمہارے نام کے نعروں سے گونج رہا ہوگا۔ واؤ! کتنا ونڈرفل سینار یو ہوگا۔'' وہ چٹخارے لیتے ہوئے بولی۔

رشی کی آنکھوں کے سامنے سرخ چادر تن گئی۔ اس نے تھوڑے ہی فاصلے پر موجود اپنی یونیفارم بیلٹ اٹھائی اور وحشیانہ انداز میں شازیہ کی گردن کے گرد لپیٹ دی۔ بقا کے جبلی احساس کے تحت شازیہ نے اپنی انگلیاں حلق اور بیلٹ کے درمیان حائل کر دیں۔ وہ کسی بھی طرح اس ہولناک احساس کو دور کر دینا چاہتی تھی لیکن ایک بپھرے ہوئے ہاتھی کی سی طاقت کا سامنا اس کے نرم و نازک وجود کے بس کی بات

www.pakistanipoint.com

ہی نہ تھی۔ اس کی ٹانگیں بُری طرح مچلنے لگیں۔ سرخ سرخ تر ہوتا چہرہ خوف اور دہشت سے بھیانک تاثر دے رہا تھا۔ آنکھیں حلقوں اور سانس لینے کے لیے زبان حلق سے باہر لٹکنے لگی۔

یہ خوفناک لمحے اور خرخراہٹ چند لمحے جاری رہی۔ شازیہ کی مزاحمت دھیرے دھیرے کم ہونے لگی۔ اس کا جسم بالآخر بے جان ہو گیا تھا۔ رشی نے اس کے چہرے پر غصے سے ٹھوکریں رسید کیں اور اپنا یونیفارم پہننے لگا۔ اس کا ذہن صورتِ حال کا تیزی سے جائزہ لے رہا تھا۔ بیگ اور یونیفارم پہن لینے کے بعد اس نے کچھ سوچ کر بستر کی چادر کھینچ کر اتاری اور کمرے سے اپنی انگلیوں کے نشان مٹانے لگا، شازیہ کی لاش وہیں فرش پر پڑی رہی۔ اس نے چند لمحے کے لیے ممکنات کا مزید جائزہ لیا۔ اسے گلی سے یہاں آتے ہوئے کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اسی لمحے ذہن میں ایک کوندا لپکا۔ اس نے چادر کو ہاتھوں میں لپیٹا اور شازیہ کی لاش کو گھسیٹتے ہوئے غسل خانہ تک لے گیا۔ اس کے مردہ وجود پر پانی کی چار بالٹیاں بہا دینے کے بعد لاش کو وہیں چھوڑا اور انگلیوں کے مزید نشانات مٹاتا ہوا ایک بار پھر کمرے میں چلا آیا۔ بستر کے نیچے موبائل کو چیل کی طرح جھپٹ کر وہ دوبارہ غسل خانہ میں گیا اور شازیہ کی لاش سے فنگر لاک کھلوا کر ویڈیوز کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی توقع کے عین مطابق وہاں کالج کے چند ایک معزز چہروں کی قابلِ اعتراض تصاویر بھی موجود تھیں جو یقیناً انہوں نے شازیہ پر کمالِ احمقانہ اعتماد کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے روانہ کر رکھی تھیں۔ وہ غسلخانہ کی دیوار کا سہارا لیے اپنی ویڈیو دوبارہ دیکھنے لگا۔ اذیت کی ایک تیز لہر رگیں چٹخانے لگی۔ یہ بارودی مواد سے بھی زیادہ دھماکے دار مادّہ یقینی طور پر شازیہ نے کسی کو نہیں بھیجا تھا۔ رشی نے فوراً ویڈیو ڈیلیٹ کر کے موبائل فون کی ترتیبات 'زیرو میٹر' کر دیں۔ اس پر بھی تسلی نہ ہوئی تو کچھ سوچ کر موبائل جیب میں ٹھونس لیا۔ اس کے ذہن میں فون ٹھکانے لگانے کا ایک ایسا مقام آیا تھا جہاں سے کوئی بھی شخص تا قیامت اسے بازیاب نہیں کر سکتا تھا۔ اس مقام کا 'محلِ وقوع' بھی موبائل فون سے بہ آسانی مل گیا۔

رشی نے مزید احتیاطی تدابیر کے تحت تمام ممکنہ مقامات سے ایک بار پھر اپنی انگلیوں کے نشان مٹائے اور برآمدے کے کونے میں بنے مختصر باورچی خانہ سے ایک سیاہ رنگ کا شاپر برآمد کر کے چادر اور موبائل اسی میں ٹھونس دیے۔ گلی میں اب بھی اندھیرا تھا۔ وہ بااعتماد قدموں سے چلتا باہر نکلا اور مرکزی سڑک پر آنے کے بعد کسی سواری کی تلاش کے بجائے پیدل ہی مخالف سمت میں چل دیا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چہرے اور گردن پر لگتے ہی اعصاب کی کشیدگی کم ہونے لگی تھی۔

نصف گھنٹے کی مسافت کے بعد وہ اپنے مطلوبہ مقام تک پہنچ گیا۔ اس نے سیمنٹ کی منڈیر پر ہاتھ رکھ کر نیچے جھانکا جہاں بدبودار تاریکی کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ ایک گندا نالا تھا جہاں علاقے بھر کے گٹروں کا پانی جمع ہوتا تھا۔ کچھ عرصہ قبل ایک ایسے ہی نالے کو بند کر دینے والی حکومتی انتظامیہ اگر مستقبل میں اس جانب متوجہ ہو بھی جاتی تو تب تک یہ سامان بہہ کر جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہوتا۔ اس نے بھرپور نفرت اور قوت سے شاپر نیچے پھینکا اور اندھیرے میں کتنی ہی دیر اس نادیدہ نکتے کو بہتے دیکھتا رہا۔ حیران کن طور پر اسے بدبو اور گھٹن کا بھی احساس نہ رہا تھا۔ اپنے ماضی کے اس شرمناک حصے سے خلاصی کا تصور اعصاب کو پُرسکون کرنے لگا تھا۔

''یا اللہ! تیرا شکر ہے۔ یہ دونوں پریشانیاں تو ختم ہوئیں۔'' اس نے شازیہ کی ذات سے وابستہ لمحات ذہن سے جھٹکتے ہوئے سوچا اور کسی سواری کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگا۔ کچھ ہی لمحوں بعد اسے ایک خالی رکشا مل گیا۔ گھر پہنچنے سے قبل ایک دو ضروری کام نمٹا کر وہ مزید پُرسکون ہو چکا تھا۔ رات گئے بستر پر لیٹتے ہی دل و دماغ ایک نئی ہلچل کی زد میں آ گئے۔ اس نے نیند کی آغوش میں پناہ لینے کی بہت کوشش کی لیکن رفتہ رفتہ یہ ہلچل شدید بے چینی میں ڈھلنے لگی۔

''شازیہ کو تو اس کے انجام تک پہنچا آیا ہوں لیکن انصاف کا تقاضا تو یہ بھی ہے کہ اس ویڈیو کے اصل 'ذمے داروں' کو بھی اسی طرح تڑپا تڑپا کر ماروں۔'' ایک سفاک سوچ نے اسے نئی راہ سجھائی۔ ذہن میں تین مختلف سراپا مکمل جزئیات کے ساتھ ابھر آئے۔

''اقصیٰ...... منیب...... جمال......'' وہ دانت کچکچاتے ہوئے بولا۔ ''ہاں! یہی ان حادثہ کے ذمے دار تھے۔ انہیں بھی تو ایسی ہی سزا ملنی چاہیے۔ وہ کیوں اس دنیا میں موجود رہیں بھلا؟''

''تم شاید بھول رہے ہو کہ اس بات کا ذمے دار کوئی 'اور' بھی تھا۔'' اس کی سماعت میں کسی نادیدہ کی سرگوشی ابھری۔

''وہ اس وقت میری پہنچ میں نہیں۔ خدا جانے کہاں ہو گا کہاں نہیں؟ اگر کبھی زندگی نے اس سے سامنا کروا دیا تو بچے گا وہ بھی نہیں۔'' اس نے خود کلامی کی۔

Wajid Azeem
www.pakistanipoint.com

’’چلو خیر! وہ تو جو ہوا سو ہوا! لیکن یہ تین تو مُردے نہیں ہیں نا۔ انہیں بھی جینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اصل ذمے دار تو یہی ہیں نا۔‘‘ سرگوشی مزید تیز ہوئی۔

’’ہاں! ایسا ہونا مشکل ہی سہی ناممکن تو بہرحال نہیں [illegible] زندگی کا احساس لیے میں کس طرح پُرسکون [illegible] گا۔‘‘ وہ بستر پر پیٹ کے بل لیٹے سوچنے لگا۔

’’مجھے زندگی میں بہت آگے جانا ہے۔ ابھی تو ایک [illegible]ل ڈگری لینی ہے، اچھی سی نوکری حاصل کرنی ہے، دولت کما کر مناہل کو شادی کی پیشکش کرنی ہے۔ اس حکومتی پنج سالہ منصوبے کے دوران اگر کوئی حزبِ اختلاف کی طرح خوفزدہ زندگی کا کوئی لمحہ لیے روڑے اٹکانے آ گیا تو میری تمام ریاضت مٹی میں مل جائے گی۔‘‘ وہ تڑپ کر سیدھا ہوا۔

’’نہیں! مجھے خوفزدہ زندگی ہی تو نہیں جینی۔ مجھے اپنے لیے نئے رستے تلاش کرنے ہیں اور وہ میں کسی بھی قیمت پر تلاش کر کے ہی رہوں گا بھلے اس کے لیے مجھے تین کیا تین سو قتل کیوں نہ کرنے پڑیں۔‘‘ شازیہ کی موت سے ملنے والی سرشاری کا احساس اس قدر طاقتور تھا کہ انسانی جان کے ضیاع کا قلق ختم ہی ہو گیا تھا۔

’’مناہل کو پروپوز کرنے کے بعد وہ ایک دو سال تک تو میرا انتظار کر ہی لے گی۔‘‘ اس نے اعتماد سے سوچا۔

مناہل کا تصور ذہن میں آتے ہی دوپہر والا واقعہ یاد آ گیا۔ اس کی جانب سے اب تک مکمل خاموشی یہی ظاہر کر رہی تھی کہ وہ یقیناً سخت ناراض ہو کر گئی تھی لیکن رشی کو بھی علم تھا کہ اس کی خفگی کس طرح دور کی جا سکتی ہے۔ اس نے اپنا واٹس ایپ اکاؤنٹ کھولا جہاں حسبِ توقع مناہل کے نمبر سے قدرے دکھیارے ’اسٹیٹس‘ نظر آ رہے تھے۔ پہلا اسٹیٹس ہی رشی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لے آیا۔

’’صبر بے مثال تھا، ہمت تھی بلا کی میری...... پر تیری بات تھی سہنے میں ذرا وقت لگا۔‘‘

رشی نے سر کھجاتے ہوئے اپنے الفاظ مجتمع کیے اور مسکراتے ہوئے جواب دینے لگا۔

’’آپ کی یہی ادا اور خوبیاں تو آپ کو کائنات بھر میں ممتاز کرتی ہیں۔‘‘

جواب روانہ ہوتے ہی اگلا اسٹیٹس نظر آیا تو وہ ایک بار پھر اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ مناہل نے ڈھیروں شکستہ دل اور آنسوؤں کے درمیان لکھا تھا۔

’’اگر کسی کو تکلیف دے کر بھی سکون کی نیند سو لیتے ہو تو اپنے ضمیر کا جنازہ پڑھ لو کیونکہ وہ وفات پا چکا ہے۔‘‘

’’یہاں سویا ہی کون کم بخت ہے؟ اگر آپ کو تکلیف دے کر ہمیں نیند آ جائے تو رب کرے کہ وہ ہماری ابدی نیند ہو۔ اس کے بعد روزِ حشر ہی آنکھ کھلے۔‘‘

جوابات بھیجتے ہوئے رشی کو یہ اطمینان بھی تھا کہ مناہل یہ پیغامات فوری پڑھ رہی ہے۔ اس نے پُرشوق انداز میں اگلا اسٹیٹس کھول لیا۔

’’اگر آپ بے کار ہو جائیں تو لوگ لاتعلق ہونے میں دیر نہیں لگاتے۔‘‘

’’چاند بھی کبھی کسی تاریک رات کے مسافر کے لیے بے کار ہوا ہے؟ وہ تو اس کے لیے منزل تک پہنچنے اور تاریکی ختم کرنے کا واحد رستہ ہوا کرتا ہے۔‘‘ رشی نے اس بار نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

’’کون ہیں آپ؟ کیا میں آپ کو جانتی ہوں؟‘‘ دوسری جانب سے ٹیڑھے منہ بنائے اسمائلز روانہ کی گئیں۔

’’ہم آپ کا دل دکھانے کے مجرم ہیں۔ سزا پانے آئے ہیں۔‘‘

’’انسان ایسا جرم کرے ہی نہ جس کے بعد یوں سزا لینے کی منتیں کرنی پڑیں۔‘‘ اس کی بے نیازی عروج پر تھی۔

’’بس کیا کروں؟ تم پر کسی کی غلط نظر یا فقرہ برداشت ہی نہیں ہوتا۔ دل چاہتا ہے ایسا کرنے والے کی آنکھیں نکال کر زبان بھی کتّوں کے آگے ڈال دوں۔‘‘ رشی نے اندازِ تخاطب تبدیل کر لیا۔

’’ہم اس دنیا میں یوں کٹ کر نہیں رہ سکتے رشی! انسان کا اگر اپنا دل صاف ہو تو ایسی نظروں کا اثر نہیں ہو سکتا۔‘‘ مناہل نے روایتی دلیل دی۔

’’تمہیں نہیں پڑتا ہو گا مانو! لیکن مجھے پڑتا ہے۔ مجھ سے تم پر کسی کی بھی غلط نظر برداشت نہیں ہوتی۔ تمہیں نہیں علم کہ ان نظروں کے پیچھے کس قدر گندگی اور حیوانیت بھری ہوتی ہے۔ پھر بھی تمہارا دل دکھانے کے لیے معذرت کرتا ہوں۔ آئی ایم ریئلی سوری۔ اب اگر تم چاہو تو مجھے تھپڑ مار کر ویری سوری کہہ لو۔ میں ہر سزا کے لیے تیار ہوں۔‘‘

’’معافی لینی ہے تو ٹریٹ دینی ہو گی۔‘‘ مناہل کا جواب حسبِ توقع تھا۔

’’منظور ہے۔ بولو! کہاں چاہیے یہ ٹریٹ؟‘‘

’’ٹھیک ہے۔ تمہیں اچھا خاصا فائن ہو گا اس ٹریٹ کے بدلے۔‘‘ اس کے مزاج کا پارا اب کافی ہلکا دکھائی دے رہا تھا۔ رشی نے اسے بڑی محبت سے ان لڑکوں کی نیت اور سوچ کے متعلق بتا کر موم کرنا شروع کر دیا۔ اگلے ایک گھنٹے

میں وہ اپنی ناراضگی ترک کر چکی تھی۔ تھوڑی دیر مزید گفتگو کے بعد وہ آف لائن ہوگئی۔ رشی کا ذہن ایک بار پھر اگلے روز کی سرگرمیوں میں اُلجھ گیا۔ اسے علم تھا کہ تینوں شکار کہاں رہتے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل ہی اتفاقی طور پر ان کی رہائش گاہ کا علم ہوا تھا۔ اس نے ایک بار وہاں جا کر تینوں کے معمولات کی ریکی کا فیصلہ کیا اور نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

☆☆☆

''یہ میں کیا سن رہا ہوں؟'' اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

''ایسا کیا سن لیا بھئی؟'' مقابل کی بے نیازی اسے ہمیشہ ہی محبوب رہی تھی لیکن آج کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

''تم نے یہ کیا فیصلہ کیا ہے؟''

''وہی جو مجھے بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔'' اس کی مسکراہٹ دل جلا رہی تھی۔

''تو پھر بہت پہلے نہ کرنے کی وجہ؟''

''ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے ناں! بس اس کام کا یہی وقت ہوگا۔'' اس کی بُردباری کسی دانشور کو بھی مات دے رہی تھی۔

''اس فیصلے کے حق میں کم از کم ایک وجہ بتا دو۔''

''وجہ تمہیں بہت پہلے سے ہی معلوم ہے۔''

''موری کی اینٹ چوبارے میں نہیں لگا کرتی۔ ابھی بھی وقت ہے اپنا فیصلہ بدل لو۔'' وہ حد درجہ سنجیدہ تھا۔

''یعنی آج تم نے بھی مجھے طعنہ دے ہی دیا۔'' اس نے ہمیشہ کی طرح فقرے سے اپنا من پسند مطلب اخذ کیا اور موخر الذکر بات بالکل نظر انداز کر دی۔

''تم اپنا یہ فضول منطق اپنے پاس ہی رکھو احمق عورت! بات کو گھمانے کی کوشش نہ کرو۔'' وہ جھنجلایا۔

''مجھے تو پہلے ہی پتا تھا کہ تم عورت ذات کی عزت کر ہی نہیں سکتے۔ آج مجھے موری کی اینٹ کے بعد احمق بھی کہہ دیا۔'' اس کے انداز سے صاف عیاں تھا کہ وہ بات کو دانستہ طور پر طول دے کر منفی باتیں اخذ کر رہی ہے۔

''زیادہ ایکٹنگ کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اچھی طرح سمجھ رہی ہو کہ میں نے کیا کہا ہے۔''

''تو تم بھی اچھی طرح سمجھ لو کہ عورت گھر بسانے کا فیصلہ صرف ایک ہی بار کرتی ہے اور جب وہ ایسا کرتی ہے تو دل اور روح کی شدت و گہرائی شامل ہوتی ہے۔ ایک بار اس کے من کو کوئی بھا جائے تو اس کے بعد وہ کسی بادشاہ کو بھی نظر بھر کر دیکھنا گوارا نہیں کرتی۔'' وہ رُکھائی سے بولی۔

''تمہارے اس فیصلے میں توازن ہوتا تو میں خود ہی رستے سے ہٹ جاتا۔ تم ایک غیر متوازن کام کر رہی ہو اور جہاں توازن نہ ہو وہاں معاملات بگڑتے بگڑتے اکثر جرائم کی طرف جا نکلتے ہیں۔'' اس نے اپنی زندگی کا تجربہ بیان کیا۔

''میں تمہاری یہ منطق نہیں مانتی۔''

''تم جان بوجھ کر انجان بن رہی ہو۔ آج میری ایک بات لکھ لو! تم جرم پیدا کرو گی اور ایک بار جرائم کا سلسلہ شروع ہو جائے تو پھر اس کی سزا نسلیں بھگتا کرتی ہیں۔''

''تم جو مرضی کہو۔ میرا یہ فیصلہ تبدیل نہیں ہوگا۔'' وہ ڈھٹائی سے بولی۔

''یعنی تم نے مستقبل میں مجرم ہی دیکھنے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو مجھ میں کیا خرابی تھی؟''

''مستقبل کا حال خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔''

''بے شک نہیں جانتا۔ لیکن اسی خدا نے انسان کو عقل بھی تو دی ہے کہ اپنے بھلے بُرے کی تمیز کر کے مستقبل کا اندازہ لگا لے۔'' وہ اسے کسی بھی قیمت پر قائل کر لینا چاہتا تھا۔

''ارے جاؤ! بڑے آئے تم مجومی۔'' اس نے حقارت سے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ اس کا انداز نہایت دل شکن تھا۔

''آخری بار سوچ لو! میں سچ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔'' وہ گڑگڑانے لگا۔ جواباً اس کی زبان سے ایسے ہولناک الفاظ برآمد ہوئے کہ وہ ساکت رہ گیا۔

اب وہاں سے خاموش روانگی کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

اگلی دوپہر رشی ایک طویل گلی نما سڑک پر موجود تھا۔

یہ کوئی مصروف یا کسی بھی خاص اہمیت کی حامل شاہراہ نہیں تھی۔ یہ چوڑائی کے لحاظ سے خاصی طویل تھی۔ منفرد بات یہ تھی کہ یہاں دونوں اطراف سے آمد و رفت کے رستوں کے علاوہ دو ذیلی گلیاں بھی موجود تھیں۔ ان گلیوں کے آگے دو بالکل متضاد رہائشی اور کاروباری علاقے شروع ہو جاتے۔ رشی نے اپنے مجرمان کی رہائش گاہ صرف ایک ہی دفعہ دیکھی تھی۔ وہ شمالاً جنوباً پھیلی اس سڑک پر شمالی سمت سے پیدل ہی داخل ہوا تھا۔ اس نے موسم کی مناسبت سے شرٹ، جینز اور ہلکی سی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں موجود جوگرز بھی معمولی ہی تھے۔ اس نے اپنے حلیے میں کوئی ایسی چیز شامل نہیں کی تھی، جس سے وہ کسی بھی نظر کا خصوصی مرکز بن سکتا۔ وہ ایک عام سی صورت اور معمولی نقش و نگار والا شخص تھا اور اسی پر ہی اکتفا بھی

www.pakistanipoint.com
Waqar Azeem

ادا کرنا۔ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ بااعتماد قدموں سے چلتا آگے بڑھتا رہا۔ اس کے ذہن میں فی الوقت کوئی واضح لائحہ عمل تو موجود نہیں تھا تاہم کسی مبہم خیال کے تحت صرف مطلوبہ افراد کے گھر اور ان کی ایک جھلک دیکھنے کے علاوہ معمولاتِ زندگی کا اندازہ کرنے یہاں تک چلا آیا تھا۔

''رک جاؤ بھائی! ایسے نہیں جا سکتے آپ۔ اس پرات میں کچھ نہ کچھ ڈال کر جانا ہوگا۔'' دس، پندرہ قدم چلتے ہی اس کی سماعت میں آواز پڑی۔ وہ سترہ، اٹھارہ سالہ دو لڑکے تھے جو عید میلاد النبی ﷺ پر علاقے کی سجاوٹ کے لیے راہگیروں سے عملی تعاون حاصل کر رہے تھے۔

رشی کے چہرے پر ایک نرم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسے دل جمعی سے چندہ اکٹھا کرتے اور سجاوٹ کے لیے بھرپور جوش و جذبہ کا مظاہرہ کرتے یہ بچے بہت اچھے لگتے تھے۔ اس نے پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پانچ سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر ان کی پرات میں رکھ دیا۔

''تھینک یو بھائی...... تھینک یو انکل۔'' وہ دونوں خوشی سے کھل اٹھے۔ صبح سے پانچ، دس اور بیس روپے کی ریزگاری اکٹھی کرنے والوں کے لیے یک مشت پانچ سو کی رقم سے یقیناً بہت سے مسائل حل ہو سکتے تھے۔

''اتنے ہینڈسم اور اسمارٹ لڑکے کو انکل کہتے ہوئے تمہارے قدموں سے یہ باٹا کی چپل کیوں نہیں نکلی لڑکے؟'' وہ منہ بنا کر بولا۔ لڑکے ہنستے ہوئے دوسرے راہگیر کی جانب متوجہ ہو گئے۔ رشی نے اپنے ہاتھ دوبارہ جیکٹ کی جیب میں ڈالے اور آگے بڑھ گیا۔ اسے یاد تھا کہ مطلوبہ مقام مغربی سمت میں نکلنے والی گلی سے چار مکانات کی دوری پر تھا۔ اس کی خوش قسمتی عروج پر تھی کہ تین گھروں کے بعد ہی اسے چند کم عمر لڑکوں کا ایک اور گروپ نظر آ گیا۔

''بھائی جان! رک جائیں۔ چندہ دے کر جانا ہوگا۔'' ایک بارہ سالہ لڑکے نے اس کا رستہ روک لیا۔ اس لڑکے کی گندمی رنگت، سیاہ آنکھوں اور گہرے بھورے بالوں میں قدرتی کشش موجود تھی۔

''ابھی وہاں پچھلے اسٹاپ پر بھی دے کر آیا ہوں۔'' رشی نے دانستہ تجاہل برتا ورنہ اس کی چھٹی حس نے فوراً عندیہ دے دیا تھا کہ یہ لڑکے اس کے لیے بہت مفید ثابت ہوں گے۔

''تو کیا ہوا پائین! جتنے اُدھر دیے ہیں اِدھر بھی دے دیں۔ اللہ آپ کی مشکلیں آسان کرے گا۔'' چودہ سالہ دبلے پتلے لڑکے نے اختتامی فقرہ کسی بھکاری کی طرح دعائیہ انداز میں کہا [illegible] بے ساختگی پر رشی مسکرا اٹھا۔

چھا بھئی! کیا یاد کرو گے؟ دے ہی دیتا ہوں۔'' اس نے بے نیازی کی اداکاری کرتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالا اور چند نوٹ نکال لیے۔ تینوں لڑکے پُرشوق نظروں سے اس کے ہاتھوں کی جنبش دیکھنے لگے۔

''یہ لو! اتنے کافی ہیں یا اور بھی بندوبست کروں کچھ؟'' اس نے ایک ہزار کے تین نوٹ ان کی پرات میں ڈال دیے۔

''او بھائی جی! خیر ہووے بیٹا...... بھاگ لگے رہن۔''

دبلے لڑکے کی زبان سے برآمد ہونے والے یہ الفاظ اس بار کسی خواجہ سرا کے تھے۔ رشی دلچسپ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

''حیران نہ ہوں بھائی صاحب! یہ ابھی ایسے اور بھی کئی جھٹکے دے گا آپ کو۔'' تیسرے لڑکے نے اس کی کیفیات بھانپ لی تھیں۔

''یہ نوٹ اصلی ہی ہیں ناں پائین؟'' دبلے لڑکے نے مشکوک نظروں سے پیسوں کی جانب دیکھا۔

''بالکل! روشنی میں چیک کر کے دیکھ لو۔'' رشی نے نوٹ اٹھا کر اچھی طرح معائنہ کروایا۔

''ڈونٹ مائنڈ نہ کرنا پائین! احتیاط بہتر ہوتی ہے نا۔ پرسوں ہمیں ایک دو نوٹ نقلی آ گئے تھے۔ اس لیے اب ذرا الرٹ ہی ہیں۔'' وہ خفت سے بولا۔

''لعنت ہے بھئی ایسے لوگوں پر جو اتنے مبارک مہینہ اور موقع پر بھی دو نمبریوں سے باز نہیں آتے۔'' رشی کو غصہ آیا۔

''یہ لو! اتنی دیر سے باتیں کر رہے ہیں ہم۔ بھائی کا نام تو پوچھا ہی نہیں۔'' تیسرے لڑکے نے کہا۔ وہ بقیہ دو سے عمر میں قدرے بڑا اور ہوشیار بھی معلوم ہوتا تھا۔

''رشی نام ہے بھئی میرا۔'' اس نے دوستانہ انداز میں جواب دیا۔

''کپور یا سنگھانیا؟'' دبلا لڑکا شرارت سے بولا۔

''اس ترکے سے اللہ محفوظ ہی رکھے۔ تم لوگ تو بتاؤ اپنے نام؟'' رشی مسکرایا۔

''یہ عبداللہ ہے پائین!'' اس نے ہوشیار لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔ ''بیگانی شادیوں میں اکثر دیوانہ ہی رہتا ہے۔ یہ سبحان ہے۔ بس اللہ نے بھی جانے کیوں میری قسمت میں یہ بھائی بنا کر بھیج دیا۔'' اس نے مصنوعی تاسف سے تیسرے لڑکے کی طرف دیکھا۔ وہ ان سبھی میں زیادہ کم گو اور لیے دیے مزاج کا مالک لگتا تھا۔

''چھوڑیں بھائی صاحب! یہ دونوں چوبیس گھنٹوں میں

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

سے کوئی چھتیس گھنٹے تو یونہی لڑائی جھگڑے میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کا انٹرو میں کروا دیتا ہوں۔ یہ حارث ہے۔ اگر آپ اسے چڑی پہلوان کہنا چاہیں تو ہمیں آپ سے زیادہ ایٹچمنٹ فیل ہوگی۔'' عبداللہ نے بھی شرارت سے کہا۔ حارث اسے گھورتے ہوئے ہنسنے لگا۔

''یہ سبحان ہے۔ حانی کہہ لیں یا نانی..... کبھی ڈونٹ مائنڈ نہیں کرے گا۔'' حارث نے پھر چٹکلا چھوڑا۔

''بہت اچھا نام ہے۔ لیکن یہ تمہارا بھائی تو بالکل نہیں لگتا۔'' رشی نے حارث کی بھوری آنکھیں، دودھیا رنگت اور چھریری جسامت دیکھ کر کہا۔ وہ دونوں بالکل متضاد رنگ روپ کے مالک تھے۔

''لگوں گا بھی کیسے؟ ماما بتاتی ہیں کہ اپنے چڑی پہلوان کو کسی جھگی سے اٹھایا تھا۔ وہاں پڑا رو رہا تھا۔ ماما پاپا کو ترس آیا تو وہ اسے اپنے ساتھ لے آئے۔'' معصوم انداز، دھیمے اور بے ساختگی سے کہے گئے یہ الفاظ سبحان کے تھے جس نے حارث کی تمام سابقہ شرارتوں کا ایک ہی وار میں بدلہ چکا دیا تھا۔

رشی کی آنکھوں میں کسی یاد کی پرچھائیں لہرائی اور ایک افسردہ مسکراہٹ بن کر ہونٹوں پر بکھر گئی۔ اسے یہ تینوں لڑکے بہت بھلے معلوم ہوئے تھے۔ وہ چہرے مہرے اور انداز و اطوار سے بھی فی الوقت بری صحبت سے دور اور خوب پڑھائی لکھائی کے شوقین لگ رہے تھے۔ رشی کی حکمتِ عملی کے مطابق یہ نقطہ بہت مددگار ثابت ہوتا۔ اس کے تجزیے کے مطابق بیدار مغز کے حامل افراد اگر منفی سرگرمیوں میں ملوث ہوں تو بعد میں کام لینے والے کے لیے ہی مسائل پیدا کرنے لگتے ہیں۔

''تمہاری تیاری تو کافی ادھوری سی معلوم ہو رہی ہے۔ اس طرف والے لڑکوں کے پاس خاصے پیسے اور سامان بھی نظر آ رہا تھا۔'' رشی نے کچھ سوچتے ہوئے ایک اور پتا پھینکا۔

''کیا کریں پائین! یہ دنیا..... یہ دنیا پیٹیل کی۔'' حارث نے فقرے کا اختتامی حصہ گنگنا کر ادا کیا۔

''اصل میں ہمارا گروپ باقی لڑکوں سے الگ ہے۔'' عبداللہ نے سنجیدگی سے بتایا۔ ''یہ کہنے کو تو سارا ایک ہی محلہ ہے لیکن یہاں مختلف کیٹیگریز ہیں۔ یہ آدھی گلی ان لوگوں کی ہے جن کے مکان ذاتی اور کام وغیرہ بھی ٹھیک ٹھاک ہی ہے۔ اس کے بعد دائیں ہاتھ جو گلی اندر مڑتی ہے اسے ایک باؤنڈری لائن سمجھ لیں۔ اس سے آگے کرائے کے مکان والے ہیں۔ کام بھی بس ماٹھا ہی رہتا ہے۔ کوئی نان چنوں کی ریڑھی لگاتا ہے، کوئی رکشا چلا لیتا ہے تو کوئی مزدوری۔''

عبداللہ نے توقف کیا اور پھر تھوڑا رخ بدلتے ہوئے بائیں طرف والی گلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''وہ آخری باؤنڈری لائن ہے۔''

''ادھر والے مکان تو ٹھیک ٹھاک ہی لگتے ہیں۔'' رشی نے اسے ٹوکا۔

''ہاں! کوئی وکیل ہے، کسی کی مارکیٹ میں اپنی دکان وغیرہ ہے۔ ہماری ان دونوں کے ساتھ ہی نہیں بنتی۔'' عبداللہ نے مزید انکشاف کیے۔

''یہ گروپنگ کیوں بھلا؟ آخر محلہ تو ایک ہی ہے ناں۔ اور پھر ہمسایوں کے گھروں کا دائرہ تو دائیں، بائیں، آگے، پیچھے چالیس گھروں تک پھیلا ہوتا ہے۔'' رشی حیران ہوا۔

''آپ کی یہ بات اسلامی اور کتابی پوائنٹ آف ویو سے بالکل درست ہے لیکن پبلک پوائنٹ سے نہیں۔'' حارث نے صاف گوئی سے کہا۔

''یہ کرائے داروں کے بچے بدتمیز ہی بڑے ہیں۔'' سبحان نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ ''ماما پاپا نے ان کے ساتھ کھیلنے یا بات کرنے سے منع کیا ہوا ہے۔ گالیاں بڑی نکالتے ہیں وہ۔ ان کے بڑے بھائی اور پاپا اسموکنگ بھی کرتے ہیں۔ ہمیں اس طرف کھیلنے کی اجازت ہی نہیں۔'' سبحان کی اس مختصر توجیہہ نے رشی پر صورتِ حال کافی واضح کر دی۔

''تیسرے والے اپنے ٹشن میں رہتے ہیں۔ ان کے بچے برگر بن کر رہنا پسند کرتے ہیں۔ اوقات تو ان کی شامی اور انڈے والے برگر کی ہے لیکن زنگر اور گرلڈ بنے پھرتے ہیں۔ صبح اسکول اور شام کوچنگ کے لیے علیحدہ گاڑیاں رکشے لگوا رکھے ہیں۔ ان کا ادھرم ہی آنا ہوتا ہے۔'' حارث نے تجزیہ مکمل کیا۔ رشی کافی پُرسکون ہونے لگا تھا۔ اپنے مطلوبہ افراد کی ریکی اور انہیں سزا دینے کے لیے قدرت نے بہترین موقع اور سہولت کار فراہم کر دیے تھے۔ وہ اپنی خوش قسمتی پر اش اش کر اٹھا۔

''ویسے پائین جی! ہم لوگوں نے اتنی چوں چوں کر لی آپ کے ساتھ۔ جو کرنے والی بات تھی کی ہی نہیں۔ آپ نے اتنے پیسے خواہ مخواہ دے دیے۔ یہ کچھ پیسے واپس رکھ لیں۔ ہم پچھلے ایک ہفتہ سے اس مشن پر لگے ہوئے ہیں۔ کافی پیسے اکٹھے ہو بھی گئے ہیں۔'' حارث کی آواز نے اسے خیالات سے چونکایا۔ وہ بڑی سنجیدگی سے اسے دو نوٹ واپس تھما رہا تھا۔ رشی نے گہری نظروں سے تینوں کا جائزہ لیا۔ عبداللہ کے چہرے پر امید و خوف کی سی کیفیت تھی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اخلاقی طور پر یہ پیسے واپس کرنے کے حق میں خاموش

www.paksociety.com

...ان دل میں کہیں نہ کہیں یہ بھی چاہتا ہے کہ رشی انکار ...ے۔ سبحان کے چہرے پر البتہ واضح انکار اور تذبذب کی ...تھی۔

''نہیں یہ رقم ہرگز واپس نہیں لوں گا۔ تم رکھ لو اسے۔ بس ...تم!'' رشی نے دو ٹوک کہا اور انہیں مزید اعتماد میں لیتے ...نے بتانے لگا۔

''تم لوگ مجھے غلط سمجھ رہے ہو یار! میں نے کسی غلط نیت یا ارادے سے نہیں دیے پیسے۔ دراصل مجھے خود بھی یہ جذبہ اور ڈیکوریشن بہت اچھی لگتی ہے۔''

''تو آپ اپنے ایریا میں یہ سب کیوں نہیں کرتے؟'' عبداللہ کا سوال منطقی تھا۔

''میں یہاں رہتا ہی نہیں۔ میرے ایریا میں صرف دو فیملیز ہی مسلم ہیں۔ اس لیے ایسا کوئی سین ہی نہیں ہوتا۔ میں اپنے والدین کا اکلوتا ہوں اور دوسری فیملی میں صرف تین لڑکیاں ہیں۔ ہر سال یونہی گھوم پھر کر اپنے شوق پورے کر لیا کرتا ہوں۔'' اس نے اپنی منصوبہ بندی کے تحت ایک قدم اور آگے بڑھایا۔

''اچھا! اسی لیے آپ اتنا انٹرسٹ لے رہے ہیں۔ ورنہ ہماری سائڈ کے جتنے بھی لڑکے ہیں، وہ بس رعب ڈال کر گزر جاتے ہیں۔ انہیں اپنے موبائل فونز اور ٹک ٹاک بنانے سے فرصت ہی نہیں ملتی۔'' سبحان نے معصومیت میں مزید انکشافات کیے۔

''بڑے ہی عجیب لوگ ہیں ویسے۔ ایک ہم ہیں کہ یہ سب کرنے کو ترستے ہیں اور وہ موقع ہوتے ہوئے بھی ضائع کر دیتے ہیں۔'' رشی نے دکھ، غصہ اور تاسف کی بھرپور اداکاری کی۔

''تو ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں آپ۔'' حارث کی آنکھیں چمکیں۔

''نہیں یار! تم لوگ فارمیلٹی میں پڑ رہے ہو۔ میں تم لوگوں کے ساتھ اچھا لگوں گا کیا؟'' رشی نے دانستہ کنی کترائی۔

''ٹھیک ہے! اگر ساتھ نہیں رہنا تو پیسے واپس رکھ لیں۔ بس آپ کا اور ہمارا ساتھ یہیں تک تھا۔'' عبداللہ نے رعب جمایا۔

''ہمارے ساتھ کوئی بھی بڑا لڑکا شامل نہیں ہے۔ آپ کے آنے سے کافی ہیلپ ہو جائے گی۔'' حارث نے بھی سنجیدگی سے کہا۔

''آل رائٹ پارٹنرز! میں تیار ہوں۔'' رشی نے رضامندی ظاہر کی۔ ''یہ بتاؤ اب تک کتنی تیاری کر رکھی ہے؟''

''کچھ بھی نہیں۔ ابھی تو صرف پیسے ہی اکٹھے کیے ہیں۔ سامان تو ابھی لانا ہے۔'' عبداللہ نے افسردگی سے بتایا۔

''صدقے جاؤں۔ پیچھے دن کتنے رہ گئے ہیں؟ لاؤ گے کب اور لگاؤ گے کب؟''

''سب کچھ ہو جائے گا پائین! نکل آئے گا کوئی نہ کوئی رستہ۔'' حارث نے امید ظاہر کی۔

''تم لوگ اگر کہیں سے بائیک کا کوئی بندوبست کر لو تو سامان لانے کی ذمّے داری میری۔'' رشی نے تجویز دی۔

''بائیک تو پاپا لے کر گئے ہیں۔ انہوں نے اپنی شاپ کے لیے کچھ سامان لانا تھا۔ عبداللہ کے پاپا کی بائیک ویسے بھی کوئی ہیرو ہنڈا ہے۔ چلتی کم اور نخرے زیادہ دکھاتی ہے۔'' حارث نے بتایا۔

''کوئی مسئلہ نہیں! ہم تھوڑا ویٹ کر لیتے ہیں۔ تمہارے پاپا آئیں گے تو اُن سے لے لینا بائیک۔ پھر ڈیکوریشن کا سامان لے آئیں گے۔'' رشی کے اس مشورے پر تینوں کے چہرے چمک اٹھے۔ وہ اسی جگہ ایک گھر کے باہر تھڑے پر بیٹھ گیا۔ حارث، عبداللہ اور سبحان آس پاس پھرتے راہگیروں سے چندہ وصول کرنے لگے۔

رشی اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے ان کے معصوم چہرے اور خوش اطواری دیکھنے لگا۔ ان تینوں نے کس قدر آرام سے ایک اجنبی پر اعتماد کر لیا تھا۔ انہیں کیسے علم ہو سکتا تھا کہ وہ درحقیقت کس جذبے کے تحت یہاں آیا تھا؟ ایک روز قبل اس کی زندگی کتنی پُرسکون اور خوش باش تھی۔ وہ اطمینان سے کالج جاتا، پڑھائی کرتا اور آنکھوں میں ڈھیروں خواب لیے سو جاتا۔ شازیہ نے ایک ہی پل میں اسے کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ اس کی زندگی گویا یکدم ہی کسی بگولے کی زد میں آ گئی تھی۔ رشی کی قلبی کیفیت عجیب سے عجیب تر ہونے لگی۔ اسے ان دو روزہ متضاد سرگرمیوں میں اپنا وجود اجنبی سا محسوس ہونے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی ٹرین نے چلتے چلتے پٹری بدل لی ہو، صبح ہوتے ہی پھر رات کی تاریکی غالب آ گئی ہو، کسی نوآموز مصنف کی اچھی خاصی ہموار کہانی ناتجربہ کاری کی بدولت اپنا ٹریک کھو کر کہیں کی کہیں جا نکلی ہو۔ ان منتشر خیالات سے نجات پانے کے لیے رشی نے سر جھٹکا اور نظریں اپنے مطلوبہ مکان پر جما دیں۔

دو مرلے پر محیط یہ مکان چوڑائی کی نسبت لمبائی کے رخ پر بنا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ ہلکے نیلے رنگ کے دروازے میں کہیں کہیں سرخ پھول بنے تھے۔ اس دروازے کے دونوں اطراف میں دیوار سے تقریباً تین انگلیوں کے متوازی خلا تھا

Wafer Azeem www.pakistanipoint.com

جس سے اہلِ خانہ بہ آسانی گلی کے دائیں اور بائیں اطراف کا جائزہ لے سکتے تھے۔ اس مکان میں اس کے اصل مجرم رہائش پذیر تھے۔ نفرت اور غصے کی ایک تیز لہر نے اسے سلگا کر رکھ دیا۔

''کیا سوچ رہے ہیں بھائی؟ کہیں ہمارے ساتھ بور تو نہیں ہو رہے؟'' سبحان اس کے پاس آ بیٹھا۔

''نہیں شہزادے! میں تو بس یونہی اِدھر اُدھر مکانوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ والا گھر کچھ زیادہ ہی عجیب ہے۔ کوئی فرنٹ نہیں۔ کوئی وینٹی لیشن نہیں۔ دم نہیں گھٹتا ہوگا ان کا اندر؟''

''ہم بھی اکثر یہی کہتے ہیں۔ ماچس کی ڈبیا ہی لگتا ہے۔'' سبحان کا لہجہ بے تاثر اور انداز سپاٹ تھا۔ اسی دوران عبداللہ بھی اپنے ہاتھ میں چند نوٹ گنتا ہوا ان کے پاس چلا آیا۔

''یار نانی! ایک دفعہ اپنی شاپ پر چکر تو لگا آ۔ ہوسکتا ہے تیرے پاپا بائیک وہیں لے آئے ہوں۔''

''اوکے! میں چیک کر لیتا ہوں۔ اِدھر ہی لیتا آؤں گا بائیک پھر۔'' سبحان اٹھ کھڑا ہوا۔

''اور ہاں! اگر مل جائے بائیک تو پاپا سے یہ نہ کہنا کہ ہم نے رشی پائین کے ساتھ کہیں نکلنا ہے۔ بس اتنا بتانا کہ اپنے دولھا کا کوئی کزن ساتھ جائے گا۔'' حارث نے کچھ سوچ کر کہا۔

''اگر پیٹرول کا کوئی ایشو ہوا تو وہ بھی میں اپنی طرف سے ڈلوا دوں گا۔'' رشی نے نئی تجویز دی۔ حارث، سبحان اور عبداللہ کھل اٹھے۔

''تھینکس پائین! مجھے لگا آپ کہیں ڈونٹ مائنڈ ہی نہ کر لیں۔ بس وہ کیا ہے ناں پاپا بڑے لڑکوں کے ساتھ گھومنے پھرنے سے منع ہی کرتے ہیں۔''

''اِٹس اوکے یار! وہ اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہیں۔ میرے کیس میں تو شک اور بھی بڑھ جائے گا نا کہ پتا نہیں کہاں سے اٹھ کر آیا ہوں اور تم لوگوں کے ساتھ کس مقصد کے لیے اپیچ ہو گیا ہوں۔''

''آپ بہت اچھے ہو باس! لو یو سچی مچی والا۔'' عبداللہ نے فرطِ جوش سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ رشی نے مسکرا کر اس کا کندھا تھپتھپا دیا۔

اگلے پانچ منٹ میں سبحان بائیک لیے چلا آیا۔ رشی نے عبداللہ سے پیسے لیے اور سبحان کے ساتھ اردو بازار کی طرف روانہ ہو گیا جہاں آرائشی لڑیاں، چمکیلی تاریں اور مختلف رنگوں کے پردے وافر مقدار میں موجود تھے۔ رشی نے دانستہ طور پر سبحان کا انتخاب کیا تھا۔ وہ عبداللہ اور حارث سے کم عمر سہی لیکن ذہانت اور مشاہدے میں ان سے کسی بھی طرح کم نہیں تھا۔ اس کا بنیادی مسئلہ صرف دوستوں کی چھیڑ چھاڑ اور ذاتی نوعیت کا ہلکا سا مذاق تھا۔ وہ ان کے ساتھ برابری کی سطح پر نہ سہی کم از کم حارث کے مساوی مقام تو حاصل کرنا ہی چاہتا تھا لیکن عبداللہ اور حارث اپنی مثلث کے اس کم عمر ترین کونے کو تیسرے درجے کا شہری سمجھ کر ہنسی مذاق میں اکثر حد سے تجاوز بھی کر جاتے۔

''ہاں بھئی شہزادے! بتاؤ پھر کیا خریدا جائے؟'' رشی نے بھرپور دوستانہ انداز اختیار کیا۔

''جو آپ کو اچھا لگے لے لیں بھائی۔'' سبحان اتنی سی توجہ پر ہی کھل سا گیا۔

''نہ شہزادے! مجھے ان چیزوں کا بالکل بھی تجربہ نہیں ہے۔ تم لوگ تو کافی عرصے سے یہ سب دیکھ اور کر رہے ہو۔ میں تو بس ہر سال گھوم پھر کر دیکھنے کی حد تک ہی شوق پورا کرتا ہوں۔ چل میرا پُتر! ہو جا شروع!'' اس نے نرمی سے شہ دی۔ سبحان کا چہرہ چمکنے لگا۔ اس نے پُرشوق نظروں سے اطراف کا جائزہ لیا اور بڑی متانت سے سامان نکلوانا شروع کر دیا۔ رشی اس کے ہر انتخاب پر برملا تعریف کرتا رہا۔ ایک دو چیزوں کے مہنگے دام سن کر سبحان نے خریداری سے کنی کترانی چاہی لیکن رشی نے اصرار کر کے اسے مزید رقم تھما دی۔

واپسی کے سفر میں جوس اور چاٹ کھلانے کے بعد سبحان اخلاقی طور پر خاصے دباؤ میں آ چکا تھا۔ اب وہ اس کی کوئی بھی بات منفی یا کسی قسم کی معلومات فراہم کرنے سے انکار کر ہی نہیں سکتا تھا۔

''واہ باس! چیزیں تو بڑی ٹاپ کلاس خریدی ہیں آپ نے۔'' عبداللہ نے معیار اور مقدار کو توصیفی نظروں سے دیکھا۔

''میرا اس میں کوئی کمال نہیں۔ یہ ساری چوائس اپنے جانی شہزادے کی ہے۔'' رشی نے بے نیازی سے کہا۔ سبحان کا چہرہ خوشی اور شرم سے سرخ ہو گیا۔

''سامان تو آ گیا..... اب اور کیا کرنا ہے؟'' حارث نے دریافت کیا۔

''اس سے پہلے کہ تمہارے پاپا بائیک واپس مانگیں ایک اور کام کر لیتے ہیں۔ سوتر دھاگا، کیل، ہتھوڑی، سیڑھی اور تھوڑا مزید سامان لے آتے ہیں۔'' رشی کی اس تجویز پر وہ تینوں ریشہ خطمی ہونے لگے۔

''سیڑھی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میرے گھر میں کچھ دن پہلے ہی تو پینٹ ہوئے ہیں۔ ایک سیڑھی پڑی ہے

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

ہاں۔ میں ابھی اٹھالاتا ہوں۔'' عبداللہ نے حل نکالا۔

''اور اگر میرے بارے میں انہوں نے کچھ پوچھا تو کیا بہانہ بناؤ گے؟'' رشی نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں۔ کہہ دوں گا کہ اپنے چڑی پہلوان اور نانی کے کوئی کزن ہو۔ کوئی بھی کنفرم کرنے تو آئے گا نہیں۔ میرے پاپا زیادہ تر اپنے کبوتروں کے ساتھ مصروف رہتے ہیں۔'' عبداللہ نے منطق دی۔ وہ باقی دونوں کی نسبت اپنے والد کے دباؤ سے آزاد محسوس ہوتا تھا۔ رشی نے خاموشی سے محض سر ہلا دینے پر ہی اکتفا کیا اور اس دفعہ حارث کو اپنے ساتھ لیے باقی سامان لینے چلا گیا۔ اس دفعہ واپسی جلد ہوگئی۔

اپنے اپنے حصے کے کام بانٹ لینے کے بعد وہ مختلف سرگرمیوں میں مگن ہوگئے۔ رشی نے دیواروں پر دونوں اطراف میں کیل ٹھونکنے شروع کر دیے۔ اس کی نظریں اسی نیلے دروازے کا طواف کر رہی تھیں جہاں ابھی تک کوئی بھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔

نصف درجن کیل ٹھونک لینے کے بعد رشی کو پہلی کامیابی نصیب ہوئی۔ اس دروازے پر ایک لڑکی کھڑی نظر آنے لگی۔ رشی کی حسیات اس کی جانب متوجہ ہوگئیں۔ اس کی عمر سولہ، سترہ سال، رنگ گندمی اور بال لمبے تھے۔ اس کا فربہی مائل سراپا قیامت خیز تھا۔ صنفِ مخالف کے لیے اس کی کشش سے بچنا ناممکن تھا۔ لڑکی نے ایک پھیری والے کو روکا اور کافی بھاؤ تاؤ کے بعد محض تین امرود لے کر دروازہ نیم وا چھوڑے اندر چلی گئی۔ عبداللہ، حارث اور سبحان نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور چہرے جھکا کر اپنی ہنسی ضبط کرنے لگے۔ رشی ناسمجھی سے انہیں دیکھ کر رہ گیا۔

اسی لمحہ قدرے فاصلے پر موجود سولہ، سترہ سالہ دو لڑکے منڈلاتے ہوئے وہیں چلے آئے۔ ان کی آنکھوں اور چہروں کی چمک بھی کسی اور ہی کہانی کا اشارہ دے رہی تھی۔ رشی کے لیے ان کی سوچ اور ارادوں کو سمجھنا کوئی راکٹ سائنس نہیں تھی۔ وہ یقینی طور پر 'اقصیٰ' کو دیکھ کر ہی یہاں منڈلا رہے تھے۔

اگلے پندرہ منٹ تک وہ بے نیازی سے اپنے کام میں مشغول رہا۔ اس نے جیکٹ کا کالر اوپر کرلیا تھا تاکہ دیگر لڑکوں کی نظروں سے محفوظ رہ سکے۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ایک اور پھیری والا اُبلے ہوئے بُھٹے لیے چلا آیا۔ لڑکے یکدم چوکس ہو کر اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگے۔

''بُھٹا کتنے کا دے رہے ہو بھائی؟'' اقصیٰ نے بڑے انداز سے کہا۔ بُھٹے والے نے ایک اچٹتی ہوئی نظر اس کی طرف ڈالی اور نظرانداز کر کے اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔ اس کے ہونٹوں پر بھی دبی دبی سی مسکراہٹ تھی۔ اقصیٰ نے ناراضگی سے اسے دیکھا اور دوپٹا ایک جانب سرکا دیا۔

''بُھٹا کتنے کا دے رہے ہو جی؟'' وہ ہر لفظ پر زور دیتے ہوئے کہنے لگی۔

''جتنے کا روز لاتا ہوں اتنے ہی کا ہے۔ لینا ہے تو بات کرو۔'' اس نے اپنی سرمہ بھری آنکھوں سے اقصیٰ کا سراپا گھورا۔

''لینا ہے بھئی! لیکن آج مصالحہ کم رکھنا۔ میرا گلا کچھ خراب ہے۔'' وہ کھنکھاتے ہوئے بولی۔

''جیسا تمہارا مرضی! ورنہ آج میرے پاس بڑا اسپیشل کھٹائی آیا تھا۔'' اس کے ہاتھ بڑی تیزی سے بھٹے پر مصالحہ لگانے لگے۔ لڑکوں کی نظریں اور اشارے بھی اخلاقی حدود سے تجاوز کر رہے تھے۔ رشی ہر ایک منظر بغور دیکھتا رہا۔

''یہ لو! اور ہمارا پیسے دے دو۔ پچھلے بھی ایک سو بیس نکلتے ہیں تمہاری طرف۔'' وہ اس کا ہاتھ دبا کر بولا۔

''اگلی بار اکٹھے ہی لے لینا۔'' اقصیٰ نے آنکھیں مٹکائیں۔

''نہ بھئی! کل کس نے دیکھا ہے۔ تم ہمارا پیسا جلدی چکا دو۔ پہلے ہی بڑا ادھار دے رکھا ہے۔''

''کیوں بے دید ہو رہے ہو بھئی؟ ایک سو بیس روپے کی ہی تو بات ہے۔ یہ لو! مجھ سے لے لو۔'' نووارد لڑکوں میں سے ایک نے کہا اور اقصیٰ کی طرف معنی خیزی سے دیکھتے ہوئے سارے واجبات چکا دیے۔

''بھٹا بھی اپنے پاس ہی رکھ لو۔ میں آئندہ کبھی تم سے کچھ نہیں لوں گی۔'' اقصیٰ نے تیور دکھائے۔ گلزار یکدم بوکھلا گیا۔ وہ تو جارحانہ حکمتِ عملی اختیار کر کے اقصیٰ سے مزید پیش قدمی کی توقع لگائے بیٹھا تھا لیکن سب کچھ تلپٹ ہوگیا۔

''جہنم میں جاؤ پھر!'' وہ زیرِلب بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

رشی ہر ایک بات کا باریک بینی سے جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اقصیٰ کے لیے سرد تپش تھی۔ وہ اب لچکتی مٹکتی ہوئی اندر چلی گئی تھی۔

''کیا کر رہے ہو تم دونوں یہاں؟ کوئی کام ہے کیا؟'' ایک کرخت مردانہ آواز نے رشی کو چونکا دیا۔ سیڑھی کے پاس کھڑے حارث اور سبحان بھی چوکنا ہو گئے تھے۔

رشی ترچھی نظروں سے اس شخص کو دیکھنے لگا۔ ہلکی سانولی رنگت اور متوازن جسم کا مالک وہ شخص صرف بڑھی ہوئی شیو

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

سے جھانکتے سفید بالوں کی وجہ سے پینتالیس سے زائد کا دکھائی دیتا تھا ورنہ جسمانی پھرتی، طراری اور بے داغ چہرے سے وہ پینتیس سے کم ہی معلوم ہوتا تھا۔

''جی پاپا! ہم وہ یہاں ڈیکوریشن......'' سبحان نے جلدی سے وضاحت دی۔

''اوئے! میں تم دونوں کی نہیں، ان لفنگوں کی بات کر رہا ہوں۔'' اس نے اقصیٰ کے گھر پر نظریں جمائے لڑکوں کو گھورا جو اس کے تیور دیکھتے ہوئے کسی بھی طریقے سے کھسکنے کی کوشش میں تھے۔

''انکل جی! وہ تو ہم یہاں ارسلان سے ملنے کے لیے کھڑے تھے۔ اسی کا انتظار کر رہے ہیں بس۔'' ایک لڑکے نے فوراً بہانہ تراش کر دائیں جانب کے ایک گھر کی طرف اشارہ کیا۔

''بچو! ایک بڑی پرانی کہاوت ہے جو آج بھی اتنی ہی سچی ہے۔ جس اسکول میں تم پڑھتے ہونا! ہم وہاں سالوں تک ہیڈ ماسٹری کر چکے ہیں۔ جھوٹے کو اس کے گھر پہنچانا مجھے اچھی طرح آتا ہے۔ اور یہ بھی پتا ہے کہ ارسلان اس وقت اپنے ماموں کی ورکشاپ میں ڈینٹنگ سیکھ رہا ہوگا۔ کہو تو ملاؤں نمبر؟'' اس کی دہاڑ پر دونوں لڑکے خون کے گھونٹ پیتے ہوئے وہاں سے کھسک گئے۔

''چھا گئے بھئی ارباز انکل تو آج۔'' عبداللہ کی آواز رشی کی سماعت میں پڑی۔

''اوئے عبداللہ! تیرے پاپا کا فون کس خوشی میں بند جا رہا ہے۔ وہ گھر آئے تو اسے میری دکان پر بھیجنا۔ بات کرتا ہوں اُس سے۔ مجھے محلے میں یہ گند برداشت نہیں ہے۔'' ارباز نے اسی اکھڑے ہوئے لہجے میں عبداللہ کو مخاطب کیا۔ غالباً وہ ہر ایک سے اسی انداز میں گفتگو کرنے کا عادی تھا۔

''ٹھیک ہے انکل! میں کہہ دوں گا۔'' عبداللہ نے فرمانبرداری سے سر ہلایا۔

''چل بھئی حانی میرے ساتھ! تھوڑا کام ہے مجھے دکان پر۔ کسٹمرز تو ہینڈل کر لینا۔'' ارباز کے اس حکم پر سبحان بادلِ ناخواستہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے ساتھ چل دیا۔ ارباز کے ہاتھ میں چند کتابیں اور لیمینیشن کا سامان تھا۔

''بے چارہ نانی! باؤنڈ ہو جائے گا اب پاپا کی وجہ سے۔'' حارث کو افسوس ہوا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ بھی تو دیکھ کہ اب کچھ گھنٹے یہاں سکون رہے گا۔'' عبداللہ نے ان لڑکوں کی بابت اشارہ کیا۔

''یہ کیا چکر تھا بھئی؟ تمہارے پاپا تو بڑے اینگری ینگ مین بنے ہوئے تھے۔ ویسے آپس کی بات ہے وہ تمہارے پاپا کم اور بڑے بھائی زیادہ لگتے ہیں۔'' رشی سیڑھی سے نیچے اتر آیا۔

''چکر نہیں پائین! یہ گول چکر ہیں۔'' حارث ہنسا۔ ''پاپا کو ان لڑکوں پر بڑا پرانا غصہ ہے۔ میری ماما گھر میں ٹیوشن پڑھاتی ہیں۔ زیادہ تر بڑی لڑکیاں آتی ہیں اُن کے پاس۔ انہوں نے دو تین لڑکیوں کا پیچھا کیا۔ وہ اُدھر اگلی گلی سے ذرا آگے رہتی تھیں۔ انہوں نے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر بدتمیزی بھی کی۔ لڑکیوں کے والدین کے پاپا سے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ وہ اکثر کتابوں کی لیمینیشن وہیں سے کرواتے ہیں۔ انہوں نے پاپا سے بھی شکایت کی اور بعد میں کسی طرح لانے، لے جانے کی ذمے داری اٹھالی۔'' حارث نے تفصیل بتائی۔

''یہ بات تو پرانی ہو گئی چڑی پہلوان!'' عبداللہ نے قطع کلامی کی۔ ''ہم آپ کو تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کرتے چلیں باس کہ اس فیملی کی وجہ سے ماحول کافی خراب ہو گیا ہوا ہے۔ اس میڈم کا سارا دن یونہی دروازے پر آنا جانا لگا رہتا ہے۔ یہاں کا ہر ایک لڑکا یہی سمجھتا ہے کہ یہ صرف اُسے ہی دیکھتی اور رسپانس دیتی ہے۔ ارباز انکل سے خیر کافی ڈرتی ہے۔ اس لیے ان کے ہوتے باہر نظر نہیں آتی۔''

''ان کے گھر میں کوئی مرد نہیں ہے کیا؟ پھل اور سبزی لینے خود چلی آتی ہے۔'' رشی نے فرضی حیرانی جتائی۔ یہ سب باتیں سبحان اسے پہلے ہی بتا چکا تھا۔

''ماں تو ہے نہیں اس کی۔ باپ سے ہم ابھی آپ کو ملوا دیں گے۔ وہ سارا دن اسی علاقے میں گھوم پھر کر ریڑھی چلاتا ہے اور رہا بھائی......'' عبداللہ نے معنی خیزی سے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''بھائی کو تو ہم اپنی بہن بیٹیوں جیسا کہتے ہیں۔'' حارث نے لقمہ دیا۔ ''بہت ہی چپ چاپ سا بندہ ہے۔ گھر سے کام پر اور کام سے سیدھا گھر۔''

رشی کی نظریں ایک بار پھر دروازے پر بھٹکنے لگیں۔ اسے ان لڑکوں کی بات سے مکمل اتفاق تھا۔ منیب کے متعلق انہوں نے کوئی نیا انکشاف نہیں کیا تھا۔ اقصیٰ اور منیب کی انہی جملہ خوبیوں کی وجہ سے تو وہ شازیہ کو قتل کرنے کے بعد انہیں بھی سزا دینے کے درپے ہوا تھا۔ اسی دوران اقصیٰ ایک بار پھر دروازے کی طرف منڈلاتی نظر آنے لگی۔

''بڑی ہی کوئی ڈھیٹ شے ہے یہ۔'' عبداللہ حیرت

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

ایا اور اس بار خود سیڑھی پر چڑھ کر کیل ٹھونکنے لگا۔ حارث اس کی بھرپور معاونت کر رہا تھا۔

رشی کے لیے غصہ ضبط کرنا محال ہونے لگا۔ اس کا دل شدت سے چاہ رہا تھا کہ ابھی دندناتا ہوا جائے اور اقصیٰ کا قصہ تمام کر دے۔ اسی لمحے اسے اقصیٰ کے عقب میں کسی لڑکے کا ہیولا محسوس ہوا۔

''اس وقت یہاں کھڑے ہونے کی کیا تُک بنتی ہے۔ اندر چلو!'' اس پر رعب جمانے کی کوشش کرتا وہ منیب تھا۔ اس کی رنگت صاف، بال بھورے اور چہرہ بیضوی تھا۔

''میری مرضی! میں جو مرضی کروں۔ تم کو کھڑے ہونا ہے تو جگہ دے دیتی ہوں ورنہ اندر دفع ہو جاؤ۔ میرا سر نہ کھاؤ۔ آئی سمجھ؟'' اس کے دھیمے انداز میں کہے گئے الفاظ رشی کو سمجھ تو نہ آئے البتہ سرکش انداز اور بے خوف تیوروں سے مدعا بخوبی واضح ہو گیا تھا۔

''چائے بنا کر دو مجھے۔ سر میں درد اور بخار محسوس ہو رہا ہے۔'' منیب نے اپنی کنپٹیاں دباتے ہوئے کہا۔

''خود ہی بنا لو جا کر! ملازم نہیں ہوں میں تمہاری۔ سارا دن گھر کے کام بھی کروں اور یہ ایکسٹرا ڈیوٹیاں بھی بھگتاتی پھروں۔'' اس نے پیر پٹخے۔ رشی کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اسی لمحہ دونوں کا گلا دبوچ لے۔ اپنے متوقع شکاروں کی اس دیدہ دلیری پر خون کنپٹیوں میں ٹھوکریں مار رہا تھا لیکن ضبط بے حد ضروری تھا۔ اس نے سر جھٹکا اور توجہ ایک بار پھر انہی کی طرف مرکوز کر دی۔ مناظر اب بھی وہی تھے۔ اقصیٰ کی ڈھٹائی اور منیب کی غیر فطری بے بسی نہ چاہتے ہوئے بھی غصے میں مبتلا کرنے لگتی۔

کچھ دیر بات چیت کے بعد منیب مایوسی سے اندر پلٹ گیا۔ اقصیٰ بے نیازی سے دوپٹا کندھے پر ایک جانب لٹکائے باہر نکلی اور دروازہ بند کر کے تھوڑے ہی فاصلے پر موجود ایک گھر میں چلی گئی۔

''کیا سوچ رہے ہیں بھائی جی؟ کہیں تھک تو نہیں گئے؟'' اپنی کیفیات سے الجھتے ہوئے اسے سبحان کی آمد کا علم ہی نہ ہو سکا۔ حارث اور عبداللہ اس دوران اپنے کام میں مشغول سیڑھی کھسکاتے چند قدم آگے جا چکے تھے۔

''ارے نہیں شہزادے! تھکاوٹ کیسی؟ میں تم لوگوں کے ساتھ واقعی بہت انجوائے کر رہا ہوں۔'' وہ بشاشت سے بولا۔ سبحان مطمئن ہو گیا۔

فضا میں اب مغرب کی اذانیں گونجنے لگی تھیں۔ حارث اور عبداللہ قدرے نڈھال سے اس کی جانب چلے آئے۔

''یہ لیں پائین! ایک سائڈ پر تو کافی کیل لگ گئے ہیں۔ اب کھانا کھا کر دوسری طرف بھی کام شروع کرتے ہیں۔ بڑی بھوک لگ رہی ہے۔''

''ٹینشن نہ لو پارٹنرز! آرام سے ہو کر آؤ گھر۔ یہ دوسری سائڈ میں دیکھ لیتا ہوں۔'' رشی مسکرایا۔

''آپ کچھ نہیں کھاؤ گے کیا؟'' حارث نے خلوص سے پوچھا۔ ''میں آپ کے لیے یہیں لے آتا ہوں۔ بریانی پکائی ہے ہم نے۔''

''قسم لے لو یار! واقعی بھوک نہیں ہے۔ دوپہر کو ہلکا پھلکا سا کھا لیا تھا۔ جب ضرورت ہوئی تو میں خود ہی تم سے کہہ دوں گا۔'' اس کی یقین دہانی پر حارث مطمئن ہو گیا۔ عبداللہ اور وہ اپنے گھروں کی طرف چل دیے۔

اب وہاں صرف سبحان اور رشی ہی موجود تھے۔ سبحان نے ایک بار پھر پرات گلی کے وسط میں میز پر رکھی اور راہگیروں کی جانب متوجہ ہو گیا۔ رشی نے سیڑھی کھسکائی اور اپنے بدن کی سنسناہٹ پر قابو پاتے ہوئے جمال کے گھر گھسیٹ لایا۔ وہ کیل وغیرہ تھمانے یا سیڑھی کو سہارا دینے کے لیے سبحان کو زحمت نہیں دینا چاہتا تھا۔ اسے کچھ لمحے تنہا اور پرسکون رہ کر ذہنی جمناسٹک کرنی تھی۔

سیڑھی بالکل مطلوبہ مقام پر رکھنے کے بعد وہ مڑا ہی تھا کہ پڑوس کے گھر سے واپس آتی اقصیٰ سے ٹکرا گیا۔

''آئی ایم سوری! میں نے آپ کو دیکھا ہی نہیں۔'' رشی نے اپنی ناگواری ضبط کرتے ہوئے شائستگی سے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔'' وہ اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے لگاوٹ سے بولی۔

''اچھا! اگر کوئی بات نہیں تو پھر ٹکرا جاتا ہوں۔'' رشی نے بھی اپنے لہجے میں تبدیلی پیدا کی۔

''موسٹ ویلکم!'' اقصیٰ نے عامیانہ انداز میں کہا اور اس کی آنکھوں کو نرم گرم پیغام دیتی اندر چلی گئی۔

رشی اپنے منصوبے کی کامیابی پر زیر لب مسکراتا ہوا سیڑھی کے تیسرے پائدان پر چڑھ گیا۔ وہ حارث اور عبداللہ کے آنے سے قبل مزید کامیابی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اقصیٰ کی شہرت کے پیش نظر وہ ان کے سامنے اپنی دلچسپی ظاہر کر کے کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا ورنہ اس کے قتل کے بعد مشکوک افراد میں اس کا نام بھی شامل ہو جاتا۔

''مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ میں نے تمہیں پہلے بھی کہیں دیکھ رکھا ہے۔'' دروازے کی دائیں درز سے اقصیٰ کی آواز ابھری۔ وہ اس لڑکی کی ذہانت اور 'وسائل' کے بھرپور استعمال پر اش اش کر اٹھا۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

''کسی سے تعارف حاصل کرنے کا یہ بڑا ہی پرانا طریقہ ہے۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''اونہہ! مجھے کیا ضرورت ہے کسی سے تعارف حاصل کرنے کی؟ میں کوئی ایسی ویسی لڑکی تھوڑی ہوں۔'' اقصیٰ نے منہ بنایا۔

''میں نے ایسا کب کہا بھئی؟'' رشی نے بوکھلانے کی اداکاری کی۔ ''مجھے تو پتا ہے کہ تم ایک بہت اسپیشل لڑکی ہو۔''

''ان بچونگڑوں کے ساتھ کیا کر رہے ہو صبح سے؟ اپنی عمر کے لڑکوں میں کیوں نہیں بیٹھتے؟''

''مجبوری ہے بھئی! کیا کروں؟'' رشی نے اپنائیت سے کہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ارباز کی وجہ سے ہی وہ ان تینوں سے خار کھائے بیٹھی ہے۔

''اونہہ! مرد کبھی مجبور نہیں ہوتا۔ اور جو مجبور ہو وہ مرد ہی نہیں ہوتا۔'' اس نے طنز کیا۔ رشی کو ایسی کم عمری میں یہ فلسفہ سن کر بالکل حیرت نہ ہوئی۔ وہ کردار کی جس سطح پر آچکی تھی، اس میں ایسی تلخ سچائیاں تو بہت معمولی آگہی تھیں۔

''امیزنگ۔ میں نے ٹھیک ہی کہا تھا ناں کہ تم بہت اسپیشل لڑکی ہو ورنہ آج کل کی لڑکیاں اتنی سمجھداری کی باتیں کر ہی نہیں سکتیں۔'' وہ گفتگو کے ساتھ ساتھ بڑی تیزی سے ہاتھ چلا رہا تھا۔

''آدمی تو تم بھی سمجھدار ہی معلوم ہوتے ہو۔'' اقصیٰ کے انداز میں پسندیدگی تھی۔

''ہائے ربا! آدمی تو نہ کہو۔ اچھا خاصا ہینڈسم اور کیوٹ لڑکا ہوں۔'' وہ تڑپ کر بولا۔ اقصیٰ اس انداز پر بے ساختہ ہنس دی۔

''تم باتیں بہت مزے کی کرتے ہو۔''

''بس کیا کروں؟ تم جیسی پرستان کی پری سامنے دیکھ کر زبان خود بخود پھسل جاتی ہے۔'' وہ معصومیت سے بولا۔

''اب بناؤ مت مجھے۔'' وہ اٹھلائی۔ ''اچھا! کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا۔ چائے یا کافی..... سادہ پانی یا کولڈ ڈرنک۔''

''چاہیے تو سہی..... لیکن ڈرتا بھی ہوں کہ کہیں تم مائنڈ ہی نہ کر جاؤ۔'' وہ اداکاری کا بھرپور مظاہرہ کر رہا تھا۔

''نہیں کرتی مائنڈ۔ بولو کیا لاؤں؟ کھانا تو نہیں کھانا؟''

اقصیٰ اپنے تئیں کامیاب تجاہل عارفانہ برت رہی تھی لیکن اس کوشش میں رشی کے سامنے خود کو ہی ایکسپوز کرتی جا رہی تھی۔

''دیکھو! اگر بُرا لگے تو پہلے ہی ایکسکیوز کر لیتا ہوں۔ مجھے اپنا سیل نمبر دے دو۔''

''کیوں بھئی؟ میں تمہیں کوئی ایسی ویسی لڑکی نظر آتی ہوں جو ڈائریکٹ نمبر ہی مانگ بیٹھے۔'' اس نے جارحانہ انداز اپنایا۔

''نہیں سوئٹی! میں نے کہا تو ہے کہ تم بہت اسپیشل ہو اسی لیے تو خود ہی تم سے ڈیمانڈ کر بیٹھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ سامنے والے گھر کی اوپری منزل سے کئی بار دو لڑکیاں جھانک کر مجھے اشارے کر چکی ہیں۔'' رشی نے ایک اور پتا پھینکا۔

''اونہہ! ان کا تو کام ہی یہی ہے۔ تاک جھانک اور لوگوں کے معاملات کی خبر رکھنے کے سوا کوئی اور کام ہی نہیں۔ لیکن میں تو ایسی نہیں ہوں۔'' اس نے ایک بار پھر اپنا پسندیدہ فقرہ دہرایا۔

''میرا خیال ہے عبداللہ اپنے گھر سے نکل کر اِدھر ہی آرہا ہے۔ تم نے نمبر تو دیا نہیں۔ میرا ہی نوٹ کر لو۔ میں تمہارے فون یا میسج کا ویٹ کروں گا۔'' رشی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنا خصوصی نمبر دہرا دیا۔ اسے یقین تھا کہ اقصیٰ نے وہ کسی نہ کسی صورت محفوظ بھی کر لیا ہوگا۔

اپنے منصوبے کا ایک اور زینہ چڑھ لینے کے بعد اس نے سیڑھی شیٹ کر آگے کی اور مکمل توجہ سے اپنا کام نمٹانے لگا۔ حارث اور عبداللہ کی دوبارہ آمد تک وہ کیلوں اور دھاگے کا فریم اسّی فیصد تک مکمل کر چکا تھا۔

''سوری باس! دیر تو نہیں ہوگئی ہمیں؟'' عبداللہ نے آتے ہی معذرت کی۔

''اتنی دیر میں تو بندہ ایک دیگ ختم کر لے یار! لیکن خیر ہے۔ میں نے کافی کام نمٹا دیا ہے۔ اب باقی تم دیکھو کوئی کمی بیشی تو نہیں۔''

''کوئی بھی کمی نہیں پائین! آپ ہمارے لیے واقعی ایک فرشتہ بن کر آئے ہیں۔'' حارث جذباتی ہوا۔

''بس یہ دو چار گھروں کا جو کام ہے ہم کر لیں گے۔ آپ بیٹھ جاؤ یہیں۔'' عبداللہ نے پیشکش کی۔

رشی اب قدرے تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا لیکن ان لڑکوں سے یکدم کنارہ کشی اختیار کر کے جانا بھی مناسب نہیں تھا۔ وہ چند ہی گھنٹوں میں ان تینوں سے کافی مانوس ہو گیا تھا۔

''اپنا چڑی پہلوان! ایک پلیٹ چاول ہی لا دے یار! بھوک لگ گئی ہے۔'' اس نے حارث کو مخاطب کیا۔

''میں لے آتا ہوں۔ چائے یا کافی پینی ہو تو بتائیں اس کا بھی کہہ آؤں گا۔'' سبحان نے فوراً اپنی خدمات پیش کیں اور پھرتی سے اندر چلا گیا۔

کھانا کافی لذیذ تھا۔ رشی نے سیر ہو کر کھایا۔ کافی بھی

Waqar Azeem Pakistanpoint.com

تھکے ماندے جسم کے لیے سکون بخش ثابت ہوئی۔ اب اسے بظاہر یہاں کوئی کام نہیں تھا لیکن پھر بھی دل و دماغ کچھ دیر مزید بیٹھے رہنے کے لیے مُصر تھے۔ اس کی حسیات کسی نئے انکشاف کی بُو سُونگھ رہی تھیں۔ اس نے دیوار سے پشت لگا کر آنکھیں موند لیں۔ یکدم مناہل کا سراپا تصور میں لہرا گیا۔

''اوڈیم شٹ!'' وہ جھنجلایا۔ مناہل سے حالیہ ناراضگی کے بعد غیر تحریری آئین کے تحت اسے ہی فون یا میسج کرنے میں پہل کرنی تھی۔ کچھ روز تک یہ ڈیوٹی سرانجام دینے کے بعد اس کا مزاج اعتدال پر آجاتا۔ اپنی اس ناگزیر مصروفیت میں اُلجھ کر وہ اس سے رابطے کا خیال ہی بھول گیا تھا۔

''مارے گئے بیٹا! اب گھن گرج اور تیز رفتار آندھی کے بعد موسلا دھار بارش میں بھیگنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' اس نے اپنی حالت پر خود ہی تاسف کا اظہار کیا اور موبائل نکال کر واٹس ایپ اکاؤنٹ کھول لیا۔ چیٹ باکس بالکل خالی تھا۔ اسے مناہل تک رسائی کا رستہ اسٹیٹس سے ہی مل سکتا تھا۔

''چل بیٹا رشی! اب اسٹیٹس اسٹیٹس کھیلنے کے لیے اپنے ڈائیلاگ تیار کر لے۔'' اس نے سر کھجاتے ہوئے مطلوبہ سہولت کھولی اور مناہل کے نام سے موجود پندرہ عدد وہ پیغامات پڑھنے لگا جو بظاہر عوامی رائے کے لیے لگائے گئے تھے لیکن وہ جانتا تھا کہ اصل مخاطب اس کے سوا اور کوئی بھی نہیں۔

''تیری زندگی کی چیزوں میں جو شے بے کار تھی وہ بس میں ہی تھی۔'' اس پہلے پیغام نے ہی اسے ہولا کر رکھ دیا۔

''الٰہی خیر! آج تو واقعی خیر نہیں میری۔'' اس نے بے تابی سے پیشانی مسلی۔

''ایسے تعلق سے تنہائی بہتر ہے جس میں کسی کو چیخ چیخ کے اپنے تعلق ہونے کا احساس دلایا جائے۔''

''او میرے خدایا! یہ لڑکیاں اتنی جلدی اتنا زیادہ جذباتی کیسے ہو جاتی ہیں؟'' وہ کراہ اٹھا۔

''اتنا خاموش ہوں گے ہم..... کہ چیخ اٹھو گے تم۔'' یہ فقرہ پڑھنے کے بعد رشی میں مزید آگے بڑھنے کی تاب نہ تھی۔ اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اب کوئی بھاری بھرکم عذر تراشنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ رشی نے کچھ دیر اس رُخ پر سوچا اور کسی اسٹیٹس کا جواب دینے کے بجائے براہِ راست پیغام لکھنے لگا۔

''آج دوپہر سے امی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ بلڈ پریشر شوٹ کر گیا تھا۔ اسپتال لانا پڑا انہیں۔ دعا کرنا تم ان کے لیے۔ مجھے یقین ہے تمہاری دعائیں بہت جلد قبول ہوں گی۔'' وہ یہ جھوٹ بولتے ہوئے سخت شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔

''اور یہ بات تم مجھے اب بتا رہے ہو؟ حد نہیں ہو گئی ویسے۔'' مناہل کا فوری جواب آیا۔

''سوری یار! وہ دراصل اسپتال کے سامنے جیل کی وجہ سے جیمرز لگے ہوئے ہیں۔ سگنل ہی نہیں آتے موبائل پر۔'' اس نے فوراً ایک اور بہانہ گھڑ دیا۔ ''ابھی بھی کچھ دوائیں لینے باہر نکلا ہوں تو تم سے رابطہ ہو پایا ہے۔''

''اوہ اِٹس سو سیڈ! میری طرف سے بہت پوچھنا انہیں۔ پروردگار انہیں جلد شفا دے۔'' وہ حسبِ توقع نرم پڑ گئی۔

''دعا کرتی رہنا بس۔ ہو سکتا ہے ایک گھنٹے تک ڈسچارج کر دیں انہیں۔'' رشی اس کی نرمی سے ذہنی تناؤ میں کمی محسوس کرنے لگا۔

''میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور بتانا اور گھر آتے ہی میسج کر دینا۔'' مناہل کا یہ جواب ناراضگی ختم ہونے کا واضح اشارہ تھا۔ رشی دل میں شکرانہ بجالاتے ہوئے الوداعی کلمات کے بعد آف لائن ہو گیا۔ اپنے اس بدترین جھوٹ پر شرمندگی محسوس کرتے ہوئے وہ خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ مناہل کو اپنے ماضی کے اس عکس اور ممکنہ جرائم کی بھنک کیسے دے سکتا تھا۔

رشی کے ان خیالات میں تعطل اس وقت آیا جب اس گلی نما سڑک کے اختتامی کونے پر ایک عجیب سا شور سنائی دینے لگا۔

''لو جی! ان کی کسر باقی رہ گئی تھی۔'' اسے عبداللہ کی ناگوار آواز آئی۔

رشی کی سلگتی نظریں بھی اسی جانب مرکوز تھیں۔ وہ اس شخص کو پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ سفید رنگ کی چوکور ریڑھی کو ایک ہاتھ سے دھکیلتا وہ 'جمال' کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ ریڑھی کے ساتھ پلاسٹک کی ساخت میں بنی مصنوعی قلفیوں کا سانچہ بنا تھا جس کے درمیان لاؤڈ اسپیکر میں مشینی آواز بڑے معتبر انداز میں کھوئے اور ملائی سے بنی قلفیوں کی مزید خوبیاں گنوا رہی تھی۔ ہم قافیہ الفاظ کی یہ گردان رشی کی سماعت کو سخت ناگوار گزر رہی تھی۔

''چل بھئی چڑی پہلوان! شروع ہو جا پھر۔'' عبداللہ نے حارث کو اشارہ کیا۔

''او نہیں یار! چھوڑ پرے۔'' ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں حارث کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔ سبحان کی آنکھوں میں بھی

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

کافی شریر چمک ابھر آئی تھی۔

''یہ کیا چکر ہے بھئی؟ کیا چھپانے کی کوشش کر رہے ہو؟'' رشی کو بھی ان کی بے ساختہ ہنسی سن کر گدگدی سی ہونے لگی۔

''بھائی جی! یہ جو اپنا چڑی پہلوان ہے نا۔ اس کی فنکاریوں کا آپ نے دوپہر سے اندازہ لگا ہی لیا ہوگا۔'' سبحان نے رازدارانہ انداز میں بتایا۔

''ہاں! دیکھ تو رہا ہوں کہ اس علاقے کا کوئی فقیر، خواجہ سرا، پھیری والا یہاں تک کہ محلے دار بھی اس کی شرارتوں سے محفوظ نہیں ہیں۔ ہر ایک کی نقالی کر لیتا ہے ماشاء اللہ۔ اسے کسی گیارہ بجے والے شو میں بھیج دو بڑا نام کمائے گا۔'' رشی نے سراہا۔

''تو باس! یہ جمال قلفی والے کی نقل بھی تو سنیں۔ دل خوش ہو جائے گا آپ کا۔'' عبداللہ نے کہا۔ حارث نے اپنی ہنسی بمشکل دبائی اور دھیمے سُروں میں اسی مشینی آواز کے مانند بولنے لگا۔

''بسم اللہ سے ابتدا ہے میری۔ سدا خوش رہو یہ ہے دعا میری۔ شہر کا جانا پہچانا قلفیوں والا جمال اب آپ کے علاقے میں۔ جو ایک بار اس کی قلفی کھائے گا وہ بار بار آئے گا۔ قلفی پانچ روپے کی، دس روپے کی اور بیس روپے کی۔''

''باس! لفظ 'قلفی' کی جگہ آپ نے شام والی 'باجی' کو ذہن میں رکھنا ہے۔'' عبداللہ نے لقمہ دیا۔ رشی نے پُرسوچ انداز میں سر ہلایا اور حارث کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''قلفی بے حیا بھی..... بے شرم بھی..... اور بے وقوف بھی..... جو ایک بار اس قلفی کا کوئی ادھار چکائے گا..... وہ بار بار میرے گھر کے چکر لگائے گا۔ بہترین، ذائقہ دار، کھوئے ملائی والی قلفی۔ آپ یہاں آؤ اور اپنے ننھے منے پیارے پیارے بچوں کو بھی یہاں آتے دیکھو۔ قلفی امرود والے کی..... سبزی والے کی اور پھیری والوں کی۔ جو ایک بار یہ قلفی کھائے گا۔ وہ شرطیہ بار بار آئے گا۔''

''کیسا پھر باس؟ اپنا چڑی پہلوان آرٹسٹ بندہ ہے کہ نہیں؟ یہ شاعری ویسے ہم دونوں نے مل کر ہی بنائی تھی لیکن اصل جان تو چڑی نے ہی ڈالی ہے اس میں۔'' عبداللہ نے داد چاہی۔

رشی حیرت، صدمہ اور تاسف سے ان تینوں کو دیکھتا رہا۔ ان کی آنکھوں میں شرارت کی معصومانہ چمک کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ ان کے ساتھ گزارے گئے چند گھنٹوں میں رشی کو کسی قسم کا کوئی اخلاقی عیب یا بُری عادت بھی نظر نہیں آئی تھی۔ پڑھائی لکھائی میں بھی وہ خاصے ہوشیار تھے۔ ان کی ذہانت اور شرارتوں کو اس تخریب کاری کی طرف منتقل کرنے والی 'ہستیاں' بھی وہی تھیں جنہوں نے اس کی زندگی کو آج اس مقام پر پہنچا دیا تھا۔ اس لمحہ رشی کو اپنے اعصاب پر قابو پانا دشوار ہونے لگا۔ جمال، منیب اور اقصیٰ کو اس دنیا سے روانہ کر دینا بے حد ضروری ہو گیا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہیں باس؟ پرفارمنس میں کوئی کمی محسوس ہوئی ہے تو دوبارہ یہ ایکٹ کر دیتے ہیں۔'' عبداللہ اس کی متغیر رنگت اور بھینچے ہوئے ہونٹ دیکھ کر اُلجھ گیا۔

''تمہیں پتا ہے یہ سارا ایریا چھوڑ کر میں صرف تم لوگوں کے ساتھ ہی ڈیکوریشن کے لیے کیوں راضی ہوا تھا؟'' اس نے کڑی سنجیدگی سے کہا۔ ان تینوں نے ناسمجھی سے سر ہلا دیے۔

''مجھے ایسا لگا کہ تم دوسرے لڑکوں سے مختلف ہو۔ اچھے گھروں سے ہو اس لیے سوچ بھی صاف ستھری ہوگی۔ لیکن ایک کیریکٹر لیس لڑکی نے تم لوگوں کو بھی اسی رستے پر ڈال رکھا ہے۔ کیا فرق رہا ان لڑکوں اور تم میں جنہیں صبح ارباز انکل نے دھتکار کر یہاں سے نکالا تھا۔''

''سوری بھائی جی! میں تو منع کرتا تھا انہیں کہ کسی کا مذاق بنانا اچھی بات نہیں۔ لیکن یہ الٹا مجھے ہی بولنے لگتے تھے۔'' سبحان نے جلدی سے وضاحت دی۔ رشی کو یقین تھا کہ ایسا ہی ہوا ہوگا۔

''آئی ایم سوری بوائز! میں بہت مایوس ہوا ہوں اس حرکت سے۔'' رشی نے تاسف سے کہا۔ حارث اور عبداللہ ندامت سے سر اٹھانے کے قابل ہی نہ رہے۔

''آئندہ ایسا کبھی نہیں ہوگا باس! جنٹلمین پرامس۔'' عبداللہ نے وعدہ کیا۔

''میری طرف سے بھی اللہ کا پکا وعدہ پائیں!'' حارث نے اس کا ہاتھ تھاما۔ ''اب آپ اس بات کا بہانہ بنا کر کل گو وینٹ گون نہ ہو جائیے گا۔ یہ ساری سجاوٹ اور محنت آپ کی وجہ سے ہی ہے۔'' اس کے تجزیے نے رشی کو ٹھٹکا دیا۔ اس کے ذہن میں یہی حکمت عملی تھی کہ یہاں آنے کا مقصد تو پورا ہو ہی چکا تھا۔ بلاضرورت آمد و رفت مستقبل میں خطرناک بھی ثابت ہو سکتی تھی۔

''ڈونٹ وری نہ لو..... میں کل ذرا دیر سے سہی لیکن آؤں گا ضرور۔'' رشی نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ وہ اب جلد از جلد یہاں سے رخصت ہونا چاہتا تھا مبادا لڑکے اس سے موبائل نمبر ہی نہ مانگ لیں۔ اس کے علاوہ جسم و جان میں پیدا

www.paksociety.com

ہ نے والی سنسنی اور بے تابی دھیرے دھیرے بڑھ رہی تھی۔ اسے اب اپنے ساتھ کچھ وقت گزارنا تھا تاکہ مستقبل کے متعلق کوئی بہترین حکمت عملی وضع کر سکے۔ واپسی کے لیے تیز تیز قدم اٹھاتے اس کا ذہن بے طرح منتشر تھا۔

☆☆☆

جمال کے ماچس کی ڈبیا نما گھر میں خاموشی کا راج تھا۔ جمال کے پاس دروازے پر لگے خود کار قفل کی زائد چابی موجود تھی۔ اس نے جھجکتے ہوئے انداز میں دروازہ کھولا اور چپل گھسیٹتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ اس کی عمر باون سال، کاٹھی مضبوط اور رنگت گندمی تھی۔ چوڑے ہاتھ پاؤں دیکھ کر مقابل خواہ مخواہ مرعوب ہونے لگتا۔ اس کی شخصیت کا مجموعی تاثر آنکھوں کے باعث ماند پڑ جایا کرتا تھا۔ گول چندی آنکھوں میں ہر وقت ایک عجیب سی چمک لہرایا کرتی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے ڈیوڑھی میں لگا انرجی سیور بند کیا اور اپنی پاٹ دار آواز میں بولا۔

''یہاں کس کی ماں نے دستکاری کا اسکول کھول رکھا ہے جس کے لیے اتنی روشنی کی ہوئی ہے؟ بل کی قیمتیں پتا ہے نا آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ کون چکائے گا یہ بل؟'' وہ کمر پر ہاتھ رکھے کئی منٹ یونہی چلاتا رہا لیکن کسی بھی جانب سے کوئی جواب موصول نہ ہوا۔

''اوئے! کدھر مر گئے ہو سب کے سب؟'' وہ پہلے سے بھی بلند آواز میں چلایا۔

''سب کے سب تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے یہاں درجن بھر لوگ رہتے ہیں۔'' اقصیٰ نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ اس نے نماز کے انداز میں سفید رنگ کا دوپٹا اوڑھ رکھا تھا۔ ہاتھ میں آدھی تہ شدہ جائے نماز سے بھی یہی تاثر مل رہا تھا کہ وہ ابھی عبادت سے فارغ ہوئی ہے۔ جمال کا غصہ سرد پڑ گیا۔

''اچھا چل درجن نہ سہی۔ تم اور منیب تو ہوتے ہی ہو نا۔ کیا ضرورت ہے اتنی بتیاں جلا کر رکھنے کی؟'' وہ بیٹی کے معاملے میں بہت جلد موم ہو جاتا تھا۔

''مجھے کیا پتا پاپا جی؟ میں تو اندر نماز پڑھ رہی تھی۔ آپ کا وہ لاڈو رانا ہی جلا کر چلا گیا ہوگا۔ پتا تو ہے کہ وہ گھر میں اندھیرا کرنے سے چڑتا ہے۔'' اقصیٰ نے اطمینان سے جھوٹ تراشتے ہوئے 'لاڈو رانی' کو مذکر صنف میں تبدیل کیا۔

جھوٹ اور بہتان تراشی میں اقصیٰ کو کمال ملکہ حاصل تھا۔ اپنے معمولی سے فائدہ کے لیے وہ کسی کے قدموں تلے بھی دروغ گوئی کی بارودی سرنگ بچھا سکتی تھی۔ اس وقت بھی وہ جمال کے سامنے مکر ہی کر رہی تھی۔ اس نے انرجی سیور جلا کر دروازہ کافی دیر سے کھلا رکھا تھا۔ گلی میں کام کرتے اور چہل قدمی کرتے لڑکوں کی نظروں سے لطف اندوز ہونا تو یوں بھی اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ بعد میں دروازہ تو بند کر دیا تھا لیکن بلب بجھانا بھول گئی۔

''آلے نواب کا پتر! پوچھ لیتا ہوں اسے بھی۔'' جمال بڑبڑاتا ہوا دیوڑھی کے بائیں جانب موجود سنک پر منہ ہاتھ دھونے لگا۔

''ہال ہال بچے آج تو۔'' اقصیٰ نے گہری سانس بھرتے ہوئے خود کلامی کی اور جائے نماز تہ کر کے ایک میز پر رکھ دی۔

وہ کمرے میں عبادت کے بجائے دوپٹے کے بغیر چست قمیص میں مختلف زاویوں سے سیلفیز لے رہی تھی۔ جمال کی اس خاموش آمد نے اسے ہڑبڑا کر رکھ دیا۔ بال سمیٹ کر لپ اسٹک اتارنے میں چند سیکنڈز ہی صرف ہوئے تھے۔ چست قمیص کو چھپانے میں البتہ یہی روپ کارگر ثابت ہوا۔ اس نے گھر کے دونوں مردوں سے اپنا بہروپ بہت کامیابی سے پوشیدہ رکھا ہوا تھا اور مستقبل میں بھی ایسی محتاط روش پر ہی چلنا چاہتی تھی۔

''اگلی دفعہ دروازے کو اندر سے بھی کنڈی لگاؤں گی تاکہ اس بے وقت چھاپے کا تو خطرہ نہ رہے۔'' وہ بڑبڑائی۔

''اندر بیٹھ کر آرام سے تسبیح کر لے۔ پھر کھانا نکال لانا۔'' جمال نے اس کی بے چین طبیعت اور بدہضمی کو تسبیح سے منسوب کر لیا۔ اسی اثنا میں منیب بھی روٹیوں والا شاپر ہاتھ میں پکڑے گھر میں داخل ہوا۔

''یہ لو! کھانا نکالو جلدی۔ مجھے بھوک لگی ہے۔'' اس نے جمال کو سلام کرتے ہوئے اقصیٰ کو مخاطب کیا۔

''کہاں غائب تھا تو اس شیش محل میں چراغاں کر کے؟'' جمال نے اسے کڑے تیوروں سے گھورا۔ منیب نے بیزاری سے اس کی جانب دیکھا اور تلخی سے بولا۔

''اس گھر میں بجلی، پانی اور گیس کے بل میں دے دیا کروں گا۔ کم ہوں یا زیادہ وہ میرا سر درد ہے۔ اس لیے آج کے بعد کوئی یہاں اندھیرا کر کے قبرستان کا ماحول نہ بنائے۔ آئی سمجھ؟''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ تو اس گھر کا بیٹا ہے، تجھے بھی فیصلے کرنے کا پورا حق ہے۔'' جمال نے فوراً پینترا بدلا۔

''آپ نے ریڑھی اس دکان کے اندر کھڑی نہیں کی کیا؟ ابھی واپس آتے ہوئے دیکھ کر آیا ہوں۔ بغیر تالے کے

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

کھڑی ہوئی تھی۔'' منیب کو اچانک یاد آیا۔ جمال نے رات کے اوقات میں ریڑھی رکھنے کے لیے اسی گلی کے اختتام پر اگلی سڑک کے بالکل کونے والی دکان کرائے پر لے رکھی تھی۔

''ہاں! اس وقت کسی کی گاڑی دکان کے آگے پارک تھی۔ شاید کسی کے گھر مہمان آیا ہو ورنہ محلے داروں کو تو پتا ہی ہے میرے ٹائم کا۔ وہ بالکل تنگی نہیں دیتے۔'' جمال نے بتایا۔

''ہٹ گئی ہے گاڑی۔ چابیاں دیں فوراً۔ میں ریڑھی اندر کر کے آؤں۔ ابھی پچھلا نقصان پورا ہوا نہیں اور آپ ایک نیا ٹیکا لگوانے کی تیاریوں میں ہیں۔'' منیب نے اسے لتاڑا۔ جمال خفت زدہ ہو گیا۔ کچھ عرصہ پہلے تک یہاں ایک رہائشی کالونی کی بیرونی دیوار کے ساتھ ریڑھیاں پارک کی جاتی تھیں۔ انتظامیہ کو معقول رقم فراہم کرنے کے باوجود ریڑھی کسی عادی نشے باز کی جانب سے غائب کر دی گئی۔ اس کے بعد جمال نے محلے میں ہی ایک شخص سے شراکت داری پر ریڑھیاں رکھنے کے لیے دکان کرائے پر لے لی تھی۔ اس نے خاموشی سے چابیاں منیب کو تھما دیں۔

''یہ لے پکڑ روٹیاں۔ میں دو منٹ میں آتا ہوں۔'' اس نے شاپر اقصیٰ کی طرف اچھالا۔

''تر پال بھی لے جا۔ اس ریڑھی کو ڈھک دینا اچھی طرح۔ میں ایک دو دن آرام کر کے چپس والی ریڑھی نکال لوں گا۔ قلفیوں کا کام اب مندا جائے گا۔'' جمال کی اس بات پر منیب نے کوئی بھی تبصرہ کیے بغیر چابیاں پکڑیں اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

اقصیٰ بڑے ماہرانہ انداز میں دوپٹا سنبھالتی ہوئی کھانا نکالنے لگی۔ منیب کے واپس آنے تک وہ برتن کمرے میں لگا چکی تھی۔ کھانا خاموشی سے ختم کرتے ہی جمال نے ایک بار پھر سلسلہ کلام کا وہیں سے آغاز کر دیا۔

''پرسوں خیر سے بڑی رحمتوں اور برکتوں والا دن ہے۔ میں نے سنا ہے کہ اس بار کئی بڑی دکانوں نے ڈسکونٹ بھی لگا رکھا ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ آئل اور مصالحہ اسی طرح اکٹھے کر لوں۔ تو بھی چلنا میرے ساتھ!'' اس نے منیب سے کہا۔

''مشکل ہے۔ میری پرسوں بھی ڈیوٹی ہے۔ آپ چلے جانا خود ہی۔'' اس نے اپنے مخصوص کم گو انداز میں جواب دیا۔ اقصیٰ بیزاری سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اسے ان دونوں کے سو جانے کا شدت سے انتظار تھا۔

''ٹھیک ہے۔ میں خود ہی کوئی جگاڑ لگا لوں گا۔'' جمال کی آنکھیں اب بند ہونے لگی تھیں۔

اقصیٰ نے جلدی سے برتن اٹھائے اور باورچی خانے کے سنک میں پٹخنے کے بعد اپنا موبائل فون لیے ڈیوڑھی میں چلی آئی۔ بلب بند کر کے وہ وہیں ایک چھوٹی سی پلاسٹک کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ یہ گھر کا واحد حصہ تھا جہاں پڑوس کے وائی فائی سگنل اچھی حالت میں آتے تھے۔ ان وائی فائی سگنلز کی فیس تو پڑوسی ہی ادا کرتے تھے تاہم یہ سہولت اپنے موبائل کے استعمال کرنے کی 'قیمت' وہ ایک منظورِ نظر 'مانی' کو مہینہ میں ایک دو بار چپکے سے گھر بلوا کر ادا کر دیا کرتی۔ نظر بازی اور موبائل پر غیر اخلاقی گفتگو میں اسے کبھی کوئی عار محسوس نہیں ہوا تھا ماضی قریب میں ایک دو لڑکوں سے جسمانی تعلقات بھی استوار رہے تھے۔ وہ اس کم عمری میں جذبات کے ایسے دہانے پر پہنچ چکی تھی جہاں یہ سب حرکات و معمولات عادت اور ضرورت بن گئے تھے۔ اس وقت بھی اس کے ذہن میں دوپہر والے لڑکے کا تصور اُجاگر تھا۔

''کیسے ہو اجنبی ہینڈسم؟'' اس نے کچھ سوچنے کے بعد واٹس ایپ پر ایک پیغام بھیجا۔

''بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔'' فوری جواب نے اس کی سنسنی بڑھا دی۔

''بوجھو تو جانیں بھلا کون ہوں میں؟'' اقصیٰ نے دانستہ طور پر لکھا۔

''وہی اسپیشل لڑکی جو مجھے آج دوپہر ٹکرائی تھی۔''

''تمہیں یہ ..... کیسے معلوم ہوا؟'' وہ ٹھٹک گئی۔ اس نے اپنا واٹس ایپ اکاؤنٹ بھی 'پرنسز' کے نام سے بنا رکھا تھا۔

''جن کی چاہت دل میں گھر کر لے ان کے بارے میں ہر بات الہام کی طرح روح پر اترا کرتی ہے۔'' رشی کا یہ پیغام پڑھ کر اقصیٰ نے اپنا بایاں ہاتھ رخسار پر رکھا اور خوابناک انداز میں ان الفاظ کو بار بار پڑھنے لگی۔ اس کی دھڑکنوں کی رفتار معتدل نہ رہی تھی۔

''باتیں تو خوب بنانی آتی ہیں تمہیں۔'' وہ سنبھل کر بولی۔

''تمہارے حسین تصور سے الفاظ خود بخود وجود میں آنے لگتے ہیں۔'' رشی نے دل سے مزین اسمائلز بھیجیں۔ اقصیٰ کو اس کا ہر پیغام ہواؤں میں اڑا رہا تھا۔ اس نے زندگی میں بہت سے لڑکوں سے گفتگو کی تھی لیکن اتنی عزت، مان اور اہمیت کسی نے بھی نہیں دی تھی۔ الفاظ کی یہ خوبصورتی اسے مسحور کرنے لگی۔

''تم یہاں کے تو نہیں لگتے۔ کسی کے گھر آئے ہوئے تھے کیا؟'' اقصیٰ نے اپنی الجھن ختم کرنے کے لیے پوچھا۔

''ہاں! ارباز کے گھر مہمان آیا ہوا تھا۔'' رشی نے

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

والدیت کے طور پر ایسا نام لکھا جس کی کسی صورت بھی تصدیق نہیں ہو پائی تھی۔

''اس کھڑوس آدمی کے رشتے دار لگتے تو نہیں ہو تم۔'' اقصیٰ نے بُرا سا منہ بنایا۔

''کیوں کیا ہوا انہیں؟ اچھے خاصے معقول آدمی ہیں۔''

''معقول نہیں نامعقول کہو! اتنی گندی نظروں سے دیکھتا ہے مجھے جیسے کچا ہی کھا جائے گا۔ وہ تو میں ایسی ویسی لڑکی ہی نہیں ورنہ اس کے ارادوں کے سامنے بند باندھنا ممکن ہی نہ تھا۔'' اقصیٰ نے اسے اپنی اہمیت جتائی۔

''تمہاری کوئل جیسی آواز سننے کا بہت دل چاہ رہا ہے۔ کال کرلوں کیا؟'' رشی نے پیش قدمی کی۔

''نہیں! اس وقت تو پاپا جی اور منیب اندر سو رہے ہیں۔ میں کل تمہیں ویڈیو کال کروں گی۔'' وہ مزید کھلی۔

''میں بے تابی سے انتظار کروں گا۔'' رشی نے اسے شہ دی۔

اگلے ایک گھنٹے تک وہ اسی طرح کی کئی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے رہے۔ اقصیٰ اس کے الفاظ و انداز سے مدہوش ہو چکی تھی۔ اس خمار کا خاتمہ اس وقت ہوا جب اسے دروازے پر آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے جلدی سے موبائل سوئٹر کی جیب میں چھپایا اور کمر پر ہاتھ رکھ کر مختصر ڈیوڑھی میں چہل قدمی کرنے لگی۔ انداز ایسا تھا کہ کسی بدہضمی کے بعد ٹہل کر طبیعت بہتر کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

''تم اتنی رات کو یہاں کیا کر رہی ہو؟ سونا نہیں ہے تمہیں؟'' منیب نے اس سے پوچھا۔ اس کے بال منتشر اور آنکھیں متورم تھیں۔

''نظر نہیں آرہا کہ گیس ہوئی ہے مجھے۔ چکر کاٹ رہی ہوں۔ پتا نہیں کس نیت سے لائے تھے روٹیاں۔ ہضم ہی نہیں ہوئی مجھے۔'' وہ چڑتے ہوئے بولی۔ اس کا یہ انداز منیب کے لیے نیا نہیں تھا۔ اقصیٰ نے اسے کبھی بھی بڑے بھائی کا رتبہ اور عزت نہیں دی تھی۔ وہ خاموشی سے ڈیوڑھی میں موجود واش روم چلا گیا اور فراغت پاتے ہی اسے بدہضمی کے لیے بھی دوائی لینے اور جلد سونے کی تلقین کرتا کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اقصیٰ ایک بار پھر موبائل کی جانب متوجہ ہوگئی جہاں اس مختصر دورانیہ میں ہی رشی کے کئی پیغام آچکے تھے۔ وہ اس کی غیر حاضری پر پریشان ہوگیا تھا۔ اقصیٰ نے اسے منیب کی آمد اور بیماری کے متعلق اختصار سے بتا دیا۔

''آج دیکھا تھا میں نے تمہارے بھائی کو۔ کچھ عجیب سا بندہ ہے وہ۔''

''عجیب نہیں۔ نمونہ کہو نمونہ۔ انتہائی شکی مزاج اور وہمی

تعریف

پہلی ملاقات میں شوہر نے بیوی کے حسن کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ ''تم ہزار لڑکیوں میں ایک ہو۔''

بیوی نے یہ سنتے ہی رونا پیٹنا شروع کر دیا۔

''ارے ارے روتی کیوں ہو؟''

بیوی نے زوردار ہچکی لی۔ ''مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ اتنی ڈھیر ساری لڑکیوں سے ملتے رہے ہیں۔''

ذیشان احمد کراچی سے

ہے۔ خیر چھوڑو! کوئی اور بات کرو۔'' اقصیٰ نے گفتگو کا رخ موڑنا چاہا۔ وہ اس کی جانب سے اپنی تعریفوں کے پُل بندھے دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے قلیل وقت میں ہی کائنات کا یہ مہلک ترین نشہ اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ تمہیں اندر چلے جانا چاہیے۔ یہ نہ ہو تمہارا بھائی کوئی ایشو بنالے۔'' رشی نے تشویش جتائی۔

''اس جوگا نہیں ہے وہ۔ ٹینشن نہ لو تم۔ اور ویسے بھی اندر وائی فائی کے سگنل نہیں آتے۔''

''تو اس میں کون سی بڑی بات ہے۔ ہم سم میسج پر بات کرلیں گے۔'' رشی کی تجویز پر وہ منہ بنا کر رہ گئی۔

''نہ بھئی نہ! سوچنا بھی نہ! مجھے واٹس ایپ پر چیٹنگ کرنا زیادہ پسند ہے۔'' میسج کے 'ٹک' براؤن سے بلیو ہونے کا انتظار، اگلے کی جانب سے 'ٹائپنگ' لکھا ہوا نظر آنے کی میٹھی میٹھی سی بے چینی۔ کیا بتاؤں بس تمہیں؟ اِٹس سو رومانٹک۔'' اس نے بلا جھجک اپنا مدعا بیان کیا۔

''آہاہ...... رومانٹک......'' رشی کا دلوں سے مزین جواب آیا۔ ''رومانس پسند ہے کیا تمہیں؟''

''ہاں! کسے پسند نہیں ہوتا بھلا؟ رومانس کے علاوہ بھی کوئی زندگی ہے؟''

''مجھے تمہاری یہ صاف گوئی بہت اچھی لگی۔ اگر میں تمہیں رومانس کی آفر کروں تو؟'' رشی کے جواب نے اسے جھومنے پر مجبور کر دیا۔ وہ گفتگو کو ایسے ہی موڑ پر لانا چاہ رہی تھی۔

''دیکھو بھئی! میں کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔ یہ تو بس میں نے روانی میں اپنی ایک پسند بتا دی۔ تم جانے کیا سمجھ رہے ہو؟'' اس نے طرح دی۔

''میں تمہیں بتا چکا ہوں جانِ من! میں تمہیں بہت اسپیشل لڑکی سمجھتا ہوں۔ اسی لیے کالج بھر کی حسینائیں چھوڑ کر اس وقت تم سے بات کر رہا ہوں۔ تو بتاؤ پھر؟ میرے ساتھ

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

رومانس کرو گی؟''

''ہاں! کرلوں گی۔ کیونکہ تم بھی مجھے بہت اچھے لگے ہو۔ تمہاری آنکھوں میں کچھ ایسا ہے جو اپنی جانب متوجہ کرلیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے ان آنکھوں کے پیچھے بھی ایک دنیا ہے۔ کوئی بہت پُراسرار دنیا۔ میں اسی دنیا تک پہنچنا چاہتی ہوں۔''

''اپنی اس دنیا تک ہی تو تمہیں لے جانا چاہتا ہوں سوئٹ ہارٹ! چلو گی ناں میرے ساتھ؟ یقین کرو میری اس دنیا میں صرف تمہاری ہی کمی ہے۔'' رشی نے بے باکی کی جانب ایک قدم اور بڑھایا۔

''ہاں! چلوں گی۔ تم مجھے جہاں جانے کے لیے کہو میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔'' اقصیٰ کو رشی کے پیغام نے ایسا سرشار کیا کہ وہ اپنا ضبط اور بھرم بالکل کھو بیٹھی۔

اس کے جوابات میں پہلے بے باکی آئی پھر رشی کی جوابی پیش قدمی کے بعد یہ بے باکی غیر اخلاقی حدود میں داخل ہوگئی۔ رشی کا ہر پیغام اس قدر خوبصورت الفاظ سے آراستہ ہوتا تھا کہ وہ بالکل ہی دیوانی ہوتی چلی گئی۔ الفاظ کی اسی بھوک میں اقصیٰ نے اسے اپنی درجنوں تصویریں بھیج دیں۔ وہ بڑے اہتمام سے اس کی دیوانگی مہمیز کرتا رہا۔ یہ سلسلہ رات گئے یونہی چلتا رہا۔ اس دوران موبائل کی بیٹری ایک فیصد تک آنے کا بھی احساس نہ ہوسکا۔ ہوش تو اس وقت آیا جب بجلی یکدم بند ہونے کے بعد پہلے وائی فائی کے سگنل غائب ہوئے اور پھر فون کی اسکرین بھی تاریک ہوگئی۔

''لعنت ہے بھئی! اس لائٹ نے بھی ابھی ہی جانا تھا کیا؟'' اس نے محکمۂ بجلی کی شان میں چند انمول الفاظ جڑ دیے۔ موبائل کی تاریک اسکرین اور گفتگو میں تعطل سے ہونے والی بے زاری اسے ماہیِ بے آب کے مانند تڑپا رہی تھی۔

اقصیٰ نے دروازے کا قفل کھول کر گلی میں جھانکا۔ ہر سُو سناٹا اور نیم تاریکی تھی۔ بجلی کے زائد میٹر استعمال کرنے والوں کے گھروں میں ہلکی سی روشنی نظر آرہی تھی۔

''اچھے ہیں یہ لوگ بھئی۔ ڈبل میٹر رکھ کر ایسی واہیات سپویشن سے تو بچ جاتے ہیں۔ ایک یہ مرغی کا دڑبا ہے۔ یو پی ایس تک کی کوئی سہولت موجود نہیں۔'' سرد ہوا چہرے سے ٹکراتے ہی اس کے وجود میں مزید انگارے بھر گئے۔ غصے سے دروازہ بند کرکے وہ اندھیرے میں دیوار ٹٹولتی ہوئی اندر چلی گئی۔ اس کی تمام تر احتیاط کے باوجود میز کی ٹانگ پاؤں تلے آگئی۔ نتیجہ حسبِ توقع برآمد ہوا۔ وہ بلبلاتا ہوا اس پر چیخنے لگا۔

''اندھی ہوگئی ہے کیا؟ اس وقت کس گارڈن میں ٹہلنے نکلی ہوئی ہے۔''

''اُلّو کے دیدے فٹ نہیں ہیں میری آنکھوں میں جو قبر جیسے اس اندھیرے میں بھی نظر آئے گا۔ ہزار دفعہ کہا ہے کہ کوئی یو پی ایس لگوالو۔ سنتا کون ہے میری یہاں؟ وہ بھی اسی انداز میں چیختی ہوئی اندازے سے دائیں جانب رکھے صوفے پر جا لیٹی۔ اس کمرے میں جمال چارپائی پر میز فرش پر گدا بچھائے اور وہ خود صوفے پر سویا کرتی تھی۔

''ریڑھیاں کھڑی کرنے کے لیے اتنا کرایہ بھر دیا جاتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ ایک یو پی ایس ہی لگوا دیں گھر میں۔'' اس کا طیش کم ہونے میں ہی نہیں آرہا تھا۔

''پتا نہیں کیا سوچ رہا ہوگا وہ میرے بارے کہ یکدم کہاں غائب ہوگئی میں؟'' اسے ایک نئی فکر لاحق ہوئی۔ ''جو بھی ہے صبح اپنی اس پریشانی کا اظہار بھلا کیسے کرے گا؟'' اس کے دل میں گدگداہٹ ہوئی۔

''کم بخت خود تو اتنا پیارا نہیں ہے لیکن باتیں کمال کی کرتا ہے۔ اس کو تو فلموں میں بھی ہنسی خوشی چانس دے دیں گے۔'' اقصیٰ نے کروٹ بدلی۔

''لیکن مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھ رکھا ہے۔ کہاں دیکھا ہے؟ کدھر ملا ہوا ہے یہ مجھے؟'' اس کے لاشعور کی خلش ایک بار پھر اُجاگر ہوگئی۔

''خیر! صبح اس سے لازمی پوچھوں گی۔ زور دے کر اگلواؤں گی۔ یہ میرا وہم تو ہرگز نہیں ہوسکتا۔ اسے کہیں نہ کہیں بہت قریب سے دیکھا ہوا ہے۔ لیکن کہاں؟'' انہی اُلجھی، بکھری سوچوں نے بالآخر نیند کے سامنے ہتھیار پھینک دیے۔

☆☆☆

رشی ایک عوامی پارک میں سنگی بینچ پر پاؤں پھیلائے بیٹھا تھا۔

اس کے چہرے پر شدید اذیت کے آثار تھے۔ گزشتہ دن اور رات بہت ہنگامہ خیز رہے تھے۔ دن بھر عبداللہ، حارث اور سبحان کی معصومانہ قربت میں خوشگوار انداز میں اختتام پذیر ہوا۔ رات کو اقصیٰ نے رابطہ کرلیا۔ اس کی یہ پیش قدمی رشی کے لیے غیر متوقع تو نہیں تھی تاہم اس کا ذہنی معیار اسے متزلزل کرگیا تھا۔

ایک روز قبل شازیہ کے ساتھ بسر کیے گئے لمحات کے بعد اقصیٰ کی بے باک گفتگو نے اسے وحشت میں مبتلا کررکھا تھا۔ وہ اس کی سوچ اور اندازوں سے کہیں زیادہ اخلاق باختہ ثابت ہوئی تھی۔ گزشتہ رات اگر گفتگو میں اچانک تعطل نہ آتا تو

www.paksociety.com

شاید وہ اسی وقت اسے فنا کے گھاٹ اتارنے نکل کھڑا ہوتا۔ جمال اور منیب کے لیے غصہ بھی نئی نہج تک پہنچنے لگا۔ اس نے پارک میں ہی موجود ایک الیکٹرک کولر سے پانی کے تین گلاس پیے اور اپنے اعصاب قابو میں رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

ان سوچوں میں شازیہ کا مردہ وجود بھی جھلک دکھاتا تو ذہنی پرواز فوراً اسی سمت مڑ جاتی۔ آج اور کل عوامی تعطیل کے باعث لاش کا منظر عام پر آنا ممکن ہی نہیں تھا۔ اس سے پہلے ہی اقصیٰ کو ٹھکانے لگانا بہت ضروری تھا۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ کوئی بھی تفتیش ان دونوں حادثات میں کڑی تلاش کر ہی نہیں سکتی تھی۔ ہاں البتہ منیب اور جمال کے سلسلے میں اسے بہت احتیاط کا مظاہرہ کرنا پڑتا۔ تاخیر کسی صورت میں برداشت نہیں ہوسکتی تھی۔ کم از کم ایک ہفتے میں ان تینوں فتنہ پرور لوگوں کے بوجھ سے دھرتی کو آزادی مل جانی چاہیے تھی۔ ان کے قتل کے لیے موقع تلاش کرنے کے بجائے موقع خود پیدا کرنا تھا۔ خطرات کی پروا یا خلش دل میں ابھرتی بھی تھی تو شازیہ کے موبائل میں موجود ویڈیو اور اس سے منسلک یادیں ہر خوف کا خاتمہ کر دیتیں۔ زندگی اس صورت میں پرخطر تھی تو دوسری صورت میں اس سے کہیں زیادہ اذیت ناک ہوتی۔ رشی نے زیادہ تکلیف سہنے کے بجائے کم تکلیف کا انتخاب کر لیا تھا۔ محفوظ مستقبل، اچھی نوکری اور مناہل کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے یہ سب تو نا گزیر تھا۔

پارک میں چند گھنٹے گزارنے کے بعد اس نے الیکٹرک کولر سے ہی منہ دھویا اور باہر چلا آیا۔ غصہ، بیزاری اور اذیت اعصاب پر تھکاوٹ طاری کر رہی تھی۔ وہ کچھ دیر خالی الذہنی کے عالم میں سڑکوں پر گھومتے عوامی جوش و خروش دیکھتا رہا۔ دو گھنٹے بعد اس کے قدم خود بخود اسی علاقے کی جانب مڑ گئے۔ سبحان، عبداللہ اور حارث اسے دیکھ کر کھل اٹھے۔

”اتنی دیر کیوں کر دی پائین؟“ حارث نے علیک سلیک کے بعد شکوہ کر دیا۔

”گھر میں کچھ مصروفیت تھی اسی لیے بس۔“ وہ ہلکا سا مسکرایا۔

”اچھا! پھر ٹھیک ہے۔ ورنہ ہم تو ڈر ہی گئے تھے کہ کہیں آپ ناراض ہی نہ ہو گئے ہوں۔“ عبداللہ نے طمانیت سے سر ہلایا۔

”تو بتائیں آج کام کس طرح مکمل کریں؟ بلکہ آپ وہاں بیٹھ کر ہمیں بتاتے جائیں۔ باقی سارا کچھ ہم خود ہی کریں گے۔“ سبحان نے تجویز دی۔ رشی انہیں گجرا لڑیوں کے متعلق ہدایات دینے لگا۔

کچھ لمحوں بعد اس کے موبائل پر میسج ٹون بج اٹھی۔ رشی نے عادتاً اس ٹون کو نظر انداز کر دیا۔ اسے اکثر موبائل نیٹ ورک کی جانب سے وقت بے وقت پیغام موصول ہوتے رہتے تھے۔ مناہل کی جانب سے بھی بے فکری تھی۔ پارک میں ہی بیٹھے اس سے ہلکی پھلکی بات چیت ہوگئی تھی۔ میسجز کا یہ سلسلہ تواتر سے شروع ہوا تو حارث کی زبان ایک دفعہ پھر مچل اٹھی۔

”دیکھ لیں پائین! لگتا ہے کسی کے ہاتھوں میں بڑی زوردار کھجلی ہو رہی ہے۔ میسج پر میسج کیے چلا جا رہا ہے۔“

رشی نے زچ ہو کر موبائل نکال لیا۔ دوسری جانب اقصیٰ کی جانب سے ڈھیروں پیغامات تھے۔

”واٹس ایپ پر آف لائن کیوں ہو؟“

”کیا بات ہے؟ اتنے بجھے بجھے سے کیوں لگ رہے ہو؟“

”آج بھی وہی کل والے ہی کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ بلیک شلوار قمیص پہنی ہوتی۔ بہت سوٹ کرتی تمہیں۔“

”آن لائن آؤ ناں! میں ویٹ کر رہی ہوں۔“

”مجھ سے ناراض ہو کیا؟“

”اچھا! میں سمجھ گئی۔ کل رات والی بات پر خفا ہو تم۔ سوری یار! لائٹ چلی گئی تھی اور چارجنگ بھی ختم ہوگئی تھی۔“

”اتنا ایٹی ٹیوڈ کس بات کا ہے آخر؟ سوری کہہ تو رہی ہوں۔“

اقصیٰ کا یہ بچکانا رویّہ اور پیغامات دیکھ کر وہ تلملا کر رہ گیا۔ یہ وقت رشی کے لیے بہت کٹھن تھا۔ اسے اپنی بیزاری اور اذیت کو خوشگواریت، ہنسی اور طمانیت کے پردے میں پوشیدہ رکھنے کی اداکاری کرنی تھی۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ دروازے کی جھریوں سے اقصیٰ اب تک جھانک رہی ہوگی۔ اس کی جانب سے گرمجوشی میں ہلکی سی کمی محسوس کرتے ہی وہ اپنی مخصوص روش کے تحت اس کے ناک میں دم کر دے گی۔ رشی نے گہری سانس لیتے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ سجائی اور جواب لکھنے لگا۔

”کوئی بات نہیں ہے۔ رات سے تمہارے بارے میں پریشان تھا۔ یہی سوچتا رہا کہ میری پرنسز کو کہیں کوئی مسئلہ نہ ہو گیا ہو۔ گھر والوں کی جانب سے کوئی ایشو نہ ہو گیا ہو۔“

”ارے نہیں! ایسا کچھ نہیں ہوسکتا۔ میری فیملی مجھ پر بہت اعتماد کرتی ہے۔ انہیں پتا ہے کہ میں کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔“ اس نے اپنا مخصوص اور پسندیدہ تکیہ کلام دہرایا۔ جواب میں رشی نے مسکراہٹ بھینچنے پر ہی اکتفا کیا۔

Nadar Azeem www.pakistanipoint.com

''آج یہیں رہو گے نا سارا دن؟'' اقصیٰ نے تجسس سے پوچھا۔

''ہاں! بچوں کے ساتھ ہی گزرے گا سارا دن۔''

میں ابھی لگاؤں گی چکر باہر کا۔'' رشی اس کا یہ منصوبہ سن کر خود کو بمشکل سر پیٹنے سے روک سکا۔ اس لڑکی کو اپنی عزت کا خیال تھا، نہ ہی معاشرتی طور طریقوں کی کوئی پروا۔ رشی نے لمحہ بھر کے لیے سوچا اور جارحانہ انداز اختیار کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

''اگر تم مجھے باہر نظر آئیں تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہو گا۔''

''یہ کس ٹون میں بات کر رہے ہو تم؟'' اقصیٰ کو دھچکا لگا۔

''وہی ٹون جس میں بات کرنے کا مجھے حق ہے اور اختیار بھی۔ تم عزت ہو میری۔ میں تمہیں اپنی غیرت سمجھتا ہوں۔ مجھے بالکل پسند نہیں کہ تمہیں میرے سوا کسی اور کی آنکھ دیکھے۔ آج تو باہر رش بھی بہت ہے۔ میں کسی ایک آدھ کا سر پھاڑ دوں گا۔''

اس کے انداز و اطوار نے گھر کی مختصر ڈیوڑھی میں بیٹھی اقصیٰ کو گنگ کر دیا۔ وہ اس وقت عجیب اور ناقابل فہم کیفیات میں گھری تھی۔ لڑکوں سے بات چیت، چوری چھپے ملاقات، گفتگو اور غیر اخلاقی تعلقات میں کبھی کسی نے اسے عزت اور غیرت کا رتبہ نہیں دیا تھا۔ اقصیٰ کو اپنی آنکھیں نم محسوس ہونے لگیں۔ وہ رشی کے بھیجے گئے ان الفاظ پر بڑی محبت سے انگلیاں پھیرنے لگی۔

''اب کچھ بولو گی بھی یا خاموش ہی رہنا ہے۔'' رشی کا اگلا پیغام موصول ہوا۔

''کیا میں اتنی اہم ہوں تمہارے لیے؟'' اس کے جواب پر رشی نے نفرت سے سر جھٹکا۔ یہ سوال اس کے لیے غیر متوقع نہیں تھا۔ رشی نے اسے مطمئن کرنے کے لیے بہترین جملوں کا انتخاب پہلے ہی کر رکھا تھا۔

''کیا ابھی بھی تمہیں یہ بتانے کی ضرورت ہے جانِ من؟ ہاں! تم میرے لیے بہت اہم ہو۔ تمہیں دیکھنے اور بات کرنے کا حق صرف اور صرف مجھے ہے۔ میں کسی اور کی تم پر نظر برداشت کر ہی نہیں سکتا۔ اگر تمہیں میری یہ پوزیسونیس پسند نہیں تو مجھے دوٹوک بتا دو۔ میں تمہیں دوبارہ کبھی ڈسٹرب نہیں کروں گا۔ تم کبھی جان ہی نہیں پاؤ گی کہ رشی کہاں گیا؟''

''ایسی بات نہ کرو۔ میں بھی خود کو صرف اور صرف تمہاری امانت سمجھتی ہوں۔ آئی لو یو۔''

''آئی لو یو ٹو جانِ من۔ بس اب گھر میں کام وغیرہ نمٹاؤ۔ میرے لیے اچھی سیلفیز لو۔ میں رات کو تم سے بات کروں گا۔ اپنا موبائل فل چارج کر کے رکھنا اور وائی فائی کا ایشو ہونے کی صورت میں سم پر پیکج کروالینا۔'' اس کی فرمائش نے اقصیٰ کو سرتاپا سنسنا دیا۔ وہ ابھی سے رات کو ہونے والی گفتگو کے بارے میں سوچ کر نہال ہو رہی تھی۔

''اوکے! میں تمہارا انتظار کروں گی۔ اتنی تو اجازت دو گے نا کہ کبھی دل چاہے تو یہاں آکر تمہیں باہر چلتے پھرتے دیکھ لوں۔''

''ہاں! دیکھ لینا۔ لیکن دروازہ نہیں کھولنا۔ مائنڈ اٹ۔'' رشی نے یاددہانی کروائی۔

''ٹھیک ہے سرتاج! جو آپ کا حکم۔ کنیز آپ کی تابعدار ہے۔'' اقصیٰ کی اس بات پر رشی کے لیے اپنا قہقہہ ضبط کرنا محال ہونے لگا۔ وہ اس کے چند پیغامات پر ہی اسے سرتاج کے عہدہ تک لے آئی تھی۔

''یہ شاید ہر لڑکی کی خُو ہوتی ہے۔ مرد کی چند یقین دہانیوں پر اسے فوراً ہی یہ درجہ دے دیتی ہے۔'' اس کے ذہن میں 'کسی' کا سراپا ابھرا۔

''کدھر کھو گئے ہیں باس؟ آج آپ اتنے اَپ سیٹ کیوں ہیں؟ لگتا ہے ہماری شرارت سے ابھی تک ناراض ہیں۔'' عبداللہ نے سنجیدگی سے کہا۔ رشی سر جھٹکتے ہوئے ان کی طرف متوجہ ہوا۔ ان سبھی کے چہرے پر افسردگی اور ملال تھا۔ لاعلمی اور کچی عمر کی معصومیت کے رنگوں نے انہیں ایک خوبصورت چمک دے رکھی تھی۔ رشی کے دل میں ایک ہوک اٹھی۔ اس عمر کے خوابوں، تقاضوں، خواہشوں اور اُمنگوں سے وہ بخوبی آشنا تھا۔ اسے ان بچوں سے خواہ مخواہ ہی محبت ہو گئی تھی۔ اس لمحے رشی کے دل میں ایک طاقتور لہر اٹھی۔ اس نے باقی ماندہ وقت یادگار بنانے کا فیصلہ کرلیا۔

''ناراض تو ہونا بنتا ہے۔ تم لوگ مجھے سامنے دیکھ کر بہت ڈھیلے پڑ گئے ہو۔ خود بھی تو کچھ ہاتھ پاؤں ہلاؤ۔ کوئی آئیڈیا ذہن میں لاؤ۔'' اس نے خفگی سے جواب دیا۔

''آئیڈیوں کی بات نہ کریں پائین! وہ تو آپ کے بھائی کے ذہن میں ایسے آتے ہیں جیسے آؤٹ آف فارم باؤلر کے اوور میں رنز آتے ہیں۔ مگر مہنگائی بڑھتی جا رہی ہے اور اپنی جیب کا یہ حال ہے کہ چندے کے پیسے دونوں کنڑوں والے ڈکار جاتے ہیں۔ ہمارے حصے میں ڈانٹ ڈپٹ کے علاوہ دس، بیس روپے ہی آرہے ہیں۔'' حارث نے اپنا دکھڑا سنایا۔

''ڈانٹ ڈپٹ کیوں بھئی؟'' رشی کی حیرانی بے ساختہ

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

تھی۔

''ان کا غصہ بھی جینوئن ہے باس! وہ کہتے ہیں اس سڑک پر تین تین جگہ چندہ کیوں لیا جاتا ہے؟ دوسری جگہوں پر تو لڑکوں نے مل بانٹ کر گلیاں سجائی ہوتی ہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ شاید ہم فراڈ کر رہے ہیں۔ آپ کو کل بھی تو بتایا تھا کہ یہاں بڑوں کی لڑائیاں، جھگڑے اور کلاس ڈیفرینس اس قدر سخت ہیں کہ وہ ایسے مقدس دن کے ویلکم پر بھی اپنے دل پتھر کیے بیٹھے ہیں۔''

رشی نے تاسف سے سر ہلایا اور جیب سے چند بڑی مالیت کے نوٹ نکال لیے۔

''ابھی کسی دکان پر جاؤ اور یہاں لٹکانے کے لیے بلب لے آؤ۔ بلب اچھی کوالٹی کے ہوں، پیسوں کی پروانہ کرنا، مقدار اور معیار دونوں ہی اچھے ہونے چاہئیں۔ مجھے کل صبح تک تمہاری یہ ڈیکوریشن اس ایریا میں بیسٹ دکھائی دینی چاہیے۔ سمجھے؟''

''سب سمجھ گئے پائین! لیکن پہلے ہی آپ پر بہت برڈن ڈالا ہے۔ اب مزید خرچہ اچھا نہیں لگتا۔'' حارث متامل تھا۔

''زیادہ دلیپ کمار بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سب کچھ میں اپنی حقیقی خوشی سے کر رہا ہوں۔'' رشی کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ایسے کسی بھی موقع اور تہوار کی یادگار میں پردۂ تصور پر تند نظریں، سرد لہجے اور زہر اگلتی زبانیں اجاگر ہو جاتی تھیں۔

''مجھے دلیپ کمار نہ بننے کا کہہ کر خود کون سے کمار بن گئے ہیں اب؟'' حارث نے اسے ٹہوکا دیا۔

''بائیک کا ارینج کرواؤ جلدی سے۔ وقت بہت کم ہے۔ رات تک کیسے ہو گا یہ سب؟'' رشی نے دانستہ طور پر افراتفری پھیلائی۔

''بائیک آن لائن نہ منگوا لیں باس؟ آپ اور نانی ساتھ چلے جانا۔ جھالر، لڑیاں، فانوس، اسٹرابری، کرسٹل بال وغیرہ لے آنا۔ میں اور اپنا چڑی پہلوان راؤ یا بلب دیکھ لاتے ہیں۔ ایک دم فائیو اسٹار مال لائیں گے۔'' عبداللہ نے سارا مسئلہ ہی حل کر دیا۔

''ٹھیک ہے ڈن ہوا۔ ملتے ہیں ایک بریک کے بعد۔'' رشی نے بائیک منگوانے کے لیے موبائل نکال لیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ سبحان کے ساتھ اردو بازار کے لیے روانہ ہو گیا۔

خریداری کے لیے بھاؤ تاؤ کرتے اور جوش و خروش سے سامان کا انتخاب کرتے ہوئے اس کے ذہن میں ایک ہی سوال کی بازگشت تھی کہ وہ یہ سب کچھ محض اپنے اصل مقصد کی تکمیل کے لیے راہ ہموار کرنے کی خاطر کر رہا تھا یا کوئی اور جذبہ بھی کارفرما تھا۔ اپنی ان کیفیات سے الجھتے، بکھرتے رشی کو اس بات کا بھی اندازہ تھا کہ اس وقت یہ مصروفیت اور جذبہ کسی نعمت سے کم نہیں ہے۔ اکیلا ہونے کی صورت میں وہ اپنی ہی وحشت سہار نہ پاتا۔

اس کے بعد وقت بہت تیزی سے گزرا۔ شام ڈھلنے تک سجاوٹ کے ساتھ ہنسی مذاق اور ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنے کا عمل جاری رہا۔ اس روز کھانا عبداللہ اپنے گھر سے لایا تھا جو ذائقہ میں گزشتہ روز کی طرح نہ سہی تاہم رشی نے اس کا دل رکھنے کے لیے رغبت سے کھایا۔ اقصیٰ سے ہلکی پھلکی گفتگو کا سلسلہ بھی کسی نہ کسی طرح برقرار رہا۔ ان اوقات میں رشی کا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس نے کھانے کے بعد لڑکوں کے ساتھ تھوڑی دیر مزید کام کروایا اور طے شدہ حکمتِ عملی کے مطابق فون دیکھ کر چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے ایک فرضی نمبر ملا لیا۔

''آپ کے نمبر سے آئی مسڈ کال میں نے ابھی دیکھی..... اور سنائیں گھر میں سب ٹھیک تو ہے نا؟..... اوہ نہیں..... کب ہوا یہ؟ ابھی کل صبح تو میری بات ہوئی تھی اُن سے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون..... جنازہ کب رکھا ہے؟ اچھا میں امی کو لے کر نکلتا ہوں ابھی۔ بہت افسوس ہوا بھائی! اللہ پاک مغفرت فرمائے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں کہتا دوسری جانب سے بات سننے کی اداکاری بھی کرتا رہا۔

''کیا ہو گیا پائین؟ کس کا فون تھا؟'' حارث پریشان ہوا۔

''میرے ایک کزن کا تھا۔ ماموں پارٹ اٹیک سے زندگی کی بازی ہار گئے ہیں۔'' اس نے اپنی آنکھیں مسلیں۔

''اوہ! بہت افسوس ہوا۔ کہاں رہتے ہیں وہ؟'' عبداللہ نے پوچھا۔

''شیخوپورہ میں۔ سوری جگرز! مجھے ابھی نکلنا ہو گا۔ امی کا فون کچھ دن سے خراب ہے۔ انہیں بتانے کا کٹھن کام بھی مجھے خود ہی کرنا ہو گا۔'' وہ بوجھل انداز میں بولا۔

''ہمت کریں بھائی جی! اللہ کی امانت تھی۔ اس نے واپس لے لی۔'' سبحان نے متانت سے اسے دلاسا دیا۔

''میں چلتا ہوں۔ مین روڈ سے کوئی رکشا پکڑتا ہوں۔''

رشی نے ان سے مصافحہ کیا اور واپس ہو لیا۔ یہ کٹھن مرحلہ آسانی سے نمٹتے ہی اسے اپنا وجود کافی ہلکا پھلکا محسوس ہونے لگا لیکن پھر اقصیٰ کا تصور ذہن میں آتے ہی وہ کراہ کر رہ گیا۔ اس سے

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

بات چیت کرنے کا اذیت ناک مرحلہ تو ابھی باقی تھا۔

''بہت انتظار کروایا تم نے آج۔'' اقصیٰ نے چھوٹتے ہی گلہ کیا۔ رشی نے جبری خوش خلقی کا لبادہ اوڑھا اور اسے الفاظ کی تال پر مسحور کرنے کا آغاز کر دیا۔ اس کی بھیجی گئی سیلفیز پر تعریفوں کے پُل باندھتے ہوئے وہ دھیرے دھیرے گفتگو اپنے ڈھب پر لانے لگا۔

''میں تم سے ملنا چاہتا ہوں اقصیٰ۔ انکار مت کرنا پلیز۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''ملنا تو میں بھی چاہتی ہوں ڈیئر!'' اس نے رضامندی ظاہر کی۔

''کل صبح نیشنل پارک میں آجانا دس بجے تک۔ میں انتظار کروں گا۔'' رشی نے دانستہ طور پر عوامی مقام کی تجویز سامنے رکھی۔

''نہیں! پارک میں نہیں۔ میرے پاس ایک اور چوائس ہے۔'' اقصیٰ نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

''جگہ جو بھی ہو بس سیف ہونی چاہیے۔ میں تمہیں کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ تمہاری عزت بہت پیاری ہے مجھے۔'' اس نے لگاوٹ سے جواب دیا۔

''ایسی سیف جگہ ہے جہاں گھنٹوں کوئی انسان تو کیا پرندہ بھی پر نہیں مار سکے گا۔'' وہ اترائی۔

''کیا واقعی؟ جلدی بتاؤ۔ میں تو سر کے بل دوڑا چلا آؤں گا۔'' رشی نے بے تابی جتائی۔

''تم کل صبح نو بجے تک میرے گھر چلے آنا۔ پاپا جی اور منیب اپنے کام کے سلسلے میں چلے گئے ہوں گے۔ وہ رات سے پہلے واپس نہیں آئیں گے۔''

''تم ہوش میں تو ہو؟ اگر محلے میں سے کسی نے دیکھ لیا تو؟'' رشی اس کی بے باکی پر دنگ رہ گیا۔

''آج ساری رات جاگ کر ڈیکوریشن کرنے والے یہ لڑکے کل دوپہر دو، تین بجے سے پہلے نہیں اٹھیں گے۔ ٹینشن نہ لو تم۔ گھر سے بہترین اور محفوظ جگہ کوئی بھی نہیں۔ اگر کوئی بے وقت آ بھی گیا تو کچن کے اوپر گیلری میں چڑھا دوں گی تمہیں۔ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ وہاں اگر دو روز بھی چھپے رہو گے تو کسی کو کچھ علم نہیں ہوگا۔'' اقصیٰ کا 'ہوم ورک' مکمل اور بھرپور تھا۔ غالباً وہ ایسی ملاقاتیں پہلے بھی کئی بار کر چکی تھی۔

''ٹھیک ہے جانِ من! جیسے تمہاری خوشی۔'' رشی نے سرِ تسلیم خم کیا۔ اس متوقع ملاقات کی جزئیات طے کرتے وہ اگلے دو گھنٹے یونہی مصروفِ گفتگو رہے۔ بات چیت کے اس اختتام پر رشی مبینہ قتل کے متعلق منصوبہ بندی میں مگن ہو گیا۔

☆☆☆

وہ سنگھار میز کے سامنے بیٹھی تھی۔

اس میز کی بھوری رنگت کئی جگہوں سے اُڑ کر سیاہ ہو چکی تھی لیکن آج کل اس کی نظریں کسی بدنمائی کی طرف دھیان ہی نہیں دیتی تھیں۔ اس وقت بھی وہ آئینے میں جھلکتے عکس کو نہار رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک ستاروں کو بھی ماند کر رہی تھی۔ گلابی ڈورے شوہر کی چاہت کا خمار تھے۔ اس کی شادی کو تین ماہ بیت چکے تھے اور ہر گزرتے دن میں شوہر کے والہانہ پن، محبت و عزت میں پہلے سے کئی گنا اضافہ ہی ہوا تھا۔

''تیرے نام..... ہم نے کیا ہے..... جیون اپنا سارا صنم..... پیار بہت کرتے ہیں تم سے..... عشق ہے تو ہمارا صنم۔'' وہ بے اختیار گنگنانے لگی۔

''ارے! یہ بھلا میں کیا گنگنا رہی ہوں۔ پیار..... عشق.....'' وہ اپنے عکس سے مخاطب ہو کر مسکرائی۔

''ہاں تو کیا ہوا؟ یہ جذبے بھی تو اسی دنیا میں موجود ہیں۔ محبت تو یوں بھی اس کائنات کا خوبصورت ترین جذبہ ہے۔'' اس کے عکس نے جواب دیا۔

اسی لمحے اس کی نظر عکس کے عقب میں نمودار ہوتے ہیولے پر پڑی۔ اس ہیولے کی آنکھوں میں شکوے، خفگی، دکھ اور کسک کے ہزاروں رنگ تھے۔

''یہ تم کہہ رہی ہو؟ تم؟ محبت اس... کائنات کا جذبہ کب سے ہو گیا تمہارے لیے؟'' اس کی آواز میں آج بھی وہی نرمی اور حدت تھی جو صرف اسی سے بات کرتے ہوئے محسوس ہوتی تھی۔

اس نے چونک کر پہلے عقب کا معائنہ کیا۔ وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا لیکن آئینے کا عکس جوں کا توں اپنے سوال کا جواب طلب کر رہا تھا۔

''یہ کیسے یاد آ گیا مجھے بھلا؟'' اس نے نخوت سے بال جھٹکتے ہوئے سوچا۔ ''بڑے دعوے کرتا تھا اپنی محبت اور میری غلط چوائس کے۔ کبھی ملے گا تو بتاؤں گی کہ غلط وہ تھا، میں نہیں۔ میرا فیصلہ بالکل ٹھیک تھا۔ میں اپنی لائف میں بہت خوش ہوں۔ ہاں ٹھیک ہے چھوٹے موٹے مسئلے مسائل تو ہر گھر میں چلتے ہی رہتے ہیں۔ اب جہاں دو برتن ہوں تو ٹکراتے بھی ہیں۔ لیکن اوور آل میری لائف بالکل سیٹ ہے۔ موری کی اینٹ نے ہی چوبارے کی شوبھا بڑھائی ہے۔'' اپنے بالوں کو برش سے سنوارتی وہ مسلسل ایک ہی نکتے پر سوچ رہی تھی۔

ان سوچوں کے درمیان وہ ایک بہت معمولی نقطہ

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

نظرانداز کیے ہوئے تھی کہ اپنی نئی زندگی میں خوشی، سرشاری، اطمینان اور سکون کے باوجود وہ آئینے میں 'اسی' کا عکس کیوں دیکھ رہی تھی جس کو دھتکار کر اس نئی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ دل ابھی بھی اسی سے ایک بار ملاقات کا متمنی کیوں تھا بھلا؟

''زمانے کے دیکھے ہیں رنگ ہزار...... نہیں کچھ سوا پیار کے۔'' وہ بڑے ترنم سے گنگناتی شوہر کے استقبال کی تیاری کرنے لگی۔

☆☆☆

سوموار کی صبح بہت خوشگوار تھی۔

کچھ دنوں سے دھوپ کا مدھم اور پھیکا سا روپ اس روز بہت چمکیلا تھا۔ گلیوں اور بازاروں میں لہراتے پردے، لڑیاں، لٹکے ہوئے فانوس، رنگ برنگی جھنڈیاں جسم و جاں میں عقیدت و سرشاری کی لہریں موجزن کیے ہوئے تھیں۔ آج ہر چہرہ روشن اور ہر وجود پُرجوش تھا۔ ان سب خوش باش اور مطمئن چہروں میں صرف رشی ہی ایسا تھا جو سرد مہری اور وحشت کا شکار تھا۔ اس کی صبح کا آغاز اپنی والدہ کی جانب سے کھنچائی پر ہوا۔

''کیا بات ہے بیٹا؟ آج بھی نماز کے لیے نہیں اٹھے تم؟'' وہ اس کے سرہانے بیٹھ گئیں۔

''طبیعت بہت بوجھل ہے بس۔'' اس نے جمائی لی۔

''میں کئی دن سے نوٹ کر رہی ہوں کہ تم کسی ٹینشن میں ہو۔''

''ایگزامز سر پر ہیں نا۔ اس کی ہی ٹینشن رہتی ہے۔'' رشی نے فوراً آفاقی عذر پیش کر دیا۔

''یہ کیسی فکر ہے بیٹا کہ کتابیں کھولنے کے بجائے سارا سارا دن گھر سے غائب رہتے ہو۔ رات کو بھی ہاتھ میں بیگ یا کتاب کے بجائے موبائل ہوتا ہے۔'' سدرہ نے فوراً اسے ٹوکا۔

''آپ سے کس نے کہا کہ میں سارا دن غائب رہتا ہوں تو صرف آوارہ گردی کرتا ہوں۔'' اس نے منہ بنایا۔ ''میں اپنے فرینڈز کے ساتھ کمبائن اسٹڈیز کے لیے جاتا ہوں۔ کچھ بکس وہیں رکھی ہوئی ہیں اس لیے بیگ گھر پر ہی رہتا ہے۔'' رشی نے اطمینان سے ایک اور جھوٹ تراش لیا۔

''اپنی ڈائٹ کا خیال رکھو پھر۔'' وہ روایتی پریشانی میں مبتلا تھیں۔

''ٹھیک ہے موم ڈیئر! آپ جو ناشتا بنا کر لانا چاہتی ہیں، لے آیئے۔ میں ذرا فریش ہو آؤں۔'' رشی نے ماں کو مطمئن کرنے کے لیے ان کا من پسند کام بتا دیا۔ سدرہ نے مسکراتے ہوئے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

رشی کے لیے اعصابی مضبوطی اب بے حد ضروری ہو گئی تھی۔ اس نے آنے والے وقت کی جزئیات طے کر لی تھیں۔ ناشتے سے فارغ ہوتے ہی وہ تیار ہو کر باہر نکل آیا۔ اس نے سدرہ کی نظر بچا کر ان کے بال رنگنے کے لیے استعمال ہونے والے پلاسٹک کے دستانے بھی جیب میں رکھ لیے تھے۔ فی الوقت اس کے ذہن میں اقصیٰ کو قتل کرنے کے متفرق منصوبے تھے۔ وہ صورتِ حال کی مناسبت سے ہی کوئی فیصلہ کرنا چاہتا تھا۔

''رستہ کلیئر ہے کہ نہیں؟'' اس نے اقصیٰ کو پیغام بھیج کر دریافت کیا۔

''مکمل طور پر نہیں۔ منیب ابھی گھر پر ہی ہے۔ تم آدھے گھنٹے بعد یہاں پہنچ جانا۔ میں دروازہ کھلا ہی رکھوں گی۔'' اقصیٰ کی طرف سے فوری جواب موصول ہوا۔ رشی کی دھڑکنیں یکبارگی تیز ہو گئیں۔

اگلا نصف گھنٹا اِدھر اُدھر گزار لینے کے دوران اس نے ایک نجی اسپتال کی فارمیسی سے منہ مانگے داموں پر ماسک خرید کر چہرے پر چڑھا لیا۔ سبزی مائل یہ ماسک پہننے کے بعد اس کا چہرہ اسّی فیصد سے زائد ناقابلِ شناخت ہو گیا تھا۔ اس عمل نے رشی کے اعتماد میں بھرپور اضافہ کر دیا۔ وہ نپے تلے قدموں سے چلتا ایک بار پھر اسی سڑک پر جا پہنچا۔ اس کی توقعات کے عین مطابق بیرونی سڑکوں پر ناشتے کے علاوہ کہیں کوئی سرگرمی نہ تھی۔ رات بھر سجاوٹ میں مشغول رہنے والے لڑکے حقیقتاً دوپہر سے قبل کسی صورت بیدار نہیں ہو سکتے تھے۔

اقصیٰ کے ماچس کی ڈبیا نما گھر تک پہنچتے اس کی نظریں دولھا، چڑی پہلوان اور نانی کے گھروں کے بند دروازوں پر بھٹک گئیں۔ اس کے دل میں ایک عجیب سا گداز پیدا ہونے لگا تھا۔ آنکھوں میں آنے والی نمی پر خود کو لتاڑتے ہوئے اس نے محتاط نظروں سے چاروں اطراف کا جائزہ لیا اور نیم وا دروازہ کھول کر گھر میں داخل ہو گیا۔

اندر جاتے ہی ایک حبس نما کیفیت اور بدبو نے اس کا استقبال کیا۔ رشی کا دل متلانے لگا۔ مختصر ڈیوڑھی کے بائیں طرف بنے ملحقہ غسل خانے اور بیت الخلا سے بھی کراہت انگیز بدبو اٹھ رہی تھی۔ ڈیوڑھی کے بعد رشی تین سیڑھیاں نیچے اتر گیا۔ سیڑھیوں کے بالکل اوپری کونے پر ایک طوطے کا پنجرہ تھا۔ اس پنجرے کا رنگ کبھی ہلکا گلابی رہا ہو گا لیکن اب پرندے کی بیٹ، امرودوں کے بیج، سبز مرچوں اور بکھرے

پانی نے گھر میں موجود پہلے سے تعفن کو دو چند کر دیا تھا۔

سیڑھیاں اترتے ہی بائیں طرف باورچی خانے کا بھی یہی حال تھا۔ دائیں جانب البتہ ایک سپاٹ دیوار تھی جس کا روغن حبس اور سیلن کی وجہ سے جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔

''بیٹا رشی! یہاں تجھے بڑے صبر سے وقت گزارنا ہوگا۔ اگنور کر..... اگنور..... ورنہ یہ بدبو تیرا دماغ خراب کر دے گی۔ تیرے فیس پر ذرا بھی ناگواری آئی تو وہ چنڈال بے قابو ہو جائے گی۔'' اس نے خود کو بھرپور انداز میں سمجھایا اور شرربار نظروں سے نیلے رنگ کے چوبی دروازے کو دیکھنے لگا جس کے عقب میں اس کی ایک مجرم موجود تھی۔

اسی لمحے دروازہ کھلا اور اقصیٰ کسی قبالہ کے روپ میں دونوں ہاتھ دروازے پر رکھ کر بدن کو خم دیے کھڑی ہوگئی۔ رشی کی نظریں اس کے سراپا پر پھسلنے لگیں۔ اس نے سیاہ چمک دار مخمل کی نہایت تنگ ٹائٹس پہن رکھی تھی۔ قمیص کی جگہ ہلکا سرخ سا سویٹر جسم سے بالکل چسپاں تھا۔ رشی کو اپنا لہو کنپٹیوں میں سنسناتا محسوس ہونے لگا۔

''آ گئے تم؟''

''ہاں! تمہیں کیا علم کہ اس وقت کا مجھے کتنا انتظار تھا۔'' وہ اسے بار بار سر تا پا دیکھنے پر خود کو مجبور پا رہا تھا۔

''پورے پندرہ منٹ لیٹ ہو تم۔'' اقصیٰ ناراضگی سے بولی۔ ''اس کی سزا ملے گی..... برابر ملے گی۔''

''میں تو پہلے ہی تمہارے اس روپ سے گھائل ہو گیا ہوں۔ یوں گبر سنگھی بنو گی تو میرا نازک دل کہیں دھڑکنا ہی نہ بھول جائے۔'' رشی نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر جواب دیا۔

''باتیں بنانی تو تم پر ختم ہیں۔'' اقصیٰ اٹھلائی۔ اسے گبر سنگھی کی اختراع بہت پسند آئی تھی۔

''تمہارے ہاں مہمان کو دروازے سے ہی ٹرخا دینے کا رواج ہے کیا؟'' رشی نے اپنے بازو سینے پر باندھے۔

''ہماری مہمان نوازی تو ایسی ہوتی ہے کہ ساری زندگی نہیں بھولے گی تمہیں۔'' وہ آگے بڑھی اور اس کا ہاتھ تھام کر کمرے میں لے آئی۔

بیرونی گندگی کی نسبت اندر قدرے صفائی اور فضا میں روم فریشنر کی مہک تھی۔ اقصیٰ نے اسے کندھوں سے تھام کر صوفے پر بٹھایا اور خود بستر پر ٹانگ پر ٹانگ دھرے براجمان ہوگئی۔ رشی گہری نگاہوں سے یک ٹک اسے دیکھتا رہا۔

''مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ میں نے تمہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہوا ہے۔ مل چکی ہوں میں تم سے پہلے بھی۔'' وہ اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

رشی کے اعصاب تن گئے۔ اس کے لیے اپنے چہرے کے تاثرات متوازن رکھنا بہت دشوار ہو رہا تھا۔

''ضرور دیکھا ہوگا۔ اپنے کسی خواب میں حسین جذبوں کی پگڈنڈی پر چہل قدمی کرتے ہوئے، کسی سہانی چاندنی رات میں سمندر کے کنارے لہروں سے کھیلتے ہوئے یا کسی برفباری میں ایک دوسرے پر گولے بنا کر پھینکتے ہوئے..... خود کو اور مجھے دیکھا ہوگا۔'' رشی کا لہجہ خوابناک ہوگیا۔ اقصیٰ دم بخود اس کی جانب دیکھتی رہی۔

''تم..... کیا چیز ہو آخر؟ آج تم مجھے اپنی باتوں سے نہیں بہلا سکو گے۔ تمہیں بتانا ہوگا کہ کون ہو تم؟ میں تمہیں کیسے جانتی ہوں؟'' وہ بضد تھی۔

''جانِ من! اتنے خوبصورت لمحات کو ان واہموں سے کیوں ضائع کر رہی ہو؟'' رشی نے ملائمت سے اسے مخاطب کیا۔ اس کی انگلیوں میں اینٹھن بڑھنے لگی تھی۔ وہ ذہنی طور پر اقصیٰ کو موت کی وادی میں دھکیلنے کے لیے مکمل تیار تھا۔

''نہیں! یہ واہمہ ہی تو نہیں ہے۔ یہ احساس بہت طاقتور ہے۔ میں تم سے مل چکی ہوں کہیں۔ ایک بار بھی نہیں شاید کئی بار۔'' اقصیٰ اپنی بات پر مُصر تھی۔

رشی نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے کچلتے ہوئے چند گہری سانسیں لیں اور اپنی اینٹھتی انگلیوں کو پُرسکون کرنے کے لیے ہاتھ اقصیٰ کی جانب بڑھا دیا۔ اس کے خون کی حدت سے دماغ بری طرح کھول رہا تھا۔ اقصیٰ نے شرماتے ہوئے نہ صرف اس کا ہاتھ تھام کر اپنے رخسار پر رکھ لیا بلکہ شاخِ گل کی طرح لچکتی ہوئی اس کے پہلو میں بھی آ بیٹھی۔ اس کے وجود سے بھی شازیہ ہی کی طرح کسی ہیجان انگیز پرفیوم کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔

''تم مجھ سے واقعی محبت کرتے ہو نا رشی؟'' وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر بولی۔

''تمہیں کوئی شک ہے مجھ پر؟'' رشی کے لیے سانس لینا بھی دشوار ہونے لگا۔ شازیہ کے ساتھ گزارے گئے لمحات پوری شدت سے حملہ آور ہوئے تھے۔

''نہیں! شک تو کوئی بھی نہیں ہے۔ بس ایک عجیب سا ڈر لگ رہا ہے۔'' وہ اس کے اور قریب ہوئی۔

''آہاں! کیسا ڈر؟'' رشی چونک گیا۔ اس لمحے اقصیٰ کو کسی بھی خطرے کا احساس ہونا اس کی ساری محنت پر پانی پھیر سکتا تھا۔ رشی نے فوری ردِعمل کے طور پر اس کے گرد اپنی گرفت مضبوط کر دی۔ اقصیٰ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور

www.pakistanipoint.com Waqar Azeem

وحشت واضطراب دیکھ کر اپنی محدود سمجھ کے مطابق پل بھر میں ہی بے باک ہوگئی۔ رشی کو بھی شازیہ کی عطا کردہ اس وحشت کا اخراج درکار تھا۔ وہ دونوں ہی طوفان کی زد میں تھے۔

رشی نے اپنی نفرت اور اضطراب کو بربریت کا روپ دے کر اقصیٰ کو بُری طرح روند ڈالا۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ شازیہ کی طرح اقصیٰ کے حُسن کی گلی کوچوں کی سیاحت کرنے والا وہ پہلا شخص نہیں ہے۔ اقصیٰ اس کی بربریت سے سرشار تھی۔ طوفان تھمتے ہی وہ اذیت کی شدت سے اپنے بال نوچنے پر مجبور ہوگیا۔

''کیا ہوگیا ہے رشی ڈارلنگ؟ اتنے اَپ سیٹ کیوں ہو گئے ہو؟'' وہ بھرپور اپنائیت سے بولی۔ رشی خاموشی اور سردمہری سے اس کی جانب دیکھتا رہا۔

''تمہاری ان آنکھوں کے پیچھے کون سی دنیا ہے؟ مجھے اب بھی ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ تمہیں حاصل کر کے بھی حاصل نہیں کرسکی۔'' اقصیٰ اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہنے لگی۔

''تم نے آتے ہی مجھے اپنی شناخت کے سوالوں میں اُلجھا دیا ورنہ آج میں تمہیں ان آنکھوں کے پیچھے اصل دنیا سے ہی واقف کروانے آیا تھا جانِ من۔'' رشی معنی خیزی سے مسکرایا۔ اقصیٰ یکدم سیدھی ہوگئی۔

''سچ! کیا واقعی؟'' وہ بے یقین تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ رشی اتنی آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالے گا۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کے قریب ہوگیا۔ اقصیٰ ہیجان زدہ ہونے لگی۔ رشی نے اپنا چہرہ اس کے نزدیک کیا اور اقصیٰ کے منہ پر تھوک دیا۔

''یہ کیا حرکت ہے یُو......'' وہ گالی دیتے ہوئے بولی۔ جواباً رشی نے ایک زوردار طمانچہ اس کے منہ پر رسید کردیا۔

''......کے بچے! میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں۔ تم انسان نہیں حیوان ہو۔'' وہ چیخ اٹھی۔

''چل! آج تجھے دکھاتا ہوں کہ حیوانیت ہوتی کیا ہے؟'' رشی نے ایک بار پھر اسے طمانچوں کی زد میں رکھ لیا۔ اقصیٰ کے ناک اور ہونٹوں سے خون رسنے لگا۔

رشی اپنا ضبط کھو چکا تھا۔ اس نے اقصیٰ کو بالوں سے گھسیٹ کر اوندھا کیا اور اس کی ٹائٹس سے دونوں بازو پشت پر سختی سے باندھ دیے۔

''ہیلپ...... پلیز ہیلپ...... مجھے اس اُچکّے سے بچاؤ کوئی!'' وہ حلق کے بل چیخنے لگی۔ اسے توقع تھی کہ باہر کوئی نہ کوئی اس کی آواز سن کر مدد کے لیے ضرور آئے گا۔ رشی نے اس کے حلق پر زوردار گھونسا مارا اور مچلتی ٹانگوں کو بھی عقب سے اسی کے سویٹر سے باندھ دیا۔

اکتوبر 2020ء کے شمارے کی ایک جھلک

دل سمندر

آخری صفحات پر طاہر جاوید مغل کے قلم سے محبت کے بیکراں سمندر میں تلاطم خیز جذبات اور مجروح احساسات کی داستان

بے منزل مسافر

گمشدہ تاریخی گوشوں پر ایک گہری نظر...... ابتدائی صفحات پر زوبیا اعجاز کے قلم کا جادو

شہ زوز

عشق ومحبت کے سحرانگیز جذبوں کی جنوں خیزی، لطیف رشتوں اور کثیف سازشوں کے جال اسما قادری کے قلم کا کمال

ساشا

کبھی پرخطر جزیروں، کبھی بغاوتوں کے جنگل میں بھٹکتے مسافر کی داستان...... عمر عبداللہ کے قلم کا شاہکار

ان کے علاوہ تنویر ریاض، غلام قادر، مظہر سلیم ہاشمی، ڈاکٹر شیر شاہ سید، منظر امام، صبا مغل، آصفہ ضیا احمد اور فہمی فردوس کی خوب صورت تحریریں

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

"اُچکا؟ اب میں اُچکا ہو گیا...... بلّے بھئی بلّے! جس وقت آدھی راتوں کو میرے ساتھ بات کرنے کے لیے مر رہی ہوتی تھی اس وقت میں سویٹ ہارٹ، ہنی اور ڈارلنگ تھا۔ آج تیری اوقات یاد دلانے لگا ہوں تو اُچکا ہو گیا۔ بلّے بھئی بلّے!" اس کا زہرناک لہجہ اقصیٰ کو سراسیمہ کرنے لگا۔

"کک...... کون ہو تم؟ میں نے تمہیں زبردستی تو نہیں بلایا تھا یہاں...... تمہاری بھی تو مرضی تھی رومانس کرنے کی۔" گھونسوں کی ضربات سے اس کی آواز بیٹھ چکی تھی۔ بات کرنے کے دوران منہ سے خون کے بلبلے پھوٹنے لگتے تھے۔

"میں رومانس کے لیے نہیں...... تجھے قتل کرنے کے لیے آنا چاہتا تھا...... تجھے تیرے ہی گھر میں مار کر تیرے اُن بے غیرت باپ اور بھائی کو وارننگ دینا چاہتا تھا کہ اگلا نمبر اُن کا ہوگا۔" رشی نے اسے سیدھا کیا۔ عقب میں بندھے ہاتھ پاؤں کی وجہ سے اقصیٰ کی تکلیف میں مزید اضافہ ہو گیا۔

رشی اطمینان سے پیچھے ہٹا اور صوفے پر پڑی اپنی جیکٹ سے تیزاب کی بوتل، تیز دھار چھری اور ایک شاپنگ بیگ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیے۔

"کسی شاعر نے کہا ہے کہ سچائی بہت خوبصورت ہوتی ہے اور موت چونکہ اس کائنات کا سب سے بڑا سچ ہے اس لیے موت بھی ایک لاثانی خوبصورتی ہے۔ لیکن تمہیں کسی شاعر یا ایسی لطیف باتوں کی کیا خبر ہوگی؟"

"مجھے چھوڑ دو...... خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔" وہ اپنی مضحکہ خیز آواز میں گڑگڑانے لگی۔

"چچ...... چچ...... بُری بات...... جب کوئی بات کر رہا ہو تو اسے درمیان میں ٹوکتے نہیں...... تمہیں کسی نے گھر یا اسکول میں اتنا بھی نہیں سمجھایا؟ لیکن سمجھاتا بھی کون؟ اسکول کے ماسٹر سے تو خود تم نے یارانہ گار رکھا تھا۔ اسی بنیاد پر تو وہ تمہیں دو سال پاسنگ مارکس دے کر آٹھویں تک لایا تھا نا؟" اُس کے زہریلے انداز پر اقصیٰ ساکت رہ گئی۔ وہ آگہی کا لمحہ تھا۔

"تم؟ نہیں...... یہ تم نہیں ہو سکتے۔" وہ اپنی بصارت پر یقین ہی نہیں کر پا رہی تھی۔

"تمہیں مجھے پہچاننا نہیں چاہیے تھا جانِ من! اب تمہاری موت اور بھیانک بنا دوں گا میں۔"

"نن...... نہیں...... خدا کے لیے نہیں۔" وہ بندشوں سے آزادی کے لیے اپنے بازو رگڑنے لگی۔

"خدا کو بیچ میں کیوں لا رہی ہو حرافہ؟ کیا تجھے وہ ویڈیو بناتے ہوئے خدا کا خوف آیا تھا؟" وہ پھنکارا۔

"نن...... نہیں...... وہ میں نے نہیں......" اقصیٰ نے بدقت کہا۔

"بکواس کرتی ہے...... جھوٹ بولتی ہے...... وہ تیرے اور تیرے یار کے ہی کام تھے...... میں کوئی چوچا بچہ نہیں ہوں جو دو جمع دو چار نہ کر سکوں۔" رشی نے اسے ٹھوکروں کی زد میں رکھ لیا۔ اقصیٰ اس تشدد سے ادھ موئی ہو چکی تھی۔

"چل بتا! کیسے مرنا پسند کرے گی؟ شاپنگ بیگ سے تیرا دم گھونٹوں؟ چھری سے تیرے اس جسم پر نقش و نگار بناؤں یا تیزاب سے تجھے بھی اس اذیت کا مزہ چکھاؤں جو تیری اور تیرے گھر والوں کی وجہ سے میں نے سہی ہے۔" اس کے ان الفاظ پر اقصیٰ کی آنکھیں پھٹنے کے قریب تھیں۔ اس کی نوکِ زبان پر بہت سے الفاظ مچل رہے تھے لیکن حلق کی تکلیف اور جسم پر لگنے والی ضربات نے اسے کچھ بھی کہنے یا کرنے کے قابل ہی نہ چھوڑا تھا۔

"میں یقیناً کوئی خواب دیکھ رہی ہوں...... یہ تم کیسے ہو سکتے ہو؟" اس نے شکستہ لفظوں میں کہا۔ رشی پر یک لخت ایک جنون طاری ہو گیا۔ اس نے پلاسٹک کے دستانے چڑھائے اور چھری اقصیٰ کے سینے میں گھونپ دی۔ لہو کا ایک فوارہ اچھلا۔

"یہ وار میری زندگی میں اُس وقت آنے کے لیے تھا۔" وہ اس کی خرخراہٹ اور مچلتے جسم کو چمکتی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"خدا کے لیے......" اقصیٰ کی آنکھوں میں موت کی وحشت اور چہرے پر شدید خوف تھا۔ رشی نے چھری سے اس کے دونوں رخسار چیر دیے اور تڑپ سے بھرپور حظ اٹھانے لگا۔ اقصیٰ کا چہرہ پل بھر میں ہی رنگین ہو گیا۔

"بس اب اس اوور کی دو بالز باقی رہ گئی ہیں جانِ من! پھر تمہارا کام خلاص۔" اس نے ملائمت سے کہتے ہوئے بائیں ہاتھ سے اس کا چہرہ دبوچا اور دائیں ہاتھ سے چھری کو قلم کی طرح تھام کر پیشانی پر نہایت اہتمام سے ایک لفظ کندہ کرنے لگا۔ اقصیٰ کا جسم اذیت اور کرب سے بُری طرح تڑپ رہا تھا۔

"شش...... بس تھوڑی دیر اور...... بس ہو گیا نا...... شش......" وہ اسے بچوں کی طرح پچکارنے لگا۔ اقصیٰ کا سانس اُکھڑنے لگا۔

"زبردست آرٹ ورک ہو گیا یہ تو۔" اس نے پیشانی کا اچھی طرح جائزہ لیا اور چھری کی دھار پر انگلی پھیرتے ہوئے بولا۔

"اب اس اوور کی آخری گیند پھینکوں گا میں۔ تمہاری زندگی کی اننگز کا دی اینڈ۔" اس نے بائیں ہاتھ سے اقصیٰ کے

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

بال سہلائے اور دائیں ہاتھ سے حلق پر سرخ لکیر کھینچ دی۔ لہو کا ایک فوارہ اُبلا اور اقصیٰ کی گردن ایک جانب ڈھلک گئی۔

رشی لہو کے ان چھینٹوں سے بچتا ہوا بستر سے نیچے اتر آیا۔ اس کے دل و دماغ پر سُرور طاری تھا۔ کچھ لمحے صوفے پر بیٹھنے کے بعد اس نے کمرے کا اچھی طرح جائزہ لیا اور اگلا راؤنڈ کھیلنے کی تیاری شروع کردی۔

اس نے اقصیٰ کے ہاتھ پاؤں کھول کر کپڑے اور لہو آلود چادر اپنے ساتھ لائے شاپنگ بیگ میں ڈال لی۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہی اس نے اقصیٰ کا موبائل فون تلاش کیا۔ اس نے بھی شازیہ کی طرح فنگر لاک ہی لگا رکھا تھا۔

موبائل کے اندرونی نظام تک رسائی حاصل کرنے کے بعد رشی نے اپنا نمبر اور چیٹنگ صفحہ ہستی سے مٹا کر فون سے سم نکالی اور جیب میں ڈال لی۔ وہ مہنگا اسمارٹ فون بھی شاپنگ بیگ کی زینت بن چکا تھا۔ اقصیٰ کی لاش کو گھسیٹتے ہوئے غسل خانہ تک لاکر اس نے بے دریغ پانی بہایا اور اسے کھینچتا ہوا ڈیوڑھی کے وسط میں اس طرح لٹا دیا کہ دروازے کی اطراف سے دیکھا جانا کسی صورت ممکن ہی نہ تھا۔

''بڑا شوق تھا تجھے اپنی نمائش کا..... اب تیری اس برہنہ لاش کا نظارہ پورا محلہ کرے گا۔'' رشی نے نفرت سے اسے ٹھوکر ماری اور جسم کے مختلف حصوں پر تیزاب کا چھڑکاؤ کرنے لگا۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہی اس نے کمرے سے اپنی انگلیوں کے نشان ہر ممکنہ جگہ سے صاف کردیے۔

''گڈ بائے جانِ من! نائس میٹنگ یو!'' رشی نے ماسک لگاتے ہوئے اقصیٰ کو ایک اور ٹھوکر ماری۔ اس نے موبائل نکال کر وقت کا اندازہ کیا۔ ابھی صرف پونے گیارہ ہی ہوئے تھے۔ وہ اطمینان سے دروازے کی درزوں سے باہر جھانکنے لگا۔ اس کی توقعات کے عین مطابق اِکا دُکا خواتین اور خاکروب کے علاوہ کوئی بھی نہ تھا۔ رشی بڑے صبر و سکون سے وہیں کھڑا رہا۔ خاکروب کے مشرقی بغلی گلی میں مڑتے ہی وہ دروازے کا خودکار قفل بند کر کے باہر نکلا تو جیکٹ کی ایک آرائشی ڈوری دروازے میں ہی پھنس گئی۔ رشی کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے اپنی جیب میں رکھے چاقو سے اسے کسی طرح نکالا اور حارث کا گھر عبور کر کے بائیں موڑ مڑ گیا۔ اس کی دھڑکن بے اعتدال تھی تاہم اپنے مجرم کو بھرپور سزا دینے میں کامیابی کی سرشاری اس بے اعتدالی پر حاوی ہونے لگی۔

اس کا دل شدت سے چاہ رہا تھا کہ کچھ دیر بعد اپنے نئے دوستوں کے ساتھ ایک بار پھر یہاں وقت گزاری کرے لیکن گزشتہ روز بولے گئے جھوٹ کا بھرم قائم رکھنا زیادہ ضروری تھا۔ وہ منیب اور جمال کو ٹھکانے لگانے سے پہلے کوئی بھی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

پندرہ منٹ کی مسافت کے بعد اسے ایک بار پھر گندا نالا نظر آیا۔ رشی نے شاپنگ بیگ غلیظ اور بدبودار پانی کی نذر کیا اور پیدل ہی گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ گھر پہنچتے ہی اسے مناہل سے بات چیت کا جرمانہ بھی ادا کرنا تھا۔

☆☆☆

گلی، کوچوں، محلوں اور بازاروں میں رونق دھیرے دھیرے معمول پر آرہی تھی۔

دو بجے تک خوابیدہ عوام کی اکثریت بھی بیدار ہوچکی تھی۔ جمال اپنے گھر سے کافی دور نکل آیا تھا۔ اس نے راستے میں مختلف مقامات پر رک کر لنگر کی مختلف چیزوں سے پیٹ پوجا کی۔ اس کے پاس ایک بڑا سا شاپنگ بیگ بھی تھا۔ تقسیم ہونے والے لنگر سے ایک شاپر اس کا حصہ بنتا رہا۔ منیب تو اپنی ڈیوٹی کے دوران سفر..... میں کہیں نہ کہیں سے بھوک پیاس مٹانے کا اہتمام کر ہی لیتا تاہم اقصیٰ کے لیے کچھ نہ کچھ لے کر جانا بہت ضروری تھا۔ وہ باہر کے چٹ پٹ کھانوں کی ویسے بھی بہت شوقین تھی۔

شام پانچ بجے تک وہ گھوم پھر کر مختلف سامان اکٹھا کرتا رہا۔ جنرل اسٹورز کے علاوہ ڈیپارٹمنٹل اسٹورز میں بھی خصوصی رعایت پر چیزیں مل رہی تھیں۔ اس نے سستے گھی، آئل، کیچپ اور چاٹ مصالحے مزید سستے داموں میں خرید لیے۔ جمال نے سمجھداری یہ کی تھی کہ اس خریداری کے وقت ایک رکشا لے لیا تھا لہٰذا سامان اٹھانے کے لیے بھی کوئی دقت نہ ہوئی۔ من پسند خریداری، پُررونق علاقوں کی دید اور مختلف اسپیکرز کے ذریعہ سماعت میں پڑتے صوفیانہ کلام نے اسے سرشاری میں مبتلا کر رکھا تھا۔

''زندگی کا اصل مزہ تو یہاں بڑی آبادیوں میں ہے۔ ہر شے کتنی خوبصورت دکھائی دیتی ہے۔'' جمال نے گلی کوچوں کی سجاوٹ دیکھتے ہوئے سوچا۔ پچھلی زندگی، غربت زدہ بستی اور اس سے وابستہ باتیں بھولی تو نہیں تھیں لیکن اب اس تواتر سے یاد بھی نہیں آتی تھیں۔

انہی سوچوں میں بھٹکتے وہ اپنے گھر آپہنچا۔ رکشا ڈرائیور کو کرایہ سے فارغ کر کے گھنٹی بجانے لگا۔ اگلے پانچ منٹ میں کئی بار یہ عمل دہرانے کے بعد بھی جب دروازہ نہ کھلا تو وہ جھنجلاہٹ کا شکار ہونے لگا۔

''کدھر مرگئی ہے یہ؟ دروازہ ہی نہیں کھول رہی۔'' وہ بڑبڑایا۔

WaqarAzeem@pakistanipoint.com

''کیوں اتنی لیبر لے رہے ہو انکل؟'' حارث کی نظر اس پر پڑی۔ ''ایکسٹرا چابی سے کھول لیں ناں دروازہ۔''

''مجھے زیادہ سمجھ نہ پڑھا کا کے! اتنی سمجھ مجھ میں بھی ہے۔'' جمال نے اپنا غصہ خوشگواریت کے پردے میں چھپایا۔ وہ اس محلے کے بچوں سے تعلقات کبھی نہیں بگاڑتا تھا۔ اسے علم تھا کہ گاہکوں کو اپنے بس میں رکھنے کے لیے خوش خلقی ہی سب سے بڑا ہتھیار ہوتی ہے۔

''تو سمجھداری دکھا کیوں نہیں رہے پھر؟'' حارث کی ہنسی نے اسے سلگا دیا۔

''شاید رات کو گھر پر ہی کہیں رکھ کر بھول گیا ہوں۔'' اس نے سر کھجایا۔

''ہو سکتا ہے گھر والے کہیں باہر گھومنے پھرنے نکلے ہوں۔ اس لیے دروازہ نہیں کھول رہا کوئی۔ فون کر کے دیکھ لیں۔'' عبداللہ بھی وہیں چلا آیا۔

''فون بھی بند جا رہا ہے۔ کدھر چلی گئی ہے یہ؟ فون تو کبھی بند ہوتا ہی نہیں اس کا۔'' وہ منہ ہی منہ میں بدبدایا۔

''اب آپ کیا کرو گے انکل؟'' سبحان نے اس کا سامان دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں اب تم تینوں کے ساتھ یہ سامان اس دکان میں رکھوں گا اور خود بھی ذرا گھومنے پھرنے نکل جاؤں گا۔'' جمال کی آنکھوں میں یکدم چمک ابھری۔

''سوری انکل! ہم تو ابھی نہا دھو کر تیار ہوئے ہیں۔ آپ کا یہ سامان ہمارے کپڑوں پر جو آرٹ ورک کرے گا اس کے بعد ہماری ماما کبھی بھی ہنستے ہوئے یہ کہہ کر ویلکم نہیں کریں گی کہ بیٹا داغ تو اچھے ہوتے ہیں۔ وہ ماؤں کے بہترین ہتھیار چپل سے پہلے ہمیں دھوئیں گی اور پھر کپڑوں کی دھلائی کی طرف آئیں گی۔ اس لیے ویری سوری۔'' حارث نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ادھر ہمارے گھر میں رکھوا دیں یہ شاپرز۔ واپسی پر اٹھا لینا۔'' سبحان کا مشورہ جمال کے دل کو لگا۔ اس نے خود ہی سامان ارباز کی ڈیوڑھی میں رکھا اور کپڑے جھاڑتا ہوا اپنی 'منزل' کی طرف روانہ ہو گیا۔

''رشی پائین پتا نہیں کہاں ہوں گے؟ ہمارے ساتھ اتنی محنت کرواتے رہے اور اینڈ پر محنت کا پھل پا ہی نہ سکے۔'' حارث یکدم سنجیدہ ہوا۔

''ہاں! اللہ پاک ان کے ماموں کو جنت میں جگہ دے۔ پتا نہیں اب دوبارہ کب ملاقات ہو پائے گی ان سے؟'' عبداللہ نے موبائل فون پر صوفیانہ کلام اور نعتیں تلاش کرتے ہوئے کہا۔ یہ فون اسے والد سے وقتی طور پر ادھار ملا تھا۔ دودھ اور شربت کی سبیل لگانے کے لیے نعتیں اور قوالیاں چلانا بھی بہت ضروری تھا۔

''تم لوگوں کی عقلوں کا بھی جواب نہیں ویسے۔ دو دن اُن کے ساتھ رہے ہو۔ اتنا نہیں ہوا کہ ان کا فون نمبر ہی مانگ لو۔'' سبحان کے اس طنز پر وہ دونوں ساکت رہ گئے۔

''واقعی! یہ خیال ہمیں پہلے کیوں نہیں آیا؟'' حارث نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔

''خیال دماغ میں آتا ہے اپنے چڑی پہلوان! اور تمہارا دماغ بھی تو چڑی جتنا ہی ہوگا۔'' سبحان نے موقع دیکھ کر ایک اور وار کیا۔

''مجھے لگتا ہے ہمیں انڈر گراؤنڈ ہو جانا چاہیے۔'' عبداللہ کے اس پُراسرار انداز پر حارث اور سبحان الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔

''کہیں ایسا نہ ہو کہ فوڈ پوائنٹ والے ہمیں اپنے فوڈ آئٹمز میں شامل کرنے کے لیے اٹھا کر لے جائیں۔ اپنے نانی نے ثابت تو کر ہی دیا ہے کہ ہم گدھے ہیں بہت بڑے۔'' عبداللہ وضاحت کے بعد خود بھی ان کے قہقہوں میں شامل ہو گیا۔

''باقی باتوں کی باتیں یار دولھے! پائین کے لیے صبر اور کامیابی کی دعائیں ہیں۔ پروردگار ان کی ہر منزل آسان کرے۔'' حارث نے خلوص سے کہا اور پھر چونک سا گیا۔ اس کی نظر جمال کے دروازے کے بائیں سمت پر تھی جہاں ایک بال پوائنٹ اور کاغذ کا ٹکڑا پڑا تھا۔ حارث نے فوراً پین اُچک لیا۔

''دولھے! یہ تو اپنے پائین کا نہیں ہے؟'' اس نے تصدیق چاہی۔

''ہاں! کل ان کی پاکٹ میں لگا ہوا دیکھا تھا۔ فریم پر لڑیاں لگاتے ہوئے کہیں گر گیا ہوگا۔'' عبداللہ نے جواب دیا۔

''رکھ لیتا ہوں پاس! اگر ملاقات ہوئی تو دے دوں گا۔'' حارث نے بے نیازی سے وہ پین اور کاغذ اپنی قمیص کی جیب میں ڈالا۔ عبداللہ سے موبائل لے کر اسپیکرز سے جوڑنے کے بعد بھرپور آواز میں اپنا 'انتخاب' چلا دیا۔

☆☆☆

رونق، چہل پہل، کلام، لنگر کی تقسیم اور میل ملاقاتوں کا سلسلہ رات گئے تک جاری رہا۔

گیارہ بجے کے بعد سبھی لڑکے تھکاوٹ سے چُور ہو چکے

تھے۔ اگلے روز تعلیمی اداروں اور دفتر جانے کی فکر بھی لاحق تھی۔ سوا گیارہ بجے کے بعد حارث، سبحان اور عبداللہ نے بھی ساؤنڈ سسٹم سمیٹنا شروع کر دیا۔ قرب و جوار میں بھی خاصی خاموشی ہو چکی تھی۔ اسی دوران انہیں جمال آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کی چال میں سرشاری اور خمار زدہ آنکھیں تیز روشنی کے باعث اتنے فاصلے سے بھی واضح دکھائی دے رہی تھیں۔

"یہ ساری فیملی مجھے کھسکی ہوئی لگتی ہے۔" عبداللہ نے اسے دیکھتے ہوئے حارث کے کان میں سرگوشی کی۔

"مجھے ایسا ہی کچھ لگتا ہے۔ عجیب ہی لوگ ہیں۔ اپنے آپ میں مست، چڑھی ہوئی آنکھیں اور عجیب نشیلی سی کیفیت۔ پتا نہیں کس چیز کا نشہ کرتے ہیں یہ تینوں؟" حارث کا تجزیہ درست تھا تاہم وہ اپنی کم عمری اور ناتجربہ کاری کے باعث انہیں زیادہ گہرائی میں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

"اپنے چڑی پہلوان! تم نے ایک اور بات نوٹ نہیں کی۔ منیب کی بہن بھی تو کل صبح سے نظر نہیں آ رہی۔" سبحان نے ایک اور نکتے کی نشاندہی کی۔

عبداللہ اور حارث اس کی بات پر بے ساختہ اچھل پڑے تھے۔ وہ اپنے اس کم عمر ترین ساتھی کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے جس نے آج دوسری بار انہیں چاروں شانے چت کیا تھا۔

"واقعی! ہم لوگ اپنے کام میں اس قدر مصروف رہے کہ اس طرف دھیان ہی نہیں گیا۔" حارث نے ایک بار پھر پیشانی پر ہاتھ مارا۔

"لیکن میں تو کچھ اور ہی سوچ رہا ہوں چڑی! یہ نانی اتنا فوکس رکھتا تھا اس پر کہ اسے یہ بھی پتا ہے وہ کل سے نظر نہیں آئی۔" عبداللہ نے بات کو من پسند رنگ دیا۔ سبحان کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔

"اوئے! کھول دو دروازہ۔ کدھر مر گئے ہیں سب کے سب؟" حارث اور عبداللہ کے قہقہوں کو جمال کی کوفت بھری آواز نے لگام دی۔ وہ اپنا موضوع گفتگو بھول کر اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔ جمال گھنٹی پر ہاتھ رکھے غصے سے بڑبڑا رہا تھا۔

سبحان شربت کے خالی برتن اندر پہنچانے لگا۔ جمال گھنٹی بجاتے رہنے کے بعد اب دروازہ دھڑ دھڑانے لگا تھا۔ اس شور و غل میں تقریباً نصف درجن محلہ دار گھروں سے باہر نکل آئے۔ لگ بھگ اتنے ہی افراد اپنے اپنے ٹیرس سے نیچے جھانکنے لگے تھے۔

"فون کر لو یار! کہیں باہر نکلی ہو گی وہ سجاوٹ وغیرہ دیکھنے۔" ارباز نے مشورہ دیا۔

"کر چکا ہوں وہ بھی۔ نمبر دوپہر سے ہی بند ہے اس کا۔" جمال کی پیشانی اب پسینے سے تر ہونے لگی تھی۔

"نکل گئی ہو گی اپنے کسی نئے آشنا کے ساتھ۔" ہجوم سے ابھرنے والی اس سرگوشی سے جمال کو زوردار جھٹکا لگا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے سرگوشی کا ماخذ تلاش کرنے لگا لیکن اسے متوجہ پا کر سبھی خاموش ہو گئے تھے۔

"بیٹے کو فون کر لو چاچا!" اس کے پاس تو ہو گی کوئی ایکسٹرا چابی۔" کسی کم عمر ہمسائے کی جانب سے مشورہ آیا۔

جمال نے تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دی اور اپنا سستا سا بٹنوں والا موبائل فون نکال کر منیب کا نمبر ملا دیا۔

"کدھر رہ گیا ہے تو؟ آدھی رات ہونے والی ہے۔ گھر کیوں نہیں پہنچا ابھی تک؟" وہ ارد گرد ہجوم کا خیال کیے بغیر اس پر چلایا۔

"کیا ہو گیا ہے؟ کس بات کا غصہ نکال رہے ہیں؟ رائیڈ لے کر آیا ہوا تھا۔ آتا ہوں دس منٹ میں گھر۔" منیب نے ناگواری سے جواب دیا۔

"چابی ہے تیرے پاس گھر کی یا نہیں؟" جمال نے اپنا وزن ایک پاؤں سے دوسری جانب منتقل کیا۔ اسے بدن میں شدید کھنچاؤ محسوس ہونے لگا تھا۔

"چابی تو میرے والٹ سے کل رات سے ہی غائب ہے۔" منیب کے انکشاف نے اسے مزید ہولا دیا۔

"ستیاناس ہو! یہ کس جنجال میں پھنس گیا ہوں میں؟" جمال اپنا سر پیٹنے لگا۔

"دروازہ توڑ لو بھئی۔ یا کسی لاک بریکر کو بلوا لو۔" عبداللہ کے والد اختر نے مشورہ دیا۔

"اس ٹائم کون بیٹھا ہو گا مارکیٹ میں؟ ہائے ربا! سب خیراں رکھنا۔ میری بچی جانے کس حال میں اور کہاں ہو گی؟" جمال کی رنگت متغیر ہونے لگی۔

"اگر کوئی ٹیرس ہوتا تو اندر کود کر دروازہ کھول دیتے۔ اب تو کوئی اور آپشن ہی نہیں۔" اقصیٰ کے ایک منظورِ نظر مانی نے دبے لفظوں میں کہا۔

"میرا ایک واقف ہے جو تالے کھول لیتا ہے۔ بڑے بازار میں بیٹھتا ہے۔ اس وقت تو خیر گھر پر ہی ہو گا۔ اگر کہتے ہو تو اسے بلوا لیتا ہوں میں۔" ایک اور ہمسائے نے تجویز دی۔

"پوچھنا کیسا؟ بلواؤ جلدی اُسے۔" ارباز نے جواب دیا۔

اس ہمسائے کے فون کرنے پر مطلوبہ شخص نے بیس منٹ بعد پہنچنے کا عندیہ دے دیا۔ جمال کے چہرے پر امید کی

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

کیفیت جھلکنے لگی۔

اگلے دس منٹ میں منیب بھی چلا آیا۔ وہ اپنے گھر کے سامنے اس قدر ہجوم دیکھ کر پریشان ہوگیا تھا۔

''کیا بات ہے؟ سب خیریت تو ہے نا؟ آپ یہاں ایسے کیوں بیٹھے ہیں؟'' وہ ایک تھڑے پر بیٹھے جمال کو دیکھ کر مزید تشویش زدہ ہوا۔

''خیریت ہی تو نہیں ہے۔ یہ منحوس تالا کھلے تو اندر جاؤں۔ اقصیٰ نہ جانے کہاں ہے۔ دروازہ ہی نہیں کھول رہی۔'' وہ منیب کو سامنے دیکھ کر بکھرنے لگا۔ اس سنگین صورتِ حال نے منیب کو بھی حواس باختہ کر دیا۔ اسے محلے داروں کی حقارت بھری استہزائیہ نظروں کی بھی کوئی پروا نہ رہی تھی۔ وہ اسی ہڑبڑاہٹ میں اپنی ٹانگیں زور زور سے دروازے پر مارنے لگا۔

''زیادہ ٹارزن بننے کی ضرورت نہیں ہے کاکے! ہم نے تیرے آنے سے پہلے ہی لاک کھلوانے کا بندوبست کرلیا ہے۔ وہ بندہ آتا ہی ہوگا۔'' ارباز نے اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں کہا۔

اسی اثناء میں مطلوبہ شخص اوزاروں کا بیگ لیے چلا آیا۔ تھوڑی سی کشمکش کے بعد دروازہ کھلنے تک ہجوم میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔

''اتنا اندھیرا کیوں ہے اندر؟ منیب پُتر! لائٹ جلا دے۔ میرا تو دل بیٹھا جارہا ہے۔'' جمال کی آواز لرزیدہ تھی۔

منیب نے ہاتھ بڑھا کر روشنی کی اور اپنے قدموں میں پڑے برہنہ و نیم سوختہ وجود کو دیکھ کر حیرت، صدمہ، بے یقینی اور اذیت سے سانس لینا بھی بھول گیا۔ یہی حالت جمال کی بھی تھی۔

''استغفراللہ! مجھے ایسی ہی کسی بات کا ڈر تھا۔'' عقب سے سنائی دینے والی سرگوشی اور چہ میگوئیوں نے جمال کا دماغ اُلٹا دیا۔

''نکل جاؤ یہاں سے تم سب! تماش بین بن کر آ گئے ہو۔ دفع ہو جاؤ سب کے سب۔'' وہ انہیں دھکے دے کر دہلیز سے باہر نکالنے لگا۔ اسے اندازہ ہی نہ ہوا کے قفل شکن بلوانے کی تجویز دینے والے بابر نے لاش کی تصویر اپنے موبائل میں پہلے ہی محفوظ کر لی تھی۔

دروازہ بند کر دینے کے بعد وہ منیب کی طرف پلٹا جس نے غسل خانہ میں رکھی ایک ٹوکری سے غیر دھلائی شدہ چادر نکال کر اقصیٰ کی لاش ڈھانپ دی تھی اور اب غم و غصے کے عالم میں اس کی پیشانی پر انگلیاں پھیر رہا تھا جہاں جمے ہوئے لہو میں بھی مہذب دنیا کی طوائف نمایاں کندہ تھا۔

''یہ کیا ہوگیا؟ یہ سب کیسے ہوگیا؟ آپ کہاں تھے آج سارا دن؟ سودا اور مصالحے اتنے ہی اہم ہوگئے تھے کہ دن بھر اسی کی شاپنگ نہیں ہوئی آپ سے؟'' منیب چلّایا۔ جمال کی آنکھوں میں خوف، پشیمانی اور پچھتاوے جھلکنے لگے۔ وہ منیب سے نظریں نہیں ملا پا رہا تھا۔

''کس درندے نے کیا ہوگا یہ سب؟ ہائے میری معصوم بچی!'' جمال اس کے پاس بیٹھا بین کرنے لگا۔

''آ گئے تم..... گڈ بائے جانِ من۔'' جمال اور منیب کے لیے یہ آواز کسی بم دھماکے سے کم نہ تھی۔

''آ گئے تم..... گڈ بائے جانِ من۔'' دائیں دیوار کے ساتھ رکھے اس طوطے کے منہ سے برآمد ہونے والے یہ فقرات ان کی بولتی بند کروا دینے کے لیے کافی تھے۔

☆☆☆

رات اپنا نصف سفر طے کر چکی تھی۔

دن بھر کے تھکے ہارے سبھی افراد نیند کی خواہش کے باوجود سونے کی کوشش میں ناکام تھے۔ محلے میں اقصیٰ کے اس قتل کی خبر نے دہشت اور اضطراب کی متفرق کیفیات برپا کر رکھی تھیں۔ دہشت کا عنصر خواتین میں نسبتاً زیادہ تھا۔ دن دہاڑے گھر میں گھس کر جوان لڑکی کی آبروریزی اور ایسے بھیانک قتل نے محلے کے امنِ عامہ پر ایک بہت بڑا سوال کھڑا کر دیا تھا۔

مرد حضرات البتہ دو طبقات میں تقسیم تھے۔ ایک گروہ اپنی لاعلمی اور کوتاہیوں پر کفِ افسوس مل رہا تھا تو دوسرا طبقہ ان افراد پر مشتمل تھا جو کسی نہ کسی طرح اقصیٰ سے روابط قائم رکھتے تھے۔ وہ اس کے موبائل میں اپنا نمبر یا گفتگو ظاہر ہونے کا تصور کر کے ہی اپنی ازدواجی زندگیوں کی بربادی، والدین سے ملنے والی متوقع ذلت اور خود کو سُولی پر لٹکے دیکھنے لگے تھے۔ ان میں سولہ، سترہ سالہ لڑکوں سے لے کر پینتالیس، پچاس سالہ مرد بھی شامل تھے۔

ان سب کی کیفیات سے بے خبر جمال اور منیب لاش کے سرہانے بیٹھے اپنی ذات اور مصروفیات کو کوس رہے تھے۔

''یہ سب کیا ہوگیا؟ کون بدذات کر گیا یہ سب؟'' جمال اپنے چہرے پر خود ہی تھپڑ مارنے لگا۔

''مجھے کیا پتا ہو؟ ایک ذرا سا بھی کُھرا مل جائے تو میں اس کا خون نہ پی جاؤں۔'' منیب کی آنکھوں میں سرخی تھی۔

''کسی کو منہ دکھانے جوگے نہیں رہے ہم..... اتنی بے عزتی..... اتنی خواری۔'' جمال کی رنگت کسی یرقان زدہ مریض

www.pakistanipoint.com

کی طرح دکھائی دینے لگی تھی۔

''آپ ہی کی غلطی ہے۔ مجمع لگا کر کھڑے تھے محلے میں۔'' منیب چلا آیا۔

''آ گئے تم...... گڈ بائے جانِ من۔'' طوطے نے ایک بار پھر تان لگائی۔

''چپ کروا لیں اس منحوس کو...... ورنہ میں اس کی گردن مروڑ دوں گا آج۔'' منیب نے بھڑک کر کہا۔

جمال گھٹنوں پر ہاتھ رکھے اٹھا اور بھاری قدموں سے خود کو گھسیٹتا ہوا ڈیوڑھی تک چلا آیا۔ طوطے کے پنجرے پر کپڑا ڈال کر وہ پلٹا ہی تھا کہ دروازے پر گھنٹی نے اسے سراسیمہ کر دیا۔

''چین کیوں نہیں پڑتا ان لوگوں کو؟ کیا جواب دوں گا میں انہیں؟'' وہ شدتِ خوف سے مزید زرد پڑنے لگا۔ لرزیدہ جسم پر قابو پاتے ہوئے دروازہ کھولا تو سامنے ارباز اور اختر موجود تھے۔

''تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔ اندر آنا ہوگا۔'' ارباز نے دھیرے سے کہا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ جمال نے انہیں بادلِ ناخواستہ رستہ دے دیا اور کمرے میں لے جانے کے بجائے مختصر سے برآمدے میں پلاسٹک کی کرسیوں پر بٹھا دیا۔ منیب بھی اس دوران برآمدے میں ہی چلا آیا۔

''اس مشکل گھڑی اور حادثے کا ہمیں بہت افسوس ہے۔'' ارباز نے گلا کھنکھارتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا تاہم اس کی آنکھوں اور چہرے سے واضح عیاں تھا کہ وہ جبری طور پر ہی یہاں آیا ہے۔

''بس جو اللہ کا حکم...... پتا نہیں کیسے ہو گیا یہ سب؟ میں تو اسے اچھا خاصا چھوڑ کر گیا تھا صبح۔'' جمال کی آواز رُندھ گئی۔

''حوصلہ کرو یار! اس وقت تمہیں مضبوط رہنا ہوگا۔'' اختر نے اسے دلاسا دیا۔

''تمہارے گھر سے جانے کے بعد فیاض ہمیں اپنی بیٹھک میں لے گیا تھا۔'' ارباز نے وقت ضائع کیے بغیر سلسلۂ کلام آگے بڑھایا۔ ''وہاں اس صورتِ حال پر تھوڑی بہت گفتگو ہوئی ہے۔ فیاض نے ہی مجھے یہاں بھیجا ہے کہ تم سے بات کروں۔''

''کیا کہتے ہیں ہمارے کونسلر صاحب؟'' منیب نے پوچھا۔

''یہ سیدھا سیدھا پولیس کیس ہے۔ ایک دو محلے دار تو پولیس اسٹیشن فون بھی کرنے لگے تھے لیکن فیاض نے ہی روک دیا کہ پہلے تم سے بات کر لیں۔''

''بات کیا ہے؟ کوئی بتائے گا بھی یا یونہی بجھارتیں ڈالتے رہو گے؟'' منیب نے چڑ کر کہا۔

''آرام سے کاکے! آرام سے...... میرے ساتھ زیادہ اوکھا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' ارباز نے سرد مہری سے اسے گھورا۔

''بچی قتل ہوئی ہے ہماری۔ کیسا محلہ ہے یہ؟ دن دہاڑے کوئی حرامزادہ گھر میں گھس کر ڈکیتی کرتا ہے، قیمتی چیزوں کا صفایا کرتا ہے، ہماری بچی کو موت کی نیند سلا جاتا ہے اور باہر کسی کو کچھ پتا ہی نہیں۔'' منیب نے بلا ارادہ معاملے کو الگ رنگ دیا۔

''یہاں دن دہاڑے کیا ہوا کرتا تھا سب پتا ہے مجھے...... سب پتا ہے۔ میری زبان نہ کھلوا۔'' ارباز حسبِ عادت بھڑک اٹھا۔ ''یہ جو فیاض اس معاملے کو ٹھپ کرنا چاہتا ہے نا اس کے پیچھے کہانی بھی پتا ہے مجھے۔ اسے اپنے اور بیٹے دونوں...'' اختر نے بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس کا بازو دبا کر خاموش کروا دیا اور ٹھنڈے لہجے میں بولا۔

''دیکھ جمال! ہمیں پتا ہے کہ مرد روزگار کے لیے جائیں تو پیچھے گھروں کی رکھوالی عورتوں کی ذمّے داری ہوا کرتی ہے۔ اب تیرے گھر میں کوئی بزرگ یا عورت تو تھی نہیں۔ بچی سارا دن اکیلی رہتی تھی۔ ناسمجھ تھی۔ بُرے بھلے کی تمیز نہیں تھی اسے۔ اس مختصر وقت میں ہم لوگوں نے جو کچھ دیکھا یا سنا ہے اس بارے میں بات کرنے کا موقع ہے، نہ فائدہ۔'' اختر نے توقف کیا۔

''مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی کہ تم لوگ کیا چاہتے ہو؟ میرا دماغ اس وقت بند ہو رہا ہے۔'' جمال نے بے بسی سے کہا۔

''میں تیری حالت سمجھ رہا ہوں۔ اس لیے تیرا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ مجھے صرف یہ بتا کہ تم لوگوں کی کسی سے کوئی دشمنی تو نہیں ہے؟'' اختر نے پوچھا۔

''نہیں! تیرے سامنے ہی ہے سب کچھ۔ ریڑھی لگا کر روزی روٹی کماتا ہوں۔ میری کون سی ملیں، کارخانے یا پیو دادے کی زمین جائیدادیں ہیں جن کے پیچھے دشمنی ہو کسی سے۔'' جمال نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

''یہاں آنے کے بعد پنگا شنگا ہوا ہو کسی سے؟'' ارباز اس بار قدرے تحمل سے بولا۔

''نہیں! پنگا ونگا تو دور کی بات ہے۔ کبھی کسی سے تُو تُو میں میں تک نہیں ہوئی۔'' منیب نے کہا۔

''تیری حد تک تو یہ بات مجھے پہلے ہی پتا ہے۔ تو نے

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

آج تک جُوں بھی نہیں ماری ہوگی۔'' ارباز نے طنز کیا۔

''خیر! اب یہ بتاؤ کہ پولیس کو خود فون کر کے بلواؤ گے؟ ایف آئی آر کٹواؤ گے یا کوئی اور پلان ہے ذہن میں؟'' اختر کی اس بات پر جمال کی رنگت مزید زرد پڑ گئی۔

''پولیس کو اطلاع تو دینی ہی پڑے گی۔''

''پولیس کو اطلاع دینے کی کیا ضرورت ہے؟'' منیب اور جمال کی زبان سے بیک وقت متضاد فقرات برآمد ہوئے۔

''میں دوٹوک بات کروں گا تم سے۔'' ارباز نے کہنا شروع کیا۔ ''فیاض اور محلے کے اکثر لوگوں کی مرضی بھی نہیں ہے کہ پولیس بلوائی جائے۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ فیاض کی بیوہ بہن کے پاس تمہاری بچی اکثر کپڑے سلوانے جاتی تھی۔ کسی کے گھر کھانا پکانے کی ترکیب لینے چلی جاتی تھی۔ اب ان سب کو کہیں نہ کہیں یہی ڈر ہے کہ تفتیش کرنے کے لیے پولیس ان کے گھروں اور بہن بیٹیوں تک نہ پہنچے۔''

''تو کیا ہوا؟ وہ زبردستی گواہی دلوانے تو عدالت میں نہیں لے جائیں گے۔ اگر کسی کو کچھ پتا ہے تو بتا دینے میں حرج ہی کیا ہے۔'' منیب چڑ کر بولا۔ اسے ان لوگوں کی منطق سمجھ ہی نہیں آرہی تھی۔

''تو واقعی بھولا ہے کاکے یا ہمارے سامنے ایکٹنگ کا شوق چڑھا ہوا ہے تجھے؟'' ارباز نے اسے تمسخر سے دیکھا۔

''اس کی باتوں پر دھیان نہ دے باؤ!'' جمال نے فوراً کہا۔ ''میں فیاض کا پیغام سمجھ گیا ہوں۔ ماڑا سا بندہ ہوں میں۔ کیس درج کروا کے پولیس کو رشوتیں کھلانے کا حوصلہ ہے نہ ہی اپنی معصوم بچی کی لاش کا پوسٹ مارٹم اور تفتیش کے نام پر انگلیاں اٹھوانے کا حوصلہ ہے۔ باپ ہوں میں اس کا۔ اولاد کی ذلت کیسے برداشت کروں؟ کیسے برداشت کروں میں؟'' جمال سینہ کوبی کرتے ہوئے بلکنے لگا۔ منیب کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے تھے۔

''ہمیں تم سے اسی فیصلے کی امید تھی۔'' اختر نے تحمل سے کہا۔ ''بہتر یہی ہے کہ اپنے جن رشتے داروں کو اطلاع دینی ہے انہیں بلوا کر میت کا چہرہ دکھا دو۔ تدفین جتنی جلد ہو جائے اچھا رہے گا ورنہ کسی نے اپنے طور پر فون کر دیا تو تم لمبے چکروں میں پھنس جاؤ گے۔'' اس نے اگلا نقطہ بتایا۔

''ہمارا ایک دوسرے کے سوا کوئی بھی نہیں ہے۔ کون آئے گا یہاں؟ کوئی بھی تو نہیں۔'' منیب نے تلخی سے جواب دیا۔ ارباز نے تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دی اور جمال سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

''تو ٹھیک ہے پھر۔ صبح ہوتے ہی غسل وغیرہ کا بندوبست کروا کے جلد از جلد تدفین کر دو۔ لاش کی حالت بھی ایسی نہیں ہے کہ زیادہ دیر تک اسے رکھا جائے۔'' ارباز کی اس بات پر منیب نے اذیت سے مٹھیاں بھینچ لیں۔

''میں یہاں کسی کو اتنا جانتا ہی نہیں میرے بھائی! بس آج تک اپنے کام سے کام ہی رکھا ہے۔'' جمال کے آنسوؤں میں شدت آ گئی۔ ''تم لوگ کسی غسال سے واقف ہو تو مہربانی کر کے بلوا دو۔ میں تدفین کے لیے تیار ہوں۔''

''مسجد کے آگے ایک عورت رہتی تو ہے لیکن اس وقت اسے کہنا مناسب نہیں ہوگا۔ فجر کے بعد ہی ممکن ہو پائے گا۔'' ارباز نے کہا۔

''تم ایسا کرو کہ کسی بھی قبرستان میں قبر کی کھدائی کا ابھی کہہ آؤ۔ کفن، پھولوں اور جنازے کی چارپائی کا بندوبست بھی کر لو۔ قبر کی جگہ ملنی کون سا آسان ہے یہاں؟'' اختر نے نرمی سے کہا۔

''اور ہماری کسی بھی بات کا بُرا نہ ماننا یار! ہماری نیت بہرحال غلط نہیں ہے۔'' ارباز کا لہجہ بھی دھیما ہو گیا۔

''مہربانی باؤ! فیاض کو بھی میری طرف سے شکریہ کہہ دینا۔'' جمال محض اتنا ہی کہہ سکا۔ ارباز اور اختر اس کا کندھا تھپک کر واپس چلے گئے۔

''یہ کیا بزدلی ہے؟ بیٹی بھی ہماری جان سے گئی اور ضابطے بھی ہمارے ہی لیے ہیں۔'' ان کے دروازے سے نکلتے ہی منیب پھٹ پڑا۔

''تو کیا چاہتا ہے تُو؟ کیا کروں میں؟'' جمال اپنا سر پیٹنے لگا۔ ''تو نے ان کے تیور نہیں دیکھے۔ میری معصوم بچی پر کتنے آرام سے بہتان لگا رہے تھے۔ وہ بادشاہ بندے ہیں اِس علاقے کے۔ میں ایک ماڑا بندہ ہوں۔ مرنے والی تو مر گئی۔ میں اسے مزید اذیت نہیں دے سکتا۔''

''جنازے کا اعلان بھی کرواؤ گے یا نہیں؟'' منیب تلخ ہوا۔

''نہیں! چار بندے جنازے کو کندھا دینے کے لیے مل ہی جائیں گے۔ تو یہیں رہنا! میں قبرستان سے کفن، چارپائی اور پھول لے کر قبر کا کہہ کر آتا ہوں۔'' جمال نے منیب کو تلقین کی اور اپنا وجود گھسیٹتا ہوا باہر نکل گیا۔

منیب اب گھر میں بالکل تنہا تھا۔ وہ اقصیٰ کے مردہ جسم کو دیکھتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ چند لمحوں بعد اسے قتل کے ایک گواہ 'مٹھو' کی باتیں یاد آنے لگیں۔

''آ گئے تم...... گڈ بائے جانِ من۔''

منیب کے دل و دماغ میں آتش سلگ اٹھی۔ اس نے

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

پنجرے سے کپڑا ہٹایا اور طوطے کی گول آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کسی انجانے قاتل کی شبیہہ دیکھنے کی دیوانی کوشش کرنے لگا۔ کامیابی تو کیا ملتی الٹا جھنجلاہٹ اور انتشار طاری ہونے لگا۔

”مجھے تبھی سمجھ جانا چاہیے تھا جب تم راتوں کو موبائل فون لے کر اندر باہر ٹہلتی پھرتی تھیں۔ مجھے تبھی ذرا سختی دکھانی چاہیے تھی جب گھر والوں سے زیادہ تمہارا دھیان اس کم بخت موبائل میں رہتا تھا۔ کاش میں نے اعتبار اور نظر انداز کر دینے کی غلطی نہ کی ہوتی۔“ وہ اس کے چادر تلے پوشیدہ جسم کو دیکھتا ہوا چیخنے لگا۔

”کیوں کیا اقصیٰ تو نے ایسا؟ تجھے اپنے گھر میں یہ فحاشی کرتے کسی کی بھی عزت کا خیال نہیں آیا؟“ اس نے اقصیٰ کے چہرے سے چادر ہٹائی۔ متورم چہرے، نیل اور زخموں کے جابجا نشانات کے ساتھ کچھ مخصوص نشان واضح طور پر بتا رہے تھے کہ وہ کسی مرد کی حیوانیت کا بخوشی حصہ بنی تھی۔ اس کے علاوہ کمرے میں کسی مردانہ پرفیوم کی تیز خوشبو بھی اس کے حواس پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ منیب کے وجود میں طیش کی شدید لہر اٹھی پھر اگلے ہی لمحے اس کیفیت پر خوف غالب آ گیا۔ موت اس سے چند گز کی دوری پر مجسم صورت میں موجود تھی۔ تنہا گھر، خاموشی، قرب و جوار کے غیر فطری سناٹے اور موت کی مہک نے اس پر لرزہ طاری کر دیا۔ وہ جھرجھراتا ہوا الٹے قدموں پلٹا اور گھر کے باہر گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹ کر بیٹھ گیا۔ وہ جمال کی آمد تک اندر جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ رات کا سفر اب بہت سست رفتاری سے طے ہو رہا تھا۔

”کاش تم مجھے ایک بار مل جاؤ۔ میں تمہارے جسم کا ہر ایک ریشہ تیزاب میں گلاؤں گا۔ ایک بار میرے سامنے آؤ بس!“ وہ گہرے سانس لیتا ہوا اس نادیدہ قاتل کے نقوش آسمان میں تلاش کرنے لگا۔

☆☆☆

رشی پرسکون انداز میں اپنے بستر میں لیٹا موسیقی سن رہا تھا۔

آج دوپہر گھر لوٹنے کے بعد سے وہ گھر سے باہر ہی نہیں نکلا تھا۔ سدرہ کو مطمئن کرنے کے لیے سر درد اور تھکاوٹ کا بہانہ بہت کامیاب ثابت ہوا۔

”پڑھائی کے لیے اتنا بھی سیریس ہونے کی کیا ضرورت ہے؟“ سدرہ حسب عادت اس کی کلاس لینے لگیں۔

”ایک تو آپ کی بھی سمجھ نہیں آتی مجھے۔ پہلے پڑھائی کے لیے سیریس نہ ہونے پر ڈانٹتی ہیں۔ پھر سیریس ہو جانے کو میرا جرم بنا لیتی ہیں۔“ رشی نے ہنستے ہوئے کہا۔

”تو کس نے کہا ہے کہ ہر معاملے میں اوور ہو جاؤ۔ انسان بیلنس رکھ کر بھی اپنی روٹین سیٹ کر سکتا ہے لیکن کبھی ماں کی طرح سوچو تو احساس ہوگا۔ اس لیول پر آؤ گے تو ہی پتا چلے گا۔“

رشی بے پروائی سے سر کھجا کر خاموش ہو گیا۔

”دوائی لے آؤ ابھی جا کر۔ یہ نہ ہو بعد میں زیادہ طبیعت خراب ہو جائے۔“ سدرہ کو اس کی سرخ آنکھیں، تپتا ہوا جسم اور تھکاوٹ تشویش زدہ کر رہی تھی۔

”آج کون سا ڈاکٹر بیٹھا ہوگا موم ڈیئر؟ آپ مجھے گھر میں رکھے میڈیکل باکس سے کوئی 'قومی دوائی' نکال دیں۔“

”بالکل نہیں! کلینک نہیں تو کسی پرائیویٹ اسپتال ہو آؤ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“ رشی ان کے تیور دیکھ کر مزید کچھ نہ بولا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ اپنے اعصابی نظام میں شدید دباؤ اور ٹوٹ پھوٹ محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنی بائیک نکال کر ایک قریبی نجی اسپتال سے معائنہ کروا کے دوا لے آیا۔ ڈاکٹر نے اسے ایک سو تین بخار تشخیص کیا تھا۔ گھر پہنچتے ہی سدرہ نے اسے گھیر لیا۔

”کیا بتایا ہے ڈاکٹر نے؟ کتنا بخار ہے؟ کوئی پریشانی کی بات تو نہیں نا؟ اسے کہہ کر ملٹی وٹامن کی کوئی ٹیبلٹس لکھوا لینی تھی۔“

”پریشانی کی بات تو ہے ماں جی!“ وہ اپنے ہونٹ کچلتے ہوئے بولا۔

”کیا ہوا ہے؟ ٹیسٹ وغیرہ بتائے ہیں تو صبح ہی کسی اچھی سی لیب سے وہ بھی کروا لیں گے۔“ وہ ہول رہی تھیں۔ رشی خاموشی سے والدہ کا چہرہ دیکھتا رہا۔

”اب زبان پر تالے کیوں پڑ گئے ہیں؟ بتاتے کیوں نہیں کہ کیا پریشانی ہے؟“ ان کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

”بہت بڑا مسئلہ تشخیص کیا ہے ڈاکٹر نے۔ اسی الجھن میں ہوں کہ آپ کو بتاؤں یا نہیں؟“ وہ نظریں چرانے لگا۔

”تمہیں میرے سر کی قسم ہے رشی! بتاؤ کیا ہوا ہے؟“

”وہ اصل میں بات یہ ہے موم...... ڈاکٹر نے کہا ہے میں کبھی ماں نہیں بن سکتا۔ اس لیے آپ کے لیول پر آ کر سوچ بھی نہیں سکوں گا۔“ اس نے سنجیدگی و تشویش سے بتایا۔

سدرہ کچھ دیر تک ہونقوں کی طرح اس کا چہرہ دیکھتی رہیں۔ ان کے چہرے پر طاری فکرمندی پہلے خفت، پھر غصہ اور انجام کار ہنسی میں تبدیل ہو گئی۔

”نوٹنکی تو ختم ہے تم پر۔ میری جان نکال کر رکھ دی تم نے۔“ وہ اس کے کان مروڑنے لگیں۔ رشی نے انہیں بڑی

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

محبت سے گلے لگالیا۔

''آپ فکر نہ کیا کریں۔ آپ کی ان پریشانیوں کو ختم کرنے کے لیے میں کسی بھی حد تک جا سکتا ہوں۔'' اس کے بے ساختہ انداز پر سدرہ نے کامیابی اور خوشیوں کی ڈھیروں دعائیں دے کر زبردستی آرام کے لیے لٹا دیا۔

سہ پہر کے بعد رات تک وہ اپنی نیند پوری کرتا رہا۔ بارہ بجے کے قریب اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ خود کو کافی تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ ذہنی رو اب بھی پے در پے دو قتل اور ان سے وابستہ حالات و واقعات کی طرف مڑ جاتی تھی۔

''اب تک تو لاش دریافت بھی ہو چکی ہو گی۔ بڑی ہاہا کار مچی ہو گی اس محلے میں تو۔'' وہ ہینڈ فری کانوں سے اتار کر ہاتھ میں گھمانے لگا۔

''میں نے خواہ مخواہ اتنی بزدلی دکھائی۔ ان تینوں کے ساتھ تھوڑا وقت گزار لیتا تو اس قتل کا لطف دوبالا ہو جاتا۔ ویسے ابھی بھی بگڑا تو کچھ نہیں۔ کل صبح ایک چکر لگا آؤں گا۔ اگر تدفین ہو بھی گئی ہو گی تو رسم قل کے لیے ٹینٹ وغیرہ تو موجود ہی ہوں گے۔'' رشی نے فوری منصوبہ بنایا اور اگلے روز کالج روانگی سے قبل جمال کے محلے میں ایک دورے کا فیصلہ کر لیا۔

''ایک منٹ..... ایک منٹ رشی پتر! کالج کے ٹائم پر وہاں سے نکلو گے تو یونیفارم کی شرٹ اور ٹائی سے شناخت میں بھی آسکتے ہو۔'' اس کے ذہن میں خدشہ سر سرایا۔

''اس کا علاج بھی کیے لیتے ہیں۔ کل گرم چادر لپیٹ لوں گا۔ کالج بیگ بھی چھپ جائے گا اور لڑکوں کے سامنے بات کا بھرم بھی رہ جائے گا کہ میں واقعی شہر سے باہر تھا۔'' اس نے اپنے منصوبے میں ترمیم کی اور مطمئن ہو کر کتابوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆☆☆

منیب اس سرد اور پتھریلے تھڑے پر اگلے تین گھنٹے تک بیٹھا رہا۔ موسم کی شدت، تنہائی اور احساسِ بے بسی نے مل کر رگوں میں آتشیں حدت دوڑا رکھی تھی۔

''کیا بات ہے؟ یہاں اکیلے بیٹھے کیا کر رہے ہو؟'' اس کی سماعت میں ایک آواز پڑی۔ محلے کا ایک ادھیڑ عمر شخص اس کے پاس کھڑا تھا۔ منیب خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ پڑوس میں رہنے والے مانی کا والد رفیق تھا۔

''اندر بڑی وحشت ہو رہی تھی اس لیے باہر چلا آیا۔'' اس نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

''جمال کو تھوڑی دیر پہلے کہیں جاتا دیکھا تھا میں نے۔ ابھی واپس نہیں آیا کیا وہ؟''

''نہیں! قبر اور کفن کا بندوبست کرنے گئے ہیں۔ کوئی پتا نہیں کب واپس آئیں گے۔''

''اس حادثے کا مجھے بہت افسوس ہے۔ محلے کے بیچوں بیچ دن دہاڑے ایک قتل ہو جاتا ہے اور ہمیں کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ بہت ماڑی بات ہے یہ۔'' رفیق نے تعزیت کی۔

''اب تو جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ کسی کے افسوس یا پچھتاوے سے ہماری بچی تو واپس نہیں آسکتی نا۔'' منیب کے تلخ جواب پر رفیق ناگواری سے اسے دیکھنے لگا۔

''ٹھیک ہی کہہ رہے ہو تم۔ خیر! میری کسی بھی مدد کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔'' اس نے رسمی انداز میں کہا۔

''جنازے کو کندھا دینے آجانا۔ اتنی ہی مہربانی کافی ہو گی۔'' منیب کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''ٹھیک ہے۔ آجاؤں گا۔ اگر اور بھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا۔'' رفیق کا اشارہ واضح طور پر مالی مدد کی طرف تھا۔ منیب اپنے متعلق محلے داروں کی اس غلط فہمی پر غصے سے پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔

''مہربانی تمہاری۔'' اس نے محض اتنا کہہ کر منہ پھیر لیا۔

''جہنم میں جاؤ! عزت راس ہی نہیں ہے۔'' رفیق کو یہ خاندان پہلے ہی ناپسند تھا اور اب اس حالیہ انا پرست رویے کے بعد تو منیب نے اپنے وجود پر دائمی نفرت کی مہر لگوالی تھی۔ وہ بڑبڑاتا ہوا اپنے گھر لوٹ گیا۔

منیب گھٹنوں میں سر دیے کافی دیر وہیں بیٹھا رہا، وقت کا اندازہ کرنے کے لیے موبائل کی طرف دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ یکایک اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔ وہ عجلت میں اندر لپکا اور کمرے میں موجود ہر شے کھنگال ڈالی۔ اقصیٰ کا موبائل کہیں بھی نہیں تھا۔ اس تلاش میں اسے دراز میں رکھی دونوں زائد چابیاں مل گئیں۔ اسے واضح طور پر اقصیٰ کے رچائے گئے کھیل کی سمجھ آگئی تھی۔

''موبائل فون مل جاتا تو میں اس خبیث ابنِ خبیث کا کوئی کھرا نکال ہی لیتا۔'' اس نے غصے سے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ موت کی مہک حواس کو الگ مختل کر رہی تھی۔ وہ گہرے سانس لیتا ہوا کمرے سے باہر آیا اور گھٹنوں کے بل برآمدے میں بیٹھ گیا۔ اس کے لیے سانس لینا بھی اذیت بننے لگا تھا۔ اسی اثنا میں جمال تھکا ہارا چلا آیا۔ اس کے ہر ایک انداز میں شکستگی اور آنکھوں میں شدید سرخی تھی۔

''تیری جوتی باہر رکھی ہے اور تو خود یہاں بیٹھا ہے۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا۔'' جمال دھیرے سے بولا اور اس کے پاس رکھی پلاسٹک کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

"اتنی جلدی نہیں مروں گا میں۔ کم از کم اپنے مجرم کی تلاش تک تو موت کو بھی شکست دوں گا۔" منیب نے دہکتے لہجے میں کہا۔ جمال نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ اسے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن لب پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ ان دونوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

خاموشی، آنسوؤں اور اذیت کا یہ دور صبح ساڑھے چھ بجے تک جاری رہا۔ وہ ارباز اور اختر کی آمد تک اسی طرح بے حس وحرکت بیٹھے رہے۔

"میں نے غسال عورت سے بات کر لی ہے۔ وہ پندرہ منٹ تک یہاں پہنچ جائے گی۔ سامان تیار ہے کہ نہیں؟" ارباز نے پوچھا۔ منیب گھٹنوں پر ہاتھ رکھے اٹھا اور باورچی خانہ میں موجود ایک بڑا پتیلا پانی سے بھر کر گرم کرنے کے لیے رکھ دیا۔ جمال نے خاموشی سے کفن اور دیگر سامان ارباز کو تھما دیا۔

"چارپائی اٹھا کر لانے کی ہمت تھی، نہ ہی اس وقت کوئی سواری مل سکتی تھی۔ گورکن کہہ رہا تھا کہ محلے کی مسجد سے بندوبست کر لینا۔"

"ٹھیک ہے! میں کرلوں گا کچھ نہ کچھ۔" ارباز نے دلاسا دیا۔ غسال عورت مقررہ وقت تک آ پہنچی۔ اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر عورت اور بھی تھی۔ ارباز، اختر، منیب اور جمال سر جھکائے باہر نکل گئے۔

"بڑا ہی عجیب وقت ہے یہ میری زندگی کا۔" ارباز نے اختر کے کان میں سرگوشی کی۔

"مسجد میں اعلان نہ ہی کسی رشتے دار کی آمد۔ عجیب لوگ ہیں یہ۔" اختر نے بھی وہی بات دہرائی۔ منیب کی سماعت میں ان کے الفاظ رسائی حاصل کر رہے تھے لیکن اس میں کوئی بھی جواب دینے کی ہمت ہی نہ تھی۔

ارباز نے مسجد سے چارپائی کا بندوبست کروا دیا۔ اقصیٰ کی میّت اٹھاتے ہوئے رفیق اور بابر بھی اس مختصر جنازے میں شامل ہو گئے۔ منیب کے لیے ہر ایک لمحہ قیامت خیز تھا۔ وہ پلکوں کو تیزی سے جھپکا کر اپنے آنسو بہنے سے روک رہا تھا۔ اسے علم تھا کہ جمال کی بھی کم وبیش یہی حالت تھی۔

اس مخدوش ذہنی کیفیت میں وہ جمال کے پہلو میں ہلکی رفتار سے چلنے والی موٹر سائیکل دیکھ کر ایک نامعلوم سی بے چینی محسوس کرنے لگا۔ اس صورتِ حال پر زیادہ دیر سوچ بچار کا وقت ہی نہ مل سکا۔ قبرستان آمد کے بعد وہیں جنازہ گاہ میں میت کا جنازہ پڑھا دیا گیا۔

قبرستان میں درختوں کی بدولت بے پناہ خنکی تھی۔ یہ ٹھنڈک اور خاموشی منیب کے اعصاب کو سکون فراہم کرنے لگی۔ لاش کو قبر میں اتارنے کا مرحلہ جمال نے پورا کیا۔ قبر کو مٹی سے ڈھکتے ہوئے منیب کو ایک بار پھر اسی بے چینی نے گھیر لیا۔ اسے واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کسی کی چبھتی ہوئی نظروں کی زد میں ہے۔ جلد ہی اس نے اپنے اضطراب کا سبب تلاش کر لیا۔

سامنے درخت کی آڑ میں ایک شخص موجود تھا۔ اس نے بالائی جسم پر گرم چادر لپیٹ رکھی تھی۔ چہرے پر ہلکا سبز ماسک بظاہر اسے غیر نمایاں کیے ہوئے تھا لیکن منیب کے ذہن میں ایک کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ وہ خودکار انداز میں اس کی طرف بڑھا لیکن اس سے قبل وہ شخص نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ منیب نے اس کا تصور ذہن سے جھٹکا اور واپس قبر کی جانب مڑ گیا جہاں اقصیٰ اپنی تمام تر بدتمیزیوں، اختلافات اور طراری کے ساتھ دردناک موت کو گلے لگائے خاک اوڑھ چکی تھی۔

☆☆☆

رشی کی خوشی اور سرشاری کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

وہ اپنا وجود بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ کالج کی پارکنگ میں بائیک کھڑی کرتے ہوئے وہ مسلسل گنگنانے میں مصروف تھا۔ مرکزی احاطہ عبور کرنے کے بعد ایک راہداری تھی جس کے اختتام پر موجود مختصر کمرے میں گلاس ٹاپ کی میز اور چیئر نشست رکھی تھی۔ رشی تمسخرانہ نظروں سے اس خالی کرسی کو دیکھتا رہا۔ معلومات فراہم کرنے اور دوسرے لفظوں میں نوواردوں کو گھیرنے کی عہدیدار شازیہ اس نشست پر بیٹھی اپنے جلوے بکھیرا کرتی تھی۔

آزادی اور طاقت کا ایک خوش کن احساس اسے جھومنے پر مجبور کر رہا تھا لیکن کالج میں اب تک بنے رہنے والے ذاتی تاثر کی وجہ سے کوئی بھی غیر معمولی ردِعمل اس کے لیے مسائل پیدا کر دیتا۔ وہ اپنی کیفیات میں توازن پیدا کرتے ہوئے کلاس روم میں چلا گیا۔ مناہل اب تک نہیں آئی تھی۔ رشی کو اس کی کمی آج کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے مناہل سے فوری رابطہ کر لیا۔

"چار چھٹیاں کر کے دل نہیں بھرا کیا تمہارا؟ کدھر رہ گئی ہو؟" رشی نے شکوہ داغا۔

"سوری ڈیئر! میں آج بھی نہیں آسکوں گی۔ مجھے کچھ اسکن الرجی ہو گئی ہے۔ فیس پر دو، تین پمپلز نکل آئے ہیں۔ ایسی حالت میں کالج کیسے آ سکتی ہوں میں؟" وہ افسردگی سے بولی۔

"کم آن مناہل! یہ کوئی اتنا بڑا ایشو تو نہیں ہے۔" رشی حیران ہوا۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

"تمہارے لیے نہیں ہوگا لیکن میرے لیے یہ بہت بڑا ایشو ہے۔ تمہیں بھی علم... ہے کہ میں اپنے فیس کے متعلق کتنی کانشس ہوں۔ میں نے تمہیں صبح کچھ میسیج بھی کیے تھے لیکن تم آف لائن تھے۔"

"ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔ جب موڈ بنے کالج آنے کا تو بتا دینا مجھے۔"

"اوکے شیور! مجھے مس ضرور کرنا۔" وہ اٹھلائی اور چند الوداعی کلمات کے بعد فون بند کر دیا۔

رشی کا دل بھی یکدم اچاٹ ہو گیا۔ اس نے بیگ اٹھایا اور کسی سے کچھ بھی کہے سنے بغیر کالج سے نکل آیا۔ گارڈ نے اسے روکنے کی زحمت بالکل نہیں کی تھی۔ رشی وہاں سے نکلتے ہی ایک بار پھر نہر کے کنارے چلا آیا۔ اُس روز کے برعکس آج وہ بائیک پر ہی سوار تھا۔ جمعے کے روز کی کیفیات اور خدشات یاد آتے ہی اس کے ہونٹوں پر جاندار مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میں خواہ مخواہ اُس دن اتنی ٹینشن لے رہا تھا۔ اس دنیا میں کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس کا حل موجود نہ ہو۔ میرے دو مجرم تو اپنے انجام تک پہنچ چکے ہیں۔ باقی دو سے بھی بہت جلد چھٹکارا پا لوں گا۔" رشی خودکار انداز میں مستقبل کی حکمتِ عملی وضع کرنے لگا۔ اس کے ذہن میں صبح کے مناظر تازہ تھے۔ اس کی توقعات کے عین مطابق اقصیٰ کا جنازہ نہایت 'شاندار' تھا۔ بائیک پر قبرستان جاتے ہوئے اس کا دل باغ باغ ہو رہا تھا۔

اس ساری خوش کن صورتِ حال میں واحد خلش منیب کا ردِعمل تھا۔ اس کا چونک کر رشی کی جانب متوجہ ہونا ہرگز مثبت امر نہیں تھا۔ رشی کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے وہیں پڑے چند پتھر اٹھائے اور نہر میں پھینکتے ہوئے لہروں کا رقص دیکھنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں غیر محسوس طریقے سے کنکروں کا یہ کھیل ایک 'ٹاس' میں تبدیل ہو گیا۔ وہ ذہن میں جمال اور منیب کا تصور لیے کنکر اچھالتا رہا۔ آخری کنکر پر منیب کا نام تھا۔ رشی کا ذہن یکسو ہو گیا، اب وہ پُرسکون ہو کر اپنے 'ٹارگٹ' کے بارے میں تفصیلی منصوبہ بندی کر سکتا تھا۔ اس بار وہ قتل کو مزید یادگار بنانا چاہتا تھا۔ ایک اور ممکنہ کامیابی، مجرم سے خلاصی اور خطرات میں کمی کا احساس رگوں میں سرشاری اور حدت دوڑانے لگا۔ اس نے تھوڑا وقت وہاں مزید گزارا اور پھر واپس گھر کی راہ لے لی۔

☆☆☆

رات اپنے سیاہ پروں کا سایہ پھیلانے کا آغاز کر رہی تھی۔

منیب اور جمال خاموشی کی چادر اوڑھے کمرے میں پڑے تھے۔ جمال تو تدفین کے بعد بالکل گھر سے نہ نکلا تھا۔ منیب میں بھی ڈیوٹی پر جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ صرف تھوڑی دیر کے لیے گاڑی کے مالک سے ملنے گیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ گھر میں ہی موجود تھا۔

"بھوک نہیں لگی کیا صبح سے تجھے؟" جمال نے بالآخر سکوت توڑا۔

"اگر یہی بات میں آپ سے کہوں تو؟" منیب نے جوابی سوال کیا۔

"کل راستے میں ہی تھوڑا بہت کھایا تھا۔" جمال نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

"بازار سے لے آتا ہوں کچھ۔ ایسا نہ ہو آپ کا بلڈ پریشر لو ہو جائے۔" منیب صوفے سے اٹھ بیٹھا۔

"نہیں نکلتی میری جان اس بھوک سے۔ اللہ جنت بخشے میرے ابا کہتے تھے انسانی جسم میں دو سو چھ ہڈیاں ہوتی ہیں پر میرے اندر دو سو دس ہیں۔ باقی ڈھیٹ ہڈیاں ہیں۔" جمال شکستگی سے ہنسا۔ "ٹھیک ہی تو کہتا تھا ابا۔ مجھ سے بڑا ڈھیٹ کون ہوگا؟ جوان بچی کو قبر میں اتار آیا ہوں۔"

منیب کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ اس نے بائیں ہاتھ کی پشت سے آنکھیں رگڑیں اور کسی خیال کے تحت بولا۔ "فریج میں دیکھتا ہوں۔ کچھ نہ کچھ پڑا ہی ہوگا۔"

"نہیں! میرا دل نہیں چاہ رہا۔" وہ بھی چارپائی پر اٹھ بیٹھا۔

"کل رسم قل کے بارے میں کیا سوچا ہے؟ خشک چنوں اور گٹھلیوں کا انتظام بھی کرنا ہوگا۔" منیب نے یاددہانی کروائی۔

"ہم یہ سب کر کے قلوں کا بندوبست کر بھی دیں تو یہاں آئے گا کون؟" جمال نے اسے آئینہ دکھایا۔ "یہ جو چار لوگ آج جنازے میں اکٹھے ہو گئے تھے ان کی بھی مہربانی۔ مجھے آئندہ کسی سے بھلائی کی کوئی توقع نہیں ہے۔ خواہ مخواہ پیسے خرچنے اور کھانا ٹھنسوانے کے لیے اکٹھے کرنے کا مجھے کوئی شوق نہیں۔"

"تو کیا یہ رسم پوری کرنی ہی نہیں؟" منیب جذباتی ہونے لگا۔

"میری بات سمجھنے کی کوشش کر کاکے! ان جیسے بددماغوں کو ترلے منتیں کر کے بلوانے سے بہتر ہے کہ میں کسی مدرسے میں چار پیسے دے کر قرآن خوانی کروا لوں۔ اپنی بچی کے ایصالِ ثواب کے لیے دیگ بھی وہیں بانٹ دوں گا۔"

جمال کی یہ تجویز منیب کے دل کو لگی۔ وہ تائیدی انداز میں سر کو جنبش دے کر خاموش ہو گیا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' جمال کو اس کی کیفیت بے چین کرنے لگی۔ وہ مزاجاً کم گو تو شروع سے ہی تھا لیکن ایسی کیفیت پہلے کبھی بھی نہ ہوئی تھی۔

''کچھ نہیں..... بس یہی کہ قبرستان میں وہ شخص کون تھا؟ مجھے اُس کی باڈی لینگویج سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ جان بوجھ کر وہاں آیا تھا۔'' منیب کے ذہن پر صبح کے مناظر نقش ہو چکے تھے۔

''ہوگا کوئی۔ فاتحہ پڑھنے کے لیے آیا ہوگا۔''

''نہیں! اس کا فوکس کوئی قبر نہیں تھی۔ وہ صرف ہمیں ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھ سے بہت فاصلے پر تھا۔ اس کے باوجود مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی آنکھوں سے شعاعیں نکل رہی ہیں۔ کوئی نہ کوئی کنکشن تو ضرور ہے اس کا ہمارے ساتھ۔'' منیب پیشانی مسلنے لگا۔

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ اتنے کم لوگ دیکھ کر تجسس میں پڑ گیا ہو۔'' جمال نے اسے تصویر کا دوسرا رُخ دکھایا۔

''میرا دل نہیں مانتا۔ یہ کوئی اور ہی چکر تھا۔'' منیب نے زور و شور سے نفی میں سر ہلایا۔

''سات بجے کے بعد پانی بند ہو جایا کرتا ہے۔ موٹر چلا کر ٹب اور بالٹیاں بھر لینا۔'' جمال نے اسے یاد دہانی کروائی۔

''آج تو کر لوں گا لیکن بعد میں یہ سب کیسے ہوگا؟'' منیب نے اسے حقیقت سے آشنا کروانا چاہا۔ جمال ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔

''گھر کی ذمے داریاں پوری کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی رستہ تو نکالنا ہی پڑے گا۔ میرا خیال ہے کہ تجھے شادی کر لینی چاہیے۔ گھر سنبھالنے کے لیے عورت کی موجودگی زیادہ ضروری ہوا کرتی ہے۔'' اس نے تجویز دی۔

''میں اور شادی؟'' منیب استہزائیہ ہنسا۔ ''مجھ سے کون کرے گی شادی؟ ایسا خواب میں نے کبھی دیکھا، نہ ہی ایسا کوئی جھنجٹ پالا ہے۔''

''کیوں بھئی؟ تجھ میں کس بات کی کمی ہے آخر؟ ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی مل سکتی ہے۔''

''رہنے دیں! اس گھر کو عورت راس نہیں آتی۔ یہ بات آپ کو بھی اچھی طرح پتا ہے۔'' وہ بیزاری سے بولا۔ ''اور میں گھر کی ذمے داریوں والی بات اس لیے نہیں کی تھی کہ آپ شادی کا ذکر لے کر بیٹھ جائیں۔ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ آپ کو اب گلگ بھی لے کر پھرنے کی ضرورت نہیں۔ گھر پر آرام کیا کریں۔ ہم دو بندے ہی تو ہیں۔ گزر جائے گی زندگی۔''

''یہ سب کہنا آسان ہے پُتر! اور میں کام نہ کروں تو اکیلا گھر بیٹھ کر کیا کروں گا؟ پاگل ہو جاؤں گا میں تو۔ کام کرتا رہوں گا تو ذہن بھی بٹا رہے گا۔''

''مرضی ہے آپ کی۔ میرے خیال میں تو اب اس خواری کی ضرورت ہی نہیں۔ میں اتنا کما تو لیتا ہوں کہ گھر چلا لوں۔'' منیب کی اس تاویل پر جمال خاموش ہو گیا۔

اگلا ایک گھنٹا اسی خاموشی اور سوچوں میں بیت گیا۔ ماحول پر چھایا جمود جمال نے ہی توڑا۔ وہ بستر سے اتر کر کہیں باہر جانے کی تیاری میں نظر آ رہا تھا۔ منیب نے آنکھوں پر رکھا بازو ہٹایا اور خفگی بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

''اب ایسے کیا دیکھ رہا ہے مجھے؟''

''کچھ نہیں! دیکھ تو آپ کو رہا ہوں لیکن ذہن میں اتصلی کی ایک بات چل رہی ہے۔ وہ ٹھیک ہی کہا کرتی تھی کہ آپ کی ریڑھی اصل میں آپ کی دلہن ہے۔ اس کے بغیر رہ ہی نہیں سکتے آپ۔ مجھے پتا ہے ابھی بھی اسی کے لیے کوئی سامان لینے جا رہے ہوگے۔''

جمال اس کے انداز اور غصے پر محض سر کھجا کر رہ گیا۔ منیب نے کروٹ بدلی اور بڑبڑاتے ہوئے ایک بار پھر بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔

''کریں اپنی مرضیاں! میری یہاں سنتا کون ہے؟''

☆☆☆

جمال پشت پر ہاتھ باندھے نپے تلے قدموں سے دکان تک پہنچا اور شٹر کھول کر کتنی ہی دیر خالی نظروں سے اپنی ریڑھیاں دیکھتا رہا۔ کچھ لمحوں بعد اس نے وہیں سے ایک کپڑا نکالا اور ریڑھی سے گرد صاف کرنے لگا۔ اس کے انداز سے واضح محسوس ہو رہا تھا کہ وہ محض اپنا دھیان بٹانے کی کوشش کر رہا ہے۔

اس صفائی کے بعد وہ دکان کا شٹر گرا کر تیز قدموں سے ایک جانب چل دیا۔ اگلے پندرہ منٹ بعد وہ ایک تنگ سی گلی میں داخل ہو گیا۔ محتاط نظروں سے قرب و جوار کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے بھورے رنگ کے دروازے پر دستک دے دی۔ تیسری دستک پر دروازہ کھل گیا۔ جمال کے سامنے ایک بھاری بھر کم عورت کھڑی تھی۔ اس نے چہرے پر میک اَپ کی گہری تہیں جما رکھی تھیں۔ بادی النظر میں اس کی عمر کا اندازہ کرنا خاصا مشکل تھا۔ اس کے کپڑے سرد موسم میں بھی ہلکے پھلکے اور جسم سے بالکل چپکے ہوئے تھے۔ وہ دوپٹے اور جوتی سے بالکل

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

بے نیاز تھی۔ جمال کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خمار اور چہرے پر ایک چمک پیدا ہوگئی۔

''کہاں رہ گئے تھے سرکار؟ کل رات سے کوئی خیر خبر ہی نہیں آپ کی۔ موبائل بھی بند کر رکھا ہے۔ پتا ہے نا مجھے آپ کی کتنی فکر رہا کرتی ہے۔'' اس نے اٹھلا کر کہا۔

''ہاں! پتا ہے مجھے۔ اسی لیے تو طبیعت سنبھلتے ہی سب سے پہلے تمہارے پاس آیا ہوں۔'' جمال نے اسے دیکھ کر منہ بسورا۔

''ہائے میں قربان جاؤں! کیا ہوگیا آپ کی طبیعت کو؟ لعنت ہو زیتون تیری عقل پر.....'' اس نے خود کو ملامت کی۔

''میں نے آتے ہی آپ سے شکوے شروع کر دیے۔ میری آنکھوں کو آپ کا یہ اترا ہوا چہرہ اور اداسی نظر کیوں نہ آئی؟''

''یہیں دروازے پر کھڑی رہ کر سوال جواب کرتی رہو گی؟ اندر نہیں بلاؤ گی مجھے؟'' جمال نے اسے سرتاپا دیکھتے ہوئے کہا۔

''سرکار! میں آپ کی..... یہ گھر آپ کا۔ آپ تو مجھے جوتیاں مارتے ہوئے اندر لے کے جاتے کہ زیتون میں ادھر پریشان تھا تجھے نظر کیوں نہ آیا؟'' زیتون نامی اس عورت نے آنکھوں میں آنسو بھرے اور جمال کے دونوں ہاتھ تھامے اندر لے گئی۔

جمال اپنی ٹانگ کی ضرب سے دروازہ بند کرنا نہیں بھولا تھا۔ زیتون نے اسے .... چارپائی پر بٹھایا اور خود زمین پر گھٹنوں کے بل جھک کر اس کی ٹانگیں دبانے لگی۔

''نہ کیا کرایا۔ تجھے کتنی بار کہا ہے کہ تیری جگہ ان قدموں میں نہیں..... یہاں ہے یہاں۔'' اس نے سینے پر ہاتھ مارا۔

''یہ تو آپ کا بڑا پن ہے سرکار۔ میں تو سدا آپ کی کنیز ہی رہوں گی۔ اب اللہ کے واسطے مجھے بتائیے کہ آپ کی رنگت ایسی زرد اور صحت ایک ہی دن میں اتنی کمزور کیسے ہوگئی ہے۔ کل رات تک تو اچھے بھلے تھے آپ۔'' وہ اس کے چہرے کو ہاتھوں میں لے کر بولی۔

''آج صبح کسی درندے کے ہاتھوں روندی گئی جوان بیٹی کی لاش دفنا کر آیا ہوں۔'' جمال کے انکشاف پر زیتون جسم و جان سے لرز گئی۔

''ہائے میرے ربّا! یہ میں کیا سن رہی ہوں؟ ہماری بچی اقصیٰ..... نہیں یہ کیسے ہوسکتا ہے بھلا؟'' وہ ہاتھ لہراتے ہوئے بین کرنے لگی۔ ''آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟ میں اس کا آخری دیدار ہی کر لیتی۔'' اس نے شکوہ کیا۔

''اس وقت ہوش ہی کہاں تھا کسی بات کا؟ بدنامی کے ڈر سے راتوں رات دفنانے کا بندوبست کرنا پڑا۔ اسی لیے تو مسجد میں جنازے کا اعلان تک نہ کروایا۔'' سارا دن اشکوں میں غرق جمال اس وقت بے حس اور سپاٹ نظر آرہا تھا۔

زیتون جیسی شاطر عورت سے اس کی یہ کیفیات بھلا کیسے پوشیدہ رہ پاتیں؟ اس نے فوراً بھانپ لیا کہ جمال کو کس 'تھراپی' کی ضرورت ہے۔

''اللہ غرق کرے اس شخص کو جو ہماری بچی کی موت کا ذمے دار ہے۔'' وہ اس کے ہاتھ اور بازو سہلانے لگی۔ جمال خاموشی سے خلا میں گھورتا رہا۔

زیتون سے اس کے تعلقات محض دو ماہ پرانے تھے۔ وہ ناقابلِ یقین انداز میں اس کے حواس پر سوار ہو کر زندگی کا حصہ بنی تھی۔ زیتون اپنی طرز کی ایک انوکھی عورت تھی۔ بیک وقت شعلہ اور شبنم۔ اپنی جانب اٹھنے والی کسی بھی نظر کو پھوڑ دینے والی اور دوسری جانب منظورِ نظر کے قدموں کی خاک بننے والی۔ اس کا لب ولہجہ شیریں اور انداز واطوار فریفتگی سے اس قدر لبریز ہوتے کہ مقابل ایک ہی پل میں ہواؤں میں اُڑنے لگتا۔ مردوں کے لیے اس کی ذات میں خصوصی کشش بھرپور سراپا کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ محبوبانہ اور مامتا سے بھرے ناز و انداز بھی تھے۔ اس انوکھے ملاپ کے سامنے کسی کے لیے بھی مزاحمت کرنا ممکن ہی نہ ہوتا، جمال کا بھی یہی عالم تھا۔ اپنے گھر اور اولاد کے سامنے مضبوط، پُراعتماد اور نڈر دکھائی دینے والا جمال اپنے اس بہروپ سے صرف زیتون کے سامنے ہی باہر آتا تھا۔

اس کا اصل روپ کلی طور پر بہروپ سے متصادم تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ جمال بے حس، خود پسند، طوطا چشم، مطلبی اور نفس پرست تھا۔ اسے اپنی ذات سے بڑھ کر کوئی رشتہ عزیز نہ تھا۔ اقصیٰ کی موت کا غم فطری سہی لیکن اس کے وجدان قتل نے جمال کی انا پرستی کو سخت ٹھیس پہنچائی تھی۔ بدنامی اور لوگوں کے متوقع سوالات کا خدشہ وجود میں الگ نفرت اور غصہ برپا کیے ہوئے تھا۔ ان کیفیات سے نجات کے لیے ہی اسے زیتون کے سہارے کی ضرورت تھی تاکہ اس علاج اور تھراپی کے بعد اپنا بہروپ کامیابی سے برقرار رکھ سکے۔

''کیا سوچ رہے ہیں آپ میرے آقا؟ آپ کی پریشانی مجھ سے دیکھی نہیں جارہی۔ بس اللہ کا مال تھا۔ اس نے لے لیا۔'' زیتون نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

''سوچنا کیا ہے۔ بس یہی فکر ہے کہ گھر کیسے چلے گا؟'' وہ چارپائی پر نیم دراز ہوگیا۔

www.paksociety.com

''میری موتیوں والی سرکار! مجھے لگتا ہے کہ آپ کو اب گھر میں ہماری بات کر لینی چاہیے۔ جب میں ہوں تو آپ کو گھر چلانے کی کیا فکر؟'' زیتون نے اس کے کندھے پر سر رکھا۔

''ہاں! دل تو میرا بھی یہی کرتا ہے کہ اب سماجی طور پر تجھے اپنی زندگی کا حصہ بنا لوں۔ اکیلا نہیں رہا جاتا اب مجھ سے۔'' جمال نے کہا اور پھر کراہتے ہوئے بولا۔

''سوچتا ہوں کہ یہ کام پہلے ہی کر لیا ہوتا تو آج یہ دن دیکھنا ہی نہ پڑتا۔ اقصیٰ تمہارے ساتھ محفوظ تو ہوتی۔'' اس نے اپنی تاخیر پر خود کو ہی ملامت کی۔ زیتون کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''میں تو آپ کے حکم کی غلام ہوں۔ جب کہیں گے آپ پر جندجان قربان کر دوں گی۔'' اس نے جمال کی قمیص کے بٹنوں سے کھیلتے ہوئے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے تو پہلے اپنے اس منحوس شوہر سے طلاق لکھوا جلدی۔'' جمال اس کی پیش قدمی سے ہیجان زدہ ہونے لگا۔

''اس کمینے کی فکر کیوں کرتے ہو؟ مولا قسم! میں اس کے ساتھ خوش ہی نہیں۔ جب سے آپ میری زندگی میں آئے ہیں اسے اپنے پاس پھٹکنے بھی نہیں دیا۔ اس سے شادی صرف ایک مجبوری تھی۔ دل کی خوشی کیا ہوتی ہے یہ تو آپ سے مل کر اندازہ ہوا ہے۔''

''تیری بیٹی مجھے قبول کر لے گی کیا؟'' اس نے اپنے خدشے کو زبان دی۔

''نہیں کرتی تو نہ کرے۔ میں نے ساری زندگی قربانیاں ہی تو دی ہیں۔ اب آ کے احساس ہوا ہے کہ سچی خوشی کیا ہوتی ہے۔ سچی محبت اور تڑپ کیا ہوتی ہے۔'' زیتون کا شیریں لہجہ اور فریفتگی جمال کو ہواؤں میں اڑانے لگی۔ اسے زیتون کا یہی والہانہ پن یہاں کھینچ لایا کرتا تھا۔

''میرے دل پر بڑے بوجھ ہیں۔ زندگی کے بہت سے موڑ ہیں، روح پر ایسے زخم ہیں جو کبھی کسی کو دکھائے ہی نہیں۔ اب دل چاہتا ہے کہ کسی اپنے کو اس میں حصہ دار بنا لوں۔ میرا سانس لینا کچھ تو آسان ہو۔'' جمال نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔

''اپنے سارے غم مجھے دے دیں سرکار! میں آپ کی زندگی خوشیوں سے بھر دوں گی۔ بس ایک بار مجھے اپنا نام دان تو کریں۔''

''اگر بلال نے تجھے طلاق نہ دی تو..... میں کیا کروں گا؟'' جمال نے اپنی آمد کا اصل مقصد بیان کیا۔

''خلع لے لوں گی میں اُس سے..... میری زندگی کا ہر رستہ اب آپ کی طرف ہی نکلتا ہے۔'' وہ پُرعزم تھی۔

''آج ہی یہ بات کر لے۔ عدت کی بعد میں دیکھی جائے گی کہ پوری کرتی ہے یا نہیں؟ جس روز تو طلاق یا خلع لے گی میں تجھے اسی وقت اپنے گھر لے جاؤں گا۔''

جمال کی اس تجویز نے زیتون کے وجود میں سنسنی دوڑا دی۔ اپنے نکھٹو نشے کے عادی اور جسمانی لاغر شوہر کے بدلے میں ایک کماؤ، پُرجوش اور مضبوط انسان کا انتخاب تو ایک دیرینہ خواب تھا۔ زیتون روزِ اول سے ہی اپنے شوہر کے ساتھ خوش نہ تھی۔ سگریٹ نوشی اور نشے کے باعث اس کے منہ اور وجود سے آنے والی بدبو زیتون کو کراہت میں مبتلا کرنے لگتی۔ شادی کے ابتدائی دس سال بہت جبر میں گزارے تھے۔ اسے شوہر سے کبھی محبت ہوئی ہی نہیں تھی۔ پہلے پہل تو وقت کسی طرح گزر گیا لیکن اب بلال کی جسمانی کمزوریوں نے اسے اپنے مدار سے بھٹکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ جمال کی مردانہ کشش کے سامنے اپنا دل ہار بیٹھی۔ زیتون کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مرد و زن کے تعلق کی اصل خوبصورتی اس نے اب جانی ہے۔ وہ سرتاپا جمال کی محبت میں گرفتار ہو چکی تھی۔ عام طور پر جمال سے اس کی یہ ملاقاتیں بیٹی کے ٹیوشن یا اسکول جانے کے دوران ہی ہوتی تھیں۔

''ٹھیک ہے! میں تو خود بھی اس کے ساتھ ایک پل نہیں رہنا چاہتی۔ لیکن سرکار! آپ کا بیٹا..... وہ تو کوئی ہجر مچر نہیں کرے گا نا؟ جوان اولاد ہے۔ باغی ہی نہ ہو جائے۔''

''اس کا اتنا دماغ نہیں ہے..... ابھی آنے سے پہلے میں نے شادی کی بات شروع کرتے ہوئے کہا کہ اس گھر کو کسی عورت کی ضرورت ہے تو کہنے لگا کہ مجھے کس نے دینی ہے لڑکی؟'' جمال کی اس بات پر زیتون اپنی ہنسی بمشکل ضبط کر پائی۔

''کم بخت! کہتا تو ٹھیک ہی ہے۔ کوئی عقل کا اندھا ہی ہو گا جو اُسے اپنی بہن یا بیٹی دینے کی حماقت کرے گا۔'' اس کے ذہن میں سوچ ابھری لیکن یہ بات وہ کسی بھی طرح جمال کے سامنے نہیں کہہ سکتی تھی۔

''خیر سلا! ایسی باتیں کیوں سوچتا ہے ہمارا چن پُتر؟ اتنا سوہنا گبرو جوان ہے۔ میں خود اس کے لیے ہیرے جیسی لڑکی ڈھونڈوں گی۔'' زیتون نے بھرپور اپنائیت سے کہا۔

''ہاں! یہ کام تم ہی کر سکتی ہو۔ میری ساری تھکاوٹ، فکریں اور پریشانیاں صرف تم ہی دور کر سکتی ہو۔'' جمال نے بوجھل انداز میں کہا۔ ''تم بلال سے جلد از جلد طلاق لو۔ میں اسی دن، اسی پل تم سے شادی کر لوں گا۔'' اس نے زیتون کو شوہر

www.paksociety.com

سے بات چیت کے لیے چند مزید نکتے بتائے اور گھر روانہ ہو گیا۔ اسے گھر بسانے کے ان خیالات میں گھر کے بقیہ دو مکینوں کے سروں پر منڈلاتی موت کی مہک محسوس ہی نہیں ہو سکتی تھی۔

☆☆☆

وہ دونوں آج پھر سرِ راہ مل گئے تھے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر ٹھٹکے، رکے اور لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ سجائے بات کا آغاز کرنے کے لیے الفاظ ڈھونڈنے لگے۔

''کیسی ہو تم؟'' اس نے نرمی سے پوچھا۔

''اچھی..... بہت اچھی۔'' وہ گردن اکڑا کر بولی۔

اُن کے درمیان کچھ دیر کے لیے پھر خاموشی چھا گئی۔ وہ اس کے لان کا سستا سوٹ اور فربہ جسم بغور دیکھتے ہوئے ایک عجیب سی کسک میں مبتلا ہو رہا تھا۔ دوسری جانب وہ بھی اس کی متین خاموشی سے ایک بے عنوان خلش محسوس کرنے لگی تھی۔

''اور سناؤ! کیسی گزر رہی ہے زندگی؟'' الفاظ نہ ملنے کی صورت میں ایسے ہی سرسری انداز اختیار کیے جاتے ہیں۔

''بہت ہی زبردست! تم سناؤ۔'' وہ بھی حتی الامکان بشاشت سے بولی۔

''پروردگار کا بہت شکر ہے۔ ویسے کافی ٹائم بعد ملنا ہوا ہے ہمارا، نہیں؟''

''ہاں! چھ سال تو گزر رہی گئے ہیں۔'' وہ بے دھیانی سے بولی اور پھر خود ہی خفیف ہو گئی۔ مقابل نے بہت گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا تھا۔ وہ ان نظروں کی تاب نہ لا کر خود کو کوسنے لگی۔

''یہاں کیا کر رہی ہو؟ اکیلی آئی ہو کیا؟'' وہ اس کے ہاتھ میں سبزی کا خالی تھیلا دیکھ کر بولا۔

''ہاں! میں اپنے سارے کام خود ہی مکمل کر لیا کرتی ہوں۔ کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ بہت خوش ہوں میں۔'' اس نے بھرپور انداز میں جتایا۔

''پروردگار تمہیں ہمیشہ ہی خوش رکھے۔'' وہ مسکرایا اور اس کے فربہ سراپا کو دیکھتے کسی فوری خیال کے تحت بولا۔

''بچے کتنے ہیں تمہارے؟''

''ابھی تک تو کوئی نہیں۔'' اس کے چہرے پر افسردگی چھائی۔

''کیوں؟ تمہیں تو بچے بہت پسند ہوا کرتے تھے۔'' اس کی حیرانی بھی بے ساختہ تھی۔

''کرتے تھے کیا مطلب؟ مجھے اب بھی بچے بہت پسند ہیں۔ رب کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں۔ ہو ہی جائے گی اولاد بھی۔''

''آہاں! صحیح کہا۔ رب کے ہاں دیر ہے۔ اندھیر تو نہیں۔ لیکن.....'' وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔

''اب یہ مت کہنا کہ اس میں بھی انہی کا کوئی قصور ہے۔'' اس نے فوری طور پر ٹوکا۔

''میں نے تو ایسا کچھ نہیں کہا لیکن شاید خود تمہارے ذہن میں بھی ایسی ہی کوئی بات ضرور ہے۔'' وہ اس کی نادانی پر ہنسا۔

''ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے آئندہ بھی ہمارا آمنا سامنا ہو تو تم میری گود میں اولاد بھی دیکھ لو۔''

''ہو سکتا ہے وہ وقت آنے سے پہلے میں ہی یہاں نہ رہوں۔'' اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

''کہیں جا رہے ہو تم کیا؟'' وہ چونکی۔

''ہاں! دور..... اس علاقے سے بہت دور..... دوسرے شہر یا ملک یہ ابھی مجھے نہیں پتا۔''

''صاف کیوں نہیں کہتے کہ مجھے خوش دیکھ کر دکھی ہو گئے ہو تم۔ اس لیے روایتی مجنوؤں کی طرح یہ گاتے ہوئے چلے جانا چاہتے ہو کہ میں تیرا شہر چھوڑ جاؤں گا۔'' وہ نخوت سے ہنسی۔

''تمہیں ایسا لگتا ہے تو یہی سہی۔'' اس نے خلافِ عادت کوئی بحث نہ کی۔ ''اچھا! اب مل ہی گئی ہو تو یہ گوشت رکھ لو۔''

''عید قربان تو ابھی بہت دور ہے۔ پھر یہ گوشت کیسا؟'' اس نے نیلے رنگ کے شاپر میں بکرے کے گوشت کی صاف ستھری نصف درجن سے زائد بوٹیاں دیکھ کر کہا۔

''میں نے اپنے بیٹے کا عقیقہ کیا ہے آج۔ اسی خوشی میں بانٹ رہا تھا۔'' وہ سادگی سے بولا اور پھر اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی بوکھلا گیا۔ اس کی آنکھوں میں یکدم بہت سے آنسو امڈے تھے۔

''ارے یہ کیا؟ تمہاری آنکھوں میں یہ آنسو کیسے؟'' وہ حیرانی سے پوچھنے لگا۔ مقابل سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

''خوشی کے ہی ہوں گے۔ تم خوش جو بہت ہو۔'' وہ نہ چاہتے ہوئے بھی طنز کر گیا۔

''ہاں! بہت خوش ہوں میں۔ میری لائف بالکل سیٹ ہے۔ میرا فیصلہ غلط نہیں تھا۔'' میکانکی انداز میں کہتے ہوئے اس نے بے دھیانی سے نیلا شاپر اپنے تھیلے میں منتقل کیا اور آگے بڑھ گئی۔ اسے اپنے عقب میں کھڑے شخص کی آنکھوں سے جھلکتے تاسف، حیرت، بے یقینی اور افسوس کا کوئی بھی رنگ نظر نہیں آ رہا تھا۔

(جاری ہے)

Nawar Azeem
www.pakistanipoint.com

ایما اسکول بس سے ... اُتری اور تیزی سے گھر کے عقب میں واقع اپنے باپ کی ورک شاپ کی جانب چل دی۔ اس کے چھوٹے بہن بھائی پیچھے آرہے تھے۔ اس نے ڈرائیوے میں سامان سے لدا ہوا ٹرک دیکھا۔ اس کا باپ جلدی گھر آگیا تھا۔ آج اس کی بیوی کی برسی تھی اور اس موقع پر باپ کا گھر میں تنہا بیٹھنا ایما کو بے چین کررہا تھا۔

چودہ سالہ ایما دستک دیے بغیر گھر میں داخل ہوئی تو اس نے اپنے باپ کو چھت کے شہتیر سے لٹکا ہوا پایا۔ اس کے قدم زمین پر جم گئے اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اس نے چیخنا چاہا لیکن سانس رک جانے کی وجہ سے اس کی چیخ بھی گھٹ کر رہ گئی۔ اس نے سر کو دائیں بائیں جھٹک کر اپنے حواس بحال کرنے کی کوشش کی پھر اپنی کتابوں کا بیگ زمین پر پھینکا۔ دوڑتی ہوئی ورکشاپ گئی۔ اسے وہاں ایک چاقو مل گیا، اس نے اسٹول پر چڑھ کر رسی کاٹی اور وہ زمین پر دھڑام سے آن گرا۔

ایما نے نیچے جھک کر رسی کی گرہ ڈھیلی کرنے کی کوشش

زندگی میں کڑواہٹ گھول دینے والے سچ کا دردناک انکشاف.....

کڑوا سچ

تنویر ریاض

انصاف کی عمارت سچ کی بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے... اور سچ جانے بغیر انصاف ملنا ممکن نہیں... ایک ایسی ہی بیٹی کی مسلسل جدوجہد... جو اپنی ماں کے قاتل کو سامنے لانا چاہتی تھی... مگر ہر دفعہ اس کا خاندان کسی نہ کسی افتاد کا شکار ہو جاتا... پے در پے ہونے والے حادثات نے گھر کے مکینوں کو ذہنی طور پر نڈھال کردیا تھا..

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

کی اور جیسے ہی اس کے باپ نے ہانپنا اور سانس لینا شروع کیا، اس نے چلاّ کر اپنے بہن بھائیوں کو متوجہ کرنے کی کوشش کی جو اس سے تھوڑے فاصلے پر ڈرائیو وے میں آ گئے تھے۔

"مائیکل! دادی کو بلاؤ۔ پاپا کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ اگر وہ سو رہی ہیں تو انہیں جگا دو۔"

مائیکل نے شاید ہی کبھی ایما سے کوئی سوال کیا ہو۔ اس لیے نہیں کہ وہ اس سے دو سال چھوٹا تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایما نے کئی مواقع پر اپنی قوتِ فیصلہ اور رہنمائی کا مظاہرہ کیا تھا چنانچہ اس نے فوراً ہی مکان کی طرف دوڑ لگائی اور منٹوں میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

ایما کی نو سالہ چھوٹی بہن باپ کے پاس کھڑی ہوئی تھی جس نے اب رونا شروع کر دیا تھا۔ اس کے حلق سے ہلکی ہلکی غراہٹ نکل رہی تھی اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا۔

دونوں لڑکیاں سینٹ الزبتھ اسکول کے یونیفارم سفید بلاؤز اور نیلے اسکرٹ میں ملبوس تھیں۔ البتہ دونوں میں بہت کم مشابہت تھی۔ ایما درمیانے قد، دبلی پتلی اور بادامی آنکھوں والی تھی جبکہ کیرولین کا قد لمبا، بھرا بھرا چہرہ اور نیلی آنکھیں تھیں۔

"پاپا کیوں رو رہے ہیں؟" کیرولین نے پوچھا لیکن قریب آنے کی کوشش نہیں کی۔

"ان کی گردن کے گرد کسی چیز کا بل پڑ گیا تھا جس نے تقریباً ان کا گلا گھونٹ دیا۔"

"اوہ......" کیرولین نے کہا اور کینڈی چوسنے لگی۔

اسی وقت دادی ٹنڈال کمرے میں داخل ہوئی اور اپنے بیٹے پر گھٹنوں کے بل جھکتے ہوئے بولی۔ "اوہ میرے خدا۔" اس کی نظر رسی اور گردن کے گرد خون آلود دائرے پر گئی تو وہ چلاتے ہوئے بولی۔ "یہ تم نے کیا کر لیا جمی؟"

پھر اس نے اپنا سیل فون نکالا اور کسی کو مدد کے لیے بلانے لگی۔ "یہ فون مجھے دو۔" یہ کہہ کر ایما نے اپنی دادی سے فون لے لیا پھر اس نے نو گیارہ ملایا اور فون دادی ماں کو واپس کر کے چاقو اپنی جگہ پر رکھنے چلی گئی۔ وہاں ایما کی نظر ایک کاغذ پر گئی جو اس کے باپ کی کاپی سے پھاڑا گیا تھا۔ وہ اس کاپی میں کبھی کبھی اپنے اشعار لکھا کرتا۔ اس کی بڑی خواہش تھی کہ اس کی غزلیں، نظمیں کتابی شکل میں شائع ہوں۔

اس صفحے پر اس کی ماں کی یاد میں کچھ شعر لکھے ہوئے تھے۔ ایما نے کانپتی انگلیوں سے اس کاغذ کو تہ کیا اور اسے اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ وہ واپس آئی، دیکھا کہ مائیکل کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ اپنے باپ کو بٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی وقت دور کہیں سے سائرن کی آواز سنائی دی۔

"میں پاپا کے لیے پانی لے کر آتی ہوں۔" گھر پہنچ کر وہ سیدھی والدین کے بیڈروم میں رکھی ہوئی سنگار میز پر گئی اور وہ دراز کھولی جس میں اس کی ماں اپنے زیورات رکھا کرتی تھی۔ اس کے قتل کے بعد پاپا نے کوئی تبدیلی نہیں کی تھی لہٰذا وہ تسبیح اپنی جگہ موجود تھی جہاں ایما کی یادداشت کے مطابق اسے ہونا چاہیے تھا۔ اس نے وہ تسبیح نکال کر اسی جیب میں رکھ لی جہاں وہ کاغذ تھا۔

جب وہ کچن میں پانی کا گلاس بھر رہی تھی تو اس نے ایک ایمبولینس اور پولیس کار کو آتے دیکھا۔ طبی عملے نے ایمبولینس سے اسٹریچر اور ضروری سامان نکالا اور تیزی سے ورک شاپ میں داخل ہو گئے۔ ایک طویل قامت پولیس آفیسر بھی ان کے ہمراہ تھا۔ کچھ دیر بعد اس کے باپ کو اسٹریچر پر باہر لایا گیا۔ طبی عملے کے علاوہ دادی اور مائیکل بھی اس کے ساتھ تھے۔ چند منٹ بعد ایمبولینس اس کے باپ کو لے کر روانہ ہو گئی۔ دادی بھی اس کے ساتھ تھیں۔ اب گھر پر بچے اکیلے رہ گئے تھے جب ایما نے دیکھا کہ پڑوس کی کئی عورتیں انہیں دیکھ رہی ہیں تو اس نے سیڑھیوں پر سے آواز لگائی۔ "مائیکل، کیرولین کو اندر لے آؤ۔"

ایما نے گزشتہ ایک برس میں یہی محسوس کیا تھا کہ ان کے زیادہ تر پڑوسیوں کا شبہ ان کے باپ پر ہے کہ اسی نے اپنی بیوی کو قتل کیا تھا۔ اسی لیے اب وہ ان کا ساتھ برداشت نہیں کر سکتی اور نہ ہی ان کی مدد قبول کرے گی۔

اندر آنے کے بعد اس نے اپنے بہن، بھائیوں کی طرف دیکھا۔ مائیکل غمگین نظر آ رہا تھا۔ اس کا اسکول بلیزر لان میں رہ گیا تھا۔ قمیص کا کالر کھلا ہوا، اور پتلون پر گھٹنوں کے پاس مٹی لگی ہوئی تھی۔ وہ عموماً خاموش رہتا تھا اور اسکول میں ہونے والے مختلف کھیلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ ماں کے مرنے کے بعد اس کی کئی مرتبہ لڑکوں سے لڑائی بھی ہوئی جو اس کے ماں، باپ اور قتل کے محرک کے بارے میں بے بنیاد باتیں کرتے تھے۔

اس کے بعد ایما نے چھوٹی بہن کیرولین کی طرف دیکھا لیکن اس کے چہرے پر اس واقعے کا کوئی اثر نظر نہیں آیا۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

''تمہیں معلوم ہے کہ آج کیا دن ہے؟'' ایما نے دونوں سے پوچھا۔

مائیکل نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کیرولین بولی۔

''جمعرات؟''

''آج کے دن ہی ایک سال پہلے ماما کا قتل ہوا تھا۔'' ایما نے انہیں یاد دلایا۔ ''اور آج پاپا نے جو کچھ کیا، اس کے بعد پولیس والے انہیں مجرم سمجھیں گے۔''

''کیا وہ حادثہ.....؟'' کیرولین نے پوچھا۔

''انہوں نے اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی تھی۔'' مائیکل نے کہا۔

''تم نے جھوٹ بولا۔'' کیرولین نے ایما کو الزام دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ بھی گناہ ہے۔''

''اس کے بعد پولیس نے قاتل کی تلاش ترک کر دی تھی اور لوگوں کے شک کی وجہ سے پاپا کو کام ملنے میں دشواری ہو رہی تھی۔''

''ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ پاپا نے انہیں قتل نہیں کیا؟'' مائیکل نے اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

''کیونکہ وہ ماما سے بہت محبت کرتے تھے۔'' ایما نے کہا۔ ''وہ انہیں دل سے چاہتے تھے۔ یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں لیکن ہمیں یہ ثابت کرنا ہوگا۔''

''کیسے؟'' کیرولین نے پوچھا۔

ایما نے جیب سے تسبیح نکالی اور اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ کیرولین کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور اس نے اسے پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''نہیں، یہ کھیلنے کی چیز نہیں ہے۔'' ایما نے اسے تنبیہہ کی۔ ''یہ ماما کی تسبیح ہے اور ہم اس پر ہاتھ رکھ کر عہد کریں گے۔''

اس نے وہ تسبیح اپنی ہتھیلی پر رکھی۔ ''تم اپنا دایاں ہاتھ اس کی صلیب پر رکھو۔''

دونوں نے ایسا ہی کیا۔ ''جو میں کہوں اسے دہراؤ۔ مجھے اپنے باپ کی بے گناہی کا یقین ہے۔''

''مجھے اپنے باپ کی بے گناہی کا یقین ہے۔'' انہوں نے دہرایا۔

''میں انہیں بے گناہ ثابت کرنے کے لیے جو کچھ میرے بس میں ہے کروں گا۔''

ان دونوں نے بھی یہی الفاظ دہرائے۔ کیرولین کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''ہنسنا بند کرو۔'' ایما نے اسے ڈانٹا پھر بولی۔ ''میری دعا ہے کہ مقدس مریم میری شفاعت کرے۔''

ان دونوں نے یہ کلمات بھی دہرائے پھر ایما نے کہا۔ ''میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی اس عہد نامہ کو افشا نہیں کروں گا۔''

''یہ کیا ہے؟'' کیرولین نے پوچھا۔

''ایک وعدہ۔'' مائیکل نے سرگوشی کی۔

اس کے بعد ایما نے کہا۔ ''میرے ساتھ آؤ۔''

وہ انہیں لے کر اپنے اور کیرولین کے مشترکہ بیڈ روم میں گئی اور بستر کے نیچے سے ایک گرد آلود کارڈ بورڈ کا بنا ہوا جوتوں کا ڈبا نکالا اور اس کی چیزیں بستر پر پھیلا دیں۔ اس میں کئی اخباروں کے تراشے اور ان کی ماں کے قتل کے بارے میں آن لائن رپورٹوں کے پرنٹ تھے۔

''اس کیس کے بارے میں جو کچھ شائع ہوا وہ ان میں موجود ہے۔'' ایما نے کہا۔

کیرولین نے ان بکھرے ہوئے کاغذات کو دیکھ کر کہا۔ ''کیا ان میں یہ بتایا گیا ہے کہ ماما کا قتل کس نے کیا؟''

''ہمیں یہی معلوم کرنا ہے۔ میں نے تمام اخبارات کی رپورٹیں پڑھی ہیں لیکن ان میں قاتل کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا۔''

مائیکل نے پوچھا۔ ''پھر اب ہم کیا کریں؟''

''ہمیں تفتیش کرنا ہوگی۔''

''مگر کیسے؟''

پہلی بار ایما تھوڑی سی ہچکچائی۔ ''ہم اس آدمی سے شروع کریں گے۔'' اس نے اخبار میں شائع ہونے والی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کا نام شیلڈن ہینڈ ہے، اس شخص کو اس جگہ آوارہ گردی کرتے ہوئے دیکھا گیا جہاں سے ماما کی لاش ملی تھی۔ میرے خیال میں پولیس نے اس پر ہی قتل کا شبہ ظاہر کیا تھا۔ اسی لیے اسے کئی بار پوچھ گچھ کے لیے بُلایا گیا۔''

''پھر انہوں نے اسے جانے کیوں دیا؟'' مائیکل نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ اس کے خلاف ثبوت نہیں مل سکے..... لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بے قصور ہے۔''

''اب وہ کہاں ہے؟''

''اگر وہ اب بھی یہیں ہے تو شاید شاپنگ پلازا کے عقب میں واقع بے گھر افراد کے کیمپ میں ہوگا۔''

''ہم وہاں کب جائیں گے؟''

ایما نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ ''اس ہفتے کے اختتام

www.pakistanidigest.com

پر جب ہمارے پاس کچھ وقت ہوگا۔''

''اگر اس نے ماما کو قتل کیا ہے تو ہمیں بھی اس کو مار دینا چاہیے۔'' کیرولین نے تجویز پیش کی۔

''یہ گناہ ہوگا۔'' ایما نے کہا پھر اس نے سب چیزیں دوبارہ جوتے کے ڈبے میں رکھیں اور اسے بستر کے نیچے دھکیل دیا۔ ''میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ ہم کیا کریں گے لیکن پہلے میں یہ اطمینان کرنا چاہتی ہوں کہ وہ اسی کیمپ میں ہے۔''

پھر وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''میں رات کے کھانے کے لیے چکن فنگرز بنانے جا رہی ہوں۔ تم لوگ اپنا ہوم ورک کرو جب کھانا تیار ہو جائے گا تو بلا لوں گی۔''

وہ دونوں اپنی کتابیں لینے گئے تو ایما بستر پر بیٹھ گئی۔ اس کا دل بوجھل ہو رہا تھا۔ منگارا میز پر اس کی ماں کی تصویر رکھی ہوئی تھی جو کئی برس پہلے فیملی پکنک کے موقع پر لی گئی تھی۔ اس تصویر میں وہ دونوں بیٹیوں کو گلے لگاتے ہوئے مسکرا رہی تھی اور پس منظر میں مائیکل اور اس کا باپ کھڑے ہوئے تھے۔ ایما کو یاد نہیں تھا کہ یہ تصویر کس نے کھینچی تھی۔

اگلے روز سہ پہر میں اسکول کی پرنسپل سسٹر جوزف نے اسے اپنے دفتر میں بلایا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' پرنسپل نے اپنے سامنے رکھی ہوئی ایک خالی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں تم سے کوئی شکایت نہیں ہے لیکن میرا تمہاری دادی سے رابطہ نہیں ہو سکا اس لیے میں نے سوچا کہ مجھے تم سے بات کر لینی چاہیے۔''

''رات دادی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔''

رات اس کی دادی نو بجے کے بعد اسپتال سے واپس آئی تھی اور اس کے لیے اپنے پیروں پر چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی پوتی کو اطمینان دلایا کہ اس کا باپ چند دنوں میں گھر واپس آ جائے گا اور اس کے بعد وہ درد کی گولی کھا کر سو گئی۔

ایما نے دادی کو صبح اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے اپنے بہن بھائیوں کے لیے ناشتا بنایا اور اسکول چلی آئی۔

''مجھے یہ سن کر افسوس ہوا۔'' سسٹر جوزف نے جواب دیا۔ ''تمہیں حالیہ دنوں میں بہت کچھ دیکھنا پڑ رہا ہے۔''

ایما سمجھ گئی کہ سسٹر جوزف اس کے باپ کی خودکشی کی کوشش کی جانب اشارہ کر رہی ہے۔

''جی ہاں۔'' اس نے جواب دیا۔

''مجھے اس میں کچھ اور اضافہ کرنا پڑ رہا ہے۔ تمہارے بھائی نے ایک بار پھر جھگڑا کیا ہے اور اس بار یہ لڑائی جم کے لاکر روم میں ہوئی۔ اس نے دوسرے لڑکے کا ہونٹ بُری طرح زخمی کر دیا۔''

ایما کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا جواب دے۔ پرنسپل نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں جانتی ہوں کہ یہ اس کے لیے بھی ایک مشکل سال ہے۔ عام طور پر دو ماہ میں تین لڑائیوں کے بعد داخلہ معطل ہو جاتا ہے لیکن میں اسے رعایت دے رہی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اسے فوری طور پر مدد کی ضرورت ہے۔ کیا تم اس سے اتفاق نہیں کرو گی؟''

ایما نے اثبات میں سر ہلایا پھر بولی۔ ''کیا وہ بھی زخمی ہوا ہے؟''

''اسے معمولی زخم آئے ہیں۔ تمہارا بھائی لڑنے میں ماہر ہے حالانکہ دوسرا لڑکا اس سے تین سال سینئر ہے۔'' سسٹر جوزف نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم اس سے اس بارے میں بات کرنا۔ میرا خیال ہے کہ وہ تمہاری بات ضرور سنے گا۔''

''ضرور کروں گی۔'' ایما نے کہا۔

''اپنے ڈیڈی کو بھی بتانا۔ جب وہ اسپتال سے واپس آ جائیں۔ انہیں بھی معلوم ہونا چاہیے۔''

''جھگڑا کس بات پر ہوا تھا؟'' ایما نے پوچھا۔

سسٹر جوزف نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میں توقع کر رہی تھی کہ تم یہ سوال نہیں پوچھو گی۔ ایڈن فشر نے تمہاری ماں کے بارے میں کچھ نازیبا باتیں کی تھیں۔''

''اس نے کیا کہا تھا؟'' ایما نے پوچھا گو کہ اسے یقین تھا کہ وہ یہ بات پہلے سے جانتی ہے۔

''یہ اتنا اہم نہیں ہے۔'' پرنسپل نے ٹالنے کی کوشش کی۔ ''میرا خیال ہے کہ اگر تم اپنے بھائی کو مجبور کرو گی تو وہ تمہیں تفصیل بتا دے گا۔''

''کیا تم میری ماں کو جانتی تھیں؟''

''بالکل..... لیکن زیادہ نہیں۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ ہمارے اسکول میں نرس تھی لیکن میرے آنے کے کچھ عرصے بعد وہ چلی گئی۔''

''کیا تم نے اسے ملازمت سے فارغ کیا تھا؟''

''تم نے یہ کیوں پوچھا؟''

''اسی نے کہا تھا کہ تم نے اسے نکالا کیونکہ لوگ اس کے کیریکٹر کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ کیا اس کو نکالنے کی یہی وجہ تھی سسٹر جوزف؟'' ایما کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''کیا اسی وجہ سے اسے قتل کیا گیا؟''

www.paksociety.com

''میرے بچے، میں نے اسے نہیں نکالا بلکہ اس نے خود ہی استعفیٰ دیا تھا۔ اس نے مجھے یقین دلایا تھا کہ مستقبل قریب میں اسے کام کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔''

''کام کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی؟'' ایما نے حیرت کے عالم میں یہ جملہ دہرایا۔

''جبکہ ماما اور پاپا میں ہمیشہ اس بات پر لڑائی ہوتی تھی کہ وہ گھر کا خرچ کیسے پورا کریں، میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی سسٹر۔''

''تمہاری ماں کبھی بھی صاف گو نہیں تھی ایما۔ وہ چیزوں کو ہمارے مقابلے میں مختلف انداز سے دیکھتی تھی۔''

''کیا مطلب؟ کیا تم یہ کہہ رہی ہو کہ ماما جھوٹی تھیں؟''

''ایسی کوئی بات نہیں۔ میں یہ تمہیں اس لیے بتا رہی ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہے تم کیا کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ تم چاہتی ہو کہ اپنی ماں کے قاتل کو سامنے لاؤ لیکن انصاف صرف سچ کی بنیاد پر ملتا ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ تم اس معاملے کو پولیس پر چھوڑ دو اور اپنے خاندان کا خیال رکھو۔ انہیں تمہاری ضرورت ہے اور مقدس مریم سے دعا کرو کہ وہ تمہاری رہنمائی اور حفاظت کرے۔''

''میں ہمیشہ دعا کرتی ہوں۔'' ایما نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس کا چہرہ غصّے اور شرم سے سرخ ہو رہا تھا۔

☆☆☆

وہ تینوں جھاڑیوں کی اوٹ سے اس کیمپ کو دیکھ رہے تھے جو خستہ حال خیموں اور ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں پر مشتمل تھا۔ ان کے قریب ہی ایک جنگل تھا جس میں شاہ بلوط اور صنوبر کے درخت سر اٹھائے کھڑے تھے۔

''کیا یہ وہی ہے؟'' کیرولین نے پوچھا۔

ایما اخبار میں چھپی تصویر دیکھ رہی تھی پھر اس کی نظریں اس آدمی پر گئیں، وہ بولی۔ ''نہیں، میرا خیال ہے کہ یہ وہ نہیں ہے۔''

کچھ لوگ اپنے خیموں سے نکل کر ڈگمگاتے ہوئے چل رہے تھے۔ جیسے انہیں سردی لگ رہی ہو اور کچھ سورج کی روشنی سے اپنے جسم کو حرارت پہنچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایما بڑے غور سے آنے جانے والے کو دیکھ رہی تھی۔

''وہ رہا۔'' مائیکل نے ایک آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ایما نے ایک بار پھر تصویر دیکھی اور بولی۔ ''ہاں، یہی ہے۔''

شیلڈن ہینڈ بھی ان لوگوں میں شامل تھا جو سردی سے بچنے اور اپنے جسم کو حرارت پہنچانے کے لیے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چار ہے تھے۔ باقی لوگوں کی طرح اس کی شیو بھی بڑھی ہوئی تھی اور اس نے ڈھیلے ڈھالے بے جوڑ کپڑے پہن رکھے تھے۔

اچانک ہی شیلڈن ایک بوڑھے آدمی سے ٹکرایا پھر اسے دھکا دے کر زمین پر گرا دیا اور اس کی جیبوں کی تلاشی لینے لگا لیکن جب کچھ نہ ملا تو اس نے بوڑھے کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔ وہ بوڑھا مدد کے لیے چلّایا لیکن کسی نے بھی اس پر توجہ نہیں دی۔

ایک ساٹھ سالہ موٹی عورت خیمے سے باہر آئی اور چلاتے ہوئے بولی۔ ''اسے مارو۔ یہ کتیا کا بچہ ہے۔''

شیلڈن نے بوڑھے آدمی کی پسلیوں پر لات ماری اور بچوں کی سمت میں چل دیا۔

''ہم اسے چاقو مارتے ہیں۔'' کیرولین نے کہا جبکہ ان میں سے کسی کے پاس چاقو نہیں تھا۔

''نہیں، سب خاموش بیٹھے رہیں۔ اس نے ہمیں نہیں دیکھا ہے۔'' ایما نے حکم دیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کاش وہ کیرولین کو گھر چھوڑ سکتی۔

مائیکل دوبارہ جھاڑیوں میں چھپ گیا۔ شیلڈن تقریباً ان کے پاس سے گزرنے والا تھا لیکن کیرولین کے سرخ سوئٹر پر نظر پڑتے ہی وہ چونک گیا۔

''اے۔'' وہ چلایا اور جھک کر جھاڑیوں میں جھانکنے لگا۔ ''تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہی ہو؟'' جب کوئی جواب نہ ملا تو اس نے پوچھا۔ ''کیا تمہارے پاس کچھ رقم ہے یا سگریٹ وغیرہ؟ بہتر ہے کہ تم مجھے بتا دو۔''

اس سے پہلے کہ ایما کچھ کہتی، اس نے ان کی جانب بڑھنا شروع کر دیا۔ ''رک جاؤ۔'' ایما نے حکم دیا اور کیرولین کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ ''اگر تم باز نہ آئے تو میرا بھائی تمہارا سر توڑ دے گا۔''

وہ جیسے ہی آگے بڑھا، مائیکل نے ایک درخت کی ٹہنی سے اس کے کندھے پر کاری ضرب لگائی جس سے اس کا توازن بگڑا اور وہ گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھ سکتا مائیکل اس کی طرف لپکا اور ٹہنی اوپر اٹھائی۔

''نہیں۔'' شیلڈن چلّایا۔

''نیچے بیٹھ جاؤ۔'' مائیکل نے کہا۔

''تم کون ہو؟'' شیلڈن نے پوچھا۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

''تمہیں یہ جاننے کی ضرورت نہیں۔'' ایما نے دوبارہ کنٹرول سنبھال لیا۔ ''تمہیں صرف ہمارے سوالوں کا جواب دینا ہے۔ اگر تم نے سچ بتا دیا تو یہ تمہیں مل جائے گی۔'' اس نے وہسکی کی بوتل دکھائی جو وہ اپنے باپ کی ورک شاپ سے لائی تھی۔

''تمہیں مجھ کو مارنے کی ضرورت نہیں۔'' شیلڈن اپنا سوجا ہوا بازو سہلاتے ہوئے بولا۔

''مجھے کچھ پینے دو۔'' اس نے بوتل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''تم سلویا ٹنڈال کو کیسے جانتے تھے؟''

''کون؟''

''وہی عورت جس کا قتل یہیں قریب میں ہوا تھا۔''

''میں اسے نہیں جانتا تھا۔ میں نے پولیس والوں کو بار بار یہ بات بتائی۔ اس سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔''

مائیکل نے مٹھی اوپر اٹھائی اور اسے وارننگ دیتے ہوئے بولا۔ ''بہتر ہوگا کہ تم سچ بتا دو ورنہ میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔''

شیلڈن نے مارے خوف کے چلاّتے ہوئے کہا۔ ''یہی سچ ہے۔ میں نے صرف اسے راستے میں کھڑے ہوئے دیکھا تھا جیسے وہ کسی کا انتظار کر رہی ہو۔''

''کیا تم نے اس سے بات کی تھی؟'' ایما نے اصرار کیا۔

''نہیں، میں اس کتیا سے کیوں بات کرتا؟''

مائیکل نے ایک بار پھر اس کے بازو پر زوردار ضرب لگائی۔ ''اسے ایسا مت کہو۔''

شیلڈن درد سے چلاّتے ہوئے بولا۔ ''تم اس عورت کی اولاد ہو۔ اچھا میں تمہیں سچ بتاتا ہوں۔ میں نے اس سے صرف کچھ رقم مانگی تھی لیکن اس نے مجھ سے کہا کہ دور ہو جاؤ چنانچہ میں وہاں سے چلا آیا۔ بس یہ ہے پوری کہانی۔''

''تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟'' ان کے عقب میں ایک آواز آئی۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہی موٹی عورت ان پر غصہ ہو رہی تھی۔

اس موقع سے فائدہ اٹھا کر شیلڈن اپنے پیروں پر کھڑا ہوا۔ اور دوڑتا ہوا جنگل میں غائب ہو گیا۔ ایما خوف زدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''بھاگو۔''

اس عورت کی نظر وہسکی کی بوتل پر گئی جو گھبراہٹ میں ایما کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ اس نے وہ بوتل اٹھائی اور ان کی روانگی کا جشن منانے لگی۔

☆☆☆

''وہ شخص زخمی بھی ہو سکتا تھا۔'' پولیس آفیسر نے کہا۔

ایما، مائیکل اور کیرولین کی سانس ابھی قابو میں نہیں آئی تھی کہ آفیسر ڈگلس نے ان کے دروازے پر دستک دی ایما نے اپنے بھائی اور بہن کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''میں بات کروں گی۔''

''تمہیں معلوم ہے کہ وہ تم پر الزام عائد کر سکتا ہے۔ ڈگلس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''وہ خود ہماری طرف بڑھا تھا۔'' ایما نے جواب دیا جس میں کچھ سچ شامل تھا۔

''لیکن تم لوگ وہاں کیوں گئے تھے؟ وہ جگہ بچوں کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔''

''ہم اپنی سائنس کلاس کے لیے کچھ پودے لینے گئے تھے۔''

''اس کا کہنا ہے کہ تم نے اس سے اپنی ماں کی موت کے بارے میں سوالات کیے۔ کیا یہ سچ ہے؟''

''جب مجھے محسوس ہوا کہ وہ کون ہے تو ہم نے اس سے کچھ سوالات کیے۔''

''تمہیں معلوم ہے کہ وہ جائے وقوعہ پر موجود نہیں تھا۔'' آفیسر نے بتایا۔ ''کیمپ کے کئی لوگوں کا کہنا ہے کہ جب یہ واقعہ پیش آیا تو وہ اس وقت ان کے ساتھ تھا۔''

''وہ بہت بڑا جھوٹا ہے۔'' کیرولین نے کہا۔

''کیمپ کے لوگ اس سے ڈرتے ہیں۔ وہ وہی کہیں گے جو وہ چاہتا ہے۔'' ایما بولی۔

''یہ تم کیسے جانتی ہو؟''

ایما نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ بولا۔ ''بہرحال تم لوگ اس شخص سے دور رہو۔'' یہ کہہ کر اس نے باری باری تینوں کی طرف دیکھا اور انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری دادی گھر آجائیں تو ان سے کہنا کہ مجھے فون کریں۔''

ایما نے اس کا کارڈ لے کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ دروازے پر رکتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ ہم ابھی تک اس کیس پر کام کر رہے ہیں۔''

اتوار کو عبادت سے فارغ ہونے کے بعد ایما اپنے بھائی اور بہن کے ساتھ چرچ کے عقب میں واقع قبرستان گئی۔ جب وہ اپنی ماں کی قبر پر پہنچے تو وہاں انہیں تازہ گلاب کے پھولوں کا گلدستہ رکھا ہوا نظر آیا۔ ایما نے جھک کر شیشے

Nasir Azeem
www.pakistanipoint.com

کے گلدان میں دیکھا۔ اس کے ساتھ ایک لفافہ منسلک تھا جس میں گل فروش کے نام و پتے کے ساتھ ایک مختصر تحریر تھی۔ ''میں تم سے پیار کرتا ہوں، تم مجھے ہمیشہ یاد آؤ گی۔'' اس تحریر پر کسی کا نام یا دستخط نہیں تھے لیکن یہ اس کے باپ کی ہینڈ رائٹنگ نہیں تھی۔

''یہ کس کی طرف سے ہے؟'' مائیکل نے پوچھا۔

''میں نہیں جانتی۔ اس پر کسی کا نام یا دستخط نہیں ہیں۔'' اس نے جواب دیا اور لفافہ جیب میں رکھ لیا پھر اس نے قبر پر پھول چڑھائے جو وہ اپنے ساتھ لائی تھی۔ اس کے بعد وہ تینوں قبر پر احتراماً خاموش کھڑے رہے۔

اگلے روز ایما نے چھٹی کے بعد مائیکل اور کیرولین کو لائبریری میں چھوڑا۔'' اور خود پھولوں کی دکان پر چلی گئی جو مرکنٹائل اسٹریٹ پر تھی۔

''ہیلو ینگ لیڈی! میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے ہوئے گل فروش نے کہا۔

''کوئی شخص میری ماں کی قبر پر پھولوں کا گلدستہ رکھ گیا ہے لیکن کارڈ پر اپنے دستخط کرنا بھول گیا۔ میرے والد اور میں، اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں لیکن ہمیں اس کا نام یا پتا معلوم نہیں۔ کیا تم اس سلسلے میں ہماری مدد کر سکتے ہو؟''

گل فروش کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''کیا وہ گلدستہ اسی دکان سے لیا گیا تھا؟''

''ہاں۔'' ایما نے تصدیق کی۔ ''اس لفافے سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔''

''ہم روزانہ گلاب کے پھول فروخت کرتے ہیں۔ تمہاری ماں کی تدفین کب ہوئی تھی؟''

''ان کے انتقال کو ایک سال ہو گیا ہے۔ یہ گلدستہ یقیناً ان کی برسی کے لیے لیا گیا ہوگا جو کہ گزشتہ جمعرات کو تھی یا ہو سکتا ہے کہ اختتامِ ہفتہ خریدا گیا ہو کیونکہ پھول بالکل تازہ لگ رہے تھے۔''

اس نے کمپیوٹر پر انگلی چلاتے ہوئے کہا۔ ''تم نے کہا جمعرات؟''

''جمعہ یا ہفتہ بھی ہو سکتا ہے۔''

''ان تین دنوں میں ہمارے پاس صرف چار آرڈر آئے تھے۔'' اس نے اسکرین ایما کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم پہچان لو گی۔ یہ شاید تمہارا کوئی رشتے دار یا پڑوسی ہو سکتا ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' ایما نے کہا پھر چوتھے نام پر اس نے سر ہلا دیا۔

''فرینڈز یا رشتے دار؟'' گل فروش نے پوچھا۔

''فرینڈز۔'' ایما نے تصدیق کی۔ ''مسٹر فشر اور ان کی فیملی کئی برسوں سے ہمارے پڑوسی ہیں۔ اس لیے مجھے ان کا پتا جاننے کی ضرورت نہیں۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔''

دکان سے باہر آتے ہی ایما کو بہت زور کا چکر آیا۔ ایڈن فشر وہی لڑکا تھا جس نے اس کی ماں کے بارے میں نازیبا کلمات کہے تھے اور مائیکل نے مشتعل ہو کر اس کا ہونٹ زخمی کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ فشر فیملی نے اس کی ماں کی تدفین میں شرکت نہیں کی تھی۔ وہ انہیں شاید ہی جانتے ہوں پھر یہ گلدستہ؟

منگل کے روز ان کے باپ کی اسپتال سے چھٹی ہو گئی۔ ایما اور کیرولین اسکول سے آئیں تو وہ گھر آ چکا تھا۔

''ابھی اس سے زیادہ بات نہ کرنا۔'' دادی نے تنبیہ کی۔ ''ڈاکٹر نے کہا ہے کہ سوجن ختم ہونے میں وقت لگے گا۔''

ایما کوئی جواب دیے بغیر باپ کے کمرے میں چلی گئی۔ کیرولین بھی اس کے پیچھے تھی۔ وہ اپنے بستر پر بیٹھا ہوا تھا۔ ایما نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا۔ ''پاپا! میں آپ سے پیار کرتی ہوں، ہم سب آپ سے محبت کرتے ہیں۔''

''مجھے بھی تم سب سے محبت ہے۔'' وہ نحیف آواز میں بولا۔

ایما نے غور کیا کہ اس نے کئی دن سے شیو نہیں کیا اور اس کی آنکھیں بھی سوجی ہوئی تھیں۔ گردن کے گرد بندھی پٹی نے رسی کے نشان چھپا لیے تھے۔

''کیوں پاپا؟'' ایما نے سرگوشی کی۔ ''تم نے ایسا کیوں کیا؟''

اس کے باپ نے سر کو ہلکی سی جنبش دی اور رونا شروع کر دیا پھر دونوں ہاتھوں میں چھپاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے تمہاری ماں یاد آ رہی تھی۔''

''خودکشی کرنا گناہ ہے۔'' کیرولین بولی۔

''ہش۔'' ایما نے اسے جھڑک دیا پھر اس نے اپنے باپ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''تم آرام کرو پاپا۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

وہ کمرے سے باہر آئی۔ تبھی بیرونی دروازہ کھلا اور مائیکل ڈگمگاتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ اس نے ایک ہاتھ سر پر رکھا ہوا تھا اور اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔

''مائیکل!'' ایما چلائی۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

دادی پریشان ہوتے ہوئے بولی۔ ''اوہ، میرے خدا، یہ کیا ہوا؟''

''میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے ایما کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''اسے مسئلہ نہ بناؤ۔'' یہ کہہ کر وہ باتھ روم کی طرف بڑھا۔ دادی اور لڑکیاں اس کے پیچھے تھیں۔ اس نے سر پر پانی بہا کر خون صاف کیا۔ اس کے کان کے نزدیک گہرا زخم آیا تھا۔

''یہ تم نے کیا کر دیا؟'' کیرولین نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''جب میں گھر آ رہا تھا تو کسی نے مجھے پتھر مارا۔''

''کہاں...... وہ کون تھا؟'' ایما نے پوچھا۔

''میں نہیں جانتا۔'' مائیکل نے اعتراف کیا۔ ''وہ سڑک کے کنارے جنگل میں چھپے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں دیکھا۔''

دادی نے اسے ایک گیلا کپڑا دیا اور بولی۔ ''اسے دبا کر زخم پر رکھو۔ میں ہائیڈروجن پرآکسائڈ لے کر آتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ وہ تمہارے باپ کے کمرے میں ہے۔''

''کیا ڈیڈی گھر میں ہیں؟'' مائیکل نے پوچھا۔

ایما نے اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔ ''کیا وہ جگہ کیمپ کے قریب ہے۔''

''ہاں۔''

شام کو ایما، دادی کے پاس گئی۔ وہ لیونگ روم میں آرام کرسی پر بیٹھی گیم شو دیکھ رہی تھی، اس نے ایما کو دیکھ کر کہا۔ ''ہمیں ممی کے بارے میں پولیس کو فون کرنا چاہیے تھا۔''

''تم نے فون کیوں نہیں کیا؟'' ایما نے پوچھا۔

بوڑھی عورت نے کہا۔ ''میں تمہارے ڈیڈی کو پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ پہلے ہی بہت تکلیف جھیل چکا ہے۔''

ایما نے اسے شیلڈن ہینڈ کے ساتھ ہونے والے واقعے کے بارے میں نہیں بتایا تھا اور جب آفیسر ڈگلس نے فون کر کے پیغام چھوڑا تو ایما نے اسے بھی مٹا دیا۔

''تم ماما کو کیوں پسند نہیں کرتی تھیں؟'' ایما نے پوچھا۔

دادی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''یہ تم نے کیسے سوچ لیا کہ میں اسے پسند نہیں کرتی تھی؟''

''تم اسے پسند نہیں کرتی تھیں۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟'' ایما نے اصرار کیا۔

بوڑھی عورت نے مشروب کا گھونٹ لیتے ہوئے ک[illegible] ''میں اپنے بیٹے سے بہت محبت کرتی ہوں اور یہ پسند نہ[illegible] کرتی کہ اسے کوئی تکلیف پہنچے۔''

''اور ہماری ماں ہم سے محبت کرتی تھی۔'' ایما نے جواب دیا۔ ''لیکن اسے پسند نہ کرنے کی وجہ کیا تھی؟''

''جب اس نے جمی کو تکلیف پہنچائی تو میں اسے ناپسند کرنے لگی۔''

''کیسی تکلیف؟''

''کیا تم نہیں جانتیں۔ اب تم اتنی چھوٹی بھی نہیں ہو۔''

''کیا پاپا نے تم سے کچھ کہا تھا؟''

''کیا تم ایسا نہیں سمجھتیں؟ کیا تم نے سوچا کہ اس نے خودکشی کی کوشش کیوں کی تھی؟''

''نہیں۔'' ایما نے جواب دیا۔ ''لیکن مجھے سچ جاننا ہے۔ سسٹر جوزف کہتی ہے کہ سچ کے بغیر تمہیں انصاف نہیں مل سکتا۔''

بوڑھی عورت چند لمحوں تک ایما کو دیکھتی رہی پھر بولی ''میں نے اس سے کبھی نہیں پوچھا اور اگر اس نے کچھ کہا ہے[illegible] میں تمہیں کبھی نہ بتاتی۔''

''اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔'' ایما نے سنا۔ اس ک[illegible] دادی دروازے پر کھڑی کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ ''اور [illegible] ہی مجھے پیغام ملا۔''

ایما اس کی آواز سنے بغیر ہی سمجھ گئی کہ دادی کا مخاطب آفیسر ڈگلس ہے۔ ''ایما، یہاں آؤ اور اپنے بھائی بہن کو بھی ساتھ لے کر آؤ۔''

جب وہ تینوں لیونگ روم میں آئے تو آفیسر نے ای[illegible] سے کہا۔ ''میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھے تمہارے پاپا یا دادی سے بات کرنی ہے۔''

''جی جناب۔'' ایما نے جواب دیا۔ ''لیکن میں بھول گئی۔''

''اس معاملے میں کسی پولیس ایکشن کی ضرورت نہیں۔'' ڈگلس نے دادی سے کہا۔ ''تاہم قاعدے کے مطابق والدین یا سرپرست کو مطلع کرنا ضروری ہوتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ اس واقعے کو نہیں دہرایا جائے گا۔''

دادی نے کہا۔ ''میں کوئی یقین دہانی نہیں کرا سکتی۔ بچے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے پھر مجھے خود ہی کچھ کرنا ہوگا۔'' آفیسر نے مسکراتے ہوئے کہا اور جانے کے لیے مڑا۔

''ایک منٹ۔'' ایما نے اسے روکا۔ ''میں تمہیں کچ[illegible]

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

دلھانا چاہتی ہوں۔''

اس نے گل فروش کی دکان کا لفافہ جیب سے نکالا۔

''یہ کیا ہے؟'' آفیسر نے لفافہ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

''کوئی شخص اسے پھولوں کے گلدستے کے ساتھ ماما لی قبر پر رکھ گیا تھا۔''

آفیسر نے وہ چھوٹا لفافہ کھولا اور اس میں رکھی ہوئی تحریر پڑھنے کے بعد ایما کو دیکھنے لگا۔

''تم یہ مجھے کیوں دے رہی ہو؟'' اس نے ایما سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ اسی شخص نے ماما کو قتل کیا تھا۔''

''تم ایسا کیوں سوچتی ہو ایما؟ اس پر کسی کے دستخط نہیں ہیں۔''

''میں جانتی ہوں کہ یہ کس نے وہاں رکھا تھا۔ وہ مسٹر سٹیفن فشر ہیں۔'' ایما نے جواب دیا۔ اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ ''میرا خیال ہے کہ وہ اور ماما.....''

''سسٹر، خاموش ہو جاؤ۔'' مائیکل بولا۔ ''تم کچھ نہیں جانتیں۔ ماما کے بارے میں کچھ مت کہو۔''

''میں یہ لفافہ اس سراغ رساں کو دے دوں گا جو تمہاری ماں کے کیس پر کام کر رہا ہے۔'' ڈگلس نے کہا۔ ''پھر دادی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''شاید ہمیں بعد میں ایما کو پولیس اسٹیشن بلانا پڑے مسز ٹنڈال۔''

پھول فروش سے تصدیق کرنے کے بعد سراغ رساں نے اسٹیفن فشر کو پوچھ گچھ کے لیے بلا لیا۔ ایما شیشے کی دیوار کی دوسری طرف بیٹھی ہوئی تھی۔ تقریباً گیارہ بجے سب چھوٹے کمرے کا دروازہ کھلا اور سراغ رساں گیون ولف نے باہر آ کر ایما سے کہا۔ ''اس نے اعتراف کر لیا ہے کہ اس کے..... اوہ میرا مطلب ہے کہ وہ تمہاری ماما کو جانتا تھا۔''

ایما کا پورا جسم اکڑ گیا۔ اس کے اعصاب کشیدہ ہونے لگے۔

''لیکن جہاں تک اسے قتل کرنے کا تعلق ہے تو وہ اس سے انکار کر رہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتا۔ اس نے تمہاری ماں کو قتل نہیں کیا ہے۔''

''وہ جھوٹ بول رہا ہے۔'' ایما آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ ''میں شرطیہ کہتی ہوں کہ ماما اس سے قطع تعلق کرنے والی تھی..... اسی لیے اس نے اسے قتل کر دیا۔''

سراغ رساں وولف نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''اس کا بیان ہے کہ اس نے تمہاری ماں سے تعلق ختم کر لیا تھا کیونکہ اس کی بیوی اس بارے میں جان گئی تھی۔''

وولف نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے پاس ایسا کوئی گواہ یا ثبوت موجود نہیں جس سے اس کی جائے وقوعہ پر موجودگی ظاہر ہو سکے۔ اس کے علاوہ جس وقت قتل ہوا وہ اپنی بیوی کے ساتھ تھا۔ ہم اسے جانے کی اجازت دے رہے ہیں۔''

''نہیں۔'' ایما چلائی۔ ''وہ فرار ہو جائے گا۔''

''وہ کہیں نہیں جائے گا۔'' سراغ رساں نے ایما کو یقین دلایا۔ ''اب تم گھر جاؤ، کافی دیر ہو گئی ہے۔''

جب وہ آفیسر ڈگلس کے ہمراہ لابی سے گزر رہی تھی تو اس نے ایک عورت اور لڑکے کو دیکھا۔ ان کے چہرے سرخ ہو رہے تھے اور لڑکے کا ہونٹ سوجا ہوا تھا۔ وہ ایڈن فشر کے ساتھ دو کلاسیں لے چکی تھی اور اس نے اس کی ماں کو بھی پہچان لیا۔ وہ اسے اسکول کی تقریبات اور گرجا میں دیکھ چکی تھی۔ جب ایما ان کے پاس سے گزری تو دونوں نے منہ پھیر لیا۔

رات کے کسی پہر ایما کی آنکھ ایک کھٹکے سے کھل گئی۔ کیرولین اپنے بستر میں خراٹے لے رہی تھی۔ وہ آواز رک رک کر آ رہی تھی۔ ایما سمجھی کہ کیرولین بستر سے اتر کر باتھ روم گئی ہے۔

''کیرولین.....؟'' ایما نیند میں بڑبڑائی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اس کے چہرے اور بالوں کو پریشان کر رہے تھے۔ اس نے کمبل اوپر کھینچ لیا لیکن اسے یاد آیا کہ کھڑکی تو بند تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو محسوس ہوا کہ کوئی نرم اور بڑی چیز اس کے چہرے کو دبا رہی ہے۔ اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ اس نے اپنے بازو اور ٹانگیں چلا کر اس دباؤ سے آزاد ہونے کی کوشش کی لیکن حملہ آور نے اپنا پورا وزن اس پر ڈالا ہوا تھا۔

پھر اچانک ہی وہ دباؤ ختم ہو گیا اور تازہ ہوا ایما کے پھیپھڑوں میں داخل ہوئی تو اس کے حواس بحال ہونا شروع ہوئے۔

''میں نے اس پر ہاکی سے حملہ کیا تھا۔'' کیرولین اپنی بہن کے چہرے پر جھکتے ہوئے بولی۔ اس نے اپنا ہتھیار لہرایا۔ ''اس کا سر پھٹ گیا ہو گا۔''

اس کے عقب والی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور وہاں سے تازہ ہوا کمرے میں آ رہی تھی۔ مائیکل اس پر جھکا ہوا تھا۔ ہال سے دادی کے چلانے کی آواز آئی۔ ''اب کیا ہوا؟''

www.pakistanipoint.com

پاپا لڑکھڑاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ ''کیا ہوا؟''

مائیکل نے چلاتے ہوئے کہا۔ ''کسی نے ایما کو مارنے کی کوشش کی تھی لیکن بھاگ گیا۔ پولیس کو فون کرو ڈیڈی۔''

اس کا باپ ایما کی طرف بڑھا اور اسے بازوؤں میں لے لیا۔ یہ دیکھ کر مائیکل خود فون کرنے چلا گیا۔ ''تم ٹھیک تو ہو؟'' پاپا نے پوچھا۔

ایما نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تبھی مائیکل نے کچن سے آواز لگائی۔ ''پولیس آرہی ہے۔''

''وہ کون تھا؟'' ایما نے کیرولین سے پوچھا۔

''میں نہیں جانتی۔'' اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آیا۔''

☆☆☆

چوبیس گھنٹے میں دوسری بار ایما پولیس اسٹیشن آئی۔ البتہ اس بار پوری فیملی اس کے ہمراہ تھی۔ ان سب کو لابی میں بٹھایا گیا۔ آفیسر ڈگلس نے انہیں اندر نہیں بلایا بلکہ خود ہی ایک کرسی گھسیٹ کر ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ لگتا تھا کہ جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہے۔

''تمہارا فون سننے کے بعد ہم نے شیرف کے دفتر سے سراغ رساں کتے منگوائے۔ انہوں نے تکیے کو سونگھا اور بیڈ روم کی کھڑکی سے باہر کود گئے اور ہمیں سیدھا فشر کے گھر لے گئے۔''

''میں یہ جانتی تھی۔'' ایما نے گہری سانس لی۔

''تم نے اسٹیفن فشر کو گرفتار کر لیا؟'' ایما کے باپ نے پوچھا۔ اسے پھولوں والی بات معلوم ہو چکی تھی۔

''نہیں، ہم نے اسے گرفتار نہیں کیا مسٹر ٹنڈال۔''

''کیوں؟'' ایما چلائی لیکن ڈگلس نے ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''کیونکہ ہم نے اس کے بیٹے ایڈن کو گرفتار کر لیا ہے۔''

ایما اور اس کی فیملی حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''جب ہم وہاں پہنچے تو اس کی کھوپڑی پر ایک بڑا زخم دیکھا۔''

''ہاہا۔'' کیرولین نے نعرہ لگایا۔ ''میں نے اس پر حملہ کیا تھا۔''

مائیکل پھٹ پڑا۔ ''اس کی مجھ سے لڑائی ہوئی تھی۔ اس لیے وہ میری بہن سے بدلہ لینے آگیا۔ میں اسے قتل کر دوں گا۔''

''ہم اس پر کیس بنا رہے ہیں۔'' آفیسر ڈگلس مائیکل کو سمجھایا۔

اس نے باری باری ان سب کو دیکھا اور گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''اس کے علاوہ اس پر تمہاری ماما کے قتل کا بھی الزام ہے۔''

ایما کو یوں لگا جیسے اس کا سانس رک گیا ہو۔ ''کیا.....؟ ماما؟''

''میں ایسا نہیں سمجھتا۔'' اس کے باپ نے کہا۔ ''ایسا کیوں کرتا۔ اس لڑکے نے سلویا کو کیوں قتل کیا ہوگا؟''

''اسے اپنے باپ کے ساتھ مسز ٹنڈال کے تعلقات کا علم ہو گیا تھا۔'' ڈگلس نے بتایا۔ ''اس بات پر اس کے والدین کے درمیان کئی مرتبہ جھگڑا ہوا بلکہ اس کی ماں نے طلاق کی دھمکی بھی دی تھی۔ وہ جان گیا تھا کہ اس کے باپ نے وعدہ کرنے کے باوجود مسز ٹنڈال سے تعلقات ختم نہیں کیے بلکہ وہ انہیں چھوڑنے کا منصوبہ بنا رہا تھا تو اس نے فیصلہ کیا کہ اسے کچھ کرنا چاہیے۔ اس کے بعد جو ہوا، وہ تم سب جانتے ہو۔''

پھر وہ مائیکل سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''اور اس نے تمہیں پتھر مارا تھا۔''

''لیکن اس نے ایما پر حملہ کیوں کیا؟'' مسٹر ٹنڈال نے پوچھا۔

''اس نے ایما کو پہلی بار اسٹیشن میں دیکھا تو یہی سمجھا کہ اسی کی وجہ سے اس کے باپ کو قتل کے سلسلے میں پوچھ گچھ کے لیے پولیس اسٹیشن بلایا گیا ہے اسی لیے وہ ایما کو راستے سے ہٹانا چاہ رہا تھا۔''

''اور اس کے والدین.....؟''

''آج رات تک انہیں معلوم نہیں تھا کہ ایڈن سے کون سا جرم سرزد ہوا ہے۔''

ایما نے اپنے باپ کا کانپتا ہوا ہاتھ پکڑا اور بولی ''میں جانتی تھی کہ تم نے ماما کو کبھی تکلیف نہیں دی۔''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے۔ اسے انصاف مل گیا تھا اور وہ اپنی ماں کے قاتل تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس کا باپ دل میں سوچ رہا تھا کہ کاش یہ کڑوا سچ کبھی سامنے نہ آتا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جس عورت سے اس نے ٹوٹ کر محبت کی، وہ اس سے اس طرح بے وفائی بھی کر سکتی ہے...

❖❖❖

Waqar Azeem
www.paksociety.com

یادیں انتہائی پُراسرار انداز میں زندگی میں سرائیت کرتی چلی جاتی ہیں... انسان اس سے کسی صورت لاتعلقی اختیار نہیں کر پاتا... کیونکہ ان یادوں کے سہارے وہ ان جذبوں کو زندہ رکھتے ہے... جس کے بغیر جینے کا تصور ممکن نہیں... دہشت و خوف کی فضا میں سانس لیتے ایک سنگر کی دردناک کہانی... وحشت و خوف میں ڈوبے لمحات اسے موت سے قریب کر رہے تھے...

بیٹی کی بے وقت موت نے باپ کو ہولناک خطرات سے دوچار کر دیا تھا.....

خوف گزیدہ

انعمہ جمیل

پُراسرار رات میں گہری جامد خاموشی بُکل مارے ہر سُو پھیلی ہوئی تھی۔ سیاہی مائل آسمان پر چمکتا چودھویں کا روشن چاند ریڈ میپل کے گوشے دار پتّوں سے جھانک رہا تھا، گویا ڈیٹرائٹ کے اس مضافاتی اور نسبتاً غیر آباد علاقے میں موجود اس تنہا مکان کا ہر راز جان لینا چاہتا ہو، جس کے در و دیوار سے اداسیاں لپٹی محسوس ہوتی تھیں، اس کے ارد گرد سوائے چند متروکہ املاک کے اور کوئی عمارت موجود نہ تھی۔ مگر درختوں کے جھنڈ نے اس سال خوردہ مکان کو

Saqar Azeem
www.pakistanipoint

چاروں طرف سے ایسے ڈھانپ رکھا تھا جیسے وہ یہاں اس کی حفاظت پر ہی مامور ہوں...... ڈھلوانی چھت والے اس مکان کی اوپری منزل پر دو رہائشی کمرے تھے۔ نچلی منزل پر ایک بڑا لاؤنج تھا جس میں بے حد مختصر اور سادہ فرنیچر رکھا گیا تھا۔ فرش جگہ جگہ سے اُکھڑا ہوا، دیواریں سیلن زدہ اور جانے کتنے برسوں پہلے اپنا رنگ کھو چکی تھیں۔

لیکن اس بوسیدہ مکان کے تہ خانے میں بنی جدید ترین تجربہ گاہ میں ایک الگ ہی دنیا بسی نظر آرہی تھی، جو گھر کے اوپری حصے سے یکسر مختلف تھی۔

یہ ایک مستطیل کمرا تھا جسے تجربہ گاہ کا روپ دیا گیا تھا۔ کمرے کی داہنی دیوار کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھا ایک ادھیڑ عمر شخص اپنے کام میں بُری طرح غرق نظر آرہا تھا۔ اس کے سامنے رکھی میز پر ایک جدید مانیٹر موجود تھا جس پر مختلف تصاویر اور کوڈز دکھائی دے رہے تھے۔ مانیٹر سے کچھ فاصلے پر ایک سیاہی مائل سبز رنگ کی چھپکلی نما مخلوق موجود تھی جو اس وقت بے جان نظر آرہی تھی۔

تجربہ گاہ کی دیواروں پر نصب اسکرینز پر اسی مخلوق کے تھری ڈی ماڈلز کئی زاویوں سے گھومتے دکھائی دے رہے تھے۔ کہیں کسی اسکرین پر کوڈز کی لمبی قطاریں چلتی چلی جارہی تھیں یوں جیسے ہدایت نامہ ہو...

عقبی دیوار پر ایک مشہور امریکی گلوکار کی مختلف تصاویر آویزاں تھیں جن پر موٹے سرخ مارکر سے ''کراس'' کا نشان لگا ہوا تھا۔ ان تصویروں کے ساتھ لٹکتے کیلنڈر پر بھی مختلف تاریخوں پر جابجا سرخ نشانات اور دائرے نظر آرہے تھے۔

کالے رنگ اور چپٹی ناک والے اس شخص کے بال بکھرے ہوئے اور داڑھی بے ترتیبی سے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی گویا کئی دنوں سے ان کو سنوارا نہ گیا ہو۔ ہونٹ پپڑی زدہ، گال پچکے ہوئے مگر پھر بھی اس کے چہرے پر دبا دبا جوش دکھائی دے رہا تھا۔ موٹے عدسوں کی عینک کے پیچھے چھپی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ذہانت کی چمک تو تھی ہی لیکن کچھ اور بھی تھا۔

وہ اور کیا تھا...... اس کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا...

کرب...

ہاں ''کرب'' تھا اُس کی آنکھوں میں...... اور ''جنون'' بھی...... ''کچھ کھو دینے کا کرب...... کچھ کر گزرنے کا جنون......''

وہ پچھلے سولہ گھنٹے سے لگاتار یہاں موجود تھا مگر اس کے وجود پر تھکن کا شائبہ تک نہ تھا۔ کبھی وہ اسکرین پر نظر آنے والے ماڈلز کو دیکھتا پھر کمپیوٹر پر لکھے کوڈز کو...... اس کے ہاتھ میں ایک جدید ٹچ اسکرین ریموٹ کنٹرول تھا جس پر انگلی کی مدد سے وہ کچھ خاکے بناتا...... کوڈز کا اندراج کرتا...... ایک نظر میز پر پڑی مخلوق پر ڈالتا اور پھر سے کسی نئے زاویے سے اس کی جانچ پڑتال کرنے کے لیے جوڑ توڑ میں مصروف ہو جاتا۔

اسی مشق کو دہراتے ہوئے اس نے ایک بار پھر ہاتھ میں پکڑے آلے پر انگلیاں پھیری تھیں۔ اب کی بار مردہ وجود میں جیسے جان پڑ گئی اور ایک ہلکی سی آواز پیدا کرتے ہوئے اس بدہیئت وجود نے اپنی آنکھیں کھولیں...... اس کی بے نور آنکھوں سے پھوٹتی سرخ روشنی اب جلنے بجھنے لگی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے انگارے دہک رہے ہوں۔

کچھ سوچتے ہوئے اس شخص نے مانیٹر کا ڈسپلے بدلا۔ اب وہاں اسی امریکن سنگر کی تصویر دکھائی دے رہی تھی جس کی تصاویر دیوار پر بھی آویزاں تھیں۔

جیسے ہی اس چھپکلی کی نظر سامنے مانیٹر پر نظر آتی تصویر پر پڑی، ایک کلک کی آواز کے ساتھ اس نے انگڑائی لی اور آن کی آن میں وہ ایک بہت بڑے کموڈو ڈریگن کا روپ دھار چکی تھی۔ چار انچ کی دکھائی دینے والی چھوٹی سی بے ضرر چھپکلی اب چار فٹ کا جسم لیے اپنے غیظ وغضب کے ساتھ چنگھاڑ رہی تھی۔ ڈریگن کی چنگھاڑ نے اس کے موجد کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی تھی...... بالآخر وہ اپنے مشن کی تکمیل کے پہلے مرحلے کو سر کر چکا تھا۔

سات سال کی انتھک محنت کے بعد وہ ایک بایونک روبوٹ بنانے میں کامیاب ہو چکا تھا جو مصنوعی ذہانت کو استعمال کرتے ہوئے اپنی ہیئت بدلنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس روبوٹ کی خاص بات یہ تھی کہ یہ بالکل اصلی چھپکلی جیسا دکھتا تھا، اور اپنی ظاہری جسامت سے کئی گناہ بڑے جسم میں خود کو ڈھال سکتا تھا۔ مزید یہ کہ بغیر کسی بیرونی ہدایات کے، ایک خودکار نظام کے تحت واپس اپنی شکل میں آسکتا تھا۔

اُس شخص کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ گہری ہوتی چلی گئی۔

☆☆☆

''آ آ آ......'' رات کی خاموشی کو ایک دلخراش نسوانی چیخ نے توڑا تھا۔ ولیم جو سونے کے لیے لیٹا ہی تھا، چیخ سن کر بھاگتا ہوا ایما کے کمرے کی طرف آیا۔

ایما اپنے کمرے کی داخلی دیوار کے ساتھ لگی تھر تھر

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

کانپ رہی تھی۔

''کیا ہوا ایما؟'' اس نے پریشانی سے پوچھا۔

باپ کو دیکھتے ہی وہ اس کے سینے سے آ لگی۔ خوف کی شدت سے اس کی سانسیں بے ترتیب اور چہرے کا رنگ زرد ہو چکا تھا۔

اس نے بمشکل سامنے کی طرف اشارہ کیا۔ ایما کی انگلی کے اشارے کے تعاقب میں ولیم نے نظر دوڑائی تو کھڑکی کے نیچے فرش پر ایک موٹی تازی چھپکلی رینگتی ہوئی دکھائی دی جو سرکتے ہوئے ان ہی کی طرف آ رہی تھی۔

ولیم نے ایما کو دیکھا، اس کے چہرے پر ابھی بھی دہشت کے آثار تھے۔ شہد رنگ آنکھوں میں وحشت ہلکورے لے رہی تھی اور دل کی دھڑکن بے قابو تھی۔ ولیم نے اس کے لرزتے وجود کو پشت سے سہلایا...... اسے کرسی پر بٹھا کر خود ایک چھڑی کی مدد سے چھپکلی کو اٹھایا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

ایما کرسی پر بیٹھی چہرہ گھٹنوں میں چھپائے اپنے خوف پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔

ولیم نے چھپکلی کو ٹھکانے لگانے کے بعد کچن سے پانی کی بوتل لا کر ایما کے منہ سے لگائی جسے وہ ایک ہی گھونٹ میں خالی کر گئی۔ ولیم کچھ دیر تک اس کو خود سے چمٹا کر سہلاتا رہا۔ آہستہ آہستہ اس کے جسم کی لرزش میں کمی آ رہی تھی مگر سانس ابھی بھی پھولی ہوئی بے ترتیب سی تھی۔ خوف اس کے پورے وجود میں سرایت کر چکا تھا جس کے اثر کو زائل ہونے میں کچھ وقت لگنا تھا۔

''اب نہیں وہ یہاں...... میں نے نکال دیا ہے اُسے......'' اس نے ایما کا بازو سہلاتے ہوئے کہا تو ایما نے سر آہستگی سے ہلا دیا۔

''شاید کوئی کھڑکی کھلی رہ گئی ہو...... میں صبح ہوتے ہی گھر کی سب کھڑکیوں اور دروازوں کے سوراخ پھر سے چیک کرتا ہوں۔'' ولیم نے خود کلامی کی۔ ایما آنکھیں بند کیے اس کے سینے سے لگی بیٹھی رہی۔

''چلو، اب سو جاؤ، کچھ دیر آرام کرو گی تو طبیعت سنبھل جائے گی۔'' اس کو بیڈ پر لٹا کر ولیم اب اس کے بال سہلا رہا تھا۔

ایما کے چہرے پر سکون پھیلنے لگا تھا۔ اس نے متشکر نگاہوں سے ولیم کو دیکھا۔

''گڈ نائٹ!'' ولیم کے لہجے میں بے پناہ شفقت تھی۔ پھر ایما کے پاس سے اٹھتے ہوئے وہ اس کے ماتھے پر بوسہ دے کر وہاں سے چلا آیا۔

ولیم کے جانے کے بعد ایما نے آنکھیں موند لیں...... تھوڑی دیر کی تگ و دو کے بعد نیند اس پر حاوی ہو گئی۔ اس نے خود کو سکون کی وادیوں میں اترنے دیا کیونکہ صبح اس کو جلدی اٹھنا تھا۔ کل ان کے کالج میں اسٹوڈنٹ میوزیکل شو تھا جہاں اسے بھی اپنی پرفارمنس دینا تھی جس کے لیے پچھلے ایک ہفتے کی محنت سے اس نے ایک خوبصورت دُھن تیار کی تھی۔ اسے امید تھی کہ اس دُھن کو یقیناً سراہا جائے گا۔

ایما جیکسن، مقامی کالج سے میوزک کمپوزیشن اور سنگنگ میں ڈگری حاصل کر رہی تھی۔ میوزک اس کا جنون تھا اور سُر اس کی زندگی...... وہ اپنے کام میں اس قدر ماہر تھی کہ سننے والے حیرت میں مبتلا ہو جاتے کہ جانے کتنے برسوں کی ریاضت کے بعد اس نے یہ اوجِ کمال حاصل کیا ہے۔ ساز کے تاروں سے کھیلنا اس کا دل پسند مشغلہ تھا۔ اس کی زندگی کی ناآسودگی اور غم، گویا دل گداز دُھنوں کی صورت اس کی انگلیوں پر سسکتے تھے...... ماں کی وفات اور باپ کی مصروف زندگی نے اسے تنہا کر دیا تھا...... فطرتاً بھی وہ ایک کم گو لڑکی تھی جس کے دوست تقریباً نہ ہونے کے برابر تھے۔ باپ سے محبت اور شفقت کا رشتہ تو ضرور تھا مگر اسے محبت کے اظہار کے مواقع بہت کم میسر آتے تھے۔ پھر اس نے خود کو خود میں اور میوزک میں گم ہو جانے دیا اور بس وہی اس کا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔ میوزک اس کی چاہت تھی اور ایک پروفیشنل میوزیشن بننا اس کا خواب...... کبھی کبھی اس کو ایسا لگتا کہ جیسے وہ بس اسی خواب کی تعبیر پانے کے لیے زندہ ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس معصوم چاہت نے اس کے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے کر اس قدر شدت سے جکڑ لیا تھا کہ اسے لگنے لگا کہ جس دن میوزک اس کی زندگی سے نکل گیا تو وہ شاید زندہ نہ رہے۔

ایما کا اسکول میں آخری سال تھا، عنقریب اسے ڈگری ملنے والی تھی...... یعنی منزل بس کچھ ہی دور تھی۔ وہ منزل جس کے لیے اس نے ہر رات دن...... سوتے جاگتے...... سپنے بُنے تھے۔

☆☆☆

راک آج کے کانسرٹ کی دھواں دھار پرفارمنس کے بعد واپس ہوٹل کے کمرے میں آ چکا تھا۔ اس کا ایونٹ آرگنائزر جارڈن بھی اس کے ساتھ تھا۔

''آج تو تم نے کمال کر دیا راک...... سارا مجمع پاگل ہو رہا تھا۔'' جارڈن نے گرمجوشی سے کہا۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

حال ہی میں راک نے اپنا دوسرا میوزک البم ریلیز کیا تھا جس نے اسے شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا تھا۔

سگریٹ کا لمبا کش بھرتے ہوئے راک نے ایک نظر جارڈن کو دیکھا اور دھیمے سے مسکراتے ہوئے سگریٹ کے دھوئیں کو فضا میں چھوڑا۔

''جارڈن تم نہیں جانتے کہ میں پیدائشی سنگر ہوں...... یعنی راک موسیقی کی دنیا کا بے تاج بادشاہ ہے۔''

اس کے اس طرح کہنے پر جارڈن ہنس دیا۔

اس نے رشک بھری نگاہوں سے راک کو دیکھا...... لمبا قد، سرخی مائل بے حد گوری رنگت، کندھوں کو چھوتے سنہری گھنگریالے بال، نیلی آنکھوں پر لگا کالے رنگ کا چوکور فریم کا چشمہ اور چہرے پر سجی خشخشی داڑھی......

بلاشبہ وہ بے حد وجیہہ تھا اور اس میں بھی کوئی شک نہ تھا کہ زیادہ تر لوگ اس کی آواز کے بجائے اس کی مقناطیسی شخصیت اور دلکش اداؤں پر مرتے تھے۔

''بادشاہ سلامت! اب آپ آرام کیجیے...... میں چلتا ہوں۔ کھانا بھجواؤں آپ کے لیے؟'' جارڈن نے خوشامدی انداز میں کہا تو راک کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''ہاں پلیز......! بس کچھ ہلکا پھلکا سا......''

راک کے کہنے پر جارڈن سر ہلاتا باہر نکل گیا۔

کچھ ہی دیر میں ویٹر ایک ٹرے میں کھانا لے آیا تھا۔

''سر کچھ اور چاہیے؟'' ویٹر نے کھانا میز پر چنتے ہوئے اس سے استفسار کیا۔

چینل بدلتے ہوئے، راک نے سرسری نگاہ اس بوڑھے ویٹر پر ڈالی اور سر نفی میں ہلایا۔

ویٹر جس تیزی سے آیا تھا اسی سرعت سے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد راک نے کھانا کھایا اور لائٹ بند کر کے سونے کے لیے لیٹ گیا۔ وہ مکمل اندھیرے میں سونے کا عادی تھا۔ کچھ سفر کی تھکاوٹ تھی اور کچھ آج کے کامیاب شو کی سرشاری...... اس کو جلد ہی نیند نے آگھیرا۔

ابھی اسے سوئے ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ کسی احساس کے تحت اس کی نیند ٹوٹی...... اسے اپنی گردن پر کسی سخت شے کا لمس محسوس ہوا تھا۔ عجیب گدگداتا ہوا، مگر نکیلا سا...... ہڑبڑا کر اس نے آنکھیں کھولیں اور ہاتھ بڑھا کر دائیں طرف موجود سائڈ لیمپ روشن کیا۔

ملگجی روشنی میں جو منظر اس نے دیکھا، وہ اس کے ہوش اُڑانے کے لیے کافی تھا۔ بائیں طرف ایک بہت بڑا کموڈو ڈریگن اس پر تقریباً جھکا ہوا، اپنا وزن اگلے پیروں پر ڈالے، اپنی دو منہا زبان سے اس کی گردن چاٹ رہا تھا۔ ڈریگن کی آنکھیں انگاروں کے مانند دہک رہی تھیں۔ راک نے بے یقینی سے اس کریہہ مخلوق کو دیکھا...... سنسنی کی ایک لہر اس کے پورے جسم میں دوڑ گئی...... زبان تالو سے جا چپکی...... ہمت مجتمع کر کے اس نے سرہانے رکھا الارم بجایا...... کموڈو ڈریگن الارم کی آواز سنتے ہی تیزی سے واپس پلٹا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ راک نے اس کے ہٹتے ہی بیڈ سے چھلانگ لگائی، ساری بتیاں روشن کیں اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ لیکن وہاں کسی ایسی شے کا وجود نہیں تھا۔ الارم کی آواز سنتے ہی اگلے چند لمحوں میں سیکیورٹی ٹیم اس کے کمرے میں آ چکی تھی۔

''سب ٹھیک ہے سر؟'' سیکیورٹی آفیسر نے راک کے چہرے پر ہوائیاں اُڑتی دیکھ کر پریشانی سے پوچھا۔

''یہاں...... کموڈو...... ڈریگن...... دیکھا میں نے...... یہاں تھا وہ...... میرے سر پر......'' راک نے بیڈ کراؤن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہکلا کر کہا۔

آفیسر کے چہرے پر حیرت پھیلی۔ ''کموڈو ڈریگن یہاں کیسے آسکتا ہے سر؟ آپ نے یقیناً کوئی خواب دیکھا ہو گا۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو آفیسر؟ میں جھوٹ بول رہا ہوں؟ جب میں کہہ رہا ہوں کہ یہاں کموڈو ڈریگن تھا...... میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اُسے...... تو آپ لوگ یقین کیوں نہیں کر رہے؟'' راک نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔ وہ اپنی گردن مسل رہا تھا جہاں ابھی تک اس کریہہ ڈریگن کی زبان کا لمس محسوس ہو رہا تھا۔

''لیکن سر پھر وہ کہاں غائب ہو گیا؟ یہاں تو ایسا......'' آفیسر نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی مگر راک نے اس کی بات کاٹ دی۔

''میں کچھ نہیں جانتا...... مجھے اس کمرے میں نہیں رہنا اب...... بلکہ اس ہوٹل میں ہی نہیں رہنا...... آپ میرے لیے دوسرے ہوٹل کا بندوبست کریں۔''

''اوکے سر! جیسے آپ کہیں......'' راک نے تحکم آمیز لہجے میں کہا تو آفیسر بے بسی سے سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔

آدھے گھنٹے بعد راک کو دوسرے ہوٹل میں شفٹ کر دیا گیا۔

کل رات اسی شہر میں اس کا دوسرا شو تھا، اس نے سوچا تھا کہ وہ دن بھر آرام کرے گا تا کہ شو کے لیے تازہ دم ہو سکے...... لیکن اس کموڈو ڈریگن نے اس کی نیندیں اُڑا دی

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

تھیں۔

وہ جانتا تھا کہ جو کچھ اس نے دیکھا، وہ خواب نہیں تھا۔ سچ مچ ایک کریہہ شکل اور خوفناک ڈریگن اس کے سر پر کھڑا اس کی گردن چاٹ رہا تھا۔ اس نے ایک جھرجھری لی۔

راک نے آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کی لیکن جیسے ہی وہ آنکھیں بند کرتا، اسے لگتا اس کی گردن پر کچھ رینگ رہا ہے۔

''عجب مصیبت ہے۔'' تنگ آ کر وہ اٹھ بیٹھا۔

''شاید میں نے اسے اپنے حواسوں پر کچھ زیادہ ہی سوار کر لیا ہے۔'' سر جھٹک کر اس نے ٹی وی کا ریموٹ اٹھایا اور چینل بدلنے لگا۔

کچھ دیر بعد اکتا کر اس نے ٹی وی بند کیا اور پھر سے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اب کی بار اس نے نیند کی ایک گولی لینا مناسب سمجھا تھا اور اس بار وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔

☆☆☆

نیند..... ولیم جیکسن کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ اب سنجیدگی سے ایما کے بگڑتے ہوئے فوبیا کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

ماضی کا وہ واقعہ اپنی پوری جزئیات کے ساتھ اس کے ذہن کے پردے پر روشن ہوا تھا۔ ایما تب تین سال کی تھی۔ اس رات وہ ایما کو سلا کر اپنے کمرے میں آیا، اپنے لیے کافی بنائی اور کوئی کتاب کھول کر بیٹھا ہی تھا کہ اس کو ایما کے چیخنے کی آواز آئی۔ وہ گھبرا کر اٹھا اور اس کے کمرے میں گیا تو ایما بیڈ سے نیچے اتر کر آنکھیں بند کیے زور زور سے چلاتی نظر آئی۔

ولیم کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ سو رہی تھی جب کوئی چیز اس کے اوپر آ گری۔ آنکھ کھلنے پر اس نے دیکھا کہ بیڈ پر ایک چھپکلی رینگ رہی تھی اور وہ اس سے خوفزدہ ہو کر چلاتی تھی۔

ولیم نے پورا کمرا چھان مارا مگر اسے چھپکلی کہیں نظر نہیں آئی۔ مگر ایما بہت ڈر گئی تھی۔

تب سے چھپکلیوں کا خوف ایما کے دل میں ایسا سرایت کر گیا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ خوف ختم ہونے کے بجائے بڑھتا ہی چلا گیا اور باقاعدہ فوبیا کی صورت اختیار کر گیا۔

ایما جب بھی کہیں چھپکلی دیکھ لیتی تو یونہی ڈر جاتی، کبھی تو جلد ہی اس کی طبیعت سنبھل جاتی اور کبھی کبھار اس حد تک خوفزدہ ہو جاتی کہ پھر کئی کئی دن اسی خوف میں مبتلا رہتی..... اسے لگتا ابھی کہیں سے کوئی چھپکلی آ جائے گی۔ اس حادثے کے بعد سے ولیم بہت احتیاط کرتا۔ کوئی چھوٹے سے چھوٹا سوراخ بھی ہوتا تو بند کر دیتا تاکہ کوئی چھپکلی سانپ وغیرہ گھر کے اندر نہ آ سکے۔ آج بھی جانے کہاں سے یہ چھپکلی اندر گھس آئی تھی۔

بچپن میں ایک دو بار وہ ایما کو ماہرِ نفسیات کے پاس بھی لے کر گیا تھا۔ اس کو لگا وقت کے ساتھ ساتھ یہ خوف دور ہو جائے گا۔ اس لیے اس نے اسے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اس کو اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ یہ خوف ایما پر اس حد تک حاوی ہو چکا ہے۔ ولیم کو اپنی بے پروائی پر افسوس بھی ہو رہا تھا۔ ایما کی ماں کے گزر جانے کے بعد اس نے صرف ایما کی خاطر کسی دوسری عورت کو اپنی زندگی میں جگہ نہیں دی تھی۔ وہ ایما سے بے حد محبت کرتا تھا اور اپنے تئیں اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتا۔ مگر شاید وہ جذبوں کے لفظی اظہار میں کبھی بھی اتنا اچھا نہیں رہا تھا اس لیے ایما کو بھی اندازہ نہیں ہو سکا کہ اس کا باپ اس سے کتنی محبت کرتا ہے۔ ولیم کو اپنی کوتاہی کا احساس شدت سے ہو رہا تھا اسی لیے اس نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ ایما کو اس خوف سے نجات دلا کر ہی رہے گا۔

☆☆☆

صبح اٹھنے پر ایما کی طبیعت بحال ہو چکی تھی اور وہ خود کو بہتر محسوس کر رہی تھی۔

تیار ہونے کے بعد اس نے میز پر رکھے اپنے نئے گٹار کو اٹھایا۔ ابھی پچھلے مہینے ہی اس کی سالگرہ پر ولیم نے اس کو یہ خوبصورت گٹار تحفے میں دیا تھا۔

اس نے ہولے سے گٹار کے تاروں کو چھیڑا..... انگلیوں کی جنبش سے تار جھنجھنا اٹھے اور مدھر ساز پورے کمرے میں بکھر گئے..... اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی تھی۔

''Today is my day!''

گٹار کو چومتے ہوئے اس نے سرگوشی کی..... پھر احتیاط سے گٹار کو کیس میں ڈالا اور کندھے پر لٹکا کر کمرے سے باہر نکل آئی۔

ولیم ناشتے کی میز پر اس کا منتظر تھا۔

''مارننگ ڈیڈ!'' کرسی گھسیٹتے ہوئے ایما نے کہا اور ایک نظر ولیم کو دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''مارننگ! کیسا ہے میرا بچہ؟'' ولیم کے چہرے پر اب بھی پریشانی کے آثار موجود تھے۔ وہ اس کے لیے فکر

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

مند نظر آ رہا تھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں ڈیڈ.....!'' چہرے پر بشاشت لاتے ہوئے ایما نے جواب دیا۔

آملیٹ کے ٹکڑوں کو کانٹے میں پھنسا کر اس نے جلدی جلدی نگلا اور ایک ہی سانس میں اورنج جوس کا گلاس خالی کر کے تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''چلتی ہوں.....'' اس نے کرسی کو پیچھے دھکیلتے ہوئے عجلت بھرے انداز میں کہا۔

''خداوند تمہیں ٹھیک رکھے.....'' ولیم نے زیرِ لب دعائیہ انداز میں کہا تو وہ ٹھٹک کر رکی پھر دھیرے سے چلتے ہوئے اس کے قریب آئی۔

''آئی لو یو ڈیڈ.....!'' ایما نے اپنی بانہوں کو ولیم کے گرد پھیلا کر اس کے دائیں گال پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

''آئی لو یو ٹو مائی چائلڈ.....'' ایک شفیق مسکراہٹ ایما کی طرف اچھالتے ہوئے ولیم نے کہا۔ ایما کے اس طرح کہنے پر ولیم کے چہرے پر خوشگوار حیرت در آئی تھی۔ ایما شاید اس کو اپنی طرف سے مطمئن کرنا چاہتی تھی.....

ولیم کو مسکراتا دیکھ کر ایما کے چہرے پر بھی سکون اترنے لگا۔ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی اور پھر جلدی سے میز پر رکھی نوٹ بک اٹھا کر خدا حافظ کہتی ہوئی باہر نکل گئی جبکہ ولیم یہ سوچ کر رہ گیا کہ ''رشتہ کوئی بھی ہو.....اس رشتے میں موجود محبت کو اگر اظہار کا پانی ملتا رہے تب ہی وہ سرسبز رہتا ہے.....''

☆☆☆

''کیا تم تیار ہو راک؟'' جارڈن نے اس سے پوچھا۔

''آف کورس!'' میک اپ کو آخری ٹچ دیتے آرٹسٹ کو اس نے ہاتھ سے ''بس'' کہتے ہوئے جارڈن سے کہا اور اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''آل دا بیسٹ.....!'' جارڈن اسے اشارہ کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

شو شروع ہونے..... والا تھا..... ہال تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ہر طرف سے جیسے رنگ و بُو کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ یہ ڈیٹرائٹ شہر کا ایک مشہور ہال تھا..... جہاں آج کی رات وہ اپنے میوزک اور آواز کا جادو جگانے والا تھا۔

اسٹیج کو ایل ای ڈیز، گرافکس اور رنگا رنگ لائٹس کی مدد سے بے حد منفرد اور خوبصورت طریقے سے سجایا گیا تھا۔ شو کا میزبان راک کو اسٹیج پر بلا چکا تھا۔ گلے میں گٹار لٹکائے وہ بیک اسٹیج سے نمودار ہوا تو ہر طرف سے اس کے نام کی پکار بلند ہونے لگی..... اسپاٹ لائٹ راک پر ہی مرکوز تھی۔ سفید روشنی کے ہالے میں چلتا ہوا وہ اسٹیج کے اگلے کنارے تک آیا۔ چہرے پر مسکراہٹ رقصاں تھی۔ ہر کوئی ہاتھ اٹھا اٹھا کر اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس نے گٹار کے تاروں کو ہلکی سی جنبش دی..... مدھر ساز بج اٹھا۔ ہجوم کی طرف سے تالیوں کا ایک اور شور بلند ہوا تھا..... تالیوں کی گونج تھمی تو اس نے ایک ادا سے اپنے بائیں ہاتھ کی دو انگلیوں سے اپنے لبوں کو چھوا اور مجمع کی طرف اچھال کر وکٹری کا نشان بنایا۔ تماشائی اس کی اس ادا پر بھی مرمٹے تھے۔

اس نے پرفارم کرنا شروع کیا تو ہال میں فسوں پھیل گیا۔ راک کی دلکش شخصیت کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا..... جس نے اس کے مداحوں کو مسحور کر دیا تھا.....

ایک سیشن مکمل ہوا تو وہ بریک کے لیے بیک اسٹیج آ گیا۔ آدھے گھنٹے بعد دوسرا سیشن تھا۔

بیک اسٹیج پر سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ وہ سگریٹ سلگائے نسبتاً پُرسکون گوشے کی جانب بڑھ گیا۔ سگریٹ کے دوسرے کش پر ہی اسے اچانک اپنے کندھے پر کسی شے کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے ہاتھ مار کر اس کو جھٹکا..... ایک چھوٹی سی چھپکلی اس کے کندھے سے اچھل کر دور جا گری تھی..... اس چھپکلی کی آنکھیں انگاروں کے مانند سرخ تھیں..... بالکل اس کموڈو ڈریگن جیسی..... اور وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسے ہی گھور رہی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا..... راک کو لگا یہ ابھی ڈریگن کا روپ دھار لے گی۔

اس کی نیلی آنکھوں میں خوف کے سائے لرزنے لگے۔ وہ اس صورتِ حال کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ اچانک ہی اس کا سر چکرانے لگا، شدید متلی محسوس کرتے ہوئے وہ واش روم کی طرف بھاگا۔ وہاں ایک بار پھر اس کو اسی سرخ آنکھوں والی چھپکلی نما مخلوق کا سامنا کرنا پڑا۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس چھپکلی نے کموڈو ڈریگن کا روپ دھار لیا..... خوف کی شدت نے راک کو مفلوج کر ڈالا تھا۔ وہ ڈریگن کسی خون آشام بلا کی طرح برق رفتاری سے اس کی طرف بڑھنے لگا۔ راک متوحش سا ہو کر واپس پلٹنا مگر جانے کس چیز سے ٹھوکر کھا کر نیچے فرش پر جا گرا۔ ڈریگن نے آن کی آن میں اپنے اگلے پنجے کسی آہنی شکنجے کی طرح اس کی گردن میں پیوست کر دیئے۔ راک کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس نے پوری قوت سے اس بلا کو پیچھے دھکیلا..... اگلے ہی پل وہ

www.paksociety.com
Waqar Azeem

ڈریگن ایک چھوٹی سی بے ضرر چھپکلی کی شکل میں واپس آ چکا تھا اور اس سے پہلے کہ راک کسی کو مدد کے لیے پکارتا وہ چھپکلی پلک جھپکتے میں نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ راک چلاتا ہوا باہر بھاگا اور سامنے آتے جارڈن سے ٹکرا گیا۔

”تم ٹھیک ہو راک؟“ جارڈن نے اس کی یہ حالت دیکھی تو پریشانی سے پوچھا۔

”نہیں...... وہ چھپکلی...... ڈریگن......“ الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے منہ سے نکلے تھے۔

”اوہ کم آن راک......! کیا بچوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔ پھر سے وہی ڈریگن...... لگتا ہے آج کچھ زیادہ ہی چڑھ گئی ہے تمہارے دماغ کو...... آؤ میرے ساتھ......“ جارڈن نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔ وہ جانتا تھا راک کو مے نوشی کی عادت ہے۔

”نہیں میں نہیں جا سکتا جارڈن...... پلیز......!“ وہ پیچھے ہٹتا ہوا کرسی پر جا بیٹھا۔

راک کے چہرے پر دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی سانسیں بے ترتیب تھیں جیسے نہ جانے کتنی دیر بھاگتا رہا ہو۔

”وہ بلا وہاں بھی ہو گی...... وہ مجھے مار ڈالے گی جارڈن......! وہ مجھے مارنا چاہتی ہے۔“ وہ منمنایا۔

”راک! تم ضرورت سے زیادہ حساس ہو رہے ہو...... سنبھالو خود کو...... کوئی ڈریگن یہاں کیسے آ سکتا ہے...... اور پھر یہاں اتنے لوگ ہیں وہ کسی اور کو نظر...... کیوں نہیں آیا......؟“ جارڈن نے جیسے ناک سے مکھی اڑائی۔

”مجھے نہیں معلوم...... مجھے لگتا ہے وہ مجھے تنہا دیکھ کر آتا ہے...... جیسے اسی موقع کی تاک میں ہو......“ راک نے بے بسی سے کہا۔

”تماشائی تمہارے منتظر ہیں راک......!“ جارڈن اس سے زیادہ اس کی بے سروپا باتیں برداشت نہیں کر سکتا تھا اس لیے اسے کہتا ہوا واپس جانے کے لیے مڑ گیا۔

”م...... م...... مت...... جاؤ...... میرے پاس ہی رہو...... وہ ڈریگن آ جائے گا پھر سے......“ وہ بدحواسی کے عالم میں جارڈن کی آستین کھینچتا ہوا بولا۔

”دیکھو راک! تم جانتے ہو اس طرح کانسرٹ کو ختم نہیں کیا جا سکتا...... اسپانسرز نے اتنا پیسا لگایا ہے تم پر...... تم یہ شو ادھورا کیسے چھوڑ سکتے ہو......“ جارڈن اب پروفیشنل انداز میں اس سے بات کر رہا تھا۔ آج کا شو اس کو خاک ہوتا نظر آ رہا تھا۔

”کچھ بھی کرو جارڈن......! کچھ بھی کہو...... لیکن میں اس حالت میں کیسے آڈینس کے سامنے جا سکتا ہوں......؟ تم خود سوچو......“ راک کے لہجے میں انتہا کی لاچاری تھی۔

جارڈن کو اسپانسرز اور آڈینس کی ناراضی کا ڈر تھا لیکن راک کی حالت دیکھتے ہوئے اس نے اس کی بات ماننے کا فیصلہ کر لیا۔

تماشائیوں سے معذرت کر لی گئی تھی۔ یہ شو جس شاندار طریقے سے شروع ہوا تھا۔ اس کا اختتام اتنے ہی بھونڈے انداز میں ہوا تھا۔ پانچ سال میں پہلی بار راک کا شو ناکام ہوا تھا۔ اس خبر نے اخباروں کی شہ سرخی بنتے دیر نہیں لگائی تھی۔

☆☆☆

ایما نے اپنی بنائی ہوئی دُھن اسٹوڈنٹ شو میں بھی سب کے سامنے پیش کر کے خوب داد سمیٹی تھی...... اور اب اپنے انسٹرکٹر سر ایرک کی فرمائش پر ایک بار پھر پوری کلاس کے سامنے اس کو دہرایا تھا۔ اس نے جیسے ہی دُھن مکمل کی، بے ساختہ سر ایرک نے تالی بجائی......

”خوبصورت...... بے حد خوبصورت......“ کلاس روم تالیوں کی آواز سے گونج اٹھا تھا۔

سر ایرک کو اس کی دُھن بے حد پسند آئی تھی، ان کا کہنا تھا کہ ایما کی انگلیوں میں جادو ہے۔ وہ پُرامید تھے کہ آنے والے چند سالوں میں دنیائے موسیقی میں ایما کا ستارہ بامِ عروج پر ہوگا۔

سر نے پوری کلاس کے سامنے اس کی تعریف جن الفاظ میں کی تھی، وہ اسے ہواؤں میں اُڑانے کے لیے کافی تھی۔

اس کی معصوم، شہد رنگ آنکھوں میں بے پناہ چمک اُمڈ آئی تھی۔ چہرے پر پھیلے رنگوں پر خوبصورت تتلی کے چمکیلے پروں کا گماں ہو رہا تھا۔ اس نے تمام ستائشی جملے اپنا حق سمجھ کر وصول کیے تھے۔

”کچھ نازک مزاج تتلیاں آج کل زیادہ ہی ہواؤں میں اُڑ رہی ہیں۔“ سر ایرک کے کلاس سے نکلتے ہی یہ جملہ اس کے کانوں میں پڑا تھا۔ آواز پیچھے سے آئی تھی، اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ اس آواز کو اچھی طرح پہچانتی تھی...... اور یہ بھی جانتی تھی کہ یہ اسی کے لیے کہا گیا ہے۔

”لیکن تتلیوں کو اس بات سے بے خبر نہیں ہونا چاہیے کہ ان کے رنگ اترتے دیر نہیں لگتی...... ایک چٹکی میں مسلا جا سکتا ہے ان کو......“ لہجے میں تمسخر سموئے ایک بار پھر سے کہا گیا...... اور اس کے ساتھ ہی ایک بلند قہقہہ فضا میں بلند ہوا

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

تھا۔

وہ رابرٹ کیمرون تھا..... اس کا کلاس فیلو..... بظاہر وہ اپنے دوست جان سے بات کرنے میں مصروف تھا مگر ایما جانتی تھی کہ وہ اسی کو سنا رہا ہے۔ اس نے نظر انداز کرنا ہی مناسب سمجھا..... ساتھ بیٹھی لیزا نے کچھ کہنا چاہا مگر ایما نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اپنا گٹار اور نوٹ بک اٹھا کر کیفے کی طرف چل دی۔

☆☆☆

''تم نے اُسے کچھ کہا کیوں نہیں ایما؟'' کیفے میں بیٹھتے ہی لیزا نے کولڈ ڈرنک کا گھونٹ بھرتے ہوئے ایما سے پوچھا۔

''چھوڑو یار! مجھے اُس کی باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا.....'' ایما نے سر جھٹکتے ہوئے کہا جیسے وہ اس بارے میں بات نہ کرنا چاہتی ہو۔

''کیا اس لیے کہ وہ فیکلٹی ڈین سر آنزک کا چہیتا اور اکلوتا بیٹا ہے؟'' لیزا کا لہجہ استفہامیہ تھا۔

''نہیں..... اس لیے کہ میں جانتی ہوں کہ اگر آپ راستے میں بھونکتے ہر کتے پر پتھر مارنے کے لیے رک جائیں تو منزل تک کبھی نہیں پہنچ سکتے.....'' ایما نے کہا تو لیزا کھلکھلا کر ہنس دی۔

''ایک بات تو ہے ایما! سب جانتے ہیں کہ رابرٹ تمہاری میوزک جنون اور صلاحیت سے جلتا ہے۔ اس سے یہ برداشت نہیں ہوتا کہ اس کے علاوہ کسی اور کو سراہا جائے اسی لیے وہ تم سے بھی خار کھاتا ہے کیونکہ سر ایرک کی کلاس کی بہترین میوزیشن صرف اور صرف ایما جیکسن ہے۔'' لیزا نے کھلے دل سے اپنی نازک دل والی دوست کو سراہا تو ایما کے لبوں پر دھیمی مسکان رقص کرنے لگی۔

☆☆☆

وہ کلاس میں بیٹھی ایک نئی دھن کی پریکٹس کر رہی تھی۔ آج وہ کچھ جلدی ہی چلی آئی تھی۔ ہال میں اِکا دُکا اسٹوڈنٹس دکھائی دے رہے تھے۔ کلاس شروع ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔

اس نے گہرے پیلے رنگ کا گھٹنوں تک آتا ایک فراک پہن رکھا تھا، جس پر بڑے بڑے پھول بنے تھے۔ ایک پیلے رنگ کا پھول اس نے اپنے کالے سیاہ لہریے دار بالوں میں بھی لگا رکھا تھا۔ متناسب قد اور عام سے نقوش والی ایما جیکسن میں ایک عجیب سی کشش تھی جو شاید اس کے چہرے کی معصومیت کی مرہونِ منت تھی۔

وہ خوبصورت نہیں تھی مگر پُرکشش تھی۔ کچھ تھا اس میں ایسا جو مقابل کو چونکا دیتا تھا۔ ابھی بھی وہ چہرے پر معصومیت سجائے، آنکھیں بند کیے اپنی ہی دنیا میں مگن پوری طرح ڈوب کر گٹار بجا رہی تھی کہ اچانک اس کو اپنی گود میں کسی ملائم اور لجلجی شے کا لمس محسوس ہوا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں۔ آنکھیں کھولنے پر جو پہلی چیز اس کو نظر آئی، وہ رابرٹ کیمرون کا سراپا تھا جو دونوں بازو باندھے اس کے بے حد قریب کھڑا اس کو دیکھنے میں مگن تھا۔ ایما نے بھویں سکیڑ کر نا سمجھی کے انداز میں اس کو دیکھا اور پھر اچانک کسی انہونی کا احساس پا کر نیچے دیکھا۔ اس کی گود میں دو عدد چھپکلیاں موجود تھیں..... ان کو اپنے اتنے قریب دیکھ کر وہ اپنی چیخوں کو روک نہیں پائی تھی۔ رابرٹ اس کی حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے زور زور سے ہنسنے لگا۔ اسٹوڈنٹ شو میں ایما کی کامیابی نے رابرٹ کو جو رنج پہنچایا تھا، اس کا اس سے بہترین بدلہ نہیں لیا جا سکتا تھا۔ جس چہرے پر کچھ دن سے سرشاری ہی سرشاری نظر آ رہی تھی، اس پر دہشت کے آثار دیکھ کر رابرٹ کو ایک کمینی سی خوشی ہوئی تھی..... وہ مکروہ انداز میں ہنستا ہی چلا جا رہا تھا۔

رابرٹ کی اس ہنسی نے ایما کے حواس پر بہت بُری طرح وار کیا تھا۔ وہ جو گٹار کی مدد سے ان چھپکلیوں کو خود سے دور کرنے کی کوشش کر رہی تھی، اس نے بدحواسی کے عالم میں گٹار سامنے کھڑے رابرٹ کے سر میں دے مارا۔ خون کا ایک فوارہ تھا جو یکدم رابرٹ کی پیشانی سے پھوٹا تھا۔ اس کی ہنسی اس کے حلق میں ہی دفن ہو گئی اور وہ پیشانی پر ہاتھ رکھے اوندھے منہ زمین پر گر گیا۔

''رابرٹ.....!'' اندر آتے جان نے یہ منظر دیکھا اور زور سے چلایا۔ اس کے چہرے پر سراسیمگی پھیل گئی۔

وہ تیزی سے آگے بڑھا اور رابرٹ کو سیدھا کیا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ خون اب بہہ کر فرش پر پھیل رہا تھا۔

''یہ تم نے کیا کیا ایما.....؟'' وہ ایما کو دیکھ کر چلایا۔

''وہ..... اس نے..... یہ..... چھ..... چھپ..... ک.....'' ایما نے خوفزدہ انداز میں نیچے گری چھپکلیوں کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ.....؟ اوہ..... یہ تو نقلی چھپکلیاں ہیں..... رابرٹ نے تم کو خوف زدہ کیا..... اور تم نے اس کے ساتھ کیا کر دیا.....؟'' جان کے لہجے میں حیرانی کے ساتھ غصہ بھی تھا۔

ایما کا بدن ابھی بھی کانپ رہا تھا۔ گٹار اُس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے جا گرا تھا۔ گرنے سے اس کے

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

سارے تار ٹوٹ کر ٹیڑھے میڑھے ہو چکے تھے۔

بالوں میں اٹکا پھول بھی بالوں سے نکل کر فرش پر بہتے خون میں لت پت ہو گیا تھا۔ ایما کے پورے بدن میں جھنجھناہٹ ہو رہی تھی۔ رنگ خطرناک حد تک زرد ہو چکا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ایما کے لباس کا پیلا پن اس کے پورے بدن پر پھیل گیا ہو..... اس کا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آجائے گا۔ آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے گالوں کو بھگونے لگے..... جان ابھی بھی رابرٹ کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے شور مچانے پر چند ہی لمحوں میں پورا ڈیپارٹمنٹ وہاں جمع ہو گیا تھا۔ رابرٹ کو بروقت اسپتال لے جایا گیا..... تبھی اس کی جان بچ گئی، مگر زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے اسے ابھی تک ہوش نہیں آسکا تھا۔

سر ایرک کے لیے یہ صورتِ حال نہایت پریشان کن تھی..... وہ جانتے تھے رابرٹ نے ایما کو ہراساں کرنے کے لیے یہ مذاق کیا تھا۔ لیکن حالات ایسے نازک ہو جائیں گے، یہ سر ایرک کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

فیکلٹی ڈین پروفیسر آئزک نے ایما کو اپنے آفس میں بلایا تھا۔ اس کے انسٹرکٹر سر ایرک اور فیکلٹی کے دوسرے ممبران بھی کمرے میں موجود تھے۔

''آپ اس واقعے پر کچھ کہنا چاہیں گی مس ایما جیکسن؟'' پروفیسر اینڈریو نے جرح کا آغاز کیا تھا۔ ایما کے ذہن پر صرف خوف سوار تھا..... اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''کیا آپ جانتی ہیں مس ایما کہ آپ کو اسکول کے کوڈ آف کنڈکٹ کی خلاف ورزی کرنے پر اسکول سے نکالا جا سکتا ہے؟'' سر پیٹر نے اس کو بولنے پر اکسایا۔

ایما کا وجود لرز رہا تھا۔ اس کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔

''ایما نے جو کچھ کیا، وہ صرف ایک panic attack کا ردِعمل تھا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ایما herpetophobic ہے..... یہ چھپکلیوں اور دیگر رینگنے والے جانوروں کو دیکھ کر شدید خوفزدہ ہو جاتی ہے اور رابرٹ نے جانتے بوجھتے صرف ایما کو ڈرانے کے لیے یہ قدم اٹھایا۔'' سر ایرک کی وضاحت پر پروفیسر آئزک نے ابرو اٹھاتے ہوئے ان کو دیکھا۔

''کیا آپ کی اس طرف داری کی وجہ جان سکتا ہوں مسٹر ایرک؟'' پروفیسر آئزک کا لہجہ طنز سے بھرپور تھا۔ سر ایرک نے بے ساختہ پہلو بدلا۔

کوڑے دان میں جھک نہ مارو۔ تمہاری بوتل میں نے چھپائی ہے۔

''شاید کوئی گہرا تعلق نکلتا ہے ان کا مس ایما جیکسن کے ساتھ..... اونہہ؟'' پروفیسر اینڈریو دور کی کوڑی لائے تھے۔

ان کی اس بات پر ایما نے تڑپ کر سامنے بیٹھے لوگوں کو دیکھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ پروفیسر اینڈریو نے ان دونوں کے سیاہ فام ہونے پر چوٹ کی تھی۔

''گستاخی کے لیے معذرت..... لیکن تعلق تو سر آئزک کیمرون کا بھی ہے رابرٹ کیمرون کے ساتھ..... نہ صرف تعلق..... بلکہ بہت گہری رشتہ داری بھی.....''

سر ایرک کی اس بات پر پروفیسر آئزک کے ماتھے پر شکنوں کا جال پھیلا۔ انہوں نے بے حد ناگواری سے مسٹر ایرک کو دیکھا تھا۔ ان کا بس چلتا تو ابھی ان دونوں کو اٹھا کر کمرے سے باہر پھینک دیتے۔ ان کی ازلی نسل پرستی اس واقعے کے بعد پھر سے امڈ آئی تھی۔ ان کے چہرے کے تاثرات ان کے دل کی عکاسی کر رہے تھے اور اس بات کا سر ایرک کو بھی بخوبی علم تھا۔

''رابرٹ اس وقت اسپتال میں ہے اور ہم اس وقت مس ایما کا موقف جاننے کے لیے یہاں موجود ہیں۔'' سر پیٹر نے بات کا رخ واپس موڑا۔

''میرا اور ایما کا تعلق صرف اتنا ہی ہے، جتنا ایک انسٹرکٹر اور کسی بھی ذہین اسٹوڈنٹ کا ہو سکتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے سر ایرک کے لہجے میں انتہا کی بے بسی تھی۔

Nagat Azeem www.pakistanipoint.com

''تو پھر آپ کی ذہین اسٹوڈنٹ سے جواب لیتے ہیں..... اب ان کو اپنے حق میں کچھ کہنے دیں۔'' پروفیسر آئزک نے تمسخرانہ انداز سے کہا۔

''کیا آپ اپنے اس اقدام کا کوئی جواز پیش کر سکتی ہیں مس ایما جیکسن؟'' پروفیسر آئزک نے اب کے سخت لہجے میں اس سے پوچھا تھا۔

''سر! رابرٹ نے مجھے ڈرانے کی غرض سے مجھ پر چھپکلیاں گرائی تھیں.....'' ایما نے ہمت کر کے کہا۔

''نقلی چھپکلیاں.....؟ رائٹ.....؟'' سر آئزک نے کہا تو ایما نے سر جھکا دیا۔

''سر! رابرٹ نے جو کیا..... اس سے ایما کی جان کو بھی خطرہ ہو سکتا تھا.....'' سر ایرک ایک بار پھر خود کو بولنے سے باز نہیں رکھ سکے تھے۔

''لیکن ایما کو ہوا تو کچھ نہیں ناں..... البتہ رابرٹ کی حالت کافی نازک ہے جس کی ذمے دار صرف اور صرف مس ایما ہیں.....'' سر اینڈریو نے کہا۔

''جو ایما کے ساتھ کیا گیا، یہ اسی کا ردِعمل تھا.....'' سر ایرک نے آخری کوشش کی۔

''تو آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ جو شرارت کرے، اس کا سر پھاڑ دیا جائے..... یہ ایک بالکل ایب نارمل ردِعمل تھا..... کل کو یہ ایسے panic ہو کر کسی کا قتل بھی کر سکتی ہیں مسٹر ایرک..... پھر آپ کیسے اس عمل کا دفاع کریں گے؟'' پروفیسر آئزک کے لہجے میں چبھن تھی۔

''میرا خیال ہے آپ کی اس ذہین اسٹوڈنٹ کو میوزک اسکول میں نہیں، کسی ذہنی امراض کے اسپتال میں ہونا چاہیے..... جہاں ان جیسے ذہنی مریضوں کا علاج کیا جاتا ہو۔ ہمیں ایسے اسٹوڈنٹس کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔'' پروفیسر آئزک نے سفاکی کی حد کرتے ہوئے کہا تو ایما کو لگا وہ اگلا سانس نہیں لے سکے گی۔

''سر! آپ ایسا نہیں کر سکتے میرے ساتھ.....'' اس نے اپنی ہمت مجتمع کرتے ہوئے پروفیسر آئزک سے کہا۔

''میں ایسا ہی کروں گا..... کل سے آپ اسکول نہیں آئیں گی۔ آپ کو مس کنڈکٹ اور وائلینس کے جرم میں اسکول سے خارج کیا جاتا ہے۔ لیٹر جلد آپ کو بھجوا دیا جائے گا۔'' لگتا تھا کمرے میں پروفیسر آئزک کی آواز نہیں گونجی بلکہ کوئی صور پھونک دیا گیا تھا..... جس نے ایما کی زندگی کو تہ و بالا کر دیا تھا..... ہر طرف خاک اُڑنے لگی تھی.....

وہ فیکلٹی ڈین تھے..... ان کے کہے کو مسترد کرنے کا حق بھلا کس کے پاس تھا۔

''یو مے گو ناؤ.....'' پروفیسر اینڈریو نے انگلی کے اشارے سے اسے جانے کا کہا۔

وہ آفس سے باہر نکلی اور دونوں ہاتھ منہ پر رکھے نیچے بیٹھتی چلی گئی۔ آس پاس سے گزرتے لوگوں کی آنکھوں میں اس کے لیے ترحم کے جذبات ابھرے تھے۔

یہ کیا ہو گیا تھا اس کے ساتھ..... کیا ہونے جا رہا تھا..... کیا وہ یہ سب برداشت کر پائے گی.....؟ کیا واقعی وہ ذہنی مریضہ ہے.....؟ کیا وہ نارمل انسان نہیں ہے.....

یہ سوال نہیں، دھماکے تھے جو اس کے دماغ میں ہو رہے تھے۔

سر ایرک اس ساری صورتِ حال پر بہت شرمندہ تھے مگر وہ بے بس تھے۔

☆☆☆

لیزا، ایما کو گھر چھوڑنے آئی تھی اور تب تک اُس کے ساتھ رہی جب تک ولیم گھر نہیں آ گیا۔ ولیم کے لیے یہ خبر ایک بہت بڑا دھچکا تھی۔

''ایسا کیسے کر سکتے ہیں وہ تمہارے ساتھ.....؟'' ولیم کے چہرے پر کرب کے آثار ابھرے تھے۔

رو رو کر ایما کی آنکھیں سوج چکی تھیں..... وہ جو اس کی چھوٹی سی تکلیف پر تڑپ جایا کرتا تھا..... آج ایما کو اس حالت میں دیکھ کر اس کا کلیجا پھٹ رہا تھا۔

''سب کچھ ختم ہو گیا ڈیڈ.....! سب کچھ.....'' وہ روتے ہوئے اس کے گلے سے آ لگی۔

''کچھ بھی ختم نہیں ہوا میری جان.....! ہم خاموش نہیں رہیں گے..... ہم اس فیصلے کے خلاف عدالت میں اپیل کریں گے..... ہم ثابت کر دیں گے کہ تم بے گناہ ہو..... اصل قصوروار رابرٹ ہے..... اور یہ بھی کہ تمہیں نسلی تعصب کا نشانہ بنایا گیا ہے..... ہم آخری حد تک جائیں گے.....'' ولیم جیکسن نے خود کو سنبھالتے ہوئے ایما کو تسلی دی..... مگر ایما تو جیسے نہ کچھ سن رہی تھی، نہ دیکھ رہی تھی، نہ محسوس کر پا رہی تھی..... بس ایک خالی پن تھا جو اس کے وجود پر طاری تھا۔

ولیم کافی دیر اس کو سمجھاتا رہا۔ وہ سر جھکائے آنسو بہاتی رہی۔

''رات بہت ہو گئی ہے ڈیڈ..... آپ سو جائیں..... مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔'' کافی دیر بعد وہ دونوں ہتھیلیوں سے اپنے آنسو رگڑتے ہوئے بولی۔

''تم دیکھنا سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا..... بس

www.pakistanipoint.com

پریشان نہ ہونا.....'' ولیم ایما کو دلاسا دے کر سونے کے لیے اپنے کمرے میں آ گیا۔

ایما بیڈ پر چت لیٹی تھی۔ کمرے میں گہرا اندھیرا تھا۔ بالکل ویسا ہی اندھیرا اس کے اندر بھی پھیلا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہ اندھیرا دھیرے دھیرے اس کو نگل رہا ہے۔

گھپ اندھیرے میں اچانک کچھ آوازیں اس کو اپنے اعصاب پر برستی محسوس ہوئی تھیں۔

''ایب..... ب نارمل..... ذہنی مریض ... panic.....expel.....''

وہ کانوں پر ہاتھ رکھے اٹھ بیٹھی..... ان آوازوں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔

''تتلیاں..... مسل..... شرارت..... ہاہاہا.....'' اب ان آوازوں میں رابرٹ کی مکروہ ہنسی بھی شامل ہو چکی تھی۔ اضطراب اور بے چینی کا شدید دباؤ تھا جو اس کے اعصاب پر حملہ آور ہوا تھا۔ متلی کی کیفیت محسوس کرتے ہوئے وہ اٹھی اور واش روم کی طرف بھاگی..... منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر اس نے چہرہ صاف کیا۔

سامنے لگے آئینے میں اسے اپنا عکس نظر آیا۔ وہ خالی الذہنی سے خود کو دیکھے گئی۔ اچانک ہی آئینے میں نظر آتا عکس دوسرے مناظر میں مدغم ہونے لگا تھا۔ پروفیسر آئزک..... پروفیسر اینڈریو..... سر پیٹر..... سر ایرک کی بے بسی..... لوگوں کی ترحم بھری نگاہیں..... رابرٹ کی ہنسی.....

''میں ایب نارمل نہیں ہوں..... نہیں ہوں میں پاگل.....'' اس نے پاس پڑی بوتل آئینے پر دے ماری..... ایک چھناکے کے سے شیشہ کرچی کرچی ہو گیا مگر اس چھناکے کی آواز باتھ روم کی بند دیواروں میں ہی دب کر رہ گئی تھی۔

''کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو سکتا اب ڈیڈ..... کچھ بھی نہیں.....'' وہ کانچ کے ٹکڑوں پر لوٹتی بول رہی تھی۔

اس اذیت بھری رات کی صبح ایک بھیانک خبر اپنے ساتھ لائی تھی۔ ایما جیکسن نے اپنی دونوں کلائیاں کاٹ کر خودکشی کر لی تھی۔ سفید فرش پر خون کی بوندیں ایک لکیر کی صورت پھیلی ہوئی تھیں اور بہتا خون اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے جا چکا تھا۔

ایما کی زندگی..... اُس کے خواب..... اور ولیم کی خوشیاں بھی.....

یہ خبر، خبر نہیں ایک دھماکا تھا جو ولیم کے وجود کے پرخچے اُڑا گیا تھا۔ اس کی اکلوتی، جان سے پیاری بیٹی نے جس اذیت میں موت کو گلے لگایا، یہ اس کے لیے ناقابلِ یقین تھا۔ ابھی تو اس نے اپنی بیٹی کے لیے کچھ کیا بھی نہ تھا.....

ایما کی موت نے ولیم پر بہت گہرا اثر ڈالا تھا..... وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ ایما کی موت کا بدلہ ہر صورت لینا ہے اسی لیے ایما کی موت کے بعد ولیم نے وہ گھر چھوڑ دیا، اور اپنی کمپنی سے بھی استعفیٰ دے دیا۔ ایما کے علاوہ اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا جو اس کے پیچھے آتا اس لیے ولیم نے خود کو دنیا کی نظروں سے اوجھل کر لیا..... وہ مکمل طور پر روپوش ہو گیا ..... کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں ہے اور اس کے عزائم کیا ہیں لیکن ولیم، جو سالوں سے ایک روبوٹس بنانے والی کمپنی سے منسلک تھا، اچھی طرح جانتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے..... وقت کی الٹی گنتی شروع ہو چکی تھی..... اب اس کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا..... ایما کی موت کا بدلہ.....

☆☆☆

ڈیٹرائٹ کے ناکام کانسرٹ کے بعد تو جیسے یہ سب تسلسل سے ہونے لگا تھا۔ راک کہیں بھی کسی شو یا کانسرٹ کے لیے جاتا، وہ سرخ آنکھوں والی چھپکلی اس کے ساتھ ہوتی..... جانے وہ کہاں سے آ جاتی تھی اور پھر اچانک ہی غائب ہو جاتی لیکن راک کے وجود پر اس کا خوف دنوں تک طاری رہتا..... وہ ہر پیٹ فوبیا کا شکار ہو چکا تھا۔ اور اس خوف نے اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اب تو ہر جگہ یہ بات پھیل چکی تھی کہ راک شدید دباؤ اور ذہنی انتشار کا شکار ہو چکا ہے بلکہ چند ایک رپورٹرز نے تو اس کو ذہنی مریض ہی ڈکلیئر کر دیا تھا..... ان کا دعویٰ تھا کہ راک نے اس دکھائی نہ دینے والی مخلوق کا خوف خود پر اس حد تک طاری کر لیا ہے کہ اس کا ٹھیک ہونا اب تقریباً ناممکن ہے..... وہ کئی ماہرینِ نفسیات کو دکھا چکا تھا مگر صورتِ حال ابتر ہوتی جا رہی تھی..... ڈاکٹرز نے تھراپیز کے ساتھ ساتھ ادویات بھی شروع کر دی تھیں مگر اسے اس خوف سے چھٹکارا نہ مل سکا تھا۔ ہر بار اس مخلوق کے سامنے آنے پر اس کی حالت پھر سے ویسی ہو جاتی.....

اس کے خوف نے اس کی ذات کو..... اس کے کیریئر کو..... اور اس کی زندگی کو..... تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا تھا..... کچھ بھی اس کے اختیار میں نہیں رہا تھا۔ ہر چیز اس کے ہاتھوں سے پھسلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

پچھلے پانچ سالوں میں جو اسپانسرز اس کے آگے پیچھے پھرتے تھے، صرف دو مہینوں میں ہی ان سب نے ایک ایک کر کے اپنے ہاتھ کھینچ لیے۔ جس پُرآسائش زندگی کا راک

www.paksociety.com

عادی ہو چکا تھا، اب یہ سب اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا اور اس سے دستبردار ہونے کا خیال بھی سوہانِ روح تھا۔ وہ خود کو بے بس محسوس کر رہا تھا۔

شراب نوشی اور نیند کی دواؤں کی عادت تو کب سے تھی اُسے..... اب وہ مزید ڈرگز لینے لگا تھا..... اس کا الٹا اثر یہ ہوا کہ نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ اسے ہر شخص میں وہی چھپکلی نظر آنے لگی تھی۔

وہ اب کہیں نہیں جاتا تھا، سارا دن نشہ آور ادویات کے زیرِ اثر اونگھتا رہتا یا چلّاتا رہتا تھا.....

جس خوف کو بنیاد بنا کر اس نے اپنے حریف کو ہرایا تھا آج وہی خوف اس کو نگل رہا تھا۔

☆☆☆

''رابرٹ.....!'' آئزک آج بہت دنوں بعد اس کے کمرے میں آیا تھا..... کمرے کی ہر چیز بکھری ہوئی تھی۔ بیڈ کی چادر نیچے ڈھلک رہی تھی۔ ایش ٹرے راکھ سے بھر چکا تھا۔ کمرے میں ناگوار بُو پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے رابرٹ کی تلاش میں نگاہ دوڑائی۔ وہ اسے کہیں نظر نہیں آیا۔

''رابرٹ.....!'' اس نے ایک بار پھر پکارا۔

واش روم کا دروازہ بھی کھلا تھا..... اچانک کھٹکے کی آواز سے آئزک چونکا۔

آواز بیڈ کے نیچے سے آئی تھی..... وہ تیزی سے بیڈ کے نیچے جھکا۔

رابرٹ سر بازوؤں میں دیے الٹا لیٹا ہوا تھا۔

آئزک نے بے حد بوجھل انداز میں اس کی طرف دیکھا..... وہ بے حد کمزور ہو گیا تھا..... گوری رنگت ہلدی جیسی زرد ہو گئی تھی۔ نیلی آنکھوں میں سرخی جھلک رہی تھی اور آنکھوں کے گرد گہرے حلقے نمودار ہو چکے تھے..... وہ بال جو کبھی خوبصورتی سے شانوں پر جھولتے تھے، اب کسی سوکھی ہوئی جھاڑی کی طرح لگ رہے تھے..... آئزک کا دل کٹ کر رہ گیا۔

گزشتہ چند سالوں سے وہ موسمِ گرما میں Apple Hill Centre for Chamber Music میں منعقد ہونے والی ورکشاپ میں بطور اتالیق شرکت کرتا تھا۔ جہاں سب لوگ دنیا کی مصنوعی رنگینیوں اور رونقوں سے الگ تھلگ کچھ وقت صرف قدرت اور موسیقی کے ساتھ گزارنا پسند کرتے تھے اور باقی دنیا سے ان کا رابطہ تقریباً کٹ جاتا تھا.....

آئزک کیمرون کے دل و دماغ کے کسی ایک گوشے میں بھی کوئی ایسا وہم ہوتا کہ ان دو مہینوں میں حالات اس طرح پلٹا کھائیں گے..... تو وہ کبھی رابرٹ کو اکیلا چھوڑ کر نہ جاتا.....

دنیائے موسیقی کے جس روشن ستارے کو وہ پچاس دن پہلے چھوڑ کر گیا تھا، یہ وہ تو نہیں تھا..... یہ تو کوئی ہارا ہوا، نفسیاتی مریض تھا۔ یہ وہ راک تو نہیں تھا جس کی ہر ادا پر دنیا مرتی تھی اور جس کی کرشماتی شخصیت کے سب دلدادہ تھے۔ جس رابرٹ کیمرون کو راک بنانے کے لیے اس نے اس کی کامیابی کی راہ میں حائل ہونے والی ہر مشکل کو دور کیا تھا..... وہ اس کو قسمت کی ستم ظریفی سے نہیں بچا سکا تھا۔ آج قسمت نے اس کے تراشے ہوئے راک کو اتنی بلندی سے نیچے پٹخا تھا کہ اس کا وجود کرچی کرچی ہو گیا تھا.....

بلندی سے پستی کا سفر بہت تیز ہوا کرتا ہے اور اذیت ناک بھی..... اس کا اندازہ آئزک کو ہو گیا تھا۔ ایک سرد آہ آئزک کے لبوں سے سسکی بن کر نکلی تھی۔

''رابرٹ.....! باہر آؤ میرے بیٹے!'' آئزک نے اسے پچکارا.....

''ک.....ک.....کو.....کون ہو تم.....؟ کیوں آئے ہو یہاں.....؟'' آئزک کو دیکھتے ہی رابرٹ کے چہرے پر دہشت پھیلی تھی۔

''میں آئزک ہوں..... تمہارا باپ.....''

''ڈیڈ.....؟'' رابرٹ کی آنکھوں میں استعجاب اترا..... وہ خاموشی سے اسے دیکھے گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اسے آئزک کا چہرہ اس کریہہ چھپکلی میں بدلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ ایک دم چلّایا.....

''جھوٹ بولتے ہو تم..... مجھے مارنے آئے ہو نا.....؟ میں جانتا ہوں.....'' رابرٹ نے کہا تو آئزک نے کرب سے آنکھیں بند کیں۔

''نہیں بیٹا! وہ کہیں نہیں ہے..... یہ صرف تمہارا وہم ہے۔'' آئزک نے بے بسی سے کہا۔

''بکواس کرتے ہو تم..... تم یہی چاہتے ہو..... کہ میں بھی مر جاؤں..... ایما تو مر گئی تھی نا..... لیکن میں اتنی آسانی سے نہیں مروں گا.....'' اب کہ رابرٹ کے چہرے پر سختی پھیلی..... وہ ہذیانی انداز میں چیخنے لگا۔

رابرٹ کے منہ سے ایما کا نام سن کر آئزک کو شدید دھچکا لگا۔

''تو کیا یہ مکافاتِ عمل تھا جو رابرٹ کو اس حالت تک لے آیا تھا.....؟'' آئزک سوچنے پر مجبور ہوا۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

''میرے بیٹے.....! ایسا کچھ نہیں ہے۔ تم باہر آؤ مجھے تم سے بات کرنی ہے.....'' آئزک نے ایک بار پھر کوشش کی۔

''نہیں..... جاؤ یہاں سے..... چلے جاؤ..... تم جانتے ہو..... میں ڈریگن ہوں..... میں بہت طاقتور ہوں..... میں تمہیں مار سکتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ایک جھٹکے سے بیڈ سے باہر نکلا اور آئزک کو دبوچ لیا۔

آئزک اس حملے کے لیے قطعاً تیار نہیں تھا۔ اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر رابرٹ پر خون سوار تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے آئزک کا گلا دبانا شروع کر دیا۔

''رابرٹ.....! کیا کر رہے ہو..... چھوڑو مجھے..... کوئی ہے..... مدد کرو میری.....'' آئزک چلانے لگا تھا۔

''دیکھو.....! میں ابھی تمہیں دکھاتا ہوں میں کتنا طاقتور ہوں.....'' اب رابرٹ اس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور پوری قوت سے اس کا گلا دبایا۔

آئزک کا دم گھٹنے لگا تھا..... آنکھیں اُبل کر باہر آگئیں۔ سینے اور گردن پر دباؤ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔

''رابرٹ..... را.....'' آئزک کی آواز اس کے حلق میں ہی دم توڑ گئی اور گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔

رابرٹ اب فاتحانہ نظروں سے اس مردہ وجود کو دیکھ رہا تھا۔

''دیکھا میں کتنا طاقتور ہوں..... میں نے کہا تھا نا تم مجھے نہیں مار سکتے..... کوئی بھی مجھے نہیں مار سکتا..... ہاہاہا.....'' فضا رابرٹ کیمرون کے کریہہ قہقہوں سے گونج اٹھی تھی۔

جس اولاد کو بچانے کے لیے اور اس کا مستقبل بنانے کے لیے آئزک ہر حد سے گزر گیا تھا، اسی کے ہاتھوں اس کی موت لکھی تھی۔

کاش وہ جان لیتا کہ بعض اوقات ماضی میں کی گئی غلطیاں انسان کے مستقبل کو اتنا بھیانک بنا دیتی ہیں کہ وہ اندازہ بھی نہیں کر پاتا کہ وہ اپنی تباہی کا سامان خود اپنے ہاتھوں سے تیار کر رہا ہے۔

☆☆☆

رابرٹ کیمرون کو اپنے باپ کے قتل کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا تھا لیکن اس کے بگڑے ہوئے ذہنی توازن کو دیکھتے ہوئے اُسے پاگل خانے سے منسلک جیل میں منتقل کر دیا گیا تھا۔

اس کو ایک جنونی قاتل کے طور پر یہاں لایا گیا تھا اس لیے اس کو ایک الگ سیل میں رکھا گیا۔

یہاں آج اس کا پہلا دن تھا اور پہلے ہی دن اس سے ملنے کوئی آیا تھا۔ آنے والے نے اپنا تعارف اس کے مرحوم باپ کے دوست کی حیثیت سے کروایا تھا۔

رابرٹ اس شخص کو کچھ دیر گھورتا رہا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی کے رنگ ابھرے تھے لیکن حیرت انگیز طور پر وہ خاموش رہا۔

شاید یہ باپ کی موت کا صدمہ تھا یا نئی جگہ کا خوف..... وہ جب سے یہاں لایا گیا تھا بالکل چپ تھا۔

سورج کی کرنیں چھوٹے سے روشن دان سے اپنا راستہ بناتی ہوئیں کوٹھری میں آ رہی تھیں..... وہ خاموشی سے بیٹھا زمین پر پڑنے والی روشنی کو گھورتا رہا۔

ولیم جیکسن خاموشی سے بیٹھا کچھ دیر رابرٹ کو تکتا رہا..... پھر اٹھ کر واپسی کے لیے مڑ گیا..... رابرٹ کے وجود میں اب بھی کوئی جنبش نہ ہوئی..... وہ اکڑوں زمین پر بیٹھا رہا۔

دن ڈھلا تو کوٹھری میں بھی اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ ایک ہی طرح بیٹھے بیٹھے اب وہ تھک گیا تھا۔ اسی لیے چت لیٹا چھت کو گھورنے لگا۔ تبھی اسے اپنی گردن پر وہی لمس محسوس ہوا..... گدگداتا ہوا..... مگر نیلا سا.....

اس نے آنکھیں گھما کر اپنے کندھے کی طرف دیکھا۔ گھپ اندھیرے میں دو سرخ آنکھیں اس کو گھور رہی تھیں۔

☆☆☆

دھیمے انداز میں قدم قدم چلتا وہ شاہ بلوط کے گھنے درخت کے سائے میں بنی اس قبر تک آیا تھا۔ پھولوں کا دستہ سنگِ قبر پر رکھتے ہوئے اس نے اپنی آنکھوں میں در آئی نمی کو صاف کیا۔

''آج میں سرخرو ہو گیا میری بچی..... تمہاری موت کا بدلہ لے لیا ہے آج میں نے..... تمہارے قاتل اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں۔''

ایما کا مسکراتا چہرہ ولیم کی نظروں کے سامنے آیا تھا۔ وہ اس کو خوش دیکھ کر مسکرا دیا۔

اتنے سالوں سے دل میں جلنے والی آگ پر ایما کے پُرسکون چہرے نے جیسے پھوار برسا دی تھی۔

ولیم جیکسن جس خاموشی سے آیا تھا، اسی خاموشی سے اپنے ریڈ مپل سے گھرے بوسیدہ مکان کی طرف واپس پلٹ گیا..... اس نے اپنا انتقام لے لیا تھا لیکن ابھی اس کے ذمے ایک کام باقی تھا۔

❖❖❖

www.pakistanipoint.com

انصاف

حسنین چوہدری

سراغ رساں بڑی جانفشانی اور محنت سے کیس پر کام کرتے ہیں... بعض کیس ایسے دلچسپ ہوتے ہیں کہ قتل کا چشم دیدگواہ سامنے موجود ہوتا ہے... مگر مجرم کے متضاد بیانات دماغ کو چکرا کر رکھ دیتے ہیں... ایک ایسے ہی پیچیدہ کیس کی روداد کہ جس نے سب کو الجھا کر رکھ دیا تھا...

انصاف کی طلب گار..... جس پر محبوب کے قتل کا الزام تھا.....

ہائی برج اسٹیشن ہاؤس کے نائٹ ڈیسک پر بجنے والی گھنٹی نے اپارٹمنٹ 65 میں ہونے والے قتل کی پہلی اطلاع دی تھی۔ وہ ٹھیک رات کے بارہ بج کر پانچ منٹ کا وقت تھا۔ 13 نومبر 1927ء اتوار کا دن تھا۔ نائٹ شفٹ کے انچارج لیفٹیننٹ فیلین نے فون اٹھایا۔ کسی شخص نے اپنا نام بتائے بغیر جائے وقوعہ کا پتا نوٹ کروایا اور فون کاٹ دیا۔

لیفٹیننٹ نے سراغ رساں ونٹر ہالٹر اور ہنری اسمتھ کو مطلوبہ پتا بتایا اور کہا۔ ''جاؤ جا کر دیکھو، وہاں کیا ہوا ہے۔''

وہ دونوں محکمے کی خستہ وین میں بیٹھے۔ نکلنے کے چار منٹ بعد وہ جائے وقوعہ کے سامنے موجود تھے۔

☆☆☆

وہ اپارٹمنٹ جس بلاک میں واقع تھا، اسے دیکھ کر بالکل نہیں لگتا تھا کہ وہاں ایسی لرزہ خیز واردات بھی ہو سکتی ہے۔ عام طور پر ایسے بلاک رات کی اس تاریکی میں گاؤں کی ویران گلیوں جیسا منظر پیش کرتے ہیں۔ ہر طرف گھپ اندھیرا اور ہو کا عالم ہوتا ہے۔ اسٹریٹ لائٹس لگانے کا تکلف بھی نہیں کیا جاتا۔ مگر جب ہالٹر اور اسمتھ وہاں پہنچے تو سارا بلاک روشن تھا۔ بلاک کے تمام اپارٹمنٹس کی کھڑکیوں سے پریشان سر جھانک رہے تھے اور آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے۔ بلاک کے سامنے بھی مختلف لوگ کھڑے پڑوسی ہونے کا حق ادا کر رہے تھے۔ وہ دونوں لفٹ کے ذریعے چھٹے فلور پر پہنچے۔ اپارٹمنٹ کے سامنے بھی لوگ کھڑے تھے۔ وہ دونوں مجمع کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے۔

''تم میں سے کس نے ہومی سائڈ کو فون کیا تھا؟'' ہالٹر مجمع سے مخاطب ہوا۔

کسی نے بھی اس فریضے کا اعتراف نہیں کیا۔ ایک پستہ قد آدمی آگے بڑھا۔ اس کی شکل ایک معروف کارٹون سے ملتی تھی۔ وہ بولا۔ ''میرلائز مئے نامی فرانسیسی خاتون کو گولیاں مار کے ہلاک کیا گیا ہے۔'' کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اندر مسز مئے کی پڑوسن اور ڈاکٹر موجود تھے۔ ہالٹر نے ڈور بیل کو دبائے رکھا۔ دروازہ کھولنے والی ایک سفید فام خوش پوش عورت تھی۔ اس نے اپنا تعارف مسز لینگ کے نام سے کروایا۔ اندر بہت کم روشنی تھی۔ انہوں نے نیم تاریکی میں دیکھا کہ ایک شخص ایک نیم برہنہ عورت پر جھکا ہوا ہے۔ جب ہالٹر اور اسمتھ نزدیک آئے تو وہ شخص کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنا تعارف ڈاکٹر کے طور پر کروایا اور بتایا کہ اسے مدد کے لیے بلایا گیا تھا۔

☆☆☆

''کیا یہ بُری طرح زخمی ہے؟'' ہالٹر نے مئے کی طرف اشارہ کیا۔ اس دوران میں اسمتھ اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔

''بہت بُری طرح زخمی ہے۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ''پہلے پہل تو مجھے لگا کہ شاید یہ مر چکی ہے۔''

''اگر یہ اس قدر زخمی ہے تو میں اس سے بیان لینا چاہتا ہوں اگر ممکن ہو تو!'' ہالٹر نے پوچھا۔

''نہیں، یہ ممکن نہیں۔ یہ نہیں جانتی کہ یہ کیا کہہ رہی ہے۔ کچھ دیر قبل مجھے اینڈی کہہ کر بلا رہی تھی اور فریاد کر رہی تھی کہ اینڈی مجھے مت مارو۔ ایسی حالت میں اسے جلد سے جلد اسپتال لے جانا ہی بہتر ہوگا۔'' ڈاکٹر نے وضاحت کی۔

ہالٹر باہر نکلا اور فون کی جانب بڑھا۔ اس نے پولیس ہیڈ کوارٹر میں فون ملایا۔ لیفٹیننٹ ڈیوو نے فون اٹھایا۔ ہالٹر کی اطلاع پر اس نے بتایا کہ ٹیمیں روانہ کی جا چکی ہیں۔ انہیں واقعے کی پہلے ہی اطلاع مل چکی ہے۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

قریبی اسپتال سے ایمبولینس، ہومی سائڈ بیورو، ڈسٹرکٹ اٹارنی، طبی عملہ، ڈسٹرکٹ پولیس کا افسر، سراغ رساں بروک مین اور فوٹو گرافر جائے وقوعہ پر ہوں گے۔

ہالٹر نے سوچا کہ ایک گھنٹے میں افسران اور عملہ پہنچ جائے گا اور یہ ان دونوں کا پہلا کیس تھا۔ وہ دونوں تیسرے درجے کے سراغ رساں تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر ایک گھنٹے میں وہ کوئی قابلِ ذکر کام نہ کر سکے تو یہ کیس ان کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ ان کا مستقبل اس کیس سے جڑا ہوا تھا۔

ہالٹر واپس کمرے میں آ گیا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ مئے کو ما میں جا چکی ہے۔ اسمتھ جائے وقوعہ سے کلیو ڈھونڈ رہا تھا۔

''یہ مجھے قتل اور ناکام خودکشی یا ناکام قتل اور خودکشی کا کیس لگ رہا تھا۔'' اسمتھ نے مردہ شخص کی لاش اور مئے کی طرف اشارہ کیا۔

ہالٹر نے جواب دینے سے پہلے ایک نظر کمرے پر ڈالی۔ یہ ایک کشادہ اور سادہ سا کمرا تھا۔ دیوار کے ساتھ ایک بیڈ اور کرسی تھی اور ساتھ ہی ایک ڈریسنگ ٹیبل تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل پر ایک فیلٹ ہیٹ پڑا تھا۔ نزدیک ہی ایک پیڈسٹل فین رکھا تھا جس کے اوپر ایک آرائشی گڑیا سجی تھی اور ایک الماری موجود تھی۔ بیڈ پر ایک شخص کی آڑی ترچھی لاش پڑی تھی۔ اس شخص کے پاؤں میں سبز جرابیں اور پیلے جوتے تھے۔ اس کے ایک ہاتھ کے نیچے پستول تھا جبکہ دوسرے ہاتھ کے پاس ایک لکڑی کا ڈبا رکھا تھا۔

''اگر یہی شخص اینڈی ہے تو اس نے مئے کو گولی ماری یا نہیں ماری لیکن ایک بات یقینی ہے کہ اس نے خود کو گولیاں نہیں ماریں۔ اس کے سر کے تقریباً چیتھڑے اُڑ گئے ہیں۔ دیکھو اسمتھ، میرے خیال میں یہ پستول بعد میں یہاں رکھا گیا ہے۔'' ہالٹر بولا۔

اسمتھ نے لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ یقیناً اینڈی ہی ہے جس کا ذکر مئے نے کیا۔'' اس کی جیب سے ایک کارڈ برآمد ہوا جس پر لکھا تھا۔ 'اینڈریو ڈی ویلو، اکاؤنٹنٹ، ویکسلر ریٹیلٹی کارپوریشن، 1457 براڈوے، برانکس سٹی۔'

اب دونوں نے اپارٹمنٹ کی نئے سرے سے تلاشی لینا شروع کردی تھی۔ انہوں نے جو شواہد اکٹھے کیے وہ یہ تھے:

دو گولیوں کے خول جو بیڈ پر پڑے تھے، دیوار میں پیوست ایک گولی، دیوار گیر الماری میں دھنسی ہوئی ایک گولی، بیڈ کے نیچے پڑے چھ خالی خول، ایک خول مردہ اینڈی کے قدموں کے پاس سے ملا اور لکڑی کے ڈبے میں اسی کیلیبر کی گولیاں تھیں۔ دو کارڈ، ایک پر لکھا تھا کہ گم ہوجانے کی صورت میں 112 ویسٹ، 49 اسٹریٹ اور دوسرے پر فیڈر ربش اینڈ برادرز 88، پارک پیلس، نیویارک کا پتا درج تھا۔ ایک پستول رکھنے کا پرمٹ اور ایک خطوط کا پلندا اور ایک علیحدہ خط جو اس کے شوہر نے لکھا تھا اس پر یہ عبارت تحریر تھی۔ ''گھبراؤ مت، ٹومی تمہارا خیال رکھے گا۔''

☆☆☆

کچن میں ایک برتنوں کی ٹوکری اور میز پر دو دُھلے... ہوئے کپ، ساسر اور ایک شاپنگ بیگ سے سنگترے جھانک رہے تھے۔

عین اسی وقت بہت سے افسران اور عملہ پہنچ گیا مگر تب تک وہ دونوں اپنا کام کر چکے تھے۔ انہوں نے ایک اہم سراغ نظر انداز کردیا تھا جسے بعد میں ہومی سائڈ کے ایک افسر نے ڈھونڈا۔ وہ ایک بہت اہم سراغ تھا۔ آلہ قتل سے بھی اہم۔

''مجھے پورا یقین نہیں کہ یہ ایک قتل اور خودکشی کا کیس ہے۔'' ہالٹر نے کام ختم کرنے کے بعد کہا۔ ''جس ظالمانہ طریقے سے گولیاں ماری گئی ہیں، یہ کسی پیشہ ور مجرم کا ہی کام ہو سکتا ہے۔''

اچانک جج جان میک گین، ڈاکٹر کارل ایس کینر ڈ کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔ ڈاکٹر کارل کاؤنٹی کا اسسٹنٹ میڈیکل افسر تھا۔ ایمبولینس بھی پہنچ گئی تھی۔ دو سراغ رساں کمرے کا معائنہ کررہے تھے۔

کیپٹن ہاپٹ، سراغ رساں پال بھی پہنچ گئے۔

مے کو اسپتال روانہ کردیا گیا تھا۔ کیپٹن نے ایک باوردی آفیسر بھی ساتھ روانہ کردیا۔

ڈپٹی انسپکٹر ڈین نے ہالٹر اور اسمتھ کی کارکردگی کو سراہا۔

''پستول کے حصول کے لیے درخواست مسز مے پہلے بھی جمع کرواچکی ہیں۔'' سراغ رساں پال نے بتایا۔

''اسے پرمٹ کیوں چاہیے تھا؟'' ڈسٹرکٹ اٹارنی نے پوچھا۔

''مسز مے نے تین نامعلوم افراد کے خلاف ہراساں کرنے کی رپورٹ کروائی تھی۔'' پال نے جواب دیا۔

ڈسٹرکٹ اٹارنی نے مسز لینگ سے سوالات کیے۔ مسز لینگ ایک مہذب اور شائستہ خاتون تھی۔ وہ مے کی پڑوسن تھی۔

مسز لینگ کے مطابق وہ آدھی رات کے وقت اپنی ساس سے مل کر واپس اپارٹمنٹ آئی۔ اسے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے احتیاطاً دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ باہر کوریڈور خالی تھا۔ چیخ مسز مے کے اپارٹمنٹ سے آئی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے مسز مے کے دروازے کو کھٹکھٹایا۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو اس نے دروازے کو ہلکا سا دبایا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اندر داخل ہوکر دیکھا تو وہاں دو لاشیں پڑی تھیں۔ ایک مسز مے کی اور ایک اس کے بوائے فرینڈ کی۔ یہ سنتے ہی وہ الٹے قدموں واپس آئی اور ڈاکٹر کو بلا لائی۔ ڈاکٹر اسی بلڈنگ کا رہائشی تھا۔ اس نے آکر معائنہ کیا تو مسز مے زندہ تھی۔ جبکہ اینڈی مر چکا تھا اور بعد میں انہوں نے ہومی سائڈ کو فون کردیا۔

اس کے بعد کا واقعہ ہالٹر اور اسمتھ دیکھ چکے تھے۔ مسز مے کے اپارٹمنٹ کو سیل کرنے کے بعد وہاں .... ایک باوردی پولیس گارڈ کو تعینات کر دیا گیا۔ تاکہ کوئی بھی اپارٹمنٹ میں آئے تو اسے اندر نہ جانے دیا جائے اور اس کا پتا اور نام لکھ لیا جائے۔

☆☆☆

اگلے چھتیس گھنٹے مسز مے ہوش اور بے ہوشی کی حالت میں رہی۔ کبھی اس کو ہوش آتا۔ کبھی بے ہوشی طاری ہوجاتی۔ اس کے چہرے پر خوف تھا۔ وہ اٹینڈنٹ کو دیکھ کر چلّانے اور فریاد کرنے لگتی۔ اسے چار پانچ نرسوں نے مل کر پکڑا اور اس کے جسم سے گولی نکال کر پٹی کر دی گئی۔ گولی اس کے پھیپھڑوں سے رگڑ کھاتی ہوئی دل کے قریب پیوست تھی۔

کبھی وہ بڑبڑانے لگتی۔ ''اینڈی نے مجھے مار کر خودکشی کرلی۔''

جبکہ پوسٹ مارٹم رپورٹ کا کہنا تھا کہ اینڈی نے خود کو گولیاں نہیں ماریں۔ ڈاکٹر کینر ڈ جو تقریباً 3000 پوسٹ مارٹم کر چکے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اینڈی کے جسم میں سات گولیوں کے زخم تھے۔ چار گولیاں ایسی مہلک تھیں کہ ان سے فوراً موت واقع ہوجانی چاہیے تھی۔ ایسی صورت میں وہ مزید گولیاں نہیں مار سکتا تھا۔ پہلی گولی اینڈی کے ماتھے میں لگی تھی اور تقریباً پیچھے سے باہر نکل گئی تھی۔ دوسری اس سے آدھ انچ بائیں طرف لگی تھی۔ تیسری کنپٹی پر کان کے پاس، جبکہ باقی گولیاں سینے میں پیوست تھیں۔ ان زخموں کی تفصیل ہی اس مصنوعی قتل کا ثبوت تھا۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

اینڈریو کی لاش مردہ خانے میں اس کے بھائی نے پہچان لی تھی۔ اس سے جو معلومات حاصل ہوئیں، وہ یہ تھیں۔

مسز مئے فرانس میں دوران جنگ ایک نرس تھی۔ وہیں اس کی ملاقات ایک امریکی فوجی ایڈم مئے سے ہوئی۔ ان کی وہی ملاقات شادی میں بدل گئی۔ دونوں میاں بیوی امریکا آ گئے۔ اسی دوران میں مسٹر مئے کو تپ دق نے آن گھیرا۔ مجبوراً مسز مئے نے کام کرنا شروع کر دیا۔ جب یہ واقعہ پیش آیا اس وقت بھی مئے ہر ہفتے معقول ڈالر کما رہی تھی۔

اینڈریو مسٹر مئے کا دوست تھا۔ اینڈریو کی عمر اس وقت بائیس سال تھی۔ جب مرض بڑھا تو مسٹر مئے واپس فرانس چلا گیا۔ اس کے علاج کے اخراجات مئے برداشت کر رہی تھی۔ اس سے ان کی محبت کا اندازہ ہوتا تھا۔ جانے سے پہلے مسٹر مئے نے اینڈریو سے درخواست کی کہ وہ گھر کا چکر لگاتا رہے تاکہ مسز مئے کو تنہائی کا احساس نہ ہو۔

دوسری طرف اینڈی اپنے ماں باپ کی آنکھوں کا تارا تھا اور وہ ہر ہفتے 100 ڈالر کما رہا تھا۔ اور اپنے ساتھی جوزف ویکسلر کے ساتھ مل کر ریئل اسٹیٹ کا کاروبار کر رہا تھا۔ اس نے بمشکل اپنے بوڑھے باپ کو گھر بیٹھنے پر قائل کیا اور آرام و سکون کا مشورہ دیا۔ لیکن شاید بوڑھے باپ کے نصیب میں آرام و سکون نہیں تھا۔

جب سراغ رساں جوزف سے ملنے گئے تو اس نے بلا جھجک کہہ دیا کہ مئے ہی اینڈی کی قاتل ہے۔ ویکسلر نے ساری رُوداد سنائی۔

''ہفتے کی صبح مسز مئے نے ہمارے دفتر کال کی، فون میں نے اٹھایا۔ مئے نے مجھ سے کہا کہ اینڈی سے بات کراؤ۔ اینڈی اس وقت دفتر میں موجود نہیں تھا۔ مئے نے مجھ سے درخواست کی کہ جب اینڈی آئے تو اسے کہنا ہر حال میں میں مجھے آج اپارٹمنٹ میں آ کر ملے۔

جب اینڈی آیا تو میں نے اسے مئے کا پیغام پہنچایا اور ساتھ میں اسے تنبیہ بھی کی۔ ''اینڈی تمہیں وہاں نہیں جانا چاہیے۔'' اس نے کہا کہ تم حسد محسوس کرتے رہو لیکن میں تو جاؤں گا۔'' ویکسلر نے تفصیل بتائی۔

''تم نے اُسے کیوں روکا؟'' ہالٹر نے پوچھا۔

ویکسلر کے چہرے پر ناگواری ظاہر ہوئی۔ وہ بولا۔ ''کیونکہ آج تک مئے نے کبھی اینڈی کو ایسے نہیں بلایا تھا۔ پچھلے دنوں ہم نیویارک سینٹرل پارک سے گزر رہے تھے۔ مئے بھی ہمارے ساتھ تھی۔ مئے اینڈی کو کوس رہی تھی کہ وہ مسلسل اسے نظر انداز کر رہا ہے۔ اینڈی نے اسے چھیڑنے کے لیے کہا، 'تم میں دیکھنے لائق ہے کیا جو تمہیں دیکھوں۔'

مئے رونے لگی۔ پھر اس نے اینڈی پر زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔ اینڈی نے اسے کہا کہ اگر تم خاموش نہ ہوئیں تو میں تمہیں گاڑی سے نیچے پھینک دوں گا۔

مئے نے رونا بند کر دیا اور اپنی گود میں پڑا پرس کھول کر میک اَپ کرنا شروع کر دیا۔ جب اس نے پرس کھولا تو مجھے پستول کا دستہ دکھائی دیا تھا۔

اس واقعے کے بعد میں نے اینڈی کو مئے سے دور رہنے کو کہا مگر اس نے میری بات ہنسی میں اُڑا دی۔ اس نے سمجھا شاید میں اس سے حسد محسوس کرتا ہوں۔''

ویکسلر نے مزید بتایا۔ ''اینڈی اور میری ملاقات قتل کی رات 9 بجے نیوجرسی میں ہونی تھی۔ لیکن جب دس بجے تک اینڈی نہ آیا تو مجھے فکر لاحق ہوئی۔ میں نے اینڈی کے گھر فون کیا۔ اس کے باپ نے کہا کہ وہ گھر سے نکل چکا ہے۔ راستے میں ہوگا مگر اگلی اطلاع مجھے اس کے قتل کی ہی ملی تھی۔''

☆☆☆

ویکسلر سے پوچھ گچھ کے بعد ہالٹر، اینڈی کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اینڈی کی ماں مسز ڈی ویلو کی حالت خراب تھی۔ مسز ڈی ویلو بیان دینا چاہتی تھی جبکہ اس کی بیٹی کا کہنا تھا کہ یہ اس کے لیے خطرناک ہو سکتا ہے۔

اس کی سیاہ آنکھوں سے نفرت جھلک رہی تھی۔ اس کا مناسب جسم خوف اور غم سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ مسز ڈی ویلو نے بولنا شروع کیا۔

''میرا بیٹا پہلی بار جب مئے کو میرے گھر لایا تو اس نے بتایا کہ مئے میری دوست ہے۔ میں نے بھی مئے کو مہمان سمجھتے ہوئے مشفقانہ رویہ اپنایا۔ لیکن جب وہ چلی گئی تو میں نے اینڈی سے پوچھا 'اینڈی! کیا یہ لڑکی شادی شدہ ہے؟'' اینڈی نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''کیا تم اسے چاہتے ہو؟'' اینڈی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اینڈی نے آج تک مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ مسز ڈی ویلو آبدیدہ ہو گئی۔

''میں نے اینڈی سے کہا کہ اگر تم اس عورت سے دوستی رکھو گے تو اس گھر میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں۔ میں مزید کچھ نہیں سننا چاہتی۔''

''تو پھر اینڈی نے کیا کہا؟'' ہالٹر نے پوچھا۔

''اگلے چھ ماہ تک وہ گھر نہیں آیا پھر وہ گھر آنے لگا۔ لیکن ہفتے میں ایک بار کچھ دیر کے لیے آتا اور کپڑے بدل کر چلا جاتا۔'' وہ افسردہ لہجے میں گویا ہوئی۔ ''اس نے میرا دل توڑ

www.pakistanipoint.com

دیا تھا لیکن کچھ دنوں سے وہ روز گھر آنے لگا۔ ہم سب خوش ہوگئے۔"

"قتل کی رات اس نے ہمارے ساتھ ڈنر کیا۔ ڈنر کے بعد ہم میاں بیوی کو لے کر تھیٹر گیا۔ ہمیں وہاں اتارنے کے بعد اس نے کہا کہ وہ ایک بزنس میٹنگ کے سلسلے میں جرسی جارہا ہے۔ رات دیر سے واپسی ہوگی لیکن ہمارا زندہ اینڈی مردہ حالت میں واپس آیا۔"

ہالٹر اور اسمتھ نے بڑھیا سے مزید سوال کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس لیے رسمی کلمات کہہ کر وہ واپس آگئے۔

مختلف ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات سے پتا لگا کہ اینڈی، مئے کو چھوڑ رہا تھا۔

مسز مئے کا پہلا بیان 19 نومبر، سوموار کی شام لیا گیا۔ اس وقت بھی اس کی حالت نازک تھی اس لیے جامع بیان نہ دے پائی۔

مسز مئے صرف اتنا بتا سکی کہ اینڈی بارہ نومبر کی رات آٹھ بجے کے قریب اپارٹمنٹ میں آیا۔ اس کے دانت میں درد تھا اور اسی وجہ سے وہ پی رہا تھا۔ وہ بیڈ کے کنارے پر بیٹھا تھا۔ اس نے تکیے کے نیچے سے میرا پستول نکالا۔ میں نے اس سے اپنا پستول واپس لینا چاہا۔ یکا یک ایک دہکتا ہوا انگارا میرے جسم میں دھنس گیا۔ اس کے بعد ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ اور اس کی آنکھ اسپتال کے بستر پر کھلی۔ اس نے بتایا کہ وہ پستول اپنی سیکیورٹی کے لیے رکھتی ہے لیکن اسے یہ یاد نہیں تھا کہ یہ پستول اس نے کہاں سے خریدا۔

اینڈی کی موت کے بارے میں اسے بالکل معلوم نہ تھا۔

کچھ دیر کے بعد جج میک گین بھی اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ آگیا۔ وہ اسٹینو گرافر کو بھی ساتھ لایا تھا۔ اس نے مئے سے خیریت دریافت کی مگر مئے نے جواب نہ دیا۔

کچھ دیر کے توقف کے بعد جج نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"تم گن کیوں رکھتی ہو؟"

"ایک سال پہلے میرے ساتھ واردات ہوئی تھی اور میرا سارا سامان چھین لیا گیا تھا۔ کچھ آدمیوں نے میرے گھر آکر مجھے دھمکیاں دی تھیں اور اس کے بعد سے میں نے گن رکھنا شروع کردی۔" وہ بولی۔

"کیا اینڈی نے اچھی خاصی پی رکھی تھی؟" جج نے پوچھا۔

"نہیں اس نے اس قدر بھی نہیں پی تھی۔ وہ دانت کے درد کی وجہ سے پی رہا تھا۔ وہ وہسکی کی بوتل ساتھ لایا تھا۔"

"کیا تمہاری اس سے لڑائی ہوئی تھی؟"

"ہاں! اینڈی نے مجھے کہا کہ گھر سے بھاگ کر شادی کرلیتے ہیں۔" میں نے اسے جھڑکا۔ "پاگل مت بنو اینڈی۔" اس کے والدین نے مجھے قبول نہیں کیا کیونکہ میں شادی شدہ ہوں۔ میں نے اینڈی سے کہا تھا کہ لڑکیاں تو بہت مل جائیں گی مگر اینڈی اپنی ضد پر قائم رہا اور اس نے کہا۔ "کیا تم میرے ساتھ مرنا پسند کروگی؟"

"اس کے ساتھ ہی میں نے ڈز ڈز کی آواز سنی۔ اینڈی بہت اچھا انسان تھا۔ اس نے ایسا کیوں کیا!"

"کیا اس نے اپنے سر پر گولیاں ماری تھیں؟"

"ہاں بالکل۔" مئے نے فوراً جواب دیا۔ "وہ اندھا دھند گولیاں چلا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ میں کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے اٹھنا چاہا مگر نہ اٹھ سکی۔ جب مجھے گولی لگی اس کے بعد مجھے یہاں ہوش آیا ہے۔"

☆☆☆

مسز مئے کے پہلے دیے گئے بیان پر تو کچھ حد تک یقین کیا جاسکتا تھا۔ مگر اس بیان میں صاف لگ رہا تھا کے مسز مئے سر تا پا جھوٹ کی دلدل میں دھنسی ہے۔

یہ بات تو ناممکن تھی کہ اینڈی خود کو سر پر اتنی گولیاں مار لے۔ اور زہروں کے ماہر ڈاکٹر الیکس کا کہنا تھا کہ مقتول کے دماغ یا معدے میں الکحول کی موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔ اگر اس نے ایک گھونٹ بھی پیا تھا تو اس کا کیمیائی تجزیے سے پتا لگانا ممکن تھا۔

جج میک گین نے مسز مئے کو شک کے دائرے میں رکھتے ہوئے پبلک وارڈ سے قیدیوں کے وارڈ میں منتقل کروا دیا۔

دو ماہ تک وہ سخت علیل رہی۔ اسے اس حالت میں عدالت میں پیش نہیں کیا جاسکتا تھا۔ تاہم اس کے خلاف ثبوت اکٹھے ہو رہے تھے تاکہ اس پر باقاعدہ فرد جرم عائد کی جاسکے۔

ایک چیز جو قتل کے حق میں جارہی تھی وہ یہ کہ جائے وقوعہ سے کوئی تحریر نہیں ملی تھی۔ اگر خودکشی کا کیس تھا تو اکثر کیسز کی طرح یہاں پر تحریری نوٹ ملنا چاہیے تھا۔ اٹارنی اور پولیس کو مکمل یقین تھا کہ مئے قاتل ہے مگر سراغ رساں اسمتھ کو یقین نہیں تھا۔

وہ تحریری نوٹ کی تلاش کے لیے دوبارہ اپارٹمنٹ گیا اور آخر کار اسے وہ نوٹ مل گیا۔

☆☆☆

ہر شے پر گرد کی دبیز تہ تھی۔ تیز بارشوں نے کھڑکیوں

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

کے شیشے دھندلا دیے تھے۔ سورج کی روشنی گرد سے چھن کر اندر آرہی تھی اور ماحول کو کسی حد تک خوفناک بنا رہی تھی۔

ڈریسنگ ٹیبل پر پڑے ہیٹ کے نیچے سے ایک پرانا کاغذ ملا۔ وہ ایک خط تھا جو مئے نے اپنے شوہر کے لیے لکھا تھا۔ خط کی عبارت یوں تھی۔

''میں جو کرنے جارہی ہوں، مجھے اس کے لیے معاف کردینا۔ مجھے پتا ہے کہ تمہیں اس سے دکھ ہوگا مگر میں یہ سب ختم کرنا چاہتی ہوں۔

''میں اینڈی سے اپنی جان سے زیادہ محبت کرتی ہوں۔ تم میری بات سمجھ سکتے ہو۔ مجھے یقین ہے تم میرا بدلہ اینڈی سے ضرور لوگے۔ میں اینڈی کے بنا نہیں جی سکتی اس لیے میں خودکشی کررہی ہوں۔ میں اینڈی سے محبت کرتی ہوں اور وہ بھی مجھ سے محبت کرتا ہے۔

''تم میرے کپڑے اور سامان ماما تک پہنچا دینا اور جانِ من تم ابھی تک مجھے عزیز ہو مگر کیا کروں۔ اس کے خاندان والے..... اینڈی نے میرے چھ سو ڈالر دینے ہیں وہ لے لینا۔ اور تم میرے بعد اداس مت ہوجانا۔ تم واپس آکر ماما کے ساتھ رہنا۔ ہمیشہ خوش رہنا اور مجھے معاف کردینا۔

تمہاری بیوی

میرلائز مئے۔''

اور اس عبارت کے نیچے ایک لکیر کھینچی تھی۔ اور اس کے نیچے لکھا تھا۔ 'میری کریکی، یونی کو دے دینا۔' کریکی اس کی بلی کا نام تھا۔

جب اینڈی کے بزنس پارٹنر سے اس رقم کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے بتایا کہ اینڈی نے ایک بار مئے سے رقم ادھار لینے کا ذکر کیا تھا مگر مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس نے اتنی بڑی رقم ادھار لی ہوگی۔

سراغ رساں نے رپورٹ درج کروانے کی تصدیق کر دی تھی۔

☆☆☆

میرلائز مئے ایک چالاک خاتون تھی۔ میرا خیال نہیں تھا کہ حکام اس کے من گھڑت بیانات کو مان لیں گے۔ لیکن ایک بات کھٹک رہی تھی کہ اگر اس نے خود کو بچانا ہی تھا تو اس نے من گھڑت بیانات دینے کے بجائے ان جرائم پیشہ افراد پر قتل کا ملبا کیوں نہیں ڈالا جو اسے ہراساں کررہے تھے۔ بعدازاں اس نے اپنے بیان میں جرائم پیشہ افراد پر ملبا ڈال کر خود کو بری الذمہ کروانا چاہا مگر ان جرائم پیشہ افراد کو گرفتار کرلیا گیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس فرانسیسی عورت نے انہیں پیسے دے کر برجلی حملے کرنے کو کہا تھا تاکہ اسے پستول کا لائسنس مل جائے۔

مئے سے آخری بیان لیا گیا پھر اس پر فردِ جرم عائد کر کے عدالت میں پیش کردیا گیا۔

مئے نے قتل کی رات والے واقعے کو یاد کرتے ہوئے ذہن پر زور دیا۔ ڈسٹرکٹ اٹارنی کے جج میک گین کو اپنا آخری بیان ریکارڈ کروایا۔ جو پھر اس سے بیان لینے اسپتال آیا تھا۔

''مسز مئے! ہم ابھی تک آپ کے بیانات سے کچھ اخذ نہیں کرپائے اس لیے مجھے قتل کی رات ہونے والے واقعات مکمل تفصیل سے بتاؤ۔'' جج میک گین نے کہا۔

وہ بولی۔ ''اینڈی آٹھ بجے کے قریب آیا۔ میں لیٹی ہوئی تھی۔ وہ پریشان لگ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ 'اینڈی تم پریشان لگ رہے ہو؟' اس نے بتایا کہ ہاں میرے دانت میں درد ہے۔ اس نے اپنے دانت پر وِسکی انڈیلی۔ میں نے اس سے اس کی پارٹی کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا کچھ خاص نہیں رہی۔ ہنی! تم تو جانتی ہو جب تم میرے ساتھ نہیں ہوتی تو مجھے مزہ نہیں آتا۔ پھر اس نے بتایا کہ کل میری ماں سے پھر لڑائی ہوئی۔ میں نے اسے روکا کہ اینڈی اگر اب تم میرے لیے اپنے گھر والوں سے لڑے تو مجھ سے مت ملنا۔ تمہیں لڑکیاں تو بہت مل جائیں گی مگر ماں نہیں ملے گی۔ اینڈی نے کہا سب لڑکیاں بھاڑ میں جائیں میں صرف تم سے محبت کرتا ہوں۔ پھر اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر پڑا میرا خط اٹھایا جو میں نے اپنے شوہر کے لیے لکھا تھا۔ میرا خط پڑھ کر وہ مجھ سے جھگڑنے لگا۔ ہم پھر بیڈروم میں چلے آئے۔ اینڈی نے میری گن تکیے کے نیچے سے اٹھائی اور مجھ سے پوچھا تم گن کیوں رکھتی ہو۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اکیلی رہتی ہوں اس لیے اپنی حفاظت کے لیے رکھتی ہوں۔ اس نے گن ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دی اور اچانک لائٹ چلی گئی۔ پھر میں نے کودنے کی آواز سنی۔ مجھے لگا شاید میری بلی کودی ہے۔ لیکن پھر ایک سایہ لہرایا۔ میں چلّائی اور اینڈی کو آگاہ کیا۔ اینڈی اس سائے پر جھپٹ پڑا۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ مجھے کسی نے دھکا دیا اور میں نیچے گری ہی تھی کہ میرے جسم میں سلگتا ہوا راڈ گھس گیا۔ اس کے بعد میری آنکھ اسپتال میں کھلی۔

''مگر قتل کے وقت تم زخمی حالت میں بڑبڑا رہی تھیں کہ اینڈی مجھے مت مارو۔ مگر یہ بیان تو کچھ اور ظاہر کررہا ہے۔ دیکھو تم مسلسل متضاد بیانات دے رہی ہو۔ درحقیقت تم اپنے

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

گرد گھیرا تنگ کر رہی ہو۔ ہمیں حقیقت بتا دو۔'' جج میک گین بولا۔

اس نے کہا۔ ''نہیں۔ تمہیں سننے میں غلط فہمی ہوئی ہو گی۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ میرے ایڈی کو مت مارو۔''

جج فوراً بولا۔ ''مگر ابھی تو تم نے کہا کہ تمہیں اسپتال آنے تک کوئی ہوش نہیں تھا۔ تو پھر اتنے وثوق سے کیسے کہہ رہی ہو کہ تم نے یہ نہیں بلکہ یہ کہا تھا۔ تمہارے تمام بیانات جھوٹ پر مبنی ہیں۔ کل تمہیں عدالت میں پیش کر دیا جائے گا۔''

یہ کہہ کر جج میک گین روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

اگلے دن اُسے عدالت میں پیش کیا گیا۔ ڈسٹرکٹ اٹارنی نے وکالت کے فرائض سرانجام دیتے ہوئے عدالت کے سامنے تمام حقائق رکھ دیے۔

پہلی بات یہ کہ ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق مقتول کے جسم سے الکوحل کی موجودگی ثابت نہیں ہوئی یعنی ایڈی نے وہسکی نہیں پی رکھی تھی اس لیے مئے کی یہ بات بھی جھوٹ ہے۔

دوسرا، ایڈی کی پارٹی کے متعلق ہونے والی گفتگو کے بارے میں مئے کا کہنا ہے کہ وہ پارٹی کے متعلق پہلی گفتگو تھی۔ جبکہ ویلسلر کا بیان تھا کہ نیویارک سینٹرل پارک میں اسی بات پر ان کا جھگڑا بھی ہوا تھا۔

تیسرا، مئے کا کہنا تھا کہ وہ خود ایڈی سے تعلق توڑ رہی تھی۔ جبکہ ہمارے پاس مستند ثبوت موجود ہیں کہ ایڈی اس تعلق کو ختم کر رہا تھا۔

چوتھا، اس کی بات پر یقین کرنا مشکل تھا کہ ایک قاتل اس کے گھر آئے اور اسلحہ ساتھ نہ لائے۔ اسی کے پستول سے مارے۔ اور ایڈی کو قاتل نے کیوں مارا۔ دھمکیاں تو مئے کو دی تھیں۔

پانچواں، جس پوزیشن سے مقتول کو گولیاں لگی تھیں اور جس پوزیشن میں لاش اور خول ملے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مقتول بیڈ پر بیٹھا تھا اور ایک مجرم سے گتھم گتھا تھا۔

اور یہ تمام کہانیاں اس نے خود کو بچانے کے لیے گھڑی ہیں۔

جج نے اگلی تاریخ دے دی۔ مئے کو وہیل چیئر پر لایا گیا تھا۔ واپسی سے پہلے اس نے چند صحافیوں کو بیان دیا۔ ''میں اپنی زندگی کی جنگ لڑ رہی ہوں۔ مجھے ایک جھوٹے کیس میں ذلیل کیا جا رہا ہے۔ کوئی اپنے محبوب کا قتل کیسے کر سکتا ہے۔ میں ایک فرانسیسی خاتون ہوں... مگر میں نے شادی امریکی سے کی ہے۔ اس لیے میں امریکی ہوں۔ اور مجھے امریکا سے ہمدردی نہیں انصاف چاہیے انصاف۔'' وہ رونے لگی۔

اگلی پیشی پر چند اہم انکشافات ہوئے۔ مئے کا خیال تھا کہ ایڈی کے قتل کے بعد وہ خود کو گولی مار کر مر جائے گی مگر وہ نہیں مری۔ اس لیے اب اس کو لگا کہ پولیس اسے ساری زندگی کے لیے جیل میں ڈال دے گی۔ چنانچہ اس نے جعلی بیانات سوچنے کے لیے کوما میں جانے کا اور پھر بیمار رہنے کا بہانہ کیا تاکہ وہ کوئی اچھا سا بہانہ گھڑ کے قتل کے کیس سے جان چھڑائے۔ یہ اہم انکشاف کچھ یوں ہوا کہ جج نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ ''ڈاکٹر! اگر کسی شخص کو گولی لگے تو کتنے دن تک صحت یاب ہو جاتا ہے؟''

''کوئی دو سے تین ہفتوں تک وہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

''اگر کوئی مریض بہانہ کر رہا ہو تو آپ کس ٹیسٹ کے ذریعے پتا لگاتے ہیں کہ آیا یہ سچ مچ بیمار ہے یا نہیں!'' جج نے پوچھا۔

''ہم جب مریضوں کا کوئی بھی ٹیسٹ کرتے ہیں تو بہانہ کرنے والا مریض ٹیسٹ کروانے سے ہچکچاتا ہے۔ جبکہ حقیقی مریض بخوشی ٹیسٹ کروا لیتا ہے۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔

''کیا مسز میرلائز مئے نے بہ آسانی ٹیسٹ کروا لیا تھا؟'' جج نے پوچھا۔

''نہیں! اس نے بہت شور کیا اور نرسوں کا منہ نوچ لیا تھا۔ اس کا ٹیسٹ زبردستی کیا گیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ میرلائز مئے بیماری کا بہانہ کر رہی تھی۔'' ڈاکٹر بولا۔

ڈاکٹر کے اس بیان نے گویا کارروائی ہی ختم کر دی۔

جج نے اگلی تاریخ کو فیصلہ سنانے کا کہا اور عدالت برخاست کر دی۔

☆☆☆

میرلائز مئے کا شوہر مئے بھی فرانس سے واپس آ گیا تھا اور آخری سماعت پر عدالت میں بھی آیا۔

جج نے اپنا فیصلہ سنایا۔

''عدالت.... لائز مئے کو اینڈریو ڈی ویلو کے قتل کے جرم میں اور عدالت کو متضاد بیانات دے کر اُلجھانے کے جرم میں دس سال قید کی سزا سناتی ہے۔''

فیصلہ سن کر مسٹر مئے نے اپنا منہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور رونے لگا جبکہ مسز مئے کے کندھے... ڈھلک گئے۔ اسے اپنا انجام صاف نظر آ رہا تھا۔ امریکا سے اسے انصاف مل چکا تھا۔

❖❖❖

www.pakistanipoint.com
Waqar Azeem

بساط

عمران قریشی

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

شطرنج کی بساط پر مُہرے سجاتے ہوئے کھلاڑی کو یقین ہوتا ہے کہ جیت اسی کی ہوگی... جبکہ یہ ایسا کھیل ہے کہ دونوں فریقین میں سے کسی کو معلوم نہیں ہوتا... کہ مات کس کے حصے میں آئے گی... کھیل ہی کھیل میں ایک ہی مسئلے سے دوچار ہو جانے والے میاں بیوی کی ڈرامائی صورتِ حال...

شطرنج کی ایسی بازی جو جیت سے ہار میں بدل گئی.....

سید صاحب نے وزیر کو اٹھا کر بادشاہ کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو شہ بھی ہوگی اور مات بھی۔''

مشتاق صاحب نے تنقیدی نگاہوں سے مہروں کا جائزہ لیا۔ بادشاہ کو بچنے کے لیے جو خانے درکار تھے، انہیں سید صاحب کا وزیر اور توپ کور کیے ہوئے تھے۔ چند لمحے گردوپیش کا جائزہ لینے کے بعد انہوں نے ہار تسلیم کر لی۔ یہ دونوں کی دوسری بازی تھی۔ پہلی مشتاق اور دوسری سید صاحب

نے جیتی تھی۔

دھوپ سائبان سے آگے آنے لگی تھی۔ گرمی کا یہ عالم تھا کہ ٹین کی چھت والا سائبان حبس کی شدت سے بھر گیا تھا اور سانس لینے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ یہ سائبان شازیہ کے گملوں کے لیے دو سال قبل تیار کیا گیا تھا۔ ان گملوں کے درمیان تخت پوش رکھ کر سید صاحب نے وقت گزارنے کے لیے مختصر جگہ کا اہتمام کرلیا تھا۔ شازیہ کو ان کی حرکت ایک آنکھ نہ بھائی اور اس نے بدلہ اتارنے کے لیے ان کی موبائل سم چوری کرلی۔ سید صاحب نے نوکر کو آواز دی۔ وہ صحن میں کھڑا کپڑے مشین میں ڈال رہا تھا۔ ان کی چنگھاڑ کو سن نہیں سکا۔ مجبوراً انہیں سائبان کے نیچے سے نکل کر سیڑھیوں تک آنا پڑا۔ اس دفعہ انہوں نے نوکر کو مخاطب کرنے سے قبل دو نہایت فحش قسم کی گالیوں سے نوازا۔ پھر دو گلاس شربت لانے کا حکم صادر کیا۔ ساتھ ہی تنبیہ کی۔ ''شربت شازیہ کے ہاتھوں کا بنا ہوا ہونا چاہیے۔'' نوکر اندر چلا گیا، وہ واپس سائبان کے نیچے آگئے۔

مشتاق صاحب مہروں کو ترتیب دے رہے تھے۔ پیادے کو آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔ ''تمہارے موبائل کی سم کا کچھ پتا چلا؟''

سید صاحب نے بتایا۔ ''شازیہ کے پاس ہے۔ چند دن بند رہی۔ گزشتہ روز میں نے نمبر ملایا تو اس نے جواب دیا اور میرے استفسار پر بتایا کہ سم تخت پوش کے نیچے سے مل گئی ہے۔ پودوں کو پانی دیتے ہوئے اسے نظر آگئی۔ تاہم اب وہ اس کے استعمال میں رہے گی۔''

مشتاق صاحب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ ''یعنی جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ تم دونوں کی نوک جھوک سے میرا دل خوش ہوجاتا ہے۔ شادی محبت کی تھی یا پھر والدین نے کروائی تھی؟''

''والد صاحب نے زبردستی کروا دی۔'' سید صاحب نے بتایا۔ ''ورنہ اچھا خاصا باہر جانے کا معاملہ چل رہا تھا۔ ناہید شادی کے لیے رضامند تھی۔ والد صاحب کو شازیہ پسند آگئی اور کیوں نہ آتی۔ وہ ان کی مرحوم بہن کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ناہید سے معاملہ انتوا میں پڑ گیا۔ اماں نے لاکھ کوششیں کیں والد صاحب کو منانے کی لیکن بات ضد اور انا کے آگے پہنچ کر ختم ہوگئی۔ ناہید، خالہ کی لڑکی تھی اور خالو امریکا میں مقیم ہیں۔ وہاں ان کا وسیع و عریض کاروبار ہے۔''

نوکر شربت کے گلاس ہاتھوں میں پکڑے نمودار ہوا۔ اس نے گلاس میز پر رکھے اور واپس چلا گیا۔

سید صاحب نے ایک گلاس مشتاق صاحب کے سامنے رکھا اور دوسرا اٹھا کر گھونٹ بھرنے کے بعد تلخ لہجے میں بولے۔ ''تم نے کبھی چینی کے بغیر شربت پیا ہے؟''

مشتاق صاحب نے انکار میں سر ہلایا۔

''تو پھر آج پیو۔ یہ ہمارے گھرانے کا خاص مشروب ہے۔ شازیہ کو چینی سے شاید نفرت ہے۔''

مشتاق صاحب نے گلاس اٹھایا۔ تب ان کی نگاہ پیندے میں تیرتی ہوئی چینی کی مختصر مقدار پر پڑی۔ وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ ''یہاں نیچے کچھ چینی موجود ہے۔ میرے خیال میں بھابی نے چمچ ہلانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔''

سید صاحب نے چونکتے ہوئے گلاس کی طرف دیکھا پھر غصیلے لہجے میں بولے۔ ''غفلت کی انتہا ہے۔ اگر اتنی ہی کام چوری مقصود تھی تب پھر نوکر کے ہمراہ چمچ ہی بھجوا دیتی۔ اب چمچ منگوانے کے لیے مجھے دوبارہ سیڑھیوں تک جانا ہوگا۔''

انہوں نے اونچی آواز میں نوکر کو چمچ لانے کے لیے کہا۔ اس دفعہ آواز میں شیر کی دہاڑ شامل تھی۔ نوکر فوراً ہی چھت پر نمودار ہوا اور چمچ سید صاحب کے ہاتھوں میں تھما کر دم سادھے واپس چلا گیا۔ سید صاحب کا شطرنج سے دل اچاٹ ہوگیا اس لیے ارادہ.... ملتوی کرتے ہوئے بولے۔

''مغرب ہم سے ہر لحاظ سے آگے ہے۔ وہاں کوئی کسی کے معاملے میں دخل اندازی نہیں کرسکتا۔ زور زبردستی کے ساتھ شادی کرنا تو درکنار بچوں پر تشدد کرنے پر بھی قانون لاگو ہوتا ہے۔ سب اپنے راستے کا تعین خود کرتے ہیں۔ اس کے لیے انہیں کسی کے مشورے کی ضرورت نہیں ہوتی۔'' انہوں نے چمچ سے گلاس کے پیندے میں بیٹھی ہوئی چینی کو حل کیا اور دوبارہ گویا ہوئے۔

''وہ شادی سے قبل ایک دوسرے کو پرکھتے ہیں۔ اگر معیار پر پورے اترے تو شادی کرلی۔ ورنہ راستے جدا۔''

مشتاق صاحب نے شربت کا گھونٹ بھرتے ہوئے جواب دیا۔ ''اس کے باوجود بھی وہاں طلاقوں کا تناسب مشرق سے زیادہ ہے۔ آئے دن اخبارات اسی قسم کی خبروں سے بھرے رہتے ہیں۔ بیوی نے شوہر سے طلاق مانگی اور شوہر نے طلاق دینے کے بجائے اسے قتل کردیا۔ مشرق میں قتل کا رجحان نہیں۔''

سید صاحب تلخ لہجے میں بولے۔ ''ایک دوسرے کو برداشت کرتے رہنے سے طلاق لے لینا لاکھ درجے بہتر ہے۔ ہمارے معاشرے میں کون ہے جو ایک دوسرے کو برداشت نہیں کررہا۔ اگر میری زندگی اتنی سال ہے اور شادی تیس سال کی عمر میں تر بردستی کردی گئی۔ تب یہ سوچ کر مجھے

www.paksociety.com Waqar Azeem

غش آنے لگتا ہے کہ مجھے اسے پچاس سال جھیلنا ہوگا۔"

"ناہید کا کیا ہوا؟ کیا وہ بیرونِ ملک تمہاری منتظر ہے یا پھر اس کی شادی ہوگئی ہے؟"

سید صاحب بولے۔ "اس کے لیے رشتوں کی کمی نہیں تھی۔ وہ خوب صورت، صاحبِ حیثیت اور مالدار عورت تھی۔ کون بے وقوف ایسے رشتے کو نظرانداز کرسکتا ہے۔ والد صاحب کے انکار کے اگلے ماہ ہی اس کی شادی ایک بہت بڑے بزنس مین سے کردی گئی۔ تاہم گزشتہ سال طلاق کی صورت میں اختتام کو پہنچی۔ خالو نے رشتہ ختم ہوجانے کے بعد دل میں تہیہ کیا کہ دوبارہ ناہید کی شادی خاندان میں کریں گے۔"

شربت کا پانی نیم گرم تھا۔ تاہم مشروب خوش ذائقہ تھا۔ مشتاق صاحب نے ایک ہی گھونٹ میں شربت کو حلق میں انڈیلا اور گلاس میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ "تو تمہارے خالو کو رشتہ دستیاب ہوا یا پھر ناہید اب بھی انتظار میں بیٹھی ہے؟"

"اس کی ضد ہے کہ میں شازیہ کو طلاق دینے کے بعد اس سے شادی کرنے کے لیے امریکا آؤں۔ بصورتِ دیگر بات چیت ختم۔"

مشتاق صاحب نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "تو اس کا مطلب ہے بات چیت کافی حد تک آگے بڑھ چکی ہے اور کباب میں ہڈی شازیہ بن رہی ہے۔"

"شازیہ کی کیا اوقات کہ وہ کباب میں ہڈی بن سکے۔ سب کیا دھرا والد صاحب کا ہے۔ انہوں نے نکاح نامے میں حق مہر پچاس لاکھ روپے لکھوادیا۔ تاکہ ہم دونوں کے درمیان طلاق نہ ہوسکے۔ ناہید ایک سال اور انتظار کرسکتی ہے۔ اس کے بعد خالو کے قریبی دوست کے لڑکے سے شادی کرلے گی۔ یہ بات میری برداشت سے باہر ہے۔ میں جیتے جی یہ سب نہیں ہونے دوں گا۔"

"تو کیا خودکشی کا ارادہ ہے؟" مشتاق صاحب نے مسکراتے ہوئے پوچھا "یا پھر پچاس لاکھ کی لاٹری نکل آئی ہے۔ حق مہر کی رقم لیے بغیر شازیہ تمہارا پیچھا چھوڑنے والی نہیں۔"

سید صاحب نے کہا۔ "اگر میں چاہوں تو حق مہر کی رقم ناہید سے لے کر شازیہ کو دے سکتا ہوں لیکن خودداری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ میں گھر داماد بننے سے پہلے وہاں اپنی حیثیت کو مستحکم کرنا چاہتا ہوں۔"

نوکر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا اور سید صاحب سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "غفور کمپاؤنڈر آیا ہے۔ بیگم صاحبہ کہہ رہی ہیں کہ ٹیکا لگوالیجیے۔"

سید صاحب نے مشتاق صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔ "ذرا ملاحظہ فرمائیے۔ ازدواجی زندگی برداشت سے باہر ہوتی جارہی ہے اور بیگم صاحبہ اولاد کے حصول کے لیے ٹیکے لگواتی پھر رہی ہیں۔" انہوں نے نوکر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اسے کہو کہ مجھے... ٹیکا نہیں لگوانا۔ کمپاؤنڈر کو دفع کردے۔"

نوکر سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔

سید صاحب نے فوراً پینترا بدلتے ہوئے کہا۔ "سنو، اس دفعہ اسے اوپر بھجوادو۔ کل سے میں اس کی صورت نہیں دیکھوں گا۔" نوکر سیڑھیاں اتر کر نیچے چلا گیا۔ سید صاحب کی جھنجلاہٹ عروج پر تھی۔ "بس سب کچھ خاموشی کے ساتھ برداشت کرتے جاؤ۔ کوئی تک بنتی ہے۔ امریکا جانے کے بعد دیکھ لوں گا۔ وہاں شخصی آزادی کو اہمیت حاصل ہے۔"

مشتاق صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔ "تم جس آزادی کی بات کررہے ہو، وہ امریکا سے زیادہ اپنے ملک میں ہے۔ امریکا میں بیوی کو طلاق دینے کے بعد تمام زندگی اس کے اخراجات برداشت کرنا ہوتے ہیں۔ میری مانو تو اپنے اور شازیہ کے رشتے کو استوار کرنے کی کوشش کرو۔"

کمپاؤنڈر سیڑھیاں چڑھ کر چھت سے ہوتا ہوا سائبان کے نیچے آگیا۔ اس نے ہاتھوں میں دوائیوں والا باکس پکڑا ہوا تھا۔ سلام دعا کے بعد اس نے باکس کھولا اور سرنج میں محلول بھرنے کے بعد انجکشن سید صاحب کے بازو میں گھونپ دیا۔ ان کے چہرے پر تکلیف کے تاثرات پیدا ہوئے اور انہوں نے تمام ڈاکٹروں کی آل اولاد کو گالیاں اگل دیں۔

کمپاؤنڈر مسکراتے ہوئے بولا۔ "میرا ہاتھ بہک گیا ورنہ آپ کو تکلیف زیادہ نہ ہوتی۔ قصور آپ کا بھی ہے۔ آپ ہاتھ کو ہلائے جارہے تھے۔"

سید صاحب ٹھنکارتے ہوئے بولے۔ "ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا۔ اپنی نااہلی میرے سر تھوپ دی۔ پتا نہیں کہاں سے منہ اٹھائے چلے آتے ہیں۔ کل سے یہاں آنے کی کوشش مت کرنا۔"

کمپاؤنڈر نے ناراض ہونے کے بجائے باکس کو بند کیا پھر بولا۔ "بیگم صاحبہ نے کہا ہے کہ ٹیکے کا معاوضہ آپ سے لے لوں۔ لیکن سید صاحب اب بات پچاس روپے میں نہیں بنے گی۔ میں دوسروں سے سو روپے لیتا ہوں۔ آپ اتنی دے دیں۔"

سید صاحب نے جیب میں سے پچاس کا نوٹ نکالا اور

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولے۔ ''تیس روپے میں نے اس تکلیف کے کاٹ لیے جو تمہارے انجکشن گھونپنے کی وجہ سے مجھے ہوئی۔ خدا کی پناہ، ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے چھرا بازو میں گھونپ دیا ہو۔ یہ نوٹ اٹھاؤ اور دفع ہو جاؤ۔''

کمپاؤنڈر نے منہ بناتے ہوئے نوٹ اٹھایا اور سیڑھیاں اُتر کر نیچے چلا گیا۔

''یہ انجکشن کا کیا ماجرا ہے؟'' مشتاق صاحب نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ بس تنگ کرنے کا ایک بہانہ ہے۔ کسی نے کہہ دیا کہ فلاں انجکشن لگوانے سے فلاں عورت کے ہاں بیس سال کے بعد اولاد ہو گئی اور بیگم صاحبہ میرے سر پر سوار ہو گئیں کہ مجھے بھی انجکشن لگوانے چاہئیں۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔ جوابی کارروائی کے طور پر دونوں کی ہڑتال نے مجھے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ تم میری عادت سے واقف ہو۔ میں باہر کا بنا ہوا کھانا نہیں کھا سکتا۔ نوکروں کے اوپر بھی مجھے شبہ رہتا ہے کہ وہ ڈنڈی ماریں گے۔''

مشتاق صاحب نے پوچھا۔ ''کچھ معلوم ہے کہ کون سے انجکشن ہیں۔ کہیں صحت کے لیے خطرناک نہ ہوں۔''

''میں نے ڈاکٹر لمبو کو دکھائے تھے۔ اس کا کہنا ہے کہ طاقت سے ہیں اور کچھ نہیں تو جسم میں پیدا ہونے والی سستی کو دور کرنے میں معاون ثابت ہوں گے۔''

مشتاق صاحب کے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ انہوں نے اسکرین پر نگاہ دوڑائی پھر ہڑبڑاتے ہوئے بولے۔ ''بیگم کا فون ہے۔ مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ اس نے چانپ کا گوشت لانے کے لیے کہا تھا۔ بساط کیا بچی میں اپنی اوقات ہی بھلا بیٹھا۔'' انہوں نے کھڑے ہوتے ہوئے اپنی واسکٹ کو درست کیا اور سیڑھیاں اتر کر صحن کی طرف چلے گئے۔

سید صاحب انہیں ترحم بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

اگلے اتوار آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ماحول میں حبس بہت زیادہ تھا۔ تاہم ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ موسم سہانا تھا۔ اس لیے سید صاحب ترنگ میں تھے۔ دو بازیاں جیتنے کے بعد بولے۔ ''گزشتہ روز ناہید کا فون آیا تھا۔ اس نے ماموں سے میرے متعلق بات چیت کر لی ہے۔ وہ خوش ہیں لیکن طلاق والا معاملہ اب بھی زیرِ بحث ہے۔ میں نے نیاز احمد سے بیس لاکھ قرضہ لینے کا معاملہ طے کیا ہے۔ تیس لاکھ میں بینک سے لون لوں گا۔ تنخواہ میں سے کٹوتی ہوتی رہے گی۔'' بوندا باندی نے شدت اختیار کر لی۔

مشتاق صاحب ان کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولے۔ ''چائے اور پکوڑوں کا دل چاہ رہا ہے۔ نوکر سے کہو پہلوان کی دکان سے لے آئے۔'' انہوں نے سو کا نوٹ نکال کر میز پر رکھ دیا۔

سید صاحب نے نوکر کو آواز دی۔ وہ صحن میں سے کپڑے اتار کر اندر لے جا رہا تھا۔ بھاگتا ہوا اوپر آ گیا۔ مشتاق صاحب نے نوٹ اس کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے پکوڑے لانے کے لیے کہا۔ نوکر جانے لگا تب سید صاحب نے شازیہ کو چائے بنانے کا بھی کہہ دیا۔ وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے چلا گیا۔

مشتاق صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔ ''تمہارا رعب و دبدبہ قابلِ تعریف ہے۔ نوکر بھاگ، بھاگ کر کام کرتا ہے۔ ورنہ آج کل کے نوکروں کے نخرے آسمان سے باتیں کرتے ہیں۔''

سید صاحب گویا ہوئے۔ ''تاہم شازیہ کے سامنے دال نہیں گلتی۔ والد صاب کی شہ نے اسے نہایت بدتمیز، اکھڑ مزاج اور ضدی بنا دیا ہے۔'' چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ دوبارہ بولے۔ ''میں نے سنا ہے۔ ڈاکٹر لمبو کے ساتھ تمہارے اچھے تعلقات ہیں۔ اس کے پاس کچھ ایسا ہے جس کی بدولت مصیبت سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔''

مشتاق صاحب نے کھنکھارتے ہوئے گلا صاف کیا۔ پھر محتاط نگاہوں سے سیڑھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''اس دنیا میں ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل موجود ہے۔ بات صرف رقم ڈھیلی کرنے کی ہے۔ میرے خیال میں پچاس لاکھ کی خطیر رقم حق مہر میں دینے سے کہیں بہتر ہے کہ پانچ لاکھ دے کر قصے کو جڑ سے ہی ختم کر دو۔''

سید صاحب بولے۔ ''اسی لیے تو تم سے بات کر رہا ہوں۔ میں نے ایک دوست کی زبانی سنا ہے۔ کوئی انجکشن وغیرہ کا چکر ہے۔''

''بات کچھ ایسی ہی ہے۔'' مشتاق صاحب نے رازدارانہ لہجے میں بتایا۔ ''میں پچھلے اتوار تم سے بات چیت کرنا چاہتا تھا لیکن موقع نہیں ملا۔ آج دل میں پکا تہیہ کر کے آیا تھا کہ تم سے بات ضرور کروں گا۔ اچھا ہوا تم نے خود ہی ذکر چھیڑ دیا۔'' انہوں نے کن انکھیوں سے سیڑھیوں کی طرف دیکھا پھر بولے۔ ''ویسے تو ایسی بہت سی ادویات ہیں جن کے استعمال سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ تاہم پکڑے جانے کا

www.pakistanipoint.com

اندیشہ لاحق رہتا ہے۔ ان کی کچھ نہ کچھ مقدار معدے میں باقی رہ جاتی ہے اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ قتل کی نشاندہی کر دیتی ہے۔ چند سال قبل ڈاکٹر لمبو کے کلینک پر ایک انجکشن کے سمپل آئے۔ ان کا مقصد دل کو تقویت دینا تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ اگر یہ انجکشن ایک صحت مند انسان کو لگائے جائیں تو چند ہی دنوں کے اندر اس کی موت واقع ہو سکتی ہے اور ڈاکٹری تشخیص ہارٹ اٹیک ظاہر کرتی ہے۔''

سید صاحب حیرت کی شدت سے اچھل پڑے لیکن اسی اثنا میں نوکر پکوڑوں سے بھرا ہوا شاپر اور پلیٹ ہاتھوں میں لیے سیڑھیوں پر نمودار ہوا۔ اس نے شاپر اور پلیٹ میز پر رکھتے ہوئے بتایا۔ ''بیگم صاحبہ نے چائے بنانے سے انکار کر دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کے سر میں درد ہے اگر چائے پینا ضروری ہے تو بازار سے منگوالیں۔''

سید صاحب کے چہرے پر غصے کے تاثرات پیدا ہوئے اور وہ جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''تم بھاگ کر دینو کے ہوٹل سے چائے لے آؤ۔ دیر نہ کرنا۔ جلدی واپس آنا۔'' نوکر نیچے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ مشتاق صاحب سے مخاطب ہوئے۔

''اب صبر کی انتہا ہو گئی ہے۔ مجھے اس کے متعلق کوئی حتمی فیصلہ کرنا ہو گا۔'' سائبان سے بارش کا پانی آبشار کی صورت میں نیچے گرنے لگا۔ تاہم تخت پوش محفوظ تھا۔ سید صاحب نے پکوڑوں کو پلیٹ میں ڈالا اور مشتاق صاحب کے سامنے رکھتے ہوئے بولے۔ ''مجھے پورا یقین ہے کہ اس کے سر میں درد نہیں ہے۔ وہ موبائل پر ماسٹر امان اللہ کے ساتھ بات چیت کر رہی ہو گی۔ یہ معاشقہ چند دنوں سے شدت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ وہ سرعام سب کچھ کر رہی ہے۔''

مشتاق صاحب نے افسوس کا اظہار کیا۔ ''اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ تاہم یہ تمہارے حق میں مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ محبت کی آگ میں جلنے والے دونوں وجودوں کو اتنی ہوا دو کہ وہ بھڑک کر اور بھی شدت اختیار کر لیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ماسٹر امان اللہ کو پانے کے لیے خود تم سے طلاق کا مطالبہ کرے گی۔ اس صورت میں تمہیں حق مہر نہیں دینا پڑے گا۔''

سید صاحب بولے۔ ''اسے ماسٹر امان اللہ کی شخصیت میں کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ یہ سب کچھ مجھے بھڑکانے کے لیے کر رہی ہے تاکہ میں طیش میں آ کر اسے طلاق دے دوں اور وہ پچاس لاکھ کی حق دار بن جائے۔ مجھے یاد ہے کہ پچھلے سال انہی دنوں میں اس کا منظورِ نظر صدیق پراپرٹی والا تھا۔ میں نے بھی سنجیدگی سے اس کے معاشقوں کی طرف توجہ نہیں دی۔ تم مجھے ڈاکٹر لمبو کی اس دریافت کے متعلق بتا رہے تھے جس کے استعمال سے نتیجہ ہارٹ اٹیک کی صورت میں واقع ہوتا ہے۔''

مشتاق صاحب نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ نوکر چینک اور پیالیوں کی ٹرے لیے نمودار ہوا۔ بارش کی شدت میں کمی واقع ہو گئی تھی اور ٹھنڈی دلفریب ہوا چلنے لگی تھی۔ نوکر نے چینک اور ٹرے کو پکوڑوں کی پلیٹ کے پاس رکھا اور سیڑھیاں اتر کر نیچے چلا گیا۔

سید صاحب نے چائے پیالی میں انڈیلی اور مشتاق صاحب کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''اب جلد از جلد بتا دو کہ معاملہ کیا ہے۔''

مشتاق صاحب بولے۔ ''تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو۔ صحت مند دل کو اگر مزید تقویت دی جائے تب نتیجہ ہارٹ اٹیک کی صورت میں ظاہر ہو سکتا ہے۔ غبارے میں ہوا ایک تناسب سے بھری جاتی ہے۔ حد سے تجاوز کی صورت میں وہ دھماکے سے پھٹ جاتا ہے۔ یہاں بھی معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔ ڈاکٹر لمبو کا ٹیکا لگنے کے بعد مرد کی موت مہینے بھر میں واقع ہوتی ہے جبکہ عورت پر اس کا اثر پندرہ دنوں میں ہوتا ہے۔'' وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولے۔ ''ہمارے معاشرے میں ہر دوسرا فرد کسی نہ کسی سے چھٹکارے کا خواہش مند ہے۔ کسی کو اپنی جھگڑالو بیوی سے نجات چاہیے اور کوئی باپ کی جائداد پر قبضہ کرنے کے لیے اس کی موت کا خواہاں ہے۔ اگر موت قدرتی ہو تب ان کے وارے نیارے ہو جائیں۔''

سید صاحب نے پوچھا۔ ''انجکشن کی قیمت کیا ہے؟ محتاط انداز میں بتانا، میرے پاس جمع پونجی نہ ہونے کے برابر ہے۔''

''ویسے تو وہ چھ لاکھ مانگتا ہے۔ ایک لاکھ میرا کمیشن اور پانچ لاکھ انجکشن کی قیمت۔ لیکن چونکہ تم میرے گہرے دوست ہو، اس لیے میں کمیشن نہیں لوں گا۔ پانچ لاکھ انجکشن کے دے دو۔''

سید صاحب کے چہرے پر سوچ کی لکیریں نمودار ہوئیں۔ ان کے اکاؤنٹ میں پانچ لاکھ سے کچھ اوپر کی رقم موجود تھی لیکن امریکا جانے کے لیے انہیں اس کی اشد ضرورت تھی۔ تاہم اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے ہامی بھرتے ہوئے پوچھا۔ ''رقم کی ادائیگی کا طریقۂ کار کیا ہے؟ اگر موت واقع نہ ہوئی تب میری رقم واپس ملے گی یا نہیں؟''

''مقصد میں کامیابی نہ ہونے کی صورت میں تمہیں تمہاری رقم واپس دے دی جائے گی۔ دوسرے انجکشن کے بعد ہدف کا بلڈ پریشر ہائی ہونے لگے گا۔ یہ اس بات کی واضح نشانی ہوگی کہ انجکشن نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ تب تمہیں پوری رقم ادا کرنا ہوگی۔''

سید صاحب نے چائے ختم کی اور پیالی کو میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تم انجکشن کب لاؤ گے؟ اور میں اسے کیسے انجکشن لگاؤں گا؟''

مشتاق صاحب نے چونکتے ہوئے بتایا۔ ''تمہارے لیے تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ غفور کمپاؤنڈر انجکشن لگانے کے لیے آتا ہے۔ اس کے ذریعے شازیہ کو انجکشن لگوا دینا۔ شازیہ کو کہہ دینا کہ ڈاکٹر لمبو نے طاقت کے چند انجکشن اس کے لیے بھی لکھوا دیے ہیں۔ ڈاکٹر سے پرچی میں حاصل کرلوں گا۔''

سید صاحب نے اثبات میں سر ہلایا اور ملاقات کا اختتام ہوا۔

اگلے دن مشتاق صاحب نے دوسر بند انجکشنوں کے ڈبے ان کے حوالے کرتے ہوئے بتایا۔ ''پانچ انجکشنوں کا کورس ہے۔ دوسرا انجکشن لگنے کے بعد اسے وجہ بے وجہ غصہ آنے لگے گا۔ یہ کیفیت نمایاں ہونے کے بعد تمہیں تین انجکشن اس وقت دیے جائیں گے جب تم رقم ادا کرو گے۔''

سید صاحب نے انجکشن کے ڈبوں پر نگاہ ڈالی۔ عام سے انجکشن تھے۔ جن کے ہمراہ ڈاکٹر کی پرچی بھی تھی۔ پرچی میں تحریر تھا کہ اولاد کے حصول کے لیے طاقت کے انجکشن لکھ کر دیے جا رہے ہیں۔

مشتاق صاحب نے انہیں تاکید کی کہ ''پرچی شازیہ کو دکھانے کے فوراً بعد پھاڑ کر پھینک دینا۔ چوتھے انجکشن کے بعد اس کی طبیعت نڈھال رہنے لگے گی۔ کوشش کرنا کہ وہ ڈاکٹر لمبو کے علاوہ کسی اور ڈاکٹر کے پاس نہ جانے پائے۔ پانچواں انجکشن لگوانے کی نوبت نہیں آئے گی۔ تاہم پھر بھی احتیاط کے طور پر انجکشن کو اپنے پاس رکھنا۔ بعض عورتوں کی قوتِ مدافعت عام عورتوں کی نسبت کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ تاہم یہ حتمی بات ہے کہ پانچویں انجکشن کے بعد سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ اس معاملے میں تمہیں کچھ احتیاطی تدابیر بھی اختیار کرنا ہوں گی۔ مثلاً انجکشن کا خالی ڈبا جلا کر تلف کر دینا۔ کمپاؤنڈر کو انجکشن دینے سے پہلے ٹیکے سے لیبل اتار لینا۔ شازیہ کو تلی ہوئی غذا زیادہ دینا۔ کولیسٹرول کی زیادتی دل کے معاملے میں تیر بہدف ثابت ہوتی ہے۔ ترش اور مسالے دار غذا کا استعمال زیادہ کر دینا۔ کام مکمل ہونے کے بعد رونے دھونے اور اداس دکھائی دینے کی اداکاری کرنا تمہاری صلاحیتوں پر منحصر ہوگا۔''

سید صاحب نے اثبات میں سر ہلایا اور مشتاق صاحب رخصت لے کر گھر سے باہر نکل آئے۔ انہیں یہ سب کرنے پر ہمیشہ افسوس محسوس ہوتا تھا لیکن مجبوری تھی۔ وہ اپنے گھرانے کے واحد کفیل تھے۔ نوکری معمولی اور تنخواہ محدود تھی۔ ان کے سات بچوں میں چھ لڑکیاں تھیں۔ وہ ان کی بڑھتی عمروں سے پریشان تھے۔ رشتے والے جہیز کا مطالبہ کرتے تھے۔ ان کے مطالبوں کو پورا کرنا ان کے اختیار میں نہیں تھا۔ ڈاکٹر لمبو سے ان کی دیرینہ جان پہچان تھی۔ ڈاکٹر ان کے معاشی مسائل اور پریشانیوں سے آگاہ تھا۔ اس نے امدادی تعاون کی غرض سے انجکشن کی خرید و فروخت پر کمیشن کے بجائے آدھی رقم دینے کا وعدہ کیا۔ پہلی ملاقات اور معاملے کی تفصیل معلوم ہو جانے کے بعد مشتاق صاحب نے کام کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ تاہم انہی دنوں ان کی بڑی لڑکی کا رشتہ آیا۔ لڑکا نہایت شریف اور سلجھی ہوئی طبیعت کا مالک تھا۔ اس نے جہیز لینے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کے باوجود بھی رخصتی پر رشتے داروں کو کھانا دینا اور لڑکی کے کپڑے لتے پر اچھا خاصا خرچ ہو جاتا جبکہ ان کے اکاؤنٹ میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔

ان کے آفس میں پینتیس سالہ کولیگ عبدالمنان کام کرتا تھا۔ اس کی بیوی کینسر کی مریضہ تھی۔ ڈاکٹروں نے اسے لاعلاج قرار دے دیا تھا۔ تاہم منان نہایت مستقل مزاجی کے ساتھ اس کا علاج کروا رہا تھا۔ اس کی تمام تنخواہ علاج و معالجے کی نذر ہو جاتی تھی اور صحت روز بروز خراب ہو رہی تھی۔ منان نے اپنی پریشانیوں کے کا ذکر مشتاق صاحب سے کیا تو چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد انہوں نے ڈاکٹر لمبو کے انجکشن والا معاملہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ منان سوچ میں پڑ گیا۔ تیسرے نشانے پر لگتا دیکھ کر مشتاق صاحب بولے۔

''وہ بہت اذیت میں ہے۔ اسے نجات دلوانے کی کوشش کرو۔ فضول میں بیماری پر رقم لگانے کا کیا فائدہ۔ میرے ایک عزیز کے ساتھ ایسا ہی معاملہ درپیش تھا۔ ڈاکٹر نے اس کی ماں کو لاعلاج قرار دے دیا تھا۔ اس کے باوجود مرتے مرتے وہ دس سال نکال گئی۔ اس دوران میرا عزیز پائی پائی کا محتاج ہو کر رہ گیا۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ میری مانو تو اسے اذیت سے نجات دلوا کر دوسری شادی کرلو۔''

دوسری شادی کے نام پر منان کے چہرے پر چند لمحوں کے لیے رونق پیدا ہوئی۔ تاہم جلد ہی وہ افسردہ لہجے میں بولا۔ ''اس کا متواتر علاج کرواتے رہنے کے بعد اب میرے پاس

www.paksociety.com

پاس بھی نہیں بچا۔ شادی کی تو میں بات ہی نہیں کرتا۔ انجکشن خریدنے کے لیے بھی رقم موجود نہیں ہے۔‘‘

مشتاق صاحب بولے۔ ’’گورنمنٹ لون دے رہی ہے۔ ماہانہ اقساط پر رقم واپس دینے کے علاوہ سود بھی بہت کم لگایا جاتا ہے۔ تم بینک سے تفصیل معلوم کر سکتے ہو۔ میری بات پر دھیان دو۔ مہنگائی کے اس دور میں اگر ایک آدمی کا خرچ بچ جائے تو ماہانہ اخراجات میں نمایاں تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور اگر خاندان کا وہ فرد مریض ہو تو تم خود سوچ سکتے ہو۔ اس پر ہونے والے خرچے کے علاوہ تمام تنخواہ بھی بہ آسانی بچ سکتی ہے۔ منان نے فوراً ہامی بھر لی اور اسی مہینے بینک سے قرضہ لینے کے بعد رقم مشتاق صاحب کے ہاتھوں میں تھما دی۔ انہوں نے پانچ لاکھ جیسی خطیر رقم زندگی میں پہلی دفعہ دیکھی تھی۔ وہ ہکا بکا رہ گئے کیونکہ اس میں سے ڈھائی لاکھ کی رقم کے وہ مالک تھے۔ انہوں نے تمام رقم کو ایک سیاہ تھیلے میں محفوظ کیا اور گھر لے آئے۔ دونوں میاں بیوی نے مل کر اپنی رقم کو علیحدہ کیا اور باقی ڈھائی لاکھ ڈاکٹر کے حوالے کر دیے۔

ڈاکٹر لمبو نے دو انجکشن اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ ’’تمہارے مفلسی کے دن ختم ہوئے۔ ہمت کو جوان رکھنا۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اس معاملے میں پھنسنے کے چانسز نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اگر کام محتاط انداز میں کیا گیا تب تمہارا اور میرا نام بیچ میں نہیں آئے گا۔ تاہم تیسری پارٹی معاملہ خراب کر سکتی ہے۔ انجکشن کا نام منظرِ عام پر آنے کی صورت میں ہم سب معاملے میں ملوث ہو جائیں گے۔ جسے انجکشن دے رہے ہو، اسے کہنا کہ استعمال کے بعد لیبل کو تلف کر دے اور جس کمپاؤنڈر سے انجکشن لگوائے اس کے گوش گزار کر دے کہ انجکشن طاقت کا ہے۔‘‘

مشتاق صاحب نے انجکشن لیے اور آفس جا کر منان کے حوالے کر دیے۔ چند ہی دنوں میں حسبِ توقع نتائج برآمد ہو گئے۔ منان کی بیوی کی موت آسان ہو گئی اور ڈھائی لاکھ کی رقم سے مشتاق صاحب نے پہلی لڑکی کی شادی نہایت دھوم دھام سے کر دی۔ رخصتی کے بعد جب سوچنے سمجھنے کا وقت ملا تب انہیں ضمیر نے پریشان کرنا شروع کیا۔ وہ نہ صرف قاتل بن گئے تھے بلکہ انہوں نے اپنی بیٹی کی شادی پر جو رقم خرچ کی تھی وہ بھی اسی قتل سے حاصل ہوئی تھی۔ ان کی راتوں کی نیند حرام ہونے لگی۔

بیوی نے دلاسا دیا۔ ’’کسی کو مارنا انسان کے لیے ممکن نہیں۔ جو پیدا ہوتا ہے اس کے مرنے کا وقت اور دن مقرر کر دیا جاتا ہے۔ ذریعہ کوئی بھی بن جاتا ہے۔ اسی طرح منان کی بیوی کے مرنے کا دن اور وقت مقرر تھا۔ ذریعہ تم بن گئے۔‘‘ بات مشتاق صاحب کی سمجھ میں آ گئی اور وہ واپس زندگی کے معمولات کی طرف آ گئے۔

مشتاق صاحب کی دوسری لڑکی کا رشتہ تیار تھا۔ اس دفعہ مسز مشتاق نے عملی قدم اٹھاتے ہوئے کیس تلاش کیا۔ ان کی گہری سہیلی مومنہ طارق کی لڑکی حافظ آباد میں بیاہی تھی۔ شوہر نہایت ظالم، بے روزگار اور ہیروئنچی تھا۔ آئے دن دونوں میاں بیوی کے درمیان لڑائی جھگڑوں کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ وہ لڑکی کو ڈنڈوں کے ساتھ پیٹتا تھا۔ تاہم حد اس وقت ہوئی جب اس نے طیش میں آ کر لڑکی کے چہرے پر تیزاب پھینک دیا۔ بروقت امداد کی وجہ سے چہرہ جھلسنے سے بچ گیا

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور
ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی، ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک سال کے لیے 12 شماروں کا سالانہ چندہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1500 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 12000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 11000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین
یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ

مرزا ثمر عباس: 0301-2454188
سرکولیشن مینیجر سید منیر حسین: 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
مین کورنگی روڈ۔ کراچی

لیکن بدنما داغ ضرور پڑ گئے۔ مومنہ نے معاملے کو ختم کرنے کے لیے لڑکی کو طلاق دلوانے کی کوشش کی۔ لڑکے والوں نے صاف انکار کر دیا اور دھمکی دی کہ اگر عدالت میں جانے کی کوشش کی تو لڑکی کی جان کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ مومنہ خاموش ہو کر بیٹھ گئی۔

مسز مشتاق نے تمام روداد سننے کے بعد اس کو ڈاکٹر لمبو کے ٹیکے کے متعلق بتایا جس کے استعمال سے لاٹھی بھی نہ ٹوٹتی اور سانپ بھی مر جاتا۔ تاہم ضرورت پانچ لاکھ جیسی خطیر رقم کی تھی۔ مومنہ سوچ میں پڑ گئی۔ وہ پرائیویٹ اسکول میں پرنسپل تھی۔ تنخواہ معقول لیکن بچت نہ ہونے کے برابر تھی۔ جمع پونجی چند زیورات کے علاوہ نہیں تھی۔ یہ وہ زیورات تھے جو اس کی بیٹی نے اپنے ہیروئنچی شوہر سے چھپا کر اس کے حوالے کیے تھے تاکہ مشکل وقت میں کام آسکیں۔ مومنہ نے تمام زیورات قریبی جیولرز کی دکان پر لے جا کر دکھائے۔ سونے کی قیمت چڑھی ہوئی تھی۔ اس لیے رقم چھ لاکھ سے اوپر بنی۔ چند دنوں کی سوچ بچار کے بعد اس نے زیور بیچ دیے اور رقم مسز مشتاق کے حوالے کر دی۔ ایک دفعہ پھر سودا طے ہوا۔ آدھی رقم مشتاق صاحب کے اکاؤنٹ میں اور آدھی ڈاکٹر لمبو کے کھاتے میں چلی گئی۔ مومنہ کو دو انجکشن دے دیے گئے۔ باقی کے تین بعد میں دینے کا وعدہ ہوا۔ دونوں انجکشن اس نے نہایت خفیہ طریقے سے لڑکی کے حوالے کر دیے۔ چند دنوں کے اندر کام نہایت خفیہ طریقے سے انجام پا گیا۔ لڑکا ہیروئن پینے کا عادی تھا۔ اس لیے اسے انجکشن لگانا مشکل ثابت نہیں ہوا اور جلد ہی شوہر سے چھٹکارے کے بعد لڑکی ماں کے پاس آگئی۔ اس کی آمد پر مومنہ مٹھائی کے ڈبے کے ساتھ مسز مشتاق کے گھر آئی اور نہ صرف مٹھائی کا ڈبا انہیں دیا بلکہ جاتے ہوئے ڈھیروں دعائیں بھی دیں۔

مشتاق صاحب، دوسرے کمرے میں بیٹھے ان کی گفتگو سن رہے تھے۔ ان کے دل و دماغ میں رہے سہے خدشات بھی ہٹتے چلے گئے۔ اب انہیں اس بات پر شرمندگی محسوس نہیں ہو رہی تھی کہ وہ اپنی بیٹیوں کی شادی پر خرچ ہونے والی رقم غیر قانونی طریقے سے حاصل کر رہے تھے۔

چند دن قبل منان نے دوسری شادی کر لی تھی۔ وہ نہایت مستقل مزاجی اور ذمے داری کے ساتھ ماہانہ اقساط اتار رہا تھا۔ اس کی دوسری بیوی پڑھی لکھی اور سلجھی ہوئی خاتون تھی۔ اس نے گھر میں قدم رکھتے ہی اپنی تمام ذمے داریوں کو ہنسی خوشی سنبھال لیا تھا۔ منان اور مشتاق صاحب کی جب بھی ملاقات ہوتی، وہ محبت بھرے انداز میں ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہتا۔

''یہ سب آپ کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ آپ نے جہاں میری پہلی بیوی کو اذیت بھری بیماری سے نجات دلوا کر اس پر احسان کیا۔ وہاں میرا گھر دوبارہ بنانے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔'' مشتاق صاحب اپنے دل کو مطمئن کرنے کے لیے سوچتے تھے۔ صرف طریقۂ کار غیر قانونی ہے۔ تاہم اس غلط طریقۂ کار کی بدولت بہت سوں کا بھلا بھی تو ہو رہا ہے۔ منان کی بیوی کو جہاں بیماری سے نجات ملی۔ وہاں ایک گھر مزید آباد ہوا۔ مومنہ کی بیٹی کو تشدد پسند شوہر سے نجات ملی۔ اب ان دونوں ماں بیٹی کے گھر میں سکون تھا۔

اس کے بعد دونوں میاں بیوی نے مل کر کام شروع کر دیا۔ تین لڑکیوں کی شادی یکے بعد دیگرے ہو گئی۔ مومنہ والے کیس کے بعد تین ایسے اور کیس آئے جو مسز مشتاق کے مرہون منت تھے۔ انہوں نے خود بات چیت کی اور خود ہی ڈاکٹر لمبو سے انجکشن لے کر کیس سے متعلق افراد کے حوالے کر دیے۔ ان سے حاصل کردہ رقم کو انہوں نے مشترکہ اکاؤنٹ میں منتقل کر دیا۔ گھر میں خوش حالی کا سماں پیدا ہونے لگا۔ اکاؤنٹ میں رقم روز بروز بڑھنے لگی۔ مشتاق صاحب موٹر سائیکل پر آفس جاتے تھے۔ وہ نہایت سنجیدگی سے گاڑی خریدنے کے متعلق سوچنے لگے۔ چار لڑکیوں کی شادیاں اچھے گھرانوں میں ہو گئی تھیں۔ اب صرف ایک لڑکی اور لڑکا باقی رہ گئے تھے۔ اخراجات میں بھی کمی آ گئی تھی۔ تنخواہ میں گزارا بہ آسانی ہو جاتا تھا اور کیسوں سے حاصل کردہ رقم بینک میں جمع ہوتی رہتی تھی۔ تاہم سید صاحب والا معاملہ حل ہونے کے قریب تھا۔

☆☆☆

دو ہفتے کے بعد انہیں مسز سید کے انتقال کی خبر موصول ہوئی اور وہ پشیمان چہرہ لیے سید صاحب کے گھر چلے آئے۔ یہ پہلا کیس تھا جس میں انہیں ذہنی تناؤ محسوس ہو رہا تھا۔ مسز سید کا قصور کیا تھا۔ انہیں کس بات کی سزا دی گئی تھی۔ اگر طلاق ہو جاتی تو زیادہ بہتر نہیں تھا۔ موت والی بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ انہوں نے دل کو مطمئن کرنے کے لیے سوچا۔ شطرنج کے کھیل میں دو میں سے ایک حریف کو مات کا سامنا تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ بساط دونوں فریقوں کے لیے بچھائی جاتی ہے۔ اب جس کا دماغ مستعدی کے ساتھ کام کرے وہ بازی لے جاتا ہے۔ اگر مسز سید اپنا دماغ استعمال کرتیں تو شاید حالات ایسے نہ ہوتے۔ ڈاکٹر لمبو کا انجکشن تو صرف ذریعہ بنا ہے۔ ہار جیت کا فیصلہ سراسر دماغ کی مستعدی پر ہوتا ہے۔ جب

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

انہوں نے سید صاحب کے گھر میں قدم رکھا، صحن محلے کی عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ مردوں کے لیے چھت پر بنے سائبان کے نیچے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آگئے۔ سائبان کے نیچے محلے کے مرد بیٹھے تھے۔ باقی چھت پر تمبو لگا کر سایہ کیا گیا تھا۔ تخت پوش اور گملوں کو ہٹا کر وہاں قالین بچھا دیے گئے تھے۔ انہوں نے محلے والوں سے سلام دعا کی اور خاموشی کے ساتھ خالی جگہ پر بیٹھ گئے۔ محلے والے مسز سید کی ناگہانی موت پر اظہارِ افسوس کر رہے تھے۔ مشتاق صاحب سوچنے لگے۔ پورے پندرہ دنوں کے اندر نتائج برآمد ہو گئے۔ ڈاکٹر لمبو کی دریافت اور تشخیص کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ سید صاحب کا مسئلہ بیٹھے بٹھائے حل ہو گیا۔ طلاق کی صورت میں پچاس لاکھ بھی خرچ کرنا پڑتے۔ عدالت کی خواری اور محلے میں ذلت علیحدہ ہوتی۔ ایک پنتھ دو کاج کے مترادف بیوی سے چھٹکارا بھی مل گیا اور محلے والوں کی نگاہوں میں عزت بھی بنی رہی۔ اس کے علاوہ قرضہ لے کر واپس کرنے کے جھنجھٹ سے بھی آزادی مل گئی۔ ان کی سوچوں کا سلسلہ درمیان میں ہی رہ گیا۔ نیچے صحن میں عورتوں کا شور سنائی دیا۔ مشتاق صاحب ہڑبڑا کر اپنی جگہ سے اٹھ کر سیڑھیوں کے پاس چلے آئے۔ صحن میں عورتوں کے درمیان انہیں اپنی بیوی کھڑی دکھائی دیں۔ وہ بوکھلائے ہوئے انداز میں ان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ مشتاق صاحب کو جب مسز سید کے انتقال کی خبر ملی تھی تب ان کی بیوی اپنی خالہ کی عیادت کے لیے گئی ہوئی تھیں۔ اس لیے وہ انہیں ہمراہ نہیں لا سکے تھے۔ تاہم انہوں نے لڑکے کے ذریعے موت کی خبر بھجوا دی تھی۔ مسز مشتاق چند لمحے قبل ہی سید صاحب کے گھر آئی تھیں۔ مشتاق صاحب نے چلاتے ہوئے ان سے معاملے کے متعلق دریافت کیا۔ لیکن نوحہ کناں عورتوں کی آوازوں کے درمیان ان کی آواز دب کر رہ گئی۔ وہ نہایت عجلت کے عالم میں سیڑھیاں اتر کر صحن میں چلے آئے۔ ان کی بیوی ان کے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔ مشتاق صاحب نے پریشان لہجے میں ان سے عورتوں کے چیخنے چلانے کی وجہ دریافت کی۔ مسز مشتاق نے وجہ بتانے کے بجائے ان سے پوچھا۔

”تم نے سید صاحب کو انجکشن فروخت کیے؟“

مشتاق صاحب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

مسز مشتاق اپنا سر تھام کر زمین پر بیٹھ گئیں اور تاسف بھرے لہجے میں بولیں۔ ”یہ کیا غضب ہو گیا۔ خدا ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔ نادانستگی میں ہم سے پورے کا پورا گھرانا اجڑ گیا۔“

مشتاق صاحب نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”تم کیا کہہ رہی ہو، مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ پہیلیاں بجھوانے کے بجائے صاف صاف الفاظ میں بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے؟“

مسز مشتاق نے دوپٹے سے اپنی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو صاف کیا پھر بھرائے ہوئے لہجے میں بولیں۔

”ایک ماہ قبل مجھے مسز سید کی جانب سے بُلاوا موصول ہوا۔ میں گھر چلی آئی۔ گھر میں مسز سید اکیلی تھیں۔ بُلانے کی وجہ دریافت کرنے پر انہوں نے مجھے بتایا کہ سید صاحب امریکا میں رہنے والے ماموں کی لڑکی ناہید سے شادی کرنا چاہتے ہیں اور چونکہ ناہید کا اصرار ہے کہ وہ پہلے اپنی بیوی کو طلاق دیں اور بعد میں امریکا آئیں۔ اس لیے سید صاحب حق مہر کی رقم کا انتظام کرنے کے لیے بینک سے لون لینے کے لیے غور کر رہے ہیں۔ مسز سید ان سے نالاں تھیں اور بدظن ہونے کے بعد ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کی متمنی تھیں۔ اس لیے انہوں نے مجھ سے ڈاکٹر لمبو کے انجکشن کے متعلق دریافت کیا۔ میں نے انہیں تمام تفصیل سے آگاہ کرنے کے بعد رقم کے متعلق بتا دیا۔ مسز سید نے اپنے زیور میرے حوالے کیے اور میں نے جیولرز کے ہاتھوں زیور فروخت کر کے رقم ڈاکٹر لمبو کو دے دی اور ڈاکٹر لمبو سے حاصل کردہ انجکشن مسز سید کے حوالے کر دیے۔ مسز سید نے اولاد کے لیے علاج کا بہانہ بناتے ہوئے غفور کمپاؤنڈر کی خدمات حاصل کر کے وہ انجکشن سید صاحب کو لگا دیے۔ چند لمحے قبل جب میں نے سید صاحب کے گھر میں قدم رکھا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ نہ صرف مسز سید کا انتقال ہوا ہے بلکہ... کچھ دیر قبل سید صاحب بھی عالمِ فانی سے کوچ کر گئے ہیں۔ میرے دماغ میں فوراً خیال پیدا ہوا۔ سید صاحب آپ کے دوست تھے۔ اگر مسز سید ان سے چھٹکارے کی متمنی تھیں تو کہیں ناہید سے شادی کرنے کے لیے انہوں نے اسے راستے سے ہٹانے کے لیے ڈاکٹر لمبو کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش تو نہیں کی اور میرا خدشہ درست ثابت ہوا۔“ وہ کلیجا تھام کر روتے ہوئے بولیں۔

”اب میں خدا کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ انجانے میں مجھ سے تمام گھرانا تباہ ہو گیا۔“ مشتاق صاحب بھی سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ شطرنج کی بساط میں دونوں فریقوں میں سے ایک کی جیت اور دوسرے کی ہار ہوتی ہے۔ تاہم اس معاملے میں دونوں کو ہی شہ کے بعد مات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ معاملہ نہایت ناقابلِ فہم تھا۔

❖❖❖

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

بارہویں قسط

الاؤ

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

الائو... مرحوم کاشف زبیر کی آخری سلسلے وار تحریر ہے... جو انہوں نے .... قارئین کے لیے تحریر کرنا شروع کی تھی... لیکن دستِ قضا نے ان کو اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ چند سنسنی خیز اقساط لکھنے کے بعد اسے اختتام تک پہنچاتے... کسی بھی مصنف کی تحریر کو اسی کے رنگ و آہنگ میں لکھنا کڑا امتحان ہوتا ہے... الائو کو آگے بڑھانے کا فریضہ اب ڈاکٹر عبدالرب بھٹی انجام دیں گے... الائو ایکشن، تھرل اور سسپنس سے بھرپور داستان ہے... ایک مسیحا کو لوگوں کی مسیحائی سے دور کرکے درندگی کے گھنائونے کھیل میں ایسا الجھایا کہ وہ زندگی کی ہر رنگینی کو بُھلا بیٹھا... اب اس کا مقصد صرف اور صرف ان دشمنوں کی کھوج تھی جو سامنے ہوتے ہوئے بھی نگاہوں سے اوجھل تھے...

انسان نما درندوں کی داستان وہ جتنے
جاگتے ہم نفسوں کو بھی بازار کی جنس بنا دیتے ہیں

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

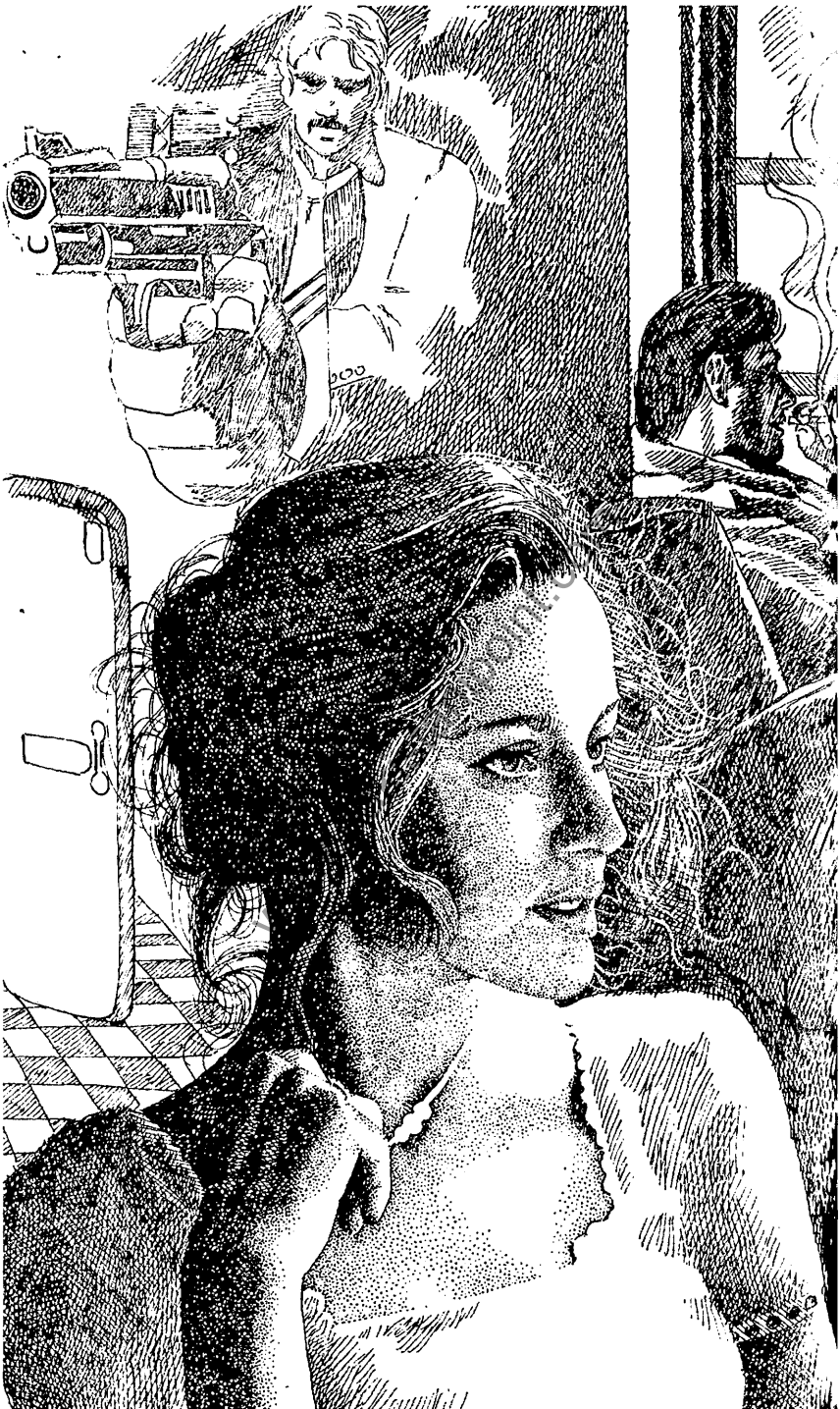

ریسیور ..... اُسے تھما کر میں دانستہ ناراضگی دکھاتے ہوئے وہاں سے اُٹھ کر دوسرے کمرے میں آ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ رومی فون پر طارق سے میری ناراضگی کا ذکر ضرور کرے گی اور میں بھی یہی چاہتا تھا۔

میرا مسئلہ یہ تھا کہ کوئی بھی مجھے حمیرا کے حوالے سے چابک لگانے کی کوشش کرتا تو مجھے بُرا لگتا تھا، آخر رومی اور طارق نے یہ کیوں سمجھ رکھا تھا کہ میں حمیرا کی جدائی یا اس کے خیال کو اپنے اہم مشن پر ترجیح دے سکتا ہوں۔ جبکہ میں بارہا اشارتاً ہی سہی بلکہ عملی طور پر بھی ان دونوں کو یہ دکھا چکا تھا، باوجود اس کے ان کا حمیرا کے حوالے سے ایسی بات کہنا مجھے بُرا لگا تھا۔

حمیرا کو بھلانے کے لیے میں جس عذاب سے گزرتا رہا ہوں، وہ میرا دل ہی جانتا تھا۔

تنہائی میں آ کر بیٹھا تو میرے ذہن کو ایک کچوکا لگا، احساس ہوا کہ میں خود کو دھوکا دے رہا ہوں۔ حمیرا اب بھی میرے تصور ..... میں موجود تھی، دل کے کسی صنم خانے میں اس کا بت اب بھی میں نے لاشعوری طور پر تراش رکھا تھا۔ اسے جھٹلانے کی بار بار شعوری کوشش مجھے لاشعوری طور پر پھر اس کا خیال آباد کرنے کا سبب بن رہی تھی اور..... شاید یہی وجہ تھی کہ میرا مزاج چڑچڑا ہونے لگتا۔ رومی اور طارق اگر حمیرا کے حوالے سے کوئی بات کرتے تو میرے چڑنے کی وجہ یہی تھی، کہ وہ اپنی جگہ غلط نہیں تھے، اور میں ناکام.....

تنہائی میں انسان کو سوچنے کی ضرورت نہیں پڑتی، خیالات اور سوچوں کی آپوں آپ ہی یلغار ہونے لگتی ہے۔ ایسے میں ہی مثبت سوچیں منفی خیالات پر حاوی بھی ہونے لگتی ہیں، انسان کو صحیح اور غلط کا احساس ہونے لگتا ہے، مجھے بھی لگا کہ میں رومی اور طارق سے اس طرح ناراض ہو کے غلطی کر رہا ہوں۔ میرے اندر کا غبار ذرا کم ہونے لگا تو میں جیسے دُھلنے کے عمل سے گزرنے لگا۔

میں جس کمرے میں آ کر بیٹھا تھا، یہ وہی کمرا تھا جہاں ہم گل بادشاہ کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔

میں سر جھٹک کر اُٹھا اور..... واپس اسی کمرے میں جانا چاہتا تھا جہاں رومی موجود تھی کہ میں چونک پڑا۔

دروازے پر رومی فون پکڑے کھڑی تھی اور میری ہی جانب تکے جا رہی تھی۔

”موڈ ٹھیک ہے تمہارا؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔“ میں نے ہولے سے کہا۔ لہجے میں خفت تھی۔

”لو پھر، طارق تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔“ اس نے فون میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ میں نے آگے بڑھ کر فون اس کے ہاتھ سے لیا اور کان سے لگاتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔ رومی بھی میرے پیچھے پلٹ آئی تھی۔

میں فون پر طارق کو ’ہیلو‘ کہتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔

”کیا ہو گیا ہے ڈاکٹر صاحب! اتنی تُنکی......؟“ دوسری جانب سے طارق نے جیسے مجھے گھُرکنے کے انداز میں کہا۔ اس کا لہجہ بھی مجھے تھوڑا بدلا ہوا محسوس ہوا، جیسے اسے بھی میرا رویہ کھلا ہو۔

”کچھ نہیں، شاید ذہن پر تھکن سوار ہو گئی ہے۔“ میں نے بات بنائی۔ میں اب خود شرمندہ تھا، سمجھتا تھا کہ جس مہم پر ہم تھے، اس میں رومی اور طارق مجھ سے زیادہ اہم تھے۔ خود میں اکیلا کیا تھا؟ اب تک بھی جو کچھ ہوا تھا، وہ انہی کے طفیل ہی ہوا تھا۔

”نہیں ڈاکٹر صاحب!“ وہ پھر اجنبی اجنبی اور ترش سے لہجے میں بولا۔ ”یہ تھکن نہیں ہے، مجھے یا رومی کو جُل دینے کی کوشش مت کرو..... تم چاہتے ہو کہ سب کچھ ویسا ہی ہوتا رہے جیسا تم چاہ رہے ہو، یوں چٹکی بجائی اور خود سوداگر ختم..... یہ ویڈیو گیم نہیں ہے ڈاکٹر صاحب! ہم نے اپنی جانیں داؤ پر لگا رکھی ہیں، ہم ایک طویل محاذ کی پیچ ہیں اس وقت.....“

”یار! تم پتا نہیں کہاں پہنچ گئے...... ایسی بات نہیں ہے۔“ میں نے خود کو مزید دھیما کیا۔

”ایسی ہی بات ہے ڈاکٹر صاحب!“ وہ پھر تلخی سے بولا اور اس بار میں جو اپنے غبار کو تحلیل کرنے کی... خاصی کوشش کر رہا تھا، وہ پھر پیچھے جاتے جاتے، کسی کھولتے پانی کے برتن کی طرح دوبارہ ابلنے آنے لگا۔ پھر بھی میں ضبط سے ہی کام لیتا رہا۔ رومی البتہ ہم دونوں کی ترش روئی پر ہونٹ کاٹنے لگی۔ وہ پریشان دکھائی دی۔

”رومی بتا رہی تھی کہ واپسی میں تم نے میری خوب غیبتیں کی ہیں، میرا اپنا طریقہ کار ہوتا ہے کام کرنے کا ڈاکٹر صاحب..... خود مجھے بھی اس وقت تک پتا نہیں ہوتا جب تک میں اس میں ہاتھ نہ ڈال دوں اور بھلا پھر میں رومی اور تم سے باتیں کیوں چھپاؤں گا؟ حمیرا کا ذکر ہم نیک نیتی سے چھیڑتے ہیں، ہمدرد غم خوار دوستوں کی طرح، تمہیں چڑانے کے لیے نہیں..... اب میں کیا کہوں مزید.....“

”کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں..... میں اپنے اُبال

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

کو دبانے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' میں نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

اسی وقت رومی نے مجھ سے فون لوٹانے کا کہا اور طارق سے خود ہی ایک کونے میں جا کر باتیں کرنے لگی۔

میں کرسی سے اُٹھا اور یونہی بستر پر دراز ہو گیا۔

میں سونے کی کوشش کر رہا تھا مگر نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور محسوس ہو رہی تھی۔ دل و دماغ نجانے کیسی کیسی کثافتوں کی زد میں تھا۔ سوچوں کے دروازے بند کرنے کے باوجود وہ کہیں نہ کہیں شعوری اور لاشعوری طور پر وارد ہو جاتی تھیں۔

میں ذرا دیر بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور تنگ آ کر تکیہ سر کے نیچے سے نکال کر اس میں منہ گھسا دیا۔

پھر نجانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ میں گہری نیند میں چلا گیا۔

☆☆☆

اگلے دن صبح مجھے رومی نے ہی جگایا۔ معلوم ہوا کہ ناشتے کی میز پر گل بادشاہ ہی نہیں بلکہ طارق بھی میرا منتظر تھا۔

مجھے طارق کی اس قدر جلدی واپسی پر حیرت ہوئی۔ میں نے وال کلاک پر وقت دیکھا۔ نو بج رہے تھے۔ ممکن تھا کہ وہ ابھی ابھی... یہاں پہنچا ہو۔

بہرحال میں فریش ہو کے ناشتے کی میز پر آ گیا۔ وہاں سب موجود تھے۔ سلام دعا کے بعد میں نے طارق کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا اور ایک کرسی سنبھال لی۔

ناشتا خاموشی سے کیا جا رہا تھا۔ اس کے بعد چائے کا دوسرا کپ نشست گاہ پر پیا جانے لگا اور وہیں اب تک کی گفتگو کا آغاز بھی ہوا۔

میں تو فی الحال خاموشی سے چائے پیتا رہا، وہ آپس میں گفتگو کرنے لگے، جبکہ طارق، گل بادشاہ کو اپنے تئیں اب تک کی صورتِ حال سے آگاہ کرتا جا رہا تھا۔ میرا تذکرہ بھی آیا۔

اس کے بعد گفتگو تبادلۂ خیال کی جانب بڑھی تو طارق نے مجھ سے بھی ان تازہ ترین حالات کے بارے میں رائے لینے کی کوشش چاہی، مقصد غالباً اس کا یہی ہوگا کہ وہ مجھے بھی اس موضوع کی جانب کھینچ لانا چاہ رہا تھا۔

میرے دل و دماغ پر ابھی تک کل رات ہونے والی ترش و تلخ باتوں کا غبار طاری تھا۔ تاہم میں برداشت کیے ہوئے تھا۔ لیکن جب اس نے مجھے مخاطب کیا تو میں نے اُلٹا اس سے سوال پوچھا۔

''میرے اور رومی کی واپسی کے بعد تم وہاں موجود رہے، کیا تمہیں کوئی خاص کلیو ملا؟ جس کے لیے تم وہاں رکے تھے؟''

طارق نے نفی میں سر ہلا دیا اور بولا۔ ''ابھی تو نہیں...... لیکن ہمارا نشانہ اب بھی بدستور گوہر شاہ کی وہی حویلی رہے گی، ممکن ہے مجھے وہاں مستقل ڈیرا ابھی ڈالنا پڑ جائے۔''

طارق کے جواب سے میں مطمئن ہو گیا اور میرے اندر کی ساری کدورت چھٹنے لگی۔

اس نے اگرچہ مجھ سے جواب مانگا تھا مگر میں نے اُلٹا اس سے سوال کر ڈالا، جس کا اس نے جواب بھی دیا، لہٰذا اب میں اپنی رائے دیتے ہوئے بولا۔

''گوہر شاہ کے خلاف اس کی بیٹی بانو والا ہی کیس بہت مضبوط ہے، انسپکٹر شعیب کا قتل بھی اسی نے کروایا ہوگا، تاکہ وہ بیان سامنے نہ آ سکے جس کی بنیاد پر گوہر شاہ نے اس کی مدد سے بانو کو ہم سے چھین کر دانستہ اس کے باپ کے حوالے کیا۔ سب سے بڑا کلیو تو جبار ماہی ہے۔ آپ کا ایس پی سجاد رندھاوا اس سے بہت کچھ اُگلوا سکتا ہے۔ میرا نہیں خیال ہے کہ اب ہمیں اس سلسلے میں مزید ہاتھ پاؤں مارنے کی ضرورت ہے۔''

یہ آخری بات میں نے دانستہ طارق اور رومی کو سنانے کے لیے بہ ظاہر گل بادشاہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہی تھی اور سارا زور میں نے پولیس اور ایس پی سجاد پر دینے کی کوشش تھی۔ ظاہر ہے ہمیں جتنا کام کرنا تھا، وہ ہم نے اپنی جانیں جوکھم میں ڈال کر کر دیا تھا۔

گل بادشاہ میری بات سمجھ رہا تھا، لیکن طارق کسی اور ہی سوچ میں گم نظر آیا، جبکہ رومی کچھ سوچنے کے انداز میں اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے...... طارق کی جانب ترچھی نگاہوں سے تکے جا رہی تھی۔ گویا اب وہ اس کے بولنے کی منتظر ہو۔

''میں تمہاری بات سے متفق ہوں ڈاکٹر صاحب!'' گل بادشاہ نے فوراً کہا۔ ''اس میں کوئی شک نہیں کہ تم تینوں نے بہت بڑا معرکہ مارا ہے۔ ان مجرموں کے خلاف قانون کے ہاتھ مضبوط کیے ہیں۔ میں ایس پی سجاد پر اسی بات کا زور دوں گا بلکہ اسے خود بھی اندازہ ہے اور وہ تم لوگوں کا مشکور بھی ہے۔''

''مگر بات صرف یہاں ختم نہیں ہو جاتی۔'' طارق

Naqar Azeem www.pakistanipoint.com

نے بالآخر لب کشائی۔ ہم سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔

”بات تو تب ہے جب ایس پی سجاد...... گوہر شاہ کو گرفتار کرے، اسے قانون کے کٹہرے میں لائے۔“

”یہ سب اپنے وقت پر ہو ہی جائے گا۔“ میں نے کہا۔ ”گوہر شاہ، حویلی والے واقعے کے بعد سے گم شدہ ہے، یعنی کہ مفرور ہی ہے۔ حویلی میں بیک وقت دو حادثے رونما ہو چکے ہیں۔ ایک بانو کی باپ ہی کے گھر میں قید اور خودکشی دوسرے اس کی بیوی یعنی بانو کی ماں جس کا نام غالباً نفیسہ بیگم معلوم ہوا تھا ہمیں...... اس نے چھلانگ لگائی۔ ان سب باتوں اور واقعات کے پھندے میں...... گوہر شاہ کی گردن پھنسی ہوئی ہے، جسے چھڑانا اب اس کے لیے آسان نہیں......“

”تو ہم کیا پھر اسے قرار واقعی سزا ملنے تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں؟“ طارق بولا۔

”میں نے یہ تو نہیں کہا......“ میں اس کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے بولا۔

”اسی مقصد کے لیے تو میں اکیلا وہاں رہ گیا تھا تاکہ مزید حالات کا جائزہ لے سکوں کہ...... حویلی میں ان واقعات کے بعد گوہر شاہ ان پر کیسے پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے؟ وہ اگر مفرور ہے بھی تو سب سے پہلے وہیں کا ہی رخ کرے گا اور وہیں سے ہی پتا چلے گا کہ وہاں وہ خود کو قانون کے پھندے سے بچانے کے لیے کون سے ہتھیار تیز کر رہا ہے۔“

”اچھی بات ہے۔“ میں نے کندھے اُچکا کر کہا۔

”لیکن تم نے کل رات سے ہی میرے وہاں رُکنے پر ایسی چڑ ڈال رکھی تھی کہ رومی پریشان ہوگئی......“ طارق کے اندر کا اُبال نکل ہی آیا۔ گل بادشاہ کو بھول کر ہم پھر آپس کی تلخیوں میں پڑنے لگے تھے۔ میں نے بھی اسی لہجے میں کہا۔

”تو ٹھیک کیا تھا میں نے...... تمہیں بتانے میں کیا حرج تھا؟ اب بھی تو تم بتا ہی رہے ہونا......؟“

میری جوابی کارروائی پر طارق جھلا کر سر جھٹکنے لگا۔ رومی پھر پریشان ہوگئی۔ طارق نے شاید میرا غصہ اسی پر نکالا اور بولا۔

”تمہیں ہی نجانے کیوں اس آدمی کی فکر کھائے جا رہی تھی کہ سیف ہم سے بددل ہو رہا ہے اسی لیے مجھے جلدی وہاں سے بھاگنا پڑا۔“

”تو یہ بات جو تم نے ابھی بتائی ہے، تم مجھے وہیں بتا دیتے، بلاوجہ ہمیں تجسس میں مبتلا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“ میں بھی براہِ راست اس کے منہ لگ ہی گیا۔

وہ گرم نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے سر جھٹک کر دوسری جانب منہ پھیر لیا۔

گل بادشاہ حیران ہو کر بولا۔ ”یہ تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے، آپس میں ہی گرما گرمی پر اُتر آئے ہو؟“

”ان دونوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ رومی نے چڑ کر کہا۔ گل بادشاہ مسکرا کر بولا۔

”ہو جاتا ہے، جہاں محبتیں زیادہ ہو جائیں وہاں گر۔ گرمی بھی ہو جاتی ہے۔“

”ڈاکٹر صاحب نے ایک ہی بات کو اپنی اَنا کا مسئلہ بنا لیا ہے۔ گل بادشاہ!“ طارق نے دل کی بھڑاس نکالی۔

”میرا ایسا مائنڈ ہی نہیں ہے کہ میں...... اس طرح کی فضول انا پرستی میں پڑوں۔“ میں نے تلخی سے کہا۔

”رومی! تم بتاؤ، آخر ان کے بیچ تنازع کس بات کا ہے؟“ گل بادشاہ نے ہمیں مزید اُلجھانے کے بجائے رومی سے ہی رابطہ قائم کرنے کا سوچا تو رومی نے اسے بتا دیا۔

گل بادشاہ چند ثانیے سوچنے کے بعد طارق کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم تینوں آپس میں گہرے دوست ہو یقیناً ایک دوسرے پر جان بھی چھڑکتے ہو گے۔ تم تینوں کا ایک ساتھ ان خونی سوداگروں کے خلاف محاذ میں اکٹھے ہونا بھی بلاشبہ ایک قابلِ تعریف عمل ہے، لیکن طارق میاں! ایک چھوٹی سی غلطی تم سے ہوئی ہے، جو بندہ ایک مقصد میں ساتھ رہے اور اس سے کچھ چھپایا جائے تو اس...کا زود رنج ہونا قدرتی بات ہے۔“

”جی ہاں، گل بادشاہ! یہی ایک چھوٹی سی...بات ہے جسے ڈاکٹر صاحب نے پھیلا کر بڑی کر دیا ہے۔“ طارق بولا۔ ”لیکن بات یہ تھی کہ میں اپنے طور پر جو سوچتا ہوں اس پر اچھی طرح غور و فکر اور عملی طور پر اسے کسی لائق نہ سمجھ جاؤں وہ میں کسی پر ظاہر نہیں کیا کرتا۔“

”لیکن جو سوچا جائے، اس پر ساتھیوں سے تبادلہ خیال تو ضرور کرنا ہوتا ہے۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ انسان خود کو عقلِ کل سمجھتا ہو۔“ گل بادشاہ مسکرا کے طارق سے بولا۔ ”ایک نکتے پر تبادلہ خیال کرنا اچھا ہوتا ہے۔ تم خود سوچو، جب تم خود ہی کچھ سوچ کر اسے مکمل سمجھو گے تو پھر اس میں بھلا تبادلہ خیال کی کیا گنجائش رہے گی۔“

اس کی بات نے طارق کو لاجواب سا کر دیا۔ وہ سر جھٹک کر اپنے ہونٹ بھینچنے لگا، بالآخر بولا۔

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

"بس گل بادشاہ ہر انسان کی اپنی فطرت ہوتی ہے، ممکن ہے میں غلط ہوں مگر پھر بھی یہ ایسی اہم بات تو نہیں کہ اسے ایشو بنا کر ناراض ہوا جائے۔"

"ہاں! یہ بات تو غلط ہے۔" گل بادشاہ نے مفاہمت اور ثالثی کی درمیانی راہ قائم رکھتے ہوئے اس کی تائید کی اور میری جانب دیکھا۔

"کیوں بھئی ڈاکٹر صاحب؟ آپ کیا کہتے ہو؟"

"بس، انکل گل! اس موضوع کو بریک کر دیں دونوں ہی پاگل ہیں لیکن اب شاید آپ کے سمجھانے سے ان کی کھوپڑی میں عقل آگئی ہو۔" رومی درمیان میں بول پڑی۔ اس نے منہ بسور رکھا تھا۔

"واہ، کیا نام دیا ہے تم نے گل بادشاہ کو بھی...... انکل گل۔" یک دم طارق کی دبی ہوئی رگِ ظرافت بھڑکی اور ہم بے اختیار مسکرا دیے۔

"چلو دونوں گلے ملو اور آئندہ کسی غلط فہمی میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" گل باشاہ ہمیں شفقت سے ڈپٹتے ہوئے بولا۔

وہ عمر میں ہم سے بڑا تھا، بلاشبہ اس کی سنگت میں ہمیں ایک بزرگی کا احساس ہوتا تھا۔ ہمارے دلوں میں قدرتی طور پر اس کا احترام پیدا ہونے لگا تھا۔ اس لیے میں اور طارق جھینپی جھینپی مسکراہٹ کے ساتھ ایک دوسرے کی جانب بڑھے اور گلے لگ گئے۔

☆☆☆

اگلے چند گھنٹوں بعد کچھ ایسی حوصلہ افزا اطلاعات ملیں جن سے دل و دماغ پر طاری مایوسیوں کے بادل چھٹتے محسوس ہونے لگے۔ جبار ماہی نے اپنے گھناؤنے جرم کا اعتراف کرلیا تھا۔ بہ قول گل بادشاہ کے، ڈالی اور ایس پی سجاد... سے روابط کے بعد مبینہ طور پر جبار ماہی نے اپنے جرائم کا اعتراف کرلیا تھا اور گوہر شاہ کا بھی کچا چٹھا کھول کر رکھ دیا تھا جس کی بِنا پر گوہر شاہ اشتہاری قرار دیا جا چکا تھا۔ ساتھ ہی اس کا مقربِ خاص تاج بھی روپوش ہوگیا ہے۔

لہٰذا اب پولیس ہی نہیں بلکہ رینجرز کے اہلکار بھی اس کی تلاش کی راہ میں لگ چکے ہیں۔ ساتھ ہی جبار ماہی نے ایک اور شخص کا نام بھی لیا ہے جس کے متعلق اس کا کہنا ہے کہ...... گوہر شاہ کی اصل سپورٹ سہراب مجوٹا کر رہا ہے۔ جس کے پیچھے ایگل اسکواڈ اور ریپڈ رسپانس فورس کو لگا دیا گیا ہے۔

سہراب مجوٹا...... کے نام پر بالخصوص میں اور رومی چونکے تھے، طارق بھی بھویں سکیڑ کر اس نام کو اپنی یادداشت میں لانے کی کوشش کرتا رہا۔

"سہراب مجوٹا...... یہ وہی تو نہیں جس کے بارے میں ہمارے انڈین ساتھیوں شوکت اور ریتا نے ہمیں بتایا تھا؟" اچانک طارق کو جیسے یاد آیا۔

"ہاں!" اپنے ان دونوں بہادر ساتھیوں کے ذکر پر میرا دل غمگین سا ہوگیا اور ان کے حق میں دعائیہ کلمات ادا کرتے ہوئے بولا۔ "اللہ ان دونوں کو جنت میں جگہ دے، ان کی بخشش فرمائے۔"

"آمین۔" رومی اور طارق نے بہ یک زبان کہا۔ میں نے بات جاری رکھی۔

"ان دونوں نے اپنی جان پر کھیل کر ان عالمی خونی سوداگروں کے خلاف یہ رپورٹ حاصل کی تھی...... جیسا کہ مذکور ہو چکا، اس کا اصل کریڈٹ بھارت ہی کی ایک دلیر اور غیر جانبدار لیڈی رپورٹر آشا دت...... کے سر جاتا ہے، جو ایک عرصے سے کشمیر کاز پر بھی کام کرتی رہی ہے اور جسے اس کی زمین (بھارت) میں، دیش دروہی (غدار) اور تضحیک کا نشانہ بنایا جاتا رہا تھا، لیکن ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو اس کی کارکردگی کو سراہتا ہے۔ اس نے بڑی محنت اور اپنی جان جوکھم میں ڈال کر یہ رپورٹ تیار کی تھی، اگر یہ منظرِ عام پر آجاتی تو...... بھارت کے بڑے بڑے نیتاؤں کے تخت زمین بوس ہوجاتے لیکن ان کی زد میں پاکستان کی بھی کچھ بھاری بھرکم شخصیات کے گھناؤنے چہرے بے نقاب ہوتے، انہی میں ایک بڑی سماجی شخصیت سہراب مجوٹا کی بھی تھی۔ جبار ماہی درحقیقت اسی کا آدمی تھا۔"

ایک لمحہ توقف کے بعد میرا بیان جاری رہا، وہ ساری رپورٹ مجھے ابھی تک ذہن نشین تھی۔ جس کی حفاظت کے لیے شوکت اور ریتا نے اپنی جانیں دے دی تھیں، لہٰذا میں رومی اور طارق کو پھر سے اس کی یاد تازہ کروانا ضروری سمجھتا تھا، کیونکہ اب...... ہماری مہم دوسرے موڑ میں داخل ہونے والی تھی، جو پہلی والی مہم سے زیادہ خطرناک اور اہم ترین تھی۔

"دوسرا نام یہاں کے ایک سابقہ ایم پی اے گوہر فیروز شاہ کا تھا، تیسری اہم شخصیت بھارت سے تعلق رکھتی تھی، جو درحقیقت ایک مافیا کے لیے بھی کام کرتی ہے، جو بہ ظاہر بھارت میں سماج سدھار کی ایک تنظیم کا روحِ رواں بھی ہے، مگر درپردہ وہ ایک جرائم پیشہ آدمی ہے۔ اس کا نام، جیسا کہ مذکور ہو چکا، شنکر چانکیہ ہے۔ یہ تینوں اعضا

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

فروشی کے اس گھناؤنے کاروبار میں بزنس پارٹنر ہیں۔ بہرکیف...... بدقسمتی سے بعد میں آشادت کو اس خونی مافیا نے حادثاتی موت مروادیا، لیکن ہمارے ان دونوں جاں بحق دوستوں، شوکت اور ریٹا نے یہ رپورٹ اُڑالی، مگر وائے افسوس کہ ثبوت اس کے پہلے ہی ضائع کردیے گئے تھے۔''

''ہاں! مجھے یاد آرہا ہے...... یہ سب......'' رومی ایک جوش سے بولی۔ طارق میری طرف دیکھتے ہوئے توصیفی لہجے میں بولا۔

''واہ میرے یار! تمہاری یادداشت تو ایک دم فرسٹ کلاس ہے۔ پورے سیاق وسباق کے ساتھ تمہیں تو یہ اہم رپورٹ ازبر ہوچکی ہے۔ مجھے تو یہ چیدہ چیدہ سے نام بھی بھول گئے تھے۔''

''مگر اس رپورٹ کی اہمیت اس وقت دوچند ہو جاتی، جب ثبوت......'' رومی کہتے کہتے شاید رُکی تھی کہ میں نے ایک دم اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے مستحکم لہجے میں کہا۔

''اس وقت بھی میں نے اس کے جواب میں یہی کہا تھا کہ...... جن حالات سے میں مڈل ایسٹ کے اس منحوس اسپتال میں اپنی ملازمت کے ایام بتاچکا ہوں، اس کے تناظر میں ہی میں نے اس رپورٹ کا جب تجزیہ کیا تو یہ مجھے سوفیصدی سچی اور درست معلوم ہوئی، اس کی سچائی میں ایک ذرا بھی مغالطہ یا مفروضہ نہیں، رہی ثبوت کی بات تو وہ کوئی بڑی بات نہیں ہے، اس رپورٹ کے بعد میرے سامنے ہدف واضح ہوچکا ہے۔''

''کیسا ہدف؟'' طارق نے قدرے بھویں اُچکا کر میری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''جبار ماہی، رنگی، بھیم ہم ڈھا چکے، گوہر شاہ بھی اب مفرور قرار پاگیا ہے۔ میرے بھائی کے اصل قاتل اور خونی سوداگروں کے اہم سرکردہ عناصر شنکر چانکیہ، سہراب مجوٹا، ڈاکٹر امرناگ اور ڈاکٹر رمیش اگروال...... ابھی زندہ ہیں۔''

''کیا تم اب ان کے پیچھے جاؤ گے؟'' رومی بدستور میری طرف تکتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

''جانا تو پڑے گا لیکن اس سے پہلے سہراب مجوٹا...... کی بھی کھٹیا کھڑی کرلینی چاہیے، یہاں ان کا نیٹ ورک بالکل ختم ہونا چاہیے۔'' میں نے گویا راہ سجھانے والے انداز میں کہا تو طارق بھی پُرسوچ لہجے میں بولا۔

''مجھے پورا یقین ہے کہ گوہر شاہ نے ضرور اس کے ہاں پناہ لی ہوگی۔ ہمیں اس مجوٹے کے گرد بھی گھیرا تنگ کرنا ہوگا۔''

''گڈ! یہی میں بھی چاہتا ہوں لیکن اس کے بعد میری پلاننگ بھی ریڈی ہوچکی ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ کیا؟'' طارق اور رومی نے بیک وقت میری جانب دیکھا۔

''میں دوبارہ سے اسی مڈل ایسٹ کے اسپتال کو جوائن کروں گا۔'' میں نے سنسناتے لہجے میں کہا۔ ''سب سے پہلے رمیش اگروال اور انسان نما شیطان قسائی سرجن ڈاکٹر امرناگ...... کو چھاپنے کی کوشش کروں گا۔''

''اوہ......'' ان دونوں کے منہ سے تحیر سے برآمد ہوا۔ ''پلاننگ تو بُری نہیں مگر میرا خیال ہے کہ دِلی ہنوز دور اَست......'' طارق بولا۔

''کیا مطلب؟''... رومی نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''یہی کہ...... سیف کی آخرالذکر مہم میں وقت پڑ ہے۔ میری نیک خواہشات اس کے ساتھ ہیں۔''

''اور تم ساتھ نہیں ہو؟'' رومی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ طارق جیسے زچ ہوکر اسے گھورنے لگا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے طارق نے دلی والی بات طنزیہ کہی ہو۔

''میں دیکھ رہا ہوں تم ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کچھ زیادہ ہی چپکی ہونے لگی ہو۔'' طارق نے وار کیا مگر میرے نزدیک یہ اوچھا وار تھا۔ خود لاجواب ہوکر دوسرے کو لاجواب کرنے کا ایک سستا ہتھکنڈا۔ میں نے مداخلت کی۔

''طارق ٹھیک کہہ رہا ہے رومی! ڈاکٹر رمیش اگروال وغیرہ کی سرکوبی...... کے لیے ابھی وقت پڑا ہے، پہلے یہاں کے سوداگروں سے نمٹ لیا جائے۔''

''وہ تو ہم نمٹ ہی رہے ہیں۔'' رومی بولی۔

''لیکن......'' اس نے مجھ سے مخاطب ہونے کے درمیان طارق کو تلخ نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

''یہ تم نے سیف کے ساتھ چپکی ہونے کی بات کس بنا پر کہی تھی؟'' رومی نے لفظ ''چپکی'' کو خاصا چبا کر ادا کیا تھا۔

''ارے بھئی، ایسے ہی کہہ دیا تھا، تم تو بال کی کھال اتارنے بیٹھ جاتی ہو۔'' طارق جھلاّ گیا۔

''سہراب مجوٹا کا کیا کرنا ہے اب؟'' میں نے پھر کسی لاحاصل بحث سے بچنے کے لیے درمیان میں دخل اندازی

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

کی۔

”اچار ڈالیں گے اس مجوٹے کا......“ طارق دانت پیس کر بولا۔

”چلو پھر سب مل کے مزے اُڑائیں گے۔“ میں نے بھی اسی لہجے میں کہا۔

”مذاق چھوڑو، اور گوہر شاہ کے مفرور ہونے کے بارے میں سوچو۔“ رومی گہری متانت سے بولی۔

”یہ کام اب پولیس کو کرنے دو۔“

”اور سہراب مجوٹا؟“

”اس کے لیے مشورہ ہے کہ پہلے کچھ دن اس کی ریکی کی جائے۔ مگر کسی پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش نہ کرو، مجھ سے فون پر رابطے میں رہنا، کچھ کرنے کا ارادہ ہو تو مجھ سے مشورہ ضرور کر لینا۔“

”اور تم کیا کرو گے؟“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا کے پوچھا۔

”یہاں آرام سے بیٹھ کے مکئی کی روٹی، ساگ اور لسّی پیوں گا اور تم دونوں کا انتظار کروں گا۔“ طارق نے آنکھیں موند کر یوں کہا جیسے ابھی سے من و سلویٰ کا تصور کرنے لگا ہو۔ میں اور رومی ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگے پھر رومی نے مجھے اشارہ کیا اور ہم دونوں خاموش ہو رہے۔

☆☆☆

زندہ انسانوں کو بے رحمی سے ہلاک کر کے ان کے اعضا نکال کر چوری کرنے والے ان خونی سوداگروں کے ریکیٹ میں مبینہ بلکہ اب مصدقہ طور پر سرخیل...... سہراب مجوٹا کی منجی ڈھانے کے لیے میں اور رومی...... پوری طرح تیار ہو چکے تھے۔

مختلف ذرائع سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق...... سہراب مجوٹا آج کل بہاول نگر کے قریب کسی پھلر وانامی سرحدی علاقے میں کسی ٹھکانے پر موجود تھا اور ایس پی سجاد رندھاوا نے پولیس فورس کے خصوصی ونگ کے نوجوانوں کے ساتھ خود وہاں کا قصد کر رکھا تھا۔

یہ بات گل بادشاہ نے مادام ڈالی اور ایس پی سجاد کے ساتھ ہونے والی ایک بیٹھک کے بعد ہی ہم سے گوش گزار کی تھی...... یہ اطلاعات پہلے گل بادشاہ کے ذریعے طارق کو معلوم ہوئی اور اسی نے ہمیں آگاہ کر دیا۔

”اب کیا کہتے ہو میرے جوان کمانڈوز......؟“

میری اور رومی کی تیاری دیکھنے کے بعد طارق نے ہم سے پوچھا۔

میں رومی کا چہرہ تکنے لگا۔ کچھ دیر پہلے اس نئی مہم پر جانے کے جوش سے ہمارے چہرے تمتمائے اور اعصاب بھی تنے ہوئے تھے وہ سرد اور ڈھیلے پڑنے لگے۔

”ظاہر ہے اب ہمارے کچھ کرنے کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”بات ٹھیک بھی ہے یہ......“ رومی بھی تائیداً بولی۔

”...... ایس پی سجاد صاحب کی خصوصی پولیس فورس ہماری ہی بنائی ہوئی راہ پر لگی ہوئی ہے اور کامیابی سے ہمکنار ہوتی رہی ہے۔“

”لیکن اس کی ”لائیو“ کوریج ضروری ہے۔ وہ میں خود کرنا چاہتا ہوں، اگر سیف اجازت دے تو......“ طارق نے آخر میں میری جانب دیکھتے ہوئے شرارت سے مسکراتے ہوئے رومی سے کہا تو وہ ہی نہیں میں بھی ہنس پڑا۔

”گڈ! یہ ہوئی نا بات......“ طارق یک دم چہکا پھر ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے آگے بولا۔

”ویسے اس کے بعد میں نہیں سمجھتا کہ ہماری کوئی مہم باقی رہ جاتی ہے، گوہر شاہ مفرور ہے، جبار ماہی قانون کی گرفت میں آچکا، سہراب مجوٹا کی کھٹیا کھڑی کرنے کے لیے...... ایس پی سجاد دوبارہ کمر بستہ ہو گیا ہے۔“

”لیکن پتا تو چلے کہ آخر یہ اونٹ پھر کس کروٹ بیٹھتا ہے؟“ رومی بولی۔

”ایگزیکٹلی!“ طارق بولا۔ ”یہی تو میرا اصل مقصد ہے کہ...... معلوم ہو سہراب مجوٹا کے تھیلے سے کیا برآمد ہوتا ہے؟ گوہر شاہ یا اس کی کوئی باقیات......“

”گوہر شاہ مفرور اور اشتہاری قرار پا چکا۔ دیر بدیر وہ قانون کی گرفت میں آ ہی جائے گا اور ان کے خونی کاروبار کا بھی سمجھو بریک اپ ہو چکا۔“ رومی بولی۔ پھر اس نے میری جانب دیکھا۔ میں مستقبل کی کسی گہری پلاننگ کی سوچ میں مستغرق تھا۔ رومی نے کہا۔

”تم کیا کہتے ہو؟“

”جو ساتھیوں کی رائے؟“ میں نے کندھے اُچکا دیے۔

”پھر بھی یار! کچھ تو بولو۔“ طارق نے بھی مجھے کریدا تو میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

”میں اس بلڈی ریکیٹ کے اصل اور اپنے معصوم بھائی عادل کے قاتلوں کو بھی کیفر کردار تک پہنچانے کا عزم کر چکا ہوں۔“

Naqar Azeem
www.pakistanipoint.com

''تمہاری مراد ڈاکٹر رمیش اگروال اور سرجن امر ناگ سے ہے؟'' رومی نے سوالیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔

''ہاں!'' میں نے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''مڈل ایسٹ کے اس اسپتال میں یہ دونوں ہرکارے درحقیقت ان خونی سوداگروں کے اصل گماشتے ہیں۔''

''مجھے تو یہی لگتا ہے کہ اس بلڈی ریکٹ کے تانے بانے مڈل ایسٹ سے بھارت تک پھیلے ہوئے ہیں۔'' طارق بولا۔

''ہمیں ان کا بھی قلع قمع کرنا چاہیے۔'' میں نے کسی خیال کے تحت دبے دبے جوش سے کہا۔

''میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ جب تک ایس پی سجاد یہاں اپنی کارروائیاں نمٹاتا رہے، تم..... اور رومی مڈل ایسٹ روانہ ہوجاؤ، باقی میں یہاں رہتے ہوئے اس مشن پر نگاہ رکھوں گا مگر ہم تقریباً روز ہی رابطے میں رہیں گے۔''

میں اور رومی اس کی بات پر چونکے بغیر نہ رہ سکے مگر میں تو فی الحال چپ رہا البتہ رومی اس سے بولی۔

''کیا مطلب؟ تم نہیں چلو گے ہمارے ساتھ؟''

''بتایا تو ہے میں نے.....'' طارق نے اس کی طرف گھورا۔

''طارق ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' میں نے مداخلت کی۔ رومی بھی کچھ سوچ کر چپ ہورہی۔

''تو کیا پھر رومی اور مجھے مڈل ایسٹ کا قصد کرنا چاہیے؟'' میں نے طارق کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''فوراً سے پیشتر.....'' طارق بھویں اُچکا کر بولا۔ ''تمہارے پاس جاب کا جو بہترین آپشن ہے، وہ تم بہ آسانی استعمال کرسکتے ہو۔ رہی رومی تو اس کے پاس اپنے شاندار پروفیشن کے حوالے سے آل ریڈی اوور تیار شدہ آپشن موجود ہی ہے۔''

''مگر کیا سیف کو وہاں دیکھ کر ڈاکٹر رمیش اور سرجن امر ناگ چونک نہیں جائیں گے؟'' رومی نے بہ ظاہر بڑے اہم نکتے کی جانب میری اور طارق کی توجہ مبذول کروائی تھی، جس پر میں خود بھی ابھی سوچ میں تھا۔

''اس سلسلے میں، میں خود بھی تم دونوں سے مشورہ کرنے والا تھا اور جہاں تک میرا خیال ہے کہ میں چونکہ ان دونوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانا چاہتا ہوں، اسی لیے ان دونوں کے درمیان رہ کر کام کروں گا، اور پوری کوشش کروں گا کہ ان کی رنگے ہاتھوں گرفتاری عمل میں آئے۔''

''تم نے خود ہی بہترین مشورہ دے ڈالا۔'' طارق بولا۔ ''اس کے لیے تمہیں پہلے اپنی شناخت بدلنا ہوگی۔''

''ہمم.....! میں سمجھ رہا ہوں تمہاری بات.....'' میں نے کہا۔ یوں جیسے اسے مزید اس پر بولنے کا موقع دینا چاہتا ہوں۔

''پلاسٹک سرجری کے ذریعے تم یہ کام انجام دے سکتے ہو، کیونکہ بیرونی سفر اور سخت چیکنگ کے لیے ریڈی میڈ میک اَپ کی یہاں ذرا سی بھی گنجائش نہیں بنتی ہے، اور باقی دیگر ضروری کاغذات..... بھی بنتے رہیں گے۔''

''ہائے اللہ! کیوں بے چارے اچھی بھلی خوب رُو شکل کے سیف کی صورت بگاڑنے پر تلے ہو طارق؟'' رومی بولی۔

''اس کی ضرورت نہیں۔'' میں نے کہا۔ وہ دونوں ایک دم مستفسرانہ نظروں سے میری جانب تکنے لگے۔ ''آج کل عمومی اور عارضی نوعیت کی کاسمیٹکس سرجری کا رواج پروان چڑھ رہا ہے۔ جن میں صرف گالوں کی اسکن گرفٹنگ، ناک کا مصنوعی اور عارضی طور پھلانا پچکانا اور بالوں کا کلر وغیرہ شامل ہے۔ آنکھوں میں لینس کام میں لائے جا سکتے ہیں، آواز بھی تھوڑی بہت ازخود ہی بدلی جاسکتی ہے۔''

''سب پھر دیکھا جائے تو اس کی بھی ضرورت نہیں، اس میں ایک تو کافی وقت لگ سکتا ہے، پھر اس کی کوئی گارنٹی بھی نہیں..... بہتر ہے کہ صرف صورت ہی بدلنے کا حربہ کارآمد رہے گا جبکہ شناخت بدلنے کا کھڑاگ نہ پالا جائے، اس سے آگے چل کر کچھ پیچیدگیاں پیدا ہونے کا امکان بہرحال موجود رہے گا۔'' طارق نے ایسا کہا تو رومی اور میں اس کی جانب تکتے رہ گئے، تاہم میں نے تیزی سے سوچتے ہوئے طارق کی بات پر غور کیا تو مجھے اس کی بات غلط محسوس نہیں ہوئی۔ اس میں کاغذی کھڑاگ بھی تھا جن میں میری ڈاکٹری کی ڈگریاں بھی شامل تھیں۔

''تب پھر میرا خیال ہے کہ میں اور سیف اپنی اصل شناخت اور حلیے سے ہی مڈل ایسٹ روانہ ہوجائیں..... وہاں اگر عارضی طور پر صورتیں بدلنے کی ضرورت پیش آئی تو ریڈی میڈ میک اَپ سے کام چلایا جاسکتا ہے۔''

''یس!'' طارق نے فوراً کہا۔ ''میرا بھی یہی مقصد تھا۔''

''مگر وہاں مذکورہ اسپتال کی جاب؟'' میں نے

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

پوچھا۔

''ضروری نہیں کہ تم وہاں ایک ڈاکٹر کی ہی حیثیت سے جوائن کرو، کوئی معمولی پوسٹ پر بھی چھوٹا موٹا کام کر سکتے ہو، شکل بدل کر، میرا نہیں خیال کہ ایک معمولی ملازم کے سلسلے میں کوئی زیادہ گمبھیر قسم کی ڈاکومینٹیشن عمل میں لائی جاتی ہو۔ تاہم تمہارے پاس وہاں بھی دبیج گراؤنڈ ہے۔ مذکورہ اسپتال تم نے دیکھا ہوا ہے، مطلوبہ افراد کو تم پہچاننے لگے ہو، پھر تم نے اپنے ایک پولیس آفیسر دوست خالد کا بھی تو ذکر کیا تھا؟''

طارق کی بات سن کر مجھے کھلے دل سے اعتراف کرنا پڑا کہ اس کے ہاتھ پاؤں ہی نہیں بلکہ دماغ بھی تیزی سے چلتا تھا۔ طارق یہ بات کہنے کے بعد میری طرف دیکھتے ہوئے یوں مسکرا رہا تھا جیسے میرے چہرے کے تاثرات سے اپنی ذہانت کا اعتراف بھانپ چکا ہو۔

''تم نے تو سارا مسئلہ ہی حل کر دیا۔'' بالآخر میں بھی ہنستے ہوئے بولا۔

''گڈ! پھر کیا مسئلہ رہ گیا؟'' طارق نے کہا اور رومی بھی کسی حد تک مطمئن نظر آنے لگی۔ ان دونوں کو اپنے لائحہ عمل سے متفق پا کر میں بھی مطمئن ہوا اور مجھے طارق کی یہ تجویز بھی بری نہیں لگی تھی کہ وہ یہاں رہتے ہوئے گوہر شاہ اور سہراب مجوٹا کے پیچھے لگا رہے گا۔

رومی اور میں، طارق کو گل بادشاہ کے پاس چھوڑ کر لاہور آ گئے۔ یہاں آتے ہی میرے دل میں ایک ہوک سی اُٹھی تھی۔ یہ وہی تو لاہور تھا، جہاں میرے بھائی عادل کا جنازہ اُٹھا تھا، یہ وہی شہرِ نگاراں تو تھا جہاں حمیرا کے ساتھ میں نے کچھ محبت بھری گھڑیاں بتائی تھیں اور یہ وہی شہرِ الوداع بھی تھا جب حمیرا مجھ سے بچھڑ کر سمندر پار چلی گئی تھی۔

یہاں پہنچ کر میں اور رومی نے سیدھا طارق والی رہائش گاہ کا رخ کیا تھا۔ وہ دن تو ہم نے آرام میں گزارا، البتہ رومی نے ٹیبل چیئر پر بیٹھ کر کچھ آن لائن ذمے داریاں نمٹائی تھیں۔

ہم نے اپنے سفری کاغذات سنبھالے، ان کا جائزہ لیا، مطلوبہ اسپتال کا اتا پتا اور فون نمبرز بہ شمول پولیس آفیسر خالد کے بھی تمام ایڈریسز میرے پاس ابھی تک محفوظ تھے۔ دو دن بعد کی ہماری فلائٹ تھی۔

اس عرصے میں ہم طارق سے بھی رابطے میں رہے۔ وہ ہماری اس نئی اور اہم مہم کی کامیابی کی دعائیں بھی دیتا رہا۔

تیسرے روز ہم مڈل ایسٹ کی فلائٹ سے امارات کی اس ریاست کی جانب پرواز کر چکے تھے جہاں میرے معصوم بھائی عادل کے سفاک قاتل اور خونی سوداگروں کے دو اہم مہروں ڈاکٹر مہیش اگروال اور سرجن کو موجود ہونا چاہیے تھا۔

دورانِ سفر میرا دل و دماغ ایک عجیب قسم کے جوش و جذبات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا، اس میں آتشِ انتقام کے الاؤ کی تپش اپنی جگہ مگر ساتھ ہی بہ قول طارق اور رومی کے مجھ سے اس عزم کے حلف کے ساتھ کہ ہم نے ان خونی سوداگروں کا قلع قمع کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھنا تھا، اس کا جوش بھی میرے پورے وجود میں اندر ہی اندر ایک آتش فشاں سا دہکائے ہوئے تھا۔

ہمارا کچھ سفر باتوں میں، کچھ خاموشی اور...... کچھ اُونگھتے ہوئے گزر گیا۔

چمکتے دمکتے ائرپورٹ پر اُترتے ہی ہم نے کسٹم اینڈ امیگریشن سے فراغت پا کر ایک درمیانے درجے کے ہوٹل کا رخ کیا۔

وہاں جا کر ہم تھوڑا بہت فریش ہوئے۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ میں نے رومی سے مختصر مشورے کے بعد...... خالد سے رابطہ کرنا چاہا لیکن نہ ہو سکا۔

ہم نے روم سروس کو فون کر کے کچھ کھانے پینے کے لیے منگوایا اور اسی دوران ہی خالد نے کال بیک کر ڈالی۔

''کون؟'' دوسری جانب سے اس کی شناسا آواز اُبھری۔

''خالد صاحب! یہ میں ہوں ڈاکٹر سیف......'' میں نے اسے سلام کرنے کے بعد کہا تو دوسری جانب سے یکلخت جیسے خالد کو سانپ سونگھ گیا۔

''کیا ہوا خالد صاحب! لگتا ہے بھول گئے، پہچانا نہیں...... مجھے......'' بالآخر میں نے مسکراتے لہجے میں کہا تو اس بار فوراً ہی اس کی آواز اُبھری۔

''آں...... ہاں! میں جھوٹ نہیں بولوں گا، ڈاکٹر صاحب! میں واقعی بھول گیا تھا لیکن تم یاد تھے۔ بس، نام یہ میرے ذہن میں نہیں آ سکا تھا اور سناؤ کیسے ہو کہاں ہو؟ نمبر سے تو یہی لگ.... رہا ہے کہ اِدھر ہی آ گئے ہو دوبارہ......''

''بالکل میں اِدھر آ چکا ہوں۔'' میں نے خوش دلی سے کہا تاہم مجھے اس کی نام اور صورت والی منطق عجیب ہی لگی۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

''آپ سناؤ، کیسے ہو؟ جاب کیسی جارہی ہے؟''

''کیسی جاب کہاں کی جاب..... میں تو اس وقت البحر میں اپنے کاٹیج میں مقیم ہوں ایک عرصے سے.....'' اس نے بتایا۔ میں چونکا۔ مجھے اس کے لہجے سے عجیب سی بے دلی اور بیزاری محسوس ہوئی تھی، جو کم از کم ایک پُرجوش پولیس آفیسر کے لہجے کا خاصہ بہرحال نہ تھی۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ خالد صاحب؟ میں..... میں سمجھا نہیں۔''

''اِدھر ہی آجاؤ میرے پاس، تفصیل سے بتادوں گا۔'' اس نے جواب دیا پھر پوچھا۔ ''اس وقت کہاں ہو، پتا بتاؤ میں آکر لے جاتا ہوں۔''

''نہیں، آپ زحمت نہ کریں، میں ہی آجاتا ہوں۔''

''لو پھر پتا اچھی طرح ذہن نشین کرلو اور پہلے یہ بتاؤ کہ کب یہاں پہنچے ہو؟ کیا اسی اسپتال میں دوبارہ جاب لے لی ہے؟''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔ پھر اس نے اپنے البحر والے مقام کے کاٹیج کا پتا بتادیا۔

خالد نے اپنا پتا بتاتے ہوئے سختی سے تاکید کی تھی ہم ہوٹل چھوڑ دیں اور اپنے سامان کے ساتھ اس کے پاس پہنچ جائیں۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔

ایک ٹیکسی کے ذریعے ہم البحر کی جانب روانہ ہو گئے۔ ٹیکسی ڈرائیور ایک سکھ تھا، اسے دیکھ کر مجھے اپنا دوست رنبیر سنگھ یاد آگیا۔

اسی نے بتایا کہ البحر شہر کے جنوب مشرق کے مضافات میں ساحل کے قریب واقع ہے اور بڑی خوب صورت جگہ ہے۔

وہاں پہنچنے میں ہمیں بہ مشکل نصف گھنٹا لگا تھا۔ یہاں پہلے تو جا بجا ریتیلے ٹیلوں اور صحرا کے سوا کچھ نظر نہیں آیا تھا مگر پھر رفتہ رفتہ نخلستانی آثار پیدا ہونے شروع ہوئے اور پھر جیسے صحرا کھجوروں کے درختوں اور باغات سے بھر گیا۔ انہی کے دامن میں آبادی کے آثار بھی نظر آنے لگے اور فضا قدرے مرطوب سی محسوس ہونے لگی۔ مجھے حیرت تھی کہ خالد نے پولیس ڈپارٹمنٹ کی جاب کیوں چھوڑ دی تھی؟

ٹیکسی ڈرائیور نے ہمیں مطلوبہ کاٹیج کے سامنے اتار دیا۔ اسے فارغ کرنے کے بعد میں اور رومی پہلے تو کاٹیج کے سامنے کھڑے ہو کے جائزہ لیتے رہے۔ بیش قیمت لکڑی اور اینٹوں کے امتزاج سے بنایا گیا یہ کاٹیج کسی دیدہ زیب لینڈ اسکیپ ہی کی تصویر پیش کرتا نظر آرہا تھا۔ دن کے وقت میں چمکتی دھوپ اور کھلے صاف آسمان تلے البحر کے اس خوب صورت پُرفضا مقام پر ایسے اور بھی کئی بنگلو نما کاٹیجز کھڑے نظر آتے تھے، مگر ان میں ایک خاص بات تھی کہ یہ ایک دوسرے سے کافی فاصلوں پر بنے ہوئے تھے۔ شاید ان کی خوب صورتی کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔

اچانک ایک کتّے کے بھونکنے کی آواز ابھری۔ کمپاؤنڈ وال کے اندر سے ہی آواز آئی تھی۔ ہم پھاٹک کے سامنے کھڑے تھے۔ اندر موجود کتّے نے اندر سے ہی اجنبیوں کی بُو پالی تھی۔

ایک ادھیڑ عمر کا سیاہ رنگت عربی باہر آیا اور میرا نام معلوم ہوتے ہی وہ ہمیں اندر لے آگیا۔

بھونکنے والا کتا ہمیں یہاں نظر آگیا۔ خاصا جسیم اور توانا کتا تھا۔ لمبے اور ادھیڑ عمر عربی نے اسے ہشکارا دیا تو وہ تھوتھنی جھکائے ایک طرف کو چلا گیا۔

اندر بھی دیدہ زیب باغیچہ بنا ہوا تھا۔ درخت بھی تھے۔ کیاریاں اور پھولوں سے لدی ہوئی بیلیں اس کے بعد کانٹوں کی باڑھ۔ ہم اس کے درمیان بنی سنگِ ارغواں اور سیاہ پتھریلے ٹکڑوں سے بنی روش پر چلتے ہوئے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوئے تو سامنے ہی خالد کو مسکراتے ہوئے اپنے دونوں بازو پھیلائے اپنے استقبال کیے پایا۔

وہ اور میں بڑے پُرتپاک انداز میں ملے۔ رومی نے بھی اس سے ہاتھ ملایا۔ میں نے جب اس کا ایک انٹرپول لیڈی انسپکٹر پس کی حیثیت سے تعارف کروایا تو وہ حیران بھی ہوا اور خوش بھی۔

ہم بیش قیمت فرنیچر سے آراستہ وسیع لاؤنج میں ہی بیٹھ گئے۔ اندر کی ٹھنڈک سے محسوس ہوتا تھا کہ یہ کاٹیج پورا ہی سینٹرلی ایئر کنڈیشنڈ تھا۔

خالد ہم سے مل کر کچھ زیادہ ہی خوش اور پُرجوش نظر آرہا تھا۔ لنچ کا وقت تھا، پہلے تو ایک خوش ذائقہ ٹھنڈے مشروب سے ہماری تواضع کی گئی اس کے بعد پُرتکلف لنچ کیا گیا۔

عربی روایت کے مطابق بعد میں ایک خوشبودار و خوش ذائقہ قہوے کا دور چلا اور اسی دوران میں خالد نے اصل موضوع چھیڑ دیا جس کے لیے میں اور رومی کافی دیر سے بے چین نظر آرہے تھے۔

''ہاں، برادرِ عزیز! اب پہلے تم اپنی سناؤ، اس کے بعد میں اپنی بپتا سناؤں گا جو خاصی سنسنی خیز بھی ہے، لیکن

www.pakistanipoint.com

اس سے پہلے مجھے اپنی آمدِ خیر کا مقصد بھی بتا دو۔'' خالد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے تو اسے سب سے پہلے اپنی یہاں آمد کے مقصد کے بارے میں آگاہ کر دیا، پھر اپنے بھائی عادل کی خونی سوداگروں کے ہاتھوں ہلاکت، اور اس کی یہاں سفاکانہ منصوبہ بندی کرنے والوں کے بارے میں بتایا اور پاکستان میں موجود ان کے ہرکاروں کی ذلت و رسوائی اور شکست کے بارے میں بھی بڑی صراحت سے آگاہ کر دیا۔

خالد ابتدا میں تو نارمل انداز میں میری باتیں سنتا رہا مگر جیسے جیسے موضوعِ گفتگو آگے بڑھتا رہا، یہاں تک کہ اختتام پر پہنچنے تک تو اس کا چہرہ جوش اور ایک پُراسرار سے مخفی جذبے سے تمتمانے لگا۔ وہ بڑے دھیان، غور اور ایک عجیب سی ساکت خاموشی کے ساتھ یہ سب سنتا رہا تھا۔

کمرے میں یکایک سناٹا طاری ہو گیا۔ یوں جیسے خالد اب اپنے بارے میں بتانے کے لیے جیسے کوئی مناسب الفاظ تلاش رہا ہو مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ میری ہی باتوں کے تناظر میں کچھ تعین کرتا محسوس ہو رہا تھا پھر ایک طویل سانس لینے کے بعد بولا۔

''برادر سیف! یہ سارا معاملہ ایک ہی ہے۔ یہ لوگ ایک منظم نیٹ ورک بچھائے ہوئے ہیں اور اسی کے تحت عمل پیرا ہیں۔ مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے ان کی ایک ذیلی شاخ کو پاکستان میں اپنے بہادر ساتھیوں کی مدد سے کاٹ ڈالا اور اب تم دونوں ایک نئے عزم کے ساتھ یہاں بھی اُن کی جڑیں کاٹنے کے لیے چلے آئے۔'' وہ اتنا کہہ کر ایک لمحہ کے لیے رکا۔ رومی اور میں اسی کے چہرے کو تکے جا رہے تھے۔

وہ ایک گہری سانس لے کر دوبارہ کہنا شروع ہوا۔
''تمہارے یہاں سے جانے کے بعد میں نے سعد عامر الکریم کی ریکی شروع کروا دی تھی اور سیف! تمہیں یقیناً یہ سن کر دھچکا لگے گا کہ میری اس کے خلاف اس خفیہ مہم جوئی کے آخری مراحل میں نکلنے والے نتائج کے مطابق اس کا لنک مجھے ڈاکٹر رمیش اور...... سرجن امرناگ تک جاتا ملا......''

وہ پھر سانس لینے کے لیے رکا اور میں اُس کے انکشاف پر واقعی چونکے بنا نہ رہ سکا۔ میرے منہ سے ہولے سے ''اوہ......'' برآمد ہوا تو خالد اسرار بھرے انداز میں مسکراتے ہوئے اپنے ایک ہاتھ کے اشارے سے مزید بولا۔

''ابھی سنتے رہو......'' وہ جیسے آگے انکشافات کرنے پر مُصر ہو۔

''انہی دونوں مجھے تم سے پوچھ تاچھ کی شدید ضرورت پڑی، ظاہر ہے یہ ممکن نہ تھا، لیکن بہرحال تمہاری بتائی ہوئی وہ ساری باتیں مجھے اچھی طرح ازبر تھیں، جن کی مدد سے میں نے ان خونی سوداگروں پر ہاتھ ڈالا، تو......

میں بتا رہا تھا کہ اس بات کا خفیہ کا سراغ لگاتے ہی کہ سعد عامر الکریم ہی درحقیقت وہ شخص ہے جو بظاہر تو یہاں کا بزنس ٹائکون ہے لیکن درپردہ وہ انہی خونی سوداگروں میں شامل ہے اور یوں مجھے پتا لگا کہ وہی یہاں ڈاکٹر رمیش اور سرجن امرناگ کو سپورٹ کرتا ہے اور اسی کے ذریعے ہی سے...... غیر قانونی طور پر انسانی اعضا ایک ملک سے دوسرے ملک بھیجے جاتے ہیں، کیونکہ اس کی ایک شپنگ کمپنی بھی ہے۔ اب مجھے کچھ ایسے ثبوت درکار تھے جن کی بنا پر میں ان تینوں پر ہاتھ ڈال سکتا، بصورت دیگر یہ بات میرے گلے پڑ سکتی تھی۔ لیکن افسوس کہ ابھی میں ان کے حصول کے لیے کوشاں ہی تھا کہ میرا بھی بھانڈا پھوٹ گیا اور...... میں جانتا تھا کہ جس روز ایسا ہوا تو مجھے بھی زندگی کا ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے، بالآخر وہی ہوا......''

یہ کہتے کہتے آخر میں اس کی آواز نے کرب کی چادر اوڑھ لی۔ وہ رکا اور پھر صوفے کے دائیں جانب دھری ایک چھوٹی سی پورٹیبل سے فریم شدہ تصویر اُٹھا کر اپنے ہاتھ میں لیے اسے تکتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں نمی بھی چمکنے لگی، چہرہ غم زدہ دکھائی دینے لگا — وہ فریم اس نے میری جانب بڑھا دیا۔

''لو...... سیف! اسے دیکھو ذرا...... کیا یہ ان دونوں کی دنیا سے جانے کی عمریں تھیں......؟'' اس نے غمگین لہجے میں کہا۔

میں نے گم صم سے انداز میں فریم والی تصویر اس کے ہاتھ سے لی اور دیکھا۔ ایک خوب صورت سی جوان عربی خاتون اور اس کے ساتھ کھڑا مسکراتا ہوا گیارہ سالہ معصوم بچہ تھا۔ رومی بھی میری جانب ذرا گردن موڑے اسے دیکھنے لگی تو میں نے وہ فریم شدہ تصویر اس کی طرف بڑھا دی۔

''یہ میری بیوی اور بچے کی تصویر ہے۔'' خالد نے جب بتایا تو اس کے گلے میں رقت اُتری ہوئی تھی۔ آواز رُندھ گئی تھی۔ ''ان ظالموں نے ان دونوں کو اغوا کر لیا تھا۔ پورا ایک ہفتہ میں اپنی بیوی بچے کی تلاش میں پاگلوں کی طرح مارا مارا پھرا تھا مگر بے سود، بالآخر آٹھویں دن مجھے

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

ایک گمنام پیغام ملا کہ اس تلاش کا کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ اب ان دونوں کے اعضا کسی اور زندہ انسانوں کے اندر دھڑک رہے ہوں گے اور اگر..... میں تب بھی خاموش نہ بیٹھا تو میرا بھی یہی حشر ہوسکتا ہے۔''

خالد یہ بتاتے بتاتے ضبط کے بندھن توڑ چکا تھا۔ بے شک وہ ایک پولیس آفیسر تھا۔ اپنی جاب کی نوعیت نے اسے خواہ کتنا ہی سخت جاں اور مضبوط بنا رکھا ہو مگر اپنے لختِ جگر اور بیوی کے بارے میں ایسی بھیانک حقیقت کے بارے میں سن کر اعصاب آہن رکھنے والے بھی دہل جاتے ہوں گے، یہی حال خالد کا ہوا۔۔۔۔ شدتِ غم سے اس کی آنکھیں چھلک پڑیں، اس قدر کہ وہ بچوں کی طرح ہچکیوں سے رونے لگا۔

رومی اور میرا چہرہ اس کی داستانِ دل گیر سن کر مغموم ہوگیا۔ ہم سے کسی کے دو الفاظ بھی نہیں بولے جاسکے اور وہ ذرا حوصلہ پکڑے خود ہی بول پڑا۔

''انہوں نے صحیح تو کہا تھا کہ اگر میں پھر بھی خاموش نہ بیٹھا تو مجھے بھی اسی طرح عبرت کا نشانہ بنانا ان کے لیے کوئی مشکل نہ ہوگا۔ تب پھر میں نے پولیس ڈپارٹمنٹ سے استعفیٰ دے دیا اور بہ ظاہر دنیا سے کنارہ کش ہو کے یہاں کاٹیج میں رہنے لگا۔''

''کک..... کیا تم واقعی ان لوگوں سے خوف زدہ ہو گئے تھے؟'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر ہولے سے کہا تو اس نے بے تاثر مسکراہٹ سے ہاتھ بڑھا دیا۔ رومی نے تصویر اس کی جانب بڑھا دی۔ وہ اس نے واپس اسی جگہ رکھ دی۔ میں اور رومی اس کی جانب تکتے رہے۔

''میرے پاس اب بھلا ڈرنے کا سبب ہی کیا بچا تھا جو میں ان سے خوف زدہ ہوتا'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''لیکن بہ ظاہر میں نے انہیں یہی تاثر دیا کہ میں ان سے شکست کھا چکا ہوں، ٹوٹ چکا ہوں اور اب کنارہ کشی اختیار کیے اِدھر آن بیٹھا ہوں، وہ یہاں بھی میری ریکی کرتے رہے تھے کچھ دن، ممکن ہو اب بھی کبھی کبھار یہاں ان کے گرگوں کی آمد رہتی ہو، لیکن اب سناٹا طاری ہو چکا ہے۔۔۔۔ میں انہیں اپنے بارے میں جو تاثر دینا چاہتا تھا، وہ کامیابی سے دے چکا تھا اور اب میرے کچھ کرنے کا وقت آیا تھا تو مجھے تمہاری آمد کی اطلاع ملی۔''

وہ اتنا کہہ کر چپ ہو رہا۔ میں اس کی بات کا مطلب سمجھ سکتا تھا پھر رومی اور میں نے اس سے متاسفانہ کلمات ادا کیے، وہ بدستور چپ رہا۔ ماحول میں یکا یک ایک عجیب سی گمبھیرتا طاری رہی پھر خالد کی لرزتی ہوئی آواز دوبارہ ابھری۔

''میں جانتا ہوں کہ جو زخم لے کر تم پاکستان سے یہاں آئے ہو، وہ میرے زخموں سے چنداں مختلف نہیں اسی لیے میں نے تمہیں یہاں آنے کا عندیہ دے ڈالا۔''

''میں سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے مختصراً کہا۔ میری پیشانی پر لاتعداد شکنوں کا جال بُن گیا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ خالد کے سینے میں بھی وہی الاؤ دہک رہا تھا جو مجھے اندر سے سلگتی ہوئی بھٹی بنائے ہوئے تھا، نیز وہ یہاں..... اپنے بیوی بچے کے بے رحم قاتلوں کے خلاف کوئی مربوط اور جامع منصوبہ بندی بنانے کے لیے کوشاں تھا۔

''پھر تم ہمیں بھی اپنے ساتھ ہی سمجھو برادرم خالد!'' اس بار رومی نے لب کشائی کی تھی۔ خالد نے اس کی جانب توصیفی نظروں سے دیکھا تھا۔ میں نے بھی کہا۔

''ہاں! عزیزم خالد! یہ درست ہے کہ میں نے بھی یہاں انہی خونی سوداگروں کی سرکوبی کے لیے ہی اپنی اس دلیر ساتھی رومانہ کے ساتھ یہاں کا قصد کیا، ہمارا ایک اور بہادر ساتھی طارق بھی اسی لائن پر عمل پیرا ہے، جس کے بارے میں مکمل تفصیل ابھی تھوڑی دیر..... پہلے ہی دے چکا ہوں تمہیں۔''

''آفرین، مجھے اللہ کی ذات پر مکمل بھروسا ہے کہ وہ ہماری اس نیک کام میں ضرور مدد کرے گا۔'' خالد نے پُرجوش ہو کے کہا۔ وہ ہم سے اب بہت مطمئن اور خوش دکھائی دے رہا تھا۔

بہرکیف..... کافی دیر تک ہمارے درمیان گفتگو ہوتی رہی، اس میں بہت کچھ آئندہ کے بارے میں بھی طے پایا جاتا رہا۔ اس کے بعد خالد نے ہمیں ہمارے کمرے دکھائے اور ہم تے وہاں کا رخ کیا۔

میں اور رومی تھکے ہوئے تھے اور اپنے اپنے کمروں میں جا کر بستروں پر پڑتے ہی سو گئے۔

نجانے کون سا پہر تھا کہ..... اچانک میری آنکھ کھلی۔ غالب خیال یہی تھا کہ کسی کھٹکے پر کھلی تھی آنکھ..... کیونکہ میری نیم خوابیدہ نظروں کے سامنے ہلکے پاور کے بلب کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ رومی دوسرے کمرے میں سو رہی تھی۔

ابھی میں اسی اُدھیڑ بُن میں تھا کہ اچانک ایک آواز نے مجھے بُری طرح چونکا دیا۔ وہ ایسی ہی ایک انسانی آواز تھی جیسے کسی نے زور لگا کر بولنے کی کوشش چاہی ہو مگر اسے

www.pakistanipoint.com

بروقت خاموش کر دیا ہو۔ میں پھرتی کے ساتھ بیڈ سے اُٹھا اور بے آواز مگر قدرے تیزی سے دروازے کی جانب بڑھا۔ اس..... قلیل ترین عرصے میں مجھے ایک دو اور بھی آوازیں سی سنائی دیتی رہی تھیں اور میں مزید محتاط ہو گیا تھا۔

کمرے کے دروازے کی جھری بنا کر میں نے باہر جھانکا۔ لاؤنج میں مجھے دو سیاہ چست لباس میں ملفوف مسلح افراد نظر آئے...... ان کا انداز ایسا ہی تھا جیسے ذرا بھی کوئی نظر آیا اور وہ اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دیں گے۔ میں سن ہو کر رہ گیا، میری سمجھ میں ہی نہ آسکا کہ میں کیا کر سکتا ہوں کیا نہیں.....؟ ایک خیال یہ بھی آیا کہ...... کمرے کی کھڑکی سے دوسری جانب نکل جاؤں، کیونکہ خالد کی زندگی تو شاید خطرے سے دوچار ہو چکی تھی، اب میں اور رومی ان کی زد میں ہو سکتے تھے اس لیے بھی کہ خالد کے کمرے کا دروازہ چوپٹ کھلا تھا اور پھر ابھی میں کوئی فیصلہ بھی نہ کر پایا تھا کہ اچانک اسی کھلے دروازے سے میں نے دو مزید افراد کو خالد کے کمرے سے نکلتے دیکھا۔

یکلخت میرا دل جیسے رک رک کر دھڑکنے لگا۔ وہ اندر شاید اپنی کوئی ظالمانہ ''کارروائی'' مکمل کر آئے تھے اور اب ہماری باری تھی، یہی وہ وقت تھا جب اندر سے برآمد ہونے والے دونوں سیاہ پوش مسلح افراد میں سے ایک نے میرے کمرے کے دروازے کی جانب دیکھا اور میرا دل اُچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ اس کے ہاتھ میں لمبی نال والا پستول نظر آرہا تھا، جو سائیلنسر تھا۔

اب مجھے لگ رہا تھا کہ کسی بھی وقت وہ چاروں میرے کمرے میں بھی دھاوا بولنے والے تھے کہ اچانک میں نے اسی شخص کو جو میرے کمرے کے دروازے کو گھور رہا تھا، ہولے ہولے معنی خیز انداز میں اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے دیکھا۔

وہ نقاب کے پیچھے یقیناً مسکرایا بھی ہو گا۔ مگر کیوں.....؟ مجھے اس کی یہ حرکت عجیب لگی، صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اسے یقین تھا میں یہاں موجود ہوں۔ یوں میں ابھی راہِ فرار کے بارے میں کوئی عملی قدم اُٹھانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک وہ سب پلٹے اور پھر تیزی کے ساتھ باہر نکلتے چلے گئے۔

موت کے ان نامعلوم ہرکاروں کے نکلتے ہی میری جان میں جان آئی اور میں پھر بھی تھوڑی دیر بعد ہی اپنے کمرے سے باہر نکلا اور تیزی کے ساتھ خالد کے کمرے کی جانب بھاگا۔

اندر داخل ہوا تو وہ متوقع اور سفاکانہ منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ کیونکہ جس انداز میں، میں نے ان ہرکاروں کو اندر دھاوا بولتے دیکھا تھا، وہ اسی منظر کا متقاضی ہو سکتا تھا۔

کمرے میں خالد اپنے بیڈ کے قریب دبیز قالین پر لاش کی صورت پڑا ہوا تھا۔ اس کے سینے میں سرخ روشندان تھا اور وہاں سے بھل بھل خون بہے جا رہا تھا۔ بیڈ پر ایک ریوالور بھی پڑا تھا جو یقیناً خالد کا ہی ہو سکتا تھا، گویا اسے بھی ان نامعلوم دراندازوں کا علم ہو چکا ہوا اور اس نے اپنے دفاع کے لیے سرہانے رکھا پستول نکالنے کی کوشش چاہی ہو لیکن بدقسمتی سے خالد کو ان پر فائر کرنے کا موقع نہ ملا ہو، یوں ہرکارے نے اپنے خاموش پستول سے اسے گولی ماردی تھی۔ اگرچہ یہ ''کرائم سین'' تھا مگر پھر بھی میں اندر داخل ہوا اور قریب آکر خالد کا معائنہ کیا۔ اس میں زندگی کی رمق عنقا تھی۔

میں ابھی چاہتا ہی تھا کہ فوراً پلٹ کر رومی کے کمرے کا رخ کروں کہ اچانک پولیس سائرن کی اُبھرنے والی سمع خراش آوازوں نے مجھے بُری طرح جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

چند ثانیوں کے لیے تو میں سمجھ ہی نہ سکا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے، پھر سنبھالا لیتے ہی میں پلٹا اور رومی کے کمرے کی جانب دوڑا۔

حقیقت مجھ پر عیاں ہو رہی تھی، اب میں اس سیاہ پوش کی اس ''عجیب حرکت'' کا مطلب سمجھا تھا کہ اس نے کیوں معنی خیز انداز میں اپنی گردن میرے کمرے کی جانب موڑ کر ہلائی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ہم وہاں موجود تھے۔ نجانے کب ہماری ریکی ہو چکی تھی یا کم از کم خالد کے کاٹیج کی ہوتی رہی ہو گی، ہماری آمد کے بعد چھپے دشمنوں نے یہ دہری چال چلی تھی۔ کاٹیج میں ہلا بول کر خالد کو قتل کر دیا اور پھر ذرا پہلے ہی پولیس کو بھی یقیناً گمنام فون کر کے سابقہ پولیس آفیسر کے قتل کی اطلاع دے ڈالی تھی۔

چال تو روایتی تھی لیکن خطرناک بھی، یہ تو شکر رہا کہ میری بروقت آنکھ کھل گئی تھی اور پل کے پل صورتِ حالات کا ادراک کرتے ہی میں رومی کو وہاں سے لے کر نکل کھڑا ہوا۔ پولیس اب وہاں ٹامک ٹوئیاں مار رہی تھی اور دشمن کسی محفوظ گوشے میں اس خبر کے منتظر تھے کہ قاتل دھر لیے گئے یا نہیں......

دھڑ سے کمرے کا دروازہ کھولا۔ میرا خیال یہی تھا کہ وہ

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہی ہوگی، لیکن میرے اس طرح درانہ وار اندر گھستے ہی...... وہ کسی ٹھٹکی اور ڈری ہوئی بلی کی طرح اُچھلی تھی۔

وہ شاید ابھی ابھی جاگی تھی اور اس کے جسم پر سیاہ رنگ کا مہین ساڈھیلا ڈھالا سلیپنگ ڈریس تھا۔

''کک...... کیا ہوگیا؟ خیریت؟'' وہ حیرت و پریشانی کے ملے جلے تاثرات سے بولی۔

''بھاگو...... جلدی...... وقت بالکل نہیں ہے......'' میں چیخا۔ پولیس سائرن کی آوازیں اس نے بھی سن لی تھیں اور یقیناً کسی حد تک صورتِ حال کی خطرناکی کا اندازہ اسے بھی ہوگیا تھا۔

وہ دوسری بار اُچھلی اور اب بستر سے نیچے تھی۔ جو بھی ہاتھ آیا وہ تیزی سے سمیٹا اس کے بعد ہم کمرے کی کھڑکی کی جانب لپکے...... رومی کو میں نے پہلے باہر نکالا اور خود بعد میں باہر بغیر دیکھے چھلانگ لگائی تو خلا کی طوالت دیکھ کر میں نے آنکھیں بند کرلیں۔

میں جھاڑی زدہ زمین پر گرنے سے پہلے رومی کے نرم وگداز جسم پر آن پڑا تھا۔ نتیجے میں اس کے حلق سے چیخ سی خارج ہوئی۔ پھر میں نے خود کو گھاس پر پڑے پایا۔

''تت...... تم ٹھیک تو ہونا......؟'' میں نے گھبرا کر دریافت کرنا چاہا۔

''آہ...... ہاں!'' رومی نے کراہتے ہوئے کہا، پھر میں نے اسے سہارا دیا لیکن پھر ہم فوری طور پر حرکت کرنے سے قاصر ہی رہے، اگرچہ ہم نے بروقت کاٹیج سے فضائی ہجرت کی تھی، لیکن...... تب تک پولیس نے چاروں طرف سے کاٹیج کو گھیرے میں لے لیا تھا، یوں لگتا تھا جیسے یہ سب کچھ پہلے ہی سے ''پلانٹڈ'' ہو۔

بہرحال، ابھی یہ سب باتیں سوچنے کا وقت نہ تھا۔ میں اور رومی چند ثانیے وہیں دبکے رہے پھر تھوڑا موقع جان کر اور رومی کی حالت قدرے بہتر ہونے پر ہم ذرا آگے کو سرکے۔

ہم تاریکی، جھاڑیوں اور کچھ وقت سے چند ثانیے پہلے حرکت پذیر ہونے کا پورا پورا فائدہ اُٹھاتے ہوئے بالآخر پولیس کے گھیرے سے نکل آئے۔

''اب خدا کے لیے رومی! رُکنا بالکل نہیں، چلتی رہو، ورنہ بڑی خطرناک مصیبت میں پھنس جائیں گے۔'' میں نے جیسے رومی سے التجا کی۔

''تم اتنی زور سے میرے اُوپر گرے ہو، میرا وجود درد کررہا ہے، چلا بھی نہیں جارہا مجھ سے۔'' اس نے دوہائی دی۔

''میں تمہیں کندھے پر اُٹھالوں؟'' میں نے یونہی کہا۔

''اُٹھالو۔'' وہ بولی۔ میں نے ہونٹ بھینچ کر اسے اُٹھا کر اپنے کندھے پر ڈال لیا۔ اس کے جسمانی بوجھ سے زیادہ اس کی نرماہٹ وگرماہٹ نے مجھے نڈھال سا کردیا۔ اس پر مستزاد...... وہ ہنوز مہین سے باریک سلیپنگ ڈریس میں ملفوف تھی۔ خدا جانے اس نے کب سے یہ واہیات لباس پہن کر سونا شروع کردیا تھا۔

میں چار و ناچار اسے لیے دوڑا۔ جنگل، جھاڑیاں ڈھلانیں اور درخت سب پار کرتا رہا بالآخر... ایک سیاہ تارکول کی سڑک کے کنارے آکر ہی دم لیا اور رومی کو نیچے اُتارا۔

میری سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی، لگاتار ناہموار راستوں پر چلتے رہنے کے باعث میری اپنی حالت غیر ہوگئی تھی۔ کافی دیر تک تو مجھ میں بات تک کرنے کا یارا نہ رہا۔

میں گہرے گہرے سانس لیتا رہا اور میری حالت کے پیشِ نظر رومی بھی خاموش رہی۔ تاہم میں نے اسی دوران اسے ہدایت کردی کہ وہ گردوپیش پر نگاہ رکھے۔

وہ یہی کرتی رہی اور جب...... میری حالت سدھری تو...... میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ رومی بھی بہتر تھی۔

''یہ کک...... یہ سب ہوا کیا تھا؟'' بالآخر اس نے پوچھا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا اور گردوپیش پر نظر ڈالنے لگا۔

رات اپنے آخری پہر میں تھی۔ آسمان روشن اور صاف تھا۔ تاروں کی روشنی میں کسی حد تک اردگرد کا منظر واضح ہوتا تھا، ہوا چل رہی تھی۔

''بولتے کیوں نہیں سیف؟'' رومی بے چینی سے دوبارہ بولی اور تب میں نے اسے بتادیا کہ کیا معاملہ تھا۔

وہ یہ سن کر ایک لمحے کے لیے ساکت سی ہوکررہ گئی۔

''بہت ستالیا۔ اب آگے بڑھو۔'' میں اسے سکتے میں کھوتے دیکھ کر بولا۔ ''پولیس بہت جلد نامعلوم مجرموں کی تلاش میں سب طرف پھیل جائے گی۔''

وہ اُٹھی اور میرے ساتھ چل دی۔ ہم یہاں سڑک کے کنارے کھڑے ہوکر کسی لفٹ ملنے کا انتظار بھی نہیں کر سکتے تھے، لفٹ مل بھی جاتی تو بھی اس میں خطرہ تھا کہ تفتیشی

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

عمل کے بعد ہمارا ذکر چھڑ سکتا تھا۔

سڑک پار کر کے ہم دوسری جانب آئے اور تیز تیز قدموں سے چلتے رہے۔ یہاں بھی گھاس، درخت اور جھاڑیاں تھیں لیکن پھر رفتہ رفتہ یہ معدوم ہوتی گئیں اور میدان، صحرائی ٹیلے اور ناہموار راستوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

کئی فرلانگ مزید چلنے کے بعد ہمیں موجوں کا شور سنائی دیا اور ہم ٹھٹک گئے۔

ہم ساحلِ سمندر کے قریب آچکے تھے۔ نجانے یہ علاقے کے کس رخ کا ساحل تھا۔ تھوڑی دیر ستانے کے بعد ہم پھر آگے بڑھ گئے۔

اب ہمارے سامنے سمندر دکھائی دے رہا تھا جس کی شوریدہ سر موجیں ساحل پر بنی آبی چٹانوں سے پُرشور انداز میں ٹکرا رہی تھیں۔

ساحل کی ریت گیلی ہو رہی تھی اور موجیں وہاں تک آکے دم توڑ کر پیچھے پلٹ رہی تھیں۔ ساحل اور سمندر پر کھلا آسمان تاروں کی موج میں دمک رہا تھا۔ چاند دور کہیں جھکا ہوا تھا۔ دور حدِ نگاہ سمندر کے بیکراں سینے پر کچھ کچھ ٹمٹماتی ہوئی سی روشنیاں بھی چمکتی نظر آجاتیں۔ جو یقیناً لانچوں یا بحری جہازوں کی تھیں۔

ساحل پر ویرانی تھی۔ وہاں چند ایک ہٹ اور ریسٹورنٹ نظر آئے، جن کے نوئن سائن بجھے ہوئے تھے اور کچھ کے تڈھم پڑے تھے۔ چند ایک موٹر گاڑیاں کھڑی نظر آئیں۔ لانچیں بھی لنگر انداز تھیں۔

''کیا خیال ہے، اس طرف چلا جائے؟'' رومی نے پوچھا۔

''یہی کرنا پڑے گا، شاید..... شہر تک جانے کے لیے کوئی لانچ ہی مل جائے۔'' میں نے کہا۔

تھوڑا ستانے کے بعد جب ہم وہاں پہنچے تو سپیدہ سحر نمودار ہو چکا تھا۔ تب ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہاں اور لوگوں کا بھی جمگھٹا لگنا شروع ہو گیا۔ پتا کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ سب مقامی تھے اور روز اعلیٰ الصبح ایک مسافر لانچ میں بیٹھ کر ساحلِ شہر پر اُترتے تھے اور شام کو واپس لوٹتے۔ ہم بھی دیگر لوگوں کے ساتھ مل کر ایک مسافر لانچ میں سوار ہو گئے۔ لگ بھگ کوئی ایک گھنٹے بعد شہر پہنچ کر ہم نے سکون کی سانس لی اور سیدھا ہوٹل کا رخ کیا۔

ہم نیند تو کر ہی چکے تھے لیکن تھکے ہوئے تھے، تھوڑا آرام کیا اور بعد میں روم سروس کو فون کر کے ناشتا وغیرہ منگوایا۔

''مجھے خالد کے مرنے کا بے حد افسوس ہے۔'' میں نے چائے کا ایک سپ لیتے ہوئے بولا۔ میری آواز مغموم سی تھی۔ ''کہاں تو ہم رات کو ایک مربوط لائحہ عمل بنا کے لیٹے تھے اور صبح ہونے تک سب پر پانی پھر گیا۔ خالد ہمارے بہت کام آسکتا تھا۔''

''اسے یوں مطمئن ہو کے نہیں بیٹھنا چاہیے تھا۔ جبکہ اسے معلوم تھا کہ اس کی بیوی اور بچے کو وہ خونی درندے ہلاک کر چکے ہیں تو اسے کب چھوڑیں گے؟'' رومی نے پُرغور سا تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

''حالانکہ اسے بھی اس بات کا احساس ہوگا کہ وہ اس کی اب بھی ریکی کر رہے ہوں گے لیکن دشمن اس کی سوچ سے بھی زیادہ مکار اور چالاک ثابت ہوئے۔ وہ اسے بھی زندہ نہیں چھوڑنا چاہتے تھے اسی لیے وہ کچھ دن اسے زندہ چھوڑ کر دیکھنا چاہتے ہوں کہ اس کے پاس کون آتا ہے اور یہ کیا کرتا ہے۔ بالآخر انہوں نے دہرا وار کر دیا۔''

''یقیناً، یہی بات ہو گی۔'' میں نے کہا۔ ''اور اب..... اس کا مطلب ہے کہ ہم ان لوگوں کی نظروں میں آچکے ہیں۔'' میرے لہجے میں تشویش تھی۔ ''ہمیں یہ ہوٹل فوراً سے پیشتر چھوڑ دینا چاہیے، کیونکہ اب تک انہیں پتا چل چکا ہوگا کہ ان کی دہری چال ناکام ہو چکی ہے۔''

''انہوں نے ہمیں اسی کے کانٹیج کے پاس دیکھا ہو گا، ہمارا تعاقب کرتے کرتے وہ وہاں تک نہیں پہنچے ہوں گے اسی لیے ہمارے بارے میں یہاں موجودگی سے وہ اب بھی لاعلم ہوں گے۔'' رومی بولی۔ ''مجھے اس کی بات سے متفق ہونا پڑا۔

''پھر بھی ہمیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے، یہ بہت بُرا ہو گیا کہ ہم ان کی نظروں میں آگئے۔''

''نہیں، یہ اچھا ہی ہوا ہے ایک طرح سے..... اب وہ بھی تو ہماری نظروں میں ہیں۔'' رومی بولی۔ ''ہمیں فوراً ریڈی میڈ میک اَپ کا سہارا لینا چاہیے اور اس کے لیے..... ایک باپ بیٹی کا کردار بہتر رہے گا، تم بوڑھے ضعیف بن جاؤ اور میں..... جوان ہی رہوں گی۔''

''اچھا.....!'' میں نے اس کی جانب گھورا۔ وہ ہنس دی۔ لیکن میں نے اس کی تجویز سے کوئی اختلاف نہیں کیا اور مسکرا دیا۔

ہوٹل چھوڑتے وقت ہم نے اس کی وسیع لابی کے واش روم میں ریڈی میڈ میک اَپ کیا اور باہر آگئے۔

www.pakistanipoint.com

رومی کی وجہ سے ہمیں یہاں اچھی اور مناسب رہائش مل سکتی تھی لیکن اس میں مشکل یہی تھی کہ اس طرح رومی ہی کی نہیں میری بھی شناخت ہو جاتی اور یہ بات ہمارے مقاصد کو نقصان پہنچانے کا سبب بنتی۔

ہم طارق سے بھی حسبِ وعدہ ٹیلی فونک رابطے میں رہتے تھے مگر کوئی اہم بات نہیں کرتے، یہ ذمہ رومی نے اپنے لیپ ٹاپ کے ذریعے اُٹھا رکھا تھا، وہ وہاں مخصوص کوڈ ورڈز میں طارق کو ساری تفصیل سے آگاہ کرتی رہتی تھی۔

اس سلسلے میں طارق اسے چند ایک ہدایات اور باقی حالات کی مطابقت کو ہمارے لیے چھوڑ کر کچھ مشورے بھی دے دیا کرتا تھا۔ مثلاً ایک مشورہ تو اس کا یہی تھا کہ..... اس واقعے کے بعد ہمیں یہ ہوٹل فوری طور پر چھوڑ دینا چاہیے اور اس سلسلے میں ذرا سا بھی رسک لینے کی ضرورت نہیں ہے، وغیرہ۔

طارق ہم پر اپنی کوئی مرضی مسلط نہیں کرتا تھا بلکہ وہ تو خود کہتا تھا کہ ہم اپنے مطابق وقت اور حالات کو دیکھتے ہوئے اپنی مرضی سے قدم اُٹھاتے رہیں لیکن رومی کا یہی خیال تھا اور کسی حد تک میرا بھی کہ طارق کو جان کاری دیتے رہیں۔

ہم نے ایک گنجان آباد علاقے میں درمیانے درجے کے ہوٹل کا رخ کیا۔ ہم دونوں باپ بیٹی کے بہروپ میں تھے۔ ہوٹل میں آئی ڈی کارڈ دکھانے کا مسئلہ پیدا ہوا تھا، وہ رومی نے اپنی حاضر دماغی اور چالاکی سے حل کر لیا۔ مجھ پر یہ الزام لگا کر کہ میں ایک قحبطی اور غائب دماغ بوڑھا ہوں، پیسوں کے پرس کے ساتھ وہ بھی کھو چکا ہوں، استقبالیہ پر موجود آدمی نے ناک بھوں تو چڑھائی تھی مگر رومی نے اس کی کچھ اس طرح رجھانے کے انداز میں منتیں کیں کہ وہ مان گیا، کچھ میں بھی اول جلول سی حرکتیں کرنے لگا، یوں بھی یہ کوئی اتنے بڑے اسٹینڈرڈ کا ہوٹل نہ تھا۔

رومی نے جیب سے روپوں کی گڈی نکال کر استقبالیہ پر رکھ دی اور زیادہ ایام رہنے کی ایڈوانس رقم آفر کر دی۔

ہمیں گراؤنڈ فلور پر ہی ایک کمرا مل گیا جو ہوٹل کی مختصر سی لابی کے دائیں جانب والے کوریڈور کی پہلی قطار میں چار پانچ کمرے چھوڑ کر تھا۔

ہم کمرے میں پہنچے اور اپنا مختصر سا سامان رکھ دیا۔

ہم مستقل اسی بھیس میں رہنا چاہتے تھے، کیونکہ کسی بھی وقت ویٹرز کی آمد و رفت ممکن تھی۔ چائے بھی ہم نے کمرے میں ہی روم سروس کو فون کر کے منگوائی تھی۔

وہ رات ہم نے سکون سے گزاری، جاگنے پر ہلکا پھلکا ناشتا کیا اور پھر رومی لیپ ٹاپ کھول کے بیٹھ گئی۔ طارق سے اسکائپ پر رابطہ ہوا، میرے ذہن میں جو لائحہ عمل تھا، وہ میں نے رومی کے گوش گزار کر دیا تھا جو اس نے طارق کے ساتھ کوڈ ورڈز میں بات چیت کر کے اسے آگاہ کیا اور کچھ اور مشورے لیے، میری منصوبہ بندی کی اس نے کم ہی توڑ پھوڑ کی تھی، باقی سب کچھ ویسا ہی تھا۔

مذکورہ طور پر میرا ارادہ پہلے اسی اسپتال جانے کا تھا جہاں پہلے میں جاب کیا کرتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اب تک وہی پچھلا اسٹاف وہاں ہوگا بھی کہ نہیں، یا ان میں چند ایک ہوں مگر ان سے مجھے کیا لینا دینا تھا؟ میں تو یوں بھی ایک بوڑھے اجنبی کے بھیس میں تھا۔ تاہم مجھے وہاں کیا کرنا تھا، وہ میں رومی کو سمجھا چکا تھا۔

اب ہم اپنے مشن کی روانگی کے لیے تیار تھے۔ رومی البتہ کچھ ضروری نوعیت کی تیاری میں مصروف تھی اور میں حسبِ معمول یونہی ذرا آرگن پائریسی سے متعلق معلومات لینے کے لیے لیپ ٹاپ لے کے بیٹھ گیا۔ سرچ کرنے کے دوران میں مجھے اپنے اندازے سے زیادہ مواد مل چکا تھا۔

آرگن پائریسی اس سے کہیں زیادہ وسیع اور پیچیدہ جرم بن گیا تھا جتنا کہ عام طور سے سوچا جا رہا تھا۔ مالی لحاظ سے یہ منشیات اور اسلحے کی غیر قانونی تجارت کے بعد تیسرے نمبر پر آ گیا تھا۔ اس سے پہلے وائلڈ لائف کا غیر قانونی شکار اور اس سے منسلک تجارت تیسرے نمبر پر تھی۔ مگر اب انسانی اعضا کی تجارت نے یہ نمبر چھین لیا تھا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق یہ سالانہ تیس بلین ڈالرز کا بزنس بن گیا تھا۔ اس کا بڑا حصہ مڈل ایسٹ، افریقہ خاص طور سے سینٹرل اور شمالی افریقہ اور برصغیر سے متعلق تھا۔ چین کے بارے میں ایک رپورٹ میں کہا گیا کہ اس کے پسماندہ حصوں سے بھی آرگن پائریسی جسے آرگنلنگ بھی کہتے ہیں۔ زور و شور سے جاری تھی مگر اس کا رخ بین الاقوامی مارکیٹ کے بجائے چین کے ہی ترقی یافتہ اور دولت مند خطوں تک تھا جہاں اعضا کے طلب گار موجود تھے اور وہ اس کی منہ مانگی قیمت دینے کو بھی تیار تھے۔

www.paksociety.com

کئی گھنٹے انٹرنیٹ پر اس بارے میں آرٹیکل، رپورٹس اور خبریں پڑھنے کے بعد بری معلومات میں کئی گنا اضافہ ہوا تھا۔ سب سے حیرت انگیز انکشاف یہ تھا کہ مغرب میں طبّی تحقیق کرنے والے ادارے بھی اس بلیک مارکیٹ کا ایک حصہ تھے۔ وہ دواؤں اور اعضا کو زیادہ دیر تک محفوظ رکھنے اور ٹرانسپلانٹ کے بعد جسم کی جانب سے رد کیے جانے کے خطرے سے بچانے کے لیے تحقیق میں مدد دے رہے تھے۔ اس سے وہ نہ صرف بھاری فنڈز حاصل کر رہے تھے بلکہ مستقبل میں ایسی ادویات اور طریقوں کے پیٹنٹ سے بھی بھاری نفع کماتے۔ سب سے بڑھ کر انہیں کسی طبّی اتھارٹی کے اجازت نامے کی محتاجی کے بغیر اپنی ادویات اور ایجاد کردہ طریقے آزمانے کا موقع مل رہا تھا۔ اگرچہ مغرب آرگن پائریسی کا مرکز نہیں تھا مگر وہ اس کی بلیک مارکیٹ میں ملوث تھا اور یہ بھی لازمی ہے کہ مغرب کے بہت سارے دولت مند اپنے اعضا تبدیل کرانے کے لیے ایشیا کا رخ کر رہے ہوں گے کیونکہ مغرب میں وہ اپنی مرضی سے یہ کام نہیں کر سکتے تھے۔ دراصل یہ کھیل ہی دولت مندوں کا تھا اور ان کی وجہ سے نہ صرف آرگن پائریسی کو فروغ حاصل ہوا تھا بلکہ اس کی باقاعدہ بلیک مارکیٹ وجود میں آگئی تھی۔

بہرکیف تھوڑی دیر بعد رومی نے روانگی کا بگل بجا دیا اور ہم مقررہ وقت میں ہوٹل سے نکلے، ہمارے پاس ریڈی میڈ میک اَپ کی کٹ ہر وقت موجود رہتی تھی۔

ہم نے ایک پبلک واش روم کا رخ کیا لیکن ہم اپنے گردوپیش سے بھی محتاط تھے، رومی پوری طرح اپنی پروفیشنل تربیت کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے ممکنہ تعاقب کا بھی دھیان رکھے ہوئے تھی۔ مقدور بھر میں بھی اپنے اردگرد سے محتاط تھا، اس کے بعد ہم باری باری دو مختلف سمتوں سے واش روم میں داخل ہوئے اور جب تھوڑی دیر بعد برآمد ہوئے تو ایک نوجوان جوڑے کی شکل میں تھے۔

یہاں سے ہم نے مذکورہ اسپتال کا رخ کیا اور ٹیکسی میں وہاں تک پہنچے۔ ٹیکسی سے اُتر کر میں نے ایک نگاہ اُٹھا کر اسپتال کو دیکھا تو یہاں مجھے ساتھی کولیگز اور دوستوں میں سب سے پہلے ہنس مکھ، دوست نواز، بذلہ سنج اور تعصب سے پاک مزاج کا مالک رنبیر سنگھ یاد آیا، اس کی بیوی رجنی یاد آئی، وہ بھی اپنے شوہر جیسے ہی مزاج کی تھی، یعنی غیر متعصب اور ملنسار۔

دیارِ غیر میں رنبیر سنگھ جیسے جی دار دوست کو یاد کر کے میرے حلق میں رقت سی اترنے لگی۔

روسل بھی مجھے یاد آئی، جو ایک چھوٹے قد کی بڑی کیوٹ سی عورت تھی۔ سانولی سنہری رنگت اور بہت خوب صورت سے نازک مشرقی بعیدی نقوش تھے۔ اس کی عمر پینتیس برس تھی لیکن دیکھنے والے اسے پچیس سے زیادہ کا نہیں سمجھتے تھے۔ جتنی خوش شکل تھی اتنی ہی خوش بدن بھی تھی اور نرس کے یونیفارم میں وہ خاصی اسمارٹ دِکھتی تھی۔ ریحانہ کو بھی نہیں بھولا تھا۔ یہ گوری چٹی لڑکی ایرانی تھی اور اپنے منگیتر سے دور یہاں جاب کر رہی تھی۔ ان کا مقصد اتنی رقم جمع کرنا تھا کہ ایک اچھا اپارٹمنٹ لے سکیں۔ ان کی شادی اسی وجہ سے رکی ہوئی تھی۔ ریحانہ میرے ساتھ کام کر چکی تھی۔ وہ بھی بڑی خوش مزاج اور ہنس مکھ سی تھی۔ مجھے اس کے ساتھ بھی مختصر سی ہونے والی گفتگو یاد آئی جب وہ مجھے وارڈ میں ملتی تھی تو سب سے پہلے مخصوص لہجے میں ہیلو، ہائے ضرور کرتی تھی۔

''ہیلو ڈاکٹر۔''

''تم کیسی ہو؟'' میں نے پوچھا۔ ''کمال کا کیا حال ہے۔''

''رو رہا تھا۔'' وہ ہنسی۔ ''کل بات ہوئی کہہ رہا تھا مکان پر لعنت بھیجو ہم کرائے کے مکان میں بھی رہ سکتے ہیں۔''

''تم نے یقیناً اس کا دل توڑ دیا ہوگا۔''

''ڈاکٹر شادی سے زیادہ مکان ضروری ہے اور ہم جیسے عام لوگ شادی سے پہلے ہی مکان بنا سکتے ہیں۔''

سری لنکن میٹرن نرس شلپا بھی مجھے نہیں بھولی تھی۔ نجانے اب یہ لوگ سب کہاں ہوں گے؟ یہاں یا کہیں اور..... غالب امکان تو یہی تھا کہ وہ اِدھر ہی ہوں یا پھر واپس چلے گئے ہوں..... مجھے یہاں سے گئے کچھ اتنا زیادہ عرصہ بھی تو نہیں ہوا تھا، جاب کنٹریکٹ بھی ان کا تھوڑا نہیں تھا۔ ہاں! البتہ اُن دنوں ہونے والے نامساعد واقعات کے بعد ہو سکتا ہے، وہ اِدھر اُدھر ہو گئے۔ باقی تو یہاں بہ ظاہر کچھ نہیں بدلا تھا، سب کچھ ویسا ہی نظر آرہا تھا۔ گیٹ، بلڈنگ، اس کا رنگ اور پارکنگ وغیرہ، پھر سیکیورٹی کا نظام بھی ویسا ہی تھا۔ جیسا کہ میں بتا چکا تھا کہ یہ ایک بہت بڑا اسپتال تھا۔ یہاں صرف شہر، ریاست اور مڈل ایسٹ کے شہری علاج کے لیے نہیں آتے بلکہ باہر سے بھی مریض علاج کے لیے آتے تھے۔ یہاں علاج کی واحد شرط دولت

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

تھی۔ صرف بہت دولت مند افراد ہی یہاں کے علاج کا خرچ برداشت کر سکتے تھے۔ یہاں ہر قسم کی سرجری سے لے کر آرگن ٹرانس پلانٹ تک تمام سہولیات دستیاب تھیں۔ اس اسپتال کا آخری فلور مکمل طور پر ٹرانسپلانٹ سرجری کے لیے مخصوص تھا۔ اعضا کی تبدیلی کے لیے لوگ یہاں آتے تھے اور ان کے ناکارہ اعضا کی جگہ دوسرے اعضا لگائے جاتے تھے۔ گراؤنڈ فلور پر او پی ڈی اور انتظامی افسران کے دفاتر تھے۔ فرسٹ فلور ایمرجنسی کے لیے تھا۔

ہم نے ایمرجنسی کی طرف جانے کے بجائے اسپتال کے لاؤنج کا رخ کیا۔ سیکیورٹی میں ہم نے یہی بتایا تھا کہ ہم کسی گائنا کولوجسٹ کو وزٹ کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا ہماری وہیں سے رہنمائی بھی کر دی گئی کہ وہ حصہ کس طرف تھا۔

ہم نے کیا خاک کسی ڈاکٹر کا وزٹ کرنا تھا، بس سلپ لے کر اندر داخل ہو گئے اور اسپتال کے وسیع و عریض لاؤنج میں آ گئے، یہاں آتے ہی میں نے عقابی نظروں سے چاروں طرف غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ سامنے استقبالیہ تھا اور وہاں دو تین افراد کو موجود پایا، جو اپنے کام میں منہمک تھے۔ ان میں.... دو لڑکیاں اور ایک مرد تھا۔

وہاں لوگوں کا رش تھا اور قطار لگی ہوئی تھی۔ ہمیں پندرھویں فلور پر جانا تھا جو ٹرانسپلانٹ سرجری کے لیے مخصوص تھا بلکہ چودھواں فلور بھی اسی میں شامل کیا گیا تھا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ وہاں سیکیورٹی کا انتظام ذرا سخت کیا گیا تھا۔ بغیر کسی ٹھوس وجہ اور تعارف کے اس میں داخل ہونا ممنوع تھا۔ اس قباحت کا ذکر میں نے رومی سے کیا تھا۔ وہ بھی ذرا متفکر ہوئی تھی، تاہم میں نے کچھ سوچ کر رومی کو تسلی دی اور ہم لفٹ میں داخل ہو گئے۔

میں نے دانستہ پہلے چودھویں اور پندرھویں منزل کے بجائے، تیرھویں منزل کا بٹن دبا دیا۔

تیرھویں منزل پر ہم نے قدم رکھا ہی تھا کہ وہاں موجود بھاری بھرکم گارڈ نے ہم سے سلپ دکھانے کا تقاضا کر دیا۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر اسے سلپ دکھا دی تو اس نے وہیں سے ہی ہمیں سیکنڈ فلور پر جانے کی ہدایت دے دی، کیونکہ..... گائنی وارڈز سیکنڈ فلورز پر تھے۔ میں نے اس سے معذرت کی اور پلٹے۔ میں اور رومی پھر لفٹ میں آ گئے۔

ہم سیکنڈ فلور کے بجائے دوبارہ گراؤنڈ پر آ گئے اور لاؤنج کے قدرے کونے والے گوشے میں صوفے پر جا بیٹھے۔

''سیکیورٹی سخت ہے۔ اب کیا کریں؟'' رومی نے دھیمی آواز میں کہا۔

''ہمم..... یہی میں سوچ رہا ہوں۔ میرا خیال ہے میں خود اکیلا کچھ ٹرائی کر کے دیکھوں۔''

''کیا کرو گے؟'' رومی نے پوچھا۔

''کسی سینیٹری ورکر کا بھیس بھرنا پڑے گا۔ یونیفارمز وغیرہ کا اسٹور ادھر ہی ہے۔''

''یہ بہت رسکی نہیں ہو گا؟'' وہ بولی۔ ''اگر دھر لیے گئے تو سب چوپٹ ہو جائے گا۔''

''کیا کریں پھر اور کوئی طریقہ سجھائی نہیں دیتا۔'' میرے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔ ''تم ہی کچھ بتاؤ..... تم کیا اتنا عرصہ انٹرپول میں جھک مارتی رہی ہو؟'' (آخر الذکر جملہ میں نے دل میں کہا تھا)

''وہی سوچ رہی ہوں، ویسے تمہاری بھی تجویز بُری نہیں۔'' اس نے گویا جان چھڑانا چاہی۔

''دیکھ لو، عام وارڈز میں جانے کی ہی کس قدر سخت سیکیورٹی ہے، یہ تو پھر بھی ٹرانسپلانٹیشن سرجیکل وارڈز ہیں۔''

چند ثانیے میں کچھ سوچتا رہا۔ اس کے بعد اُٹھ کھڑا ہوا۔ دائیں جانب فارمیسی تھی اور اس کے بعد ایک کوریڈور تھا، میں ٹہلنے کے انداز میں اس طرف نکل گیا، ابھی میں چند قدم ہی چلا ہوں گا نجانے کہاں سے ایک وردی پوش میری جانب بڑھ آیا۔

''ایکسکیوزمی! آپ کو کیا کام ہے؟''

''کک..... کچھ نہیں، میں دراصل سیڑھیوں کا راستہ دیکھ رہا تھا اُوپر گائنی وارڈ تک جانے کا۔'' میں نے کہا۔ پھر اسے جلدی سے سلپ دکھا دی۔ ''دراصل میری بیوی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، لفٹ میں اسے گھٹن ہوتی ہے۔''

اس نے مجھے ہدایت دی کہ میں ریسپشن میں جا کر بات کر لوں۔ میں نے مسکرا کر اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنا سا منہ لے کر پلٹ آیا۔

''کیا ہوا؟'' رومی نے میرا لٹکا ہوا چہرہ دیکھ کر سوال کیا۔

''کوئی حل نکلتا نظر نہیں آ رہا۔'' میں نے مایوسی سے کہا۔

''میرا خیال ہے ہمیں یہاں آنے سے پہلے ہی سوچ سمجھ کر نکلنا چاہیے تھا، اندھیرے میں تیر چھوڑا ہم نے۔''

www.pakistanipoint.com

''ہاں! لیکن حالات کا تو اندازہ ہو گیا نا.....''

''یہ کوئی بڑی بات نہیں، اس کا اندازہ تمہیں پہلے ہی ہونا چاہیے تھا، آفٹر آل تم یہاں جاب کر چکے ہو اور اسے چھوڑے تمہیں زیادہ عرصہ بھی نہیں ہوا۔'' رومی نے کہا۔

ابھی ہم ایک دوسرے سے باتیں کر ہی رہے تھے کہ اچانک..... میری نظر لاؤنج میں ایک خوب صورت سی لڑکی پر پڑی۔ وہ داخلی راستے سے اندر داخل ہوئی تھی اور اب لفٹ کے اس حصے کی جانب بڑھ رہی تھی جو صرف اسٹاف کے لیے مخصوص تھا۔

میں اسے دیکھتے ہی پہچان گیا تھا..... وہ میری..... نرس ریحانہ تھی۔ وہی ریحانہ جو بے چاری پیسے کمانے ایران سے یہاں آئی تھی تاکہ بہت سارا روپیہ کما کر وہ ایران میں اپنا مکان خرید سکے اور اپنے منگیتر کمال..... سے شادی کر سکے.....

دل تو میرا بے اختیار چاہا کہ اسے آواز دوں لیکن ظاہر میں ایسا کرنے سے قاصر تھا۔ ایک تو میں نے بھیس بھر رکھا تھا، وہ مجھے آواز سے پہچان سکتی تھی، مگر یہ میں ابھی نہیں چاہتا تھا۔ تب پھر میرے تیزی سے سوچتے دماغ میں ایک بات سمائی۔

''کیا ہوا؟ تم کسے دیکھ رہے ہو؟ کہاں کھو گئے؟'' رومی بولی۔

''ایک منٹ، اِدھر ہی رہو۔'' میں اسے یہ کہہ کر فوراً ریحانہ کی جانب بڑھا اور اپنی آواز بدل کر اس کے قریب جا کر ہولے سے پکارا۔

''سسٹر.....!''

وہ رکی اور پیچھے مڑ کر میری جانب سپاٹ سی نگاہوں سے گھورا۔

''معاف کیجیے گا، میں یہاں اپنے بھائی ڈاکٹر سیف کی تلاش میں آیا ہوں وہ یہاں جاب کرتے ہیں.....'' میں نے اسے متوجہ پا کر جلدی سے کہہ دیا۔ تب ہی ڈاکٹر سیف کے ذکر پر اس کی آنکھوں میں حیرت چمکی اور من موہنے چہرے کے سپاٹ تاثرات میں بھی کمی واقع ہوئی، بلکہ فوراً ہی اب اس کی جگہ ایک مسکراہٹ نے لے لی۔ یوں مجھے ڈر بھی تھا کہ کہیں وہ مجھے ریڈی میڈ میک اَپ کے باوجود پہچان ہی نہ لے، ظاہر ہے تھوڑی بہت شبیہہ تو پڑتی ہی ہو گی، ایسے میں جبکہ اس نے میرے ساتھ خاصا وقت بھی گزارا ہو۔ اسی لیے میں نے ''بھائی'' کا ٹانکا لگا دیا تھا۔ تاکہ اسے مجھ میں کسی بھی قسم کی مماثلت اگر محسوس بھی ہو وہ بھائی کے لاحقے میں کام آجائے، آخر کو بھائیوں کی شکل ایک دوسرے سے ملتی ہی ہیں۔

''آ..... آپ ڈاکٹر سیف کے بھائی ہیں؟'' اس نے بہ غور میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے گویا تصحیح چاہی۔

''جی ہاں! نعمان نام ہے میرا.....'' میں نے جلدی سے کہا۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ آگے اس کے کیا سوالات ہو سکتے تھے اسی لیے میں ان کے جواب سوچ چکا تھا۔

''وہ تو جاب چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ کمال ہے آپ ان کے بھائی ہیں اور آپ کو پتا تک نہیں اس بات کا.....؟''

''وہ میرے سوتیلے بھائی ہیں اور کسی بات سے ناراض تھے۔'' میں نے بات بنائی۔ ''ان کا بھی قصور نہیں تھا، ہمارے درمیان کچھ جائداد کا تنازعہ تھا اب وہ حل ہو گیا ہے تو انہوں نے رابطہ ہی توڑ دیا ہے۔''

''اوہ..... آئی سی.....'' وہ بولی۔ ''اچھا! آپ ایسا کریں میرے ساتھ آئیں، میں آپ کو ریکارڈ چیک کروا کے ان کا پتا بتا دیتی ہوں، لیکن وہ پاکستان جا چکے ہیں، آپ کہاں رہتے ہیں؟'' کہتے ہوئے اس نے اپنے قدم لفٹ کی جانب بڑھا دیے اور میں بھی اس کا شکریہ ادا کرتا ہوا اس کے ہمراہ ہو لیا۔

''اوہ اچھا، مجھے یہی ڈر تھا۔'' میں نے جلدی سے اس کے ساتھ لفٹ کے اندر گھستے ہوئے کہا۔ یہ چونکہ اسٹاف والی لفٹ تھی اسی لیے ہم دونوں اکیلے ہی اندر تھے۔ میں نے دزدیدہ نظروں سے دیکھا تھا کہ اس نے چودھویں فلور کا بٹن پش کیا تھا اور یوں اچانک میری مراد بر آتے ہی میرے اندر مسرت کی بجلیاں چمکنے لگیں۔ آگے بولا۔

''میں تو کویت میں رہتا ہوں، ایک جاب کے سلسلے میں، مقیم انڈیا میں ہوں۔ اس کی تلاش میں یہاں آیا ہوں کہ شاید اس کا کچھ اتا پتا چل جائے تو اس کا حق اسے دے دیا جائے۔ آپ کے ذریعے میں ایک بڑا ثواب کما لوں گا۔''

''یہ تو اچھی بات ہے، میں بھی یہی سوچ کر آپ کی مدد کر رہی ہوں۔'' وہ ہولے سے مسکرائی۔

''میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھلا سکتا۔ آپ کو دعائیں دوں گا، لگتا ہے، سیف بھائی کا رویہ آپ لوگوں کے ساتھ بہت اچھا رہا ہے، اسی لیے آپ بھی میری اور اس کی مدد کر رہی ہیں۔'' پھر ایک ذرا رک کر میں نے دانستہ اس کا نام پوچھا، (جو مجھے معلوم ہی تھا، لیکن میں نہیں چاہتا

www.PakistaniPoint.com

تھا کہ اسے مجھ پر ذرا سا بھی شُبہ ہو)

''ریحانہ ہے میرا نام......'' اس نے نام بتایا۔

''الحمدُ للہ! میں آپ کو دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ آپ بھی مسلم ہیں۔''

''جی ہاں! میرا تعلق ایران سے ہے......''

''ماشاءاللہ، خوشی ہوئی کہ آپ کا تعلق برادر اسلامی ملک سے ہے۔''

''یقیناً، اچھے رویّے یاد رہ جاتے ہیں، اسی طرح بُرے رویّے بھی۔'' اس نے پہلی والی بات آگے بڑھائی۔ ''اگر آپ کا ڈاکٹر سیف سے رابطہ ہو جائے تو میرا بھی سلام کہہ دینا اُن سے اور خیر خیریت پوچھ لینا۔''

''ضرور...... ضرور...... کیوں نہیں......'' میں نے فوراً کھلے دل سے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس دوران میں نے محسوس کیا تھا کہ ریحانہ کے رنگ روپ میں تھوڑا فرق آ گیا تھا، پہلے تو خیال کیا کہیں یہ اتنے عرصے بعد اسے دیکھنے کا نتیجہ تو نہیں؟ یوں بھی ہوتا ہے آدمی کافی عرصہ ساتھ رہے اسے یا کسی اور کو کوئی تبدیلی محسوس نہیں ہوتی لیکن جیسے ہی، خواہ تھوڑے ہی عرصے کے لیے سہی، دور ہو کر دوبارہ اسے دیکھے، تب وہ نظر آ جاتی ہے۔

خیر، ریحانہ کا رنگ اب بھی گورا چٹا تھا، لیکن اس میں تھوڑی میلاہٹ آتی محسوس کر رہا تھا میں...... اس کے چہرے کی شوخی میں وہ اُجلا پن عنقا نظر آ رہا تھا جو اس کا خاصہ ہوا کرتا تھا، آنکھوں میں چمکتی درخشاں اور مسرت بھرے خوابوں کی خوش رنگ تعبیریں جو کہکشاں کی صورت ہر سمے چمکتی رہتیں، وہ بھی معدوم سی ہو گئی تھیں۔ اس کی جگہ ایک نامعلوم سی بے چینی اور سراسیمگی تھی۔

اسی طرح ہم باتیں کرتے ہوئے چودھویں فلور پر پہنچے تو وہاں متعین گارڈ مجھے دیکھتے ہی چونکا۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

''یہ میرے گیسٹ ہیں۔'' ریحانہ نے اس سے کہا تو وہ پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے سکون کی سانس لی۔

وہ مجھے فلور پر بنے مختصر سے لاؤنج میں لے آئی اور صوفے پر بیٹھنے کا کہہ کر کاؤنٹر کی جانب بڑھ گئی جہاں اور بھی اسٹاف کے لوگ یونیفارم میں موجود اپنے کاموں میں مصروف تھے۔

میں بہ غور اطراف کا جائزہ لینے میں محو ہو گیا، ساتھ ہی وہاں کام کرتے اور آتے جاتے ڈاکٹرز اور اسٹاف کے لوگوں کے چہرے بھی غور غور سے دیکھنے لگا، لیکن مجھے ابھی تک ماسوائے ریحانہ کے کوئی شناسا چہرہ دکھائی نہ دیا۔ ہو سکتا تھا وہ جا چکے ہوں یا پھر ان کی کسی اور وارڈ میں ڈیوٹی شفٹ لگ گئی ہو۔ بہرحال یہاں ریحانہ تھی۔ میرے لیے یہی کافی تھا اور میں اسے خدا کی طرف سے امدادِ غیبی سمجھ رہا تھا، ظاہر ہے جب سے میں اور رومی یہاں آئے تھے، ہمیں مسلسل ناکامی کا منہ ہی دیکھنا پڑ رہا تھا بلکہ اگر ریحانہ سے اچانک ملاقات نہ ہوتی تو شاید میں اور رومی مایوس ہو کر یہاں سے چلے جاتے۔

میں اب اس بات کا پختہ ارادہ کیے ہوئے تھا کہ...... ریحانہ ہی میرے کام آ سکتی ہے اور مجھے اس سے کسی بہانے سہی راہ و رسم بڑھانے چاہئیں۔

ذرا ہی دیر بعد وہ ٹک ٹک کرتی چلی آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک کمپیوٹر پیپر تھا۔ وہ میرے سامنے والے صوفے پر براجمان ہو گئی اور پیپر میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔

''یہ میں نے آن لائن ریکارڈ روم سے براہِ راست سرچ کر کے پرنٹ نکلوالیا ہے جس میں آپ کے بھائی ڈاکٹر سیف کا پاکستان والا پتا اور ایک کونٹیکٹ نمبر موجود ہے لیکن اس نمبر پر رابطہ نہیں ہو پایا تھا۔''

''میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں مس ریحانہ......!'' میں نے مسکرا کر انتہائی ممنون بھرے لہجے میں اس سے کہا۔ وہ بھی مسکرائی۔ میں نے اب بھی اس کے چہرے سے محسوس کیا تھا کہ...... وہ کچھ اُترا اُترا سا ہے، چونکہ میں پہلے جاب کے سلسلے میں اس کے ساتھ وقت گزار چکا تھا اور ہر وقت میں نے اسے خوش اور شوخ ہی دیکھا تھا، مگر اب وہ بدلی ہوئی نظر آ رہی تھی، جانے کیا بات تھی؟ دل میں تو آئی کہ اس سے اس کے منگیتر کمال کے بارے میں پوچھوں، مگر خود ہی ہنس دیا، ظاہر میں اس کے سامنے ڈاکٹر سیف کی حیثیت سے تو موجود نہ تھا۔ نعمان کے اسم اور سوتیلے بھائی کے تعلق سے میں اس وقت ریحانہ کے سامنے تھا۔ ریحانہ اب میرے لیے یہاں ایک اُمید کی کرن تھی، میرے دل میں آیا بھی کہ اسے اپنی حقیقت بتا دوں، بلکہ سب کچھ بتا دوں لیکن ابھی شاید یہ قبل از وقت ہوتا، لہٰذا بجلی کی سی تیزی کے ساتھ میرے سوچتے ذہن میں ایک خیال کلک ہوا اور میں نے اس سے رخصت ہوتے وقت اس کا کونٹیکٹ نمبر دینے کی گزارش کر ڈالی جو اس نے تھوڑی سی ردّ و قدح کے بعد دے دیا۔ یہ اس کا سیل نمبر تھا اور یہاں کا نمبر بھی۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

مجھے اگرچہ پہلے ہی سے اس کی رہائش کا پتا تھا لیکن پھر بھی میں نے اس سے پوچھ لیا۔ تسلی ہوگئی کہ وہ اب بھی وہیں اپنی پہلی والی رہائش گاہ پر مقیم تھی۔

میں نے ایک بار پھر اس کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا اور لفٹ کی جانب پلٹا۔ میں نے دیکھا کہ گارڈ اِدھر اُدھر چکر لگاتے ہوئے میری جانب دیکھ لیتا تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور...... اعصاب تنے ہوئے تھے، کیونکہ یہاں تک آنے کا مجھے ایک سنہری موقع ملا ہوا تھا چاہے ریحانہ کے توسط سے ہی سہی، لیکن کیا یہ جلد بازی ٹھیک ہوتی؟ جبکہ ریحانہ سے بھی اب میری نعمان کی حیثیت سے ہی سہی اچھی سلام دعا ہوگئی تھی۔ اگر میں یہاں اس وقت کسی مہم جوئی کے دوران دھر لیا جاتا تو ریحانہ کا ہاتھ آیا پتا میرے ہاتھوں نکل جاتا اور وہ مجھ سے بدظن یا خوف زدہ ہو جاتی۔ اسی لیے میں نے سوچا تقدیر اگر ساتھ دے ہی رہی ہے تو ''ٹھنڈی'' کر کے کھانی چاہیے، یوں بھی وہ گارڈ اب مجھے لگاتار گھور رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو اب جاؤ یہاں سے......' ورنہ میں اسی وقت یہاں کی سن گن لینے کی تیاری میں تھا۔

بہرکیف...... ریحانہ یہاں تھی تو مجھے بعد میں بھی مواقع ملتے رہیں گے، یہ سوچ کر میں لفٹ میں داخل ہوگیا اور گراؤنڈ کا بٹن پش کر دیا۔ لفٹ نیچے جانے لگی۔

یہاں ایک عجیب بات ہوئی، غیر ارادی طور پر میں نے اسی لفٹ کا رخ کیا تھا جس سے میں ریحانہ کے ساتھ اُوپر آیا تھا اور جو صرف اسٹاف کے لیے مستعمل تھی، اب اُصولی طور پر مجھے عام افراد کی لفٹ کے ذریعے ہی نیچے جانا تھا، گارڈ بھی اس پر شاید توجہ نہ دے سکا اور میں بھی اپنی ہی جھونک میں نکل آیا۔

میں ابھی اسٹاف کی لفٹ میں ہی تھا کہ درمیان میں لفٹ رکی تو ایک ادھیڑ عمر کا ڈاکٹر وائٹ کوٹ میں سوار ہوا، اس کے ہمراہ درمیانی عمر کا آدمی تھا۔ میں اس کے جسم کی مخصوص یونیفارم کو دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ یہ سرجیکل کلیننگ تھا۔ دفعتاً ہی پھر میری نظر ادھیڑ عمر کے ڈاکٹر کے سفید ایپرن پر لگی نیم پلیٹ پر پڑی۔

''ڈاکٹر امرناگ......''

☆☆☆

یہ نام پڑھتے ہی میں اپنی جگہ سُن ہو کر رہ گیا تھا۔ ڈاکٹر امرناگ کا نام...... کسی ہتھوڑے کی طرح میری کنپٹیوں پر پڑنے لگا۔ یہی تو وہ شیطان تھا جسے واصلِ جہنم کرنے کے لیے میں یہاں آیا تھا اور اس کا ساتھی ڈاکٹر رمیش...... یقیناً وہ بھی یہیں ہوگا اب تک......

...... دھیان ہی نہ رہا کہ میں اس کی جانب آنکھیں پھاڑے تکے جا رہا ہوں، احساس تو مجھے تب ہوا جب اس کے ساتھ کھڑے اسٹاف کے آدمی نے مجھے گھور کر ہولے سے کھنکھارا تھا۔ اسے شاید میری یہ حرکت ناگوار گزری تھی اور خود مجھے بھی سنبھالا لینا پڑا تھا۔

''تم اسٹاف والی لفٹ میں کیا کر رہے ہو؟ کسی گارڈ نے تمہیں نہیں روکا؟'' بالآخر اس نے اپنا غبار نکال ہی لیا اور اسی ناگواری سے مجھ سے بولا تھا۔ میں اسے نہیں بتانا چاہتا تھا کہ میں ریحانہ کا ''گیسٹ'' تھا۔ تاہم میں بھی اسی ناگواری سے اُلٹا اس پر چڑھ دوڑا۔

''غضب خدا کا...... کوئی انسانیت ہی نہیں یہاں...... کوئی ایمرجنسی میں ہو تو کیا کرے آدمی......؟''

''خاموش رہو روڈی......!'' ڈاکٹر امرناگ نے اسے ٹوک دیا اور میری جانب گمبھیر سی نظروں سے دیکھا پھر لفٹ کی چھت کو گھورنے لگا۔ روڈی نامی وہ آدمی چپ ہو رہا۔

لفٹ گراؤنڈ فلور پر آگئی۔ میں باہر نکل آیا۔ یونہی کن انکھیوں سے میں نے ذرا گردن موڑ کر دیکھا تو لفٹ کے باہر وہ دونوں کھڑے نظر آئے لیکن ڈاکٹر امرناگ، روڈی سے کچھ کہہ کر ایگزٹ کی جانب بڑھ گیا اور میں نے دیکھا کہ روڈی وہیں کھڑا بہ غور میری جانب تکے جا رہا تھا، میں نے کوئی تاثر نہ دیا اور سید ھا رومی کی طرف بڑھا۔

''جلدی سے ہولے ہولے کراہنا شروع کر دو۔'' اس کے قریب پہنچ کر کہا۔ ''معاملہ تھوڑا سا گڑبڑ ہو گیا ہے۔'' وہ بھی زیرک دماغ تھی، اس نے بہ یک ٹرنت ایسا ہی کیا اور...... لگی ہائے...... ہائے کرنے...... میں نے اسے سنبھالا دیا اور اپنے چہرے پر بھی پریشانی اور تشویش کے آثار طاری کر لیے، تب ہی میں نے دُزدیدہ نظروں سے دیکھا کہ روڈی اب مطمئن ہو کر آگے بڑھ گیا تھا۔ اس کا رخ بھی ایگزٹ کی جانب تھا اور میں بھی رومی کو لیے اسی جانب بڑھ گیا۔

رومی کو میں نے ''ایکٹنگ'' جاری رکھنے کا کہا اور باہر نکلا تو اُن دونوں کو میں نے ایک بڑی سی انٹرکولر ٹائپ گاڑی میں سوار ہوتے دیکھا۔ میں نے جلدی سے ایک ٹیکسی کو اشارہ کیا اور رومی کو ''سنبھالا'' دیے اس کی عقبی سیٹ پر براجمان ہوگیا۔ پھر ڈرائیور سے سامنے اسی گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جلدی سے بولا۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

''اس گاڑی کے پیچھے چلتے رہو..... لیکن ذرا فاصلے سے..... انہیں تعاقب کا شبہ نہ ہو.....''

ٹیکسی ڈرائیور واہے گرو..... واہے گرو کرتے ہوئے میری جانب گردن موڑ کر تکنے لگا تو مجھے ایک جھٹکا لگا، یہ وہی سکھ ڈرائیور تھا جو ہمیں ''البحر'' کی جانب لے کر گیا تھا اور اسے دیکھ کر مجھے اپنے دوست رنبیر سنگھ کی یاد آ گئی تھی۔

''او خیریت تو ہے نا.....''

''ارے تم سردار جی.....! ذرا جلدی گاڑی آگے بڑھاؤ..... باقی باتیں میں تمہیں بتاتا ہوں۔''

''یہ لو جی بڑھا دی گڈی.....'' کہتے ہوئے اس بھلے مانس سکھ ڈرائیور نے ایک جھٹکے سے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔

''یہ چکر کیا ہے؟ پہلے تسی البحر تے فیر یہاں اسپتال وچ..... اے تو اڈی پٹنی ہے گی جی.....؟'' اس نے رومی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''آہو سردار جی.....!'' میں نے کہا اور بات بنا دی کہ..... سامنے گاڑی میں جانے والے ڈاکٹر صاحب سے اپائنٹمنٹ لینی تھی..... مگر وہ وقت نہیں دے رہا اور اپنے کلینک کی جانب جو خدا جانے اس کے گھر پر ہی بنا ہوا ہے، جا رہا ہے تو سوچا وہیں چل کر دکھا دیں۔

''تو فیر یہ خفیہ تعاقب کیا معنی رکھتا ہے؟''

''ہمیں نہیں معلوم کہ اس کی ذاتی کلینک کہاں ہے؟ پھر ہم اسے ناراض بھی نہیں کرنا چاہتے کہ ہم اس کا تعاقب کر کے یہاں تک پہنچے ہیں۔''

ایسے میں، میں نے رومی کو چٹکی کاٹی، اس کا ڈراما موقوف ہونے لگا تھا، اس نے چٹکی کا مطلب سمجھتے ہی دوبارہ نوٹنکی شروع کر دی اور لگی 'ہائے، ہائے' کرنے۔

سردار جی کے دماغ نے بس اتنا ہی کام کیا اور پھر وہی کرنے لگا جو میں نے اس سے کہا تھا۔

سر بہ فلک عمارتیں، پُر رونق مارکیٹیں اور ہوٹلز کے درمیان مصروف شاہراہ پر یہ تعاقب جاری رہا۔ نصف گھنٹے بعد آگے جانے والی گرے انٹرکولر ایک ایسے پوش علاقے میں داخل ہو گئی جو نسبتاً بلند سطح مرتفع پر تھی۔ یہاں عالیشان گھر، کوٹھیاں اور بنگلے بنے ہوئے تھے۔ سفیدے اور ناریل کے اسٹائلش انداز میں تراشیدہ درخت، باغات اور ان کے درمیان سے گزرتی مختلف بلاکس کی جانب جاتی ہوئی تارکول کی پختہ سڑک نما روشیں، بڑی بھلی معلوم ہوتی تھیں۔

ایک جگہ ہرڈل راڈ پر بنے..... کیبن میں گارڈز نے ہمیں روکا تو میں نے ڈاکٹر امرناگ کا نام لے لیا، کہ انہیں مریض دکھانا ہے، ڈر بھی لگا کہ کہیں وہ فون پر رابطہ نہ کر لے، مگر میں نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ ایسے تو ایسے ہی سہی، لیکن شاید تقدیر مدد کر رہی تھی، گارڈ کچھ معترض نہ ہوا اور ہم اندر آ گئے۔

ایک بلاک کی گلی میں گرے انٹرکولر مڑ گئی اور میں نے فوراً ڈرائیور کو ادھر ہی ٹیکسی روکنے کا کہہ دیا۔ میں نے اسے کرایہ دے کر فارغ کیا اور رومی کو سنبھالے ہوئے مذکورہ گلی کی جانب بڑھ گیا۔

ٹیکسی نظروں سے اُوجھل ہوتے ہی رومی نارمل حالت میں آ گئی۔

ابھی تک میں نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا مگر اب میں نے اسے مختصر ترین الفاظ میں سب کچھ بتا دیا۔ ایک خوشگوار سی حیرت تلے اس کی آنکھیں پھیل گئیں، اس نے بھی وہی تبصرہ کیا جو میں پہلے ہی اپنے آپ سے کر چکا تھا کہ کہاں تو یہاں آتے ہی ہر جگہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ رہا تھا اور اب جیسے تقدیر چھپر پھاڑے ہماری کامیابی کی راہیں آسان کیے آن کھڑی ہوئی تھی، وغیرہ۔

''اسے ہمتِ مرداں اور مددِ خدا، کہتے ہیں رومی ڈیئر!'' میں بھی گویا ترنگ میں آ گیا اور رومی ایک دلکش سی نگاہ میرے چہرے پر ڈالتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

''تمہارا مجھے ڈیئر کہنا اچھا لگا۔''

''اچھی بات ہے۔'' میں نے کہا اور آگے بڑھنے کا اشارہ کر دیا۔

بڑا پُرسکون ماحول اور تھمی تھمی سی فضا تھی یہاں کی..... جیسا کہ اس طرح کے پوش علاقوں کا خاصہ ہوتی ہے۔

اِکا دُکا ہی لوگ نظر آئے، وہ بھی ملازمین ٹائپ کے..... ہم دونوں گلی میں داخل ہوئے تو تین محل نما وسیع و عریض کوٹھیاں چھوڑ کر ہمیں وہ گرے کلر کی انٹرکولر کھڑی نظر آ گئی۔

علاقہ ایسا تھا کہ ہم اس طرح دبکے کھڑے نہیں رہ سکتے تھے، کسی کی نظر پڑ جاتی تو وہ..... ہماری جانب سے شک میں پڑ سکتا تھا۔ ہم آگے بڑھے۔

انداز ایسا ہی تھا جیسے کسی مطلوبہ گھر کی تلاش ہو۔ پھر جب واقعی ''مطلوبہ'' گھر کے گیٹ کے سامنے سے گزرے تو اس کی..... پیشانی پر درج ''ناگ وِلا'' دیکھ کر میرے منہ سے بے اختیار ایک گہری سانس خارج ہو گئی۔

ہم اسی وقت وہاں سے پلٹے، دوسرے گیٹ سے

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

باہر آ گئے۔ ٹیکسی لی اور ایک آدھ گھنٹے بعد اپنے ہوٹل کے روم میں تھے۔

☆☆☆

”بہت بہت مبارک باد......! تم لوگ تو ایک دم فرسٹ کلاس جا رہے ہو، دل چاہتا ہے میں بھی وہاں آ جاؤں اور ایک ساتھ مل کر پہلے امرناگ جیسے شیطان کی گردن دبوچ لوں......“

رومی کے طارق سے ”لیپ ٹاپ“ رابطے پر اب تک کی ساری کتھا سننے کے بعد طارق نے بڑے توصیفی انداز میں ہم سے یہ کہا تھا اور میں اور رومی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے تھے۔

”تو آ جاؤ تم بھی...... کس نے روکا ہے تمہیں......؟“ رومی بولی۔

”آ جاؤں گا، وعدہ رہا جیسے ہی یہاں کے رہے سہے اور باقی ماندہ معاملات تسلی بخش انداز میں نمٹ جائیں، میں فوراً آ جاؤں گا۔“ وہ بولا۔

”وہاں کے کیا حالات ہیں؟ گوہر شاہ کا کچھ پتا چلا، سہراب مجوٹے کا کیا بنا؟“ میں نے پوچھا۔ وہ بولا۔

”گوہر شاہ کو شاید سہراب مجوٹے نے ہی کسی باہر کے ملک فرار کروا دیا ہے، بے فکر رہو، اب اس کے لیے کہیں بھی جائے اماں نہیں رہی ہے، وہ ایک بین الاقوامی اشتہاری مجرم قرار پا چکا ہے۔“

طارق کا خیال تھا کہ مجھے خوشی ہو گی لیکن میں مایوس ہوا تھا، اسی لہجے میں بولا۔

”اس سے کیا فرق پڑا، وہ تو اب نجانے کون سے سر سبز ملک میں کسی عالیشان رہائش گاہ پر آرام سے بیٹھا ہو گا۔“

”میں تمہاری بات سمجھ گیا۔“ طارق بولا۔ ”فکر مت کرو، میری ذاتی کوششیں جاری ہیں...... پھل سائیں اور محترمہ ڈالی کی مدد میرے ساتھ ہے، وہ مردود کہیں بھی گیا ہو، انٹرپول کو اس کے پیچھے لگا دیں گے۔ اس پر بہت حساس اور خطرناک چارج لگا دیا گیا ہے۔ ایسے خطرناک اور اشتہاری مجرم کو کوئی ملک اپنی سرزمین پر برداشت نہیں کر سکتا۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ رومی نے دعائیہ لہجے میں بولی۔

”اس مردود کے خاص آدمی تاج کا کیا بنا......؟ میں تو اُسے جہنم واصل کرنے کی حسرت ہی کرتا رہ گیا۔“ میں

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ ستمبر 2020ء کی جھلکیاں

ارض، فرض، قرض
ایک جری جواں کی داستان

ترانے کا سفر
ملی نغموں پر ایک پُر مغز تحریر

قیدی شہنشاہ
مغلیہ سلطنت کی بے بسی کا بیان

ایک تھی حسینہ
ایک معصوم سی مظلوم دوشیزہ کی سچ بیانی

اس کے علاوہ

دلچسپ سفر کہانی ”سفر پہلا پہلا“
فلم نگری کی روداد ”کراچی سینما“
اور بھی بہت سی سچ بیانیاں، سچے واقعات، دلچسپ روداد، ایسی تحریریں جو سرگزشت کا خاصہ ہیں۔

ہر صاحبِ علم کے لیے تحفہ، سرگزشت کا ہر شمارہ خاص شمارہ

Nosar Azeem www.pakistanipoint.com

نے طارق سے کہا۔

''تمہاری اس خواہش کو پورا کرنے کا بیڑا پھل سائیں اور میں نے اُٹھا رکھا ہے۔ بہت جلد تم اس کی کتے جیسی موت کی خبر سنو گے۔''

اس کے بعد مزید اگلے مشن کے لیے ہمارے بیچ اسی مخصوص کوڈ ورڈز میں گفتگو ہونے لگی جو میں نے طے کر رکھا تھا۔

''بالکل ٹھیک سمت جا رہے ہو دوستو! میری شُبھ کامنائیں تم دونوں کے ساتھ ہیں......'' آخر میں طارق نے ہم سے کہا تھا۔ وہ بھی میری اس بات سے متفق تھا کہ جب راہیں آسان ہو ہی رہی ہیں تو کھیر کو ٹھنڈا کر کے کھایا جائے۔

تھوڑی دیر بعد ہم نے لنچ کیا اور ذرا کمر سیدھی کی......میری طرح رومی کو بھی جوش چڑھا ہوا تھا کہ کم از کم سرجن امرناگ اور ڈاکٹر رمیش اگروال کو تو نرغے میں لایا جائے۔ اس کے لیے رومی نے آفیشل پیپر ورک پر کام شروع کر دیا تھا۔ وہ ان دونوں کے گرد قانونی پھندا تیار کرنا چاہتی تھی۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا، میری پہنچ اور تھی اور رومی کی اور......جبکہ طارق، ہم دونوں سے متفق تھا۔

خود میں بھی کوئی بڑا ''بگ باس'' یا گینگسٹر ٹائپ کی چیز نہیں تھا کہ اِدھر گن اُٹھائی اور اُدھر دھنا دھن بھائی کے قاتلوں کو خون میں نہلاتا چلا گیا۔ اسی لیے فی الحال مجھے بھی رومی کی انڈر لائن میں رہنا تھا جب تک کہ میں یہ نہ سمجھتا قاتل کسی رعایت یا کمزوری کا فائدہ اُٹھانے کی راہ پر ہوں۔

اپنے طور پر میں نے بھی انہیں ایک ذرا سا موقع ملنے پر بھی زندہ نہ چھوڑنے کی قسم اُٹھا رکھی تھی اور ایسے میں رومی کی بھی میں پروا نہ کرتا۔

دیکھا جاتا تو اللہ نے مجھے ایک بڑی کامیابی عطا کی تھی۔ اس کے لیے میری اور میرے ساتھیوں کی جدوجہد بھی کم نہ تھی۔ اس بات کی تسلی ہو جانے کے بعد کہ سرجن امرناگ اب تک اِدھر ہی تھا، جس نے میرے معصوم بھائی عادل کے اعضا نکالے تھے، اس کا ساتھی ڈاکٹر رمیش اگروال کو بھی اِدھر ہی ہونا چاہیے تھا۔ ان دونوں قصائیوں نے کس کے ایما پر یہ سب کیا تھا، اس کا بھی انہی دونوں خنزیروں سے ہی پتا چل سکتا تھا، سوچنا یہ تھا کہ آخر میرے بھائی کو کیوں کر نشانہ بنایا گیا تھا؟ کیا یہ کسی دشمنی کا شاخسانہ تھا یا پھر......ان خونی سوداگروں کا یہ کاروباری فعل تھا۔

دشمنی میری یہاں کسی سے نہیں تھی، ڈاکٹر رمیش کے بارے میں ابتدا میں بتا ہی چکا ہوں کہ اس کے ساتھ میری قومیت، ملکی اور مذہبی لحاظ سے منہ ماری ہو جایا کرتی تھی۔

رنبیر نے بھی مجھے اس کے بارے میں بتایا تھا کہ رمیش ایک نمبر کا متعصب، بغضی اور......منتقم مزاج آدمی تھا۔ ایک ذرا بال برابر بھی کوئی اسے چھیڑ دیتا تو یہ اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا ڈالتا تھا اور جب تک بدلہ نہیں لے لیتا، چین سے نہیں بیٹھتا تھا۔

مجھ سے بھی اس نے بڑا زہریلے قسم کا بیر رکھا ہوا تھا۔ کبھی اس نے سیدھے منہ مجھ سے بات کرنا تو درکنار دیکھتے ہی نفرت انگیزی پر مائل ہو جاتا تھا، یوں جیسے اس کا بس چلے تو مجھے......اسی وقت دبوچ لے۔ کچھ ایسے ہی خوفناک تاثرات اس کی آنکھوں اور چہرے سے مترشح ہونے لگتے تھے جب کبھی میرا اور اس کا ذرا سا بھی سامنا ہو جاتا تھا۔

یوں ڈاکٹر رمیش اگروال میری نظروں میں ایسا قبیح انسان تھا جس سے میں روئے زمین پر سب سے زیادہ نفرت کرتا ہوں۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اسی سے نفرت کرتا ہوں۔ رمیش اگروال ایک انڈین ہندو تھا......سرتاپا تعصب اور پاکستان دشمنی میں لتھڑا ہوا۔ وہ یہاں سرجن تھا مجھے یاد تھا، ایک دن اسپتال کے اسٹاف لاؤنج میں پاکستان اور انڈیا کا میچ دیکھتے ہوئے اس نے جس قسم کے خیالات کا اظہار کیا تھا اس پر خود انڈین بھی حیران ہوئے تھے کیونکہ وہاں خاصے پاکستانی بھی تھے۔ اس پر جھگڑا لازمی تھا۔ کچھ سمجھدار لوگوں نے معاملہ رفع دفع کیا لیکن پاکستانی احتجاجاً وہاں سے اٹھ گئے تھے۔ بدقسمتی سے ہماری ٹیم میچ ہار گئی۔ اس پر رمیش کو مزید بکواس کرنے کا موقع ملا۔ اس نے کہا کہ جس طرح ہماری ٹیم نے پاکستانی ٹیم کو ختم کر دیا ہے اسی طرح ایک دن انڈیا پاکستان کو ختم کر دے گا۔ اس دن کے بعد سے میرا اس سے سامنا ہوتا تو میں اس کے منحوس چہرے کی طرف دیکھتا بھی نہیں تھا۔ خوش قسمتی سے جاب کے دوران بھی اس سے واسطہ نہیں پڑتا تھا۔

یہ خبیث یعنی رمیش اگروال کسی قدر صاف رنگت اور سیاہ بالوں اور داڑھی والا شخص تھا۔ نقوش اچھے تھے مگر ان میں ایک نوع کا مکروہ پن تھا یقیناً اس کی باطن کی خباثت چھلک کر اوپر آتی تھی۔ مگر اس وقت مجھے اس کی طرف دیکھنا پڑا تھا کیونکہ اس کے سیاہ بال اور داڑھی گولڈن براؤن ہو رہی تھی۔ یقیناً اس نے بہت سلیقے سے ہائڈروجن پر

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

آکسائیڈ استعمال کیا تھا۔ رنگ بالکل نیچرل لگ رہا تھا۔ وہ نابکار ہمیشہ مجھے عجیب اور استہزائیہ نظروں سے دیکھا کرتا تھا، جس میں میرے لیے اور میرے پاکستان سے تعلق کی بنا پر نفرت، تعصب اور بغض صاف نظر آتا تھا۔

اسی لیے دشمنی کے تناظر میں اگر یہ بات دیکھی جاتی تو میرا پہلا یقین کی حد تک شُبہ اسی انڈین ڈاکٹر رمیش اگروال کی طرف جاتا تھا۔ اگر ایسا تھا تو میں نے بھی عادل کی قبر کی مٹی اُٹھا کر قسم کھا رکھی تھی، اس کے قاتلوں کو عبرت کا نشان بنادوں گا۔

رومی نے مجھ سے کہا کہ..... مجھے ریحانہ کے ساتھ راہ و رسم کو ذرا آگے بڑھاتے ہوئے امرناگ اور رمیش کے بارے میں معلومات لینے کے بارے میں کوشش کرنی چاہیے۔ یہی میں بھی کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے لیے پہلے مجھے ایک محفوظ گراؤنڈ بنانے کی ضرورت تھی، حل ایک ہی تھا اس کا کہ میں ریحانہ کو اعتماد میں لے کر اسے اپنی اور دوسری ساری حقیقت بتا دوں۔ مجھے اس کے چہرے کے بدلے ہوئے تاثرات بھی بھولے نہیں تھے، ایک کھٹک مجھے بھی اس کی طرف سے تھی۔

اگلے دن میں نے ریحانہ کے نمبر پر اس لئے بات کی۔ میری کوشش یہی تھی کہ اسے ایسے وقت میں کال کروں جب وہ بزی نہ ہو۔ خوش قسمتی سے اس نے کال ریسیو کر لی۔ اس بار اپنے لائحہ عمل کے مطابق میں نے اس سے اپنے اصل یعنی ڈاکٹر سیف والے لہجے میں بات کی تھی، ممکن تھا کہ وہ..... بھولی ہوئی ہو۔ تاہم اب میں اسے اپنی حقیقت بتانے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔

''سوری مس ریحانہ! میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔'' میں نے سلام دعا کے بعد اس سے کہا ساتھ ہی اپنا نام بھی بتایا اور کل کی ملاقات کا بھی ذکر کیا۔

''کوئی بات نہیں، بولیں، کیا بات ہے؟'' اس نے خوش اخلاقی سے کہا۔ وہ اب بھی میری آواز نہ پہچان پائی، حتیٰ کہ کل والا لہجہ بھی نہ بھانپ پائی تھی۔ فون پر یوں بھی آواز اور لہجے میں تھوڑی ردّوبدل ہو جاتی ہے۔

''وہ..... اگر آپ بُرا نہ منائیں تو میں آپ سے کہیں ملاقات کر سکتا ہوں؟'' میں نے کہا۔ ''میرا مطلب ہے اسپتال سے باہر کہیں، جہاں آپ کہیں۔'' دوسری جانب لمحہ بھر کو پُرسوچ سی خاموشی طاری رہی پھر اس کی مدھم سی آواز آئی۔

''میرے خیال میں تو میں نے آپ کا کل ہی مسئلہ حل کر دیا تھا تو پھر اب دوبارہ اس طرح کی ملاقات کیا معنی رکھتی ہے؟'' مجھے اس کے لہجے میں تھوڑی تلخی کی جھلک محسوس ہوئی۔

''آپ کی بات بجا ہے، وہ دراصل مجھے..... آپ سے اس کے علاوہ بھی ایک ضروری بات کرنا تھی..... جو میں کرنا چاہتا تھا مگر وہاں اسپتال میں نہیں کر پایا تھا۔''

''دیکھیے نعمان صاحب!'' اس کی پھر دوسری جانب سے کھنڈی ہوئی سنجیدگی لیے تلخ سی آواز اُبھری۔ ''آپ نے مزید جو بات کہنی ہے وہ کہہ دیں، ورنہ میں فون بند کر دوں گی۔''

صورتِ حال بگڑ گئی تھی، لہٰذا اب میرا خاموش رہنا مناسب نہ تھا۔ کہیں وہ کال ہی نہ کاٹ دے۔

''ریحانہ! یہ میں ہی ہوں..... ڈاکٹر سیف.....! میں ایک مشکل میں ہوں، پلیز مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔'' یہ سنتے ہی دوسری جانب سے یکلخت سی خاموشی طاری ہوگئی پھر اس کی متحیّرانہ آواز اُبھری۔

''اوہ..... ڈاکٹر سیف! یہ تم ہو.....؟ لیکن..... پھر یہ بھیس.....''

''ایک مجبوری تھی۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''شکر ہے تم نے مجھے پہچانا۔ پلیز، اب مجھے بتاؤ ملاقات ہو سکتی ہے؟''

''ضرور، کیوں نہیں.....''

''تمہارے اپارٹمنٹ کا پتا تو وہی ہے؟''

''ہاں! معلوم ہے تمہیں، یاد دوبارہ میں.....''

''نہیں، وقت دو میں پہنچ جاؤں گا۔'' میں نے کہا۔ اس نے کچھ سوچ کر وقت دیا اور میں نے اسے اس بات کو راز میں رکھنے کی تاکید کر کے رابطہ منقطع کر دیا۔

اگلے دن میں اور رومی اپنی اصل صورتوں کے ساتھ ہوٹل سے نکلے اور سیدھا بلیوارڈ اسٹریٹ نائن کا رخ کیا جدھر ریحانہ کا اپارٹمنٹ تھا۔

وہ اپارٹمنٹ میں ہی تھی اور اکیلی تھی۔ اس کی دو ساتھی روم میٹ جنہوں نے مل کر ''پرہیڈ'' کرائے پر لیا تھا وہ کام پر گئی ہوئی تھیں۔ کیونکہ ریحانہ اکیلے دو کمروں کا یہ اپارٹمنٹ کرائے پر لینے کی سکت نہیں رکھتی تھی۔

اس نے مجھے اصل روپ میں دیکھتے ہی پہچان لیا البتہ رومی کی طرف وہ سوالیہ نگاہوں سے تکنے لگی تو میں نے اس سے رومی کا تعارف بھی کروا دیا۔

اس نے کافی بنائی اور ہم لاؤنج میں بیٹھ گئے۔ وہ

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

میری طرف حیرت بھری نگاہوں سے تکے جارہی تھی۔

''تم کسی مشکل میں ہو سیف؟'' ریحانہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بہت بڑی مشکل میں ہوں......'' میں نے کہا اور پھر اُسے ساری حقیقت بتادی۔ سرجن امرناگ، ڈاکٹر رمیش اگروال سے لے کر اس کے ساتھ میرا اس روز ہونے والا لفٹ میں سامنا اور پھر اس کی رہائش گاہ تک تعاقب کے بارے میں بھی بتا دیا۔ یہ بھی کہ میں یہاں سے واپس پاکستان گیا تو کیوں نہیں لوٹا تھا وغیرہ۔ میں نے اسے یہ بھی بتا ڈالا تھا کہ...... میرے بھائی عادل کے ساتھ بھی انہی خونی سوداگروں نے وہ خوف ناک کھیل کھیلا تھا جو یہ لوگ دیگر لوگوں کے ساتھ کھیلتے آرہے ہیں اور اس کی منصوبہ بندی اِدھر ہی اور ڈاکٹر رمیش اگروال کے ساتھ کسی دشمنی کی وجہ سے ہوئی ہے۔''

میں نے دیکھا یہ سب سن کر وہ دنگ رہ گئی، بلکہ اس کے چہرے پر ایک دم...... دبے دبے خوف کے آثار طاری ہوگئے مگر اس میں مجھے ایک جوش کی سی کیفیت کا بھی شائبہ محسوس ہوا تھا۔

''مجھے خود بھی ان دونوں پر یہی شبہ ہے۔'' بالآخر ریحانہ نے میرے سامنے ایک غیر متوقع سا انکشاف کیا۔

''کیا مطلب؟ کیسے شبہ ہوا تمہیں ان پر......؟'' میں نے پوچھ لیا۔ وہ کچھ سوچنے کے انداز میں جواباً بولی اور پھر بتانے لگی۔

''تمہارے جانے کے بعد ہم سب ہی تمہارے بارے میں سوچتے تھے۔ تمہارا ہم سب کے ساتھ رویہ ایسا ہی تھا کہ تمہارے جانے کے بعد ایک اچھے ساتھی کی یاد آتی رہی۔ ایک خاص وجہ تذکرے کی، تمہاری نامعلوم دشمنی کے حوالے سے بھی رہی تھی۔ پولیس اور ہمارے خیال کے مطابق احسان اللہ اور رنبیر سنگھ والے واقعے کے بعد ہمیں بھی یہی محسوس ہونے لگا تھا کہ کوئی یہاں تمہاری جان کا دشمن بنا ہوا ہے۔''

''تم مجھے اپنے شبہے کے بارے میں بتا رہی تھیں۔'' میں نے اسے یاد دلایا اور آگے بولا۔ ''مجھے یہ بتاؤ پہلے کہ اسپتال میں، یہ شبہ صرف تمہیں ہی ہوا ہے یا اور بھی کسی کو ہے؟''

''درحقیقت شبہ مجھے نہیں کسی اور کو ہوا ہے۔'' اس نے جیسے جواب میں ایک اور انکشاف کر ڈالا۔

''کسے؟'' میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

''زوہرہ یہ نام ہے اس لڑکی کا......''

''یہ کون ہے؟'' میری سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر گڑی رہیں۔

''تمہیں ایک مریض یاد ہے، لبنانی مریض حمید فارابی......'' اس نے کہا اور میں چونکا۔ عام مریض بھلا مجھے کہاں یاد رہتے ہوں گے۔ لیکن اسے یاد کرنے کی وجہ بڑی اہم اور سنگین تھی۔ اس لیے کہ اسے میرے ہی ڈیوٹی ٹائم میں کسی نے زہر کا ٹیکا لگا کر ہلاک کیا تھا جو بعد میں پولیس تفتیش کے مطابق قاتل تھا، مجھے اس میں پھنسانے کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ جگر کی سرجری کرانے آیا تھا۔ لبنان میں اس کے زیتون کے باغات تھے۔ دولت مند ہونے کی وجہ سے وہ یہاں اپنے علاج کی غرض سے آیا تھا۔

''وہی جسے زہر کا انجکشن......''

''ہاں...... ہاں، یاد ہے مجھے آگے کہو......'' میں نے وقت بچانے کے لیے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ وہ آگے بولی۔

''تب پھر شاید تمہیں وہ مریض بھی یاد آجائے جو انہی دنوں اسپتال میں داخل ہوا تھا اور وہ ہارٹ پیشنٹ تھا، یعقوب ترمذی......'' میں نے اس مریض کو یاد کرنے کی کوشش چاہی مگر نہ کرسکا۔ میں نے سوچنے والے انداز میں ہونٹ بھینچ کر نفی میں سر ہلا دیا۔

''اس کے ہمراہ ایک جوان اور خوب صورت سی مقامی لڑکی بھی تھی...... بڑی بڑی ہرنی آنکھوں والی......''

وہ اس پری جمال کا نقشہ کھینچنے لگی۔ تب میں چونکا اور میرے ذہن کی اسکرین روشن ہوتی چلی گئی۔ یعقوب ترمذی کو یاد کرنے کی کچھ ''رنگین'' سی وجہ وہ غزال چشم اور حسین، مثل اپسرا...... لڑکی تھی۔ پہلی بار میں نے اسے مذکورہ مریض کے ساتھ اس کی اٹینڈنٹس کے طور پر دیکھا تھا، اس وقت...... یعقوب ایک وہیل چیئر پر تھا۔ اسے یاد کرتے ہی اس دن کا وہ سارا منظر میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔

مریض...... کی عمر زیادہ نہیں تھی، مشکل سے پچاس برس کا ہوگا لیکن اس وقت اس کے چہرے سے ایسی نقاہت ٹپک رہی تھی جیسے برسوں کا مریض ہو۔ دو افراد اس کے ساتھ تھے ایک اس کی وہیل چیئر سنبھالے ہوئے تھا اور دوسرا ایک ٹرالی سنبھالے ہوئے تھا جس پر کچھ مخصوص آلات رکھے تھے اور اس ٹرالی کے ساتھ ہی ایک اسٹینڈ پر ڈرپ لگی تھی۔ مشین سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ ہارٹ کا مریض تھا اور یہ مشین اس کے دل کے مسلز کو کرنٹ دے کر

چلانے میں مدد دے رہی تھی۔ یہ ایک طرح سے بیرونی پیس میکر تھا۔ مجھے مریض کے خدوخال جانے پہچانے لگنے لگے تھے۔

اس کے اٹینڈنٹس کے بعد ایک لڑکی باہر آئی۔ یہ وہی غزال چشم لڑکی تھی جس سے مجھے یہ مریض یاد رہ گیا تھا...... جس نے مقامی طرز کا لیکن جدید لباس پہن رکھا تھا، یہ میکسی نما لباس تھا جو کسی بہت قیمتی اور ڈھلک جانے والے کپڑے کا بنا تھا۔ وہ اس کے جسم کے تناسب کے ساتھ ڈھلک رہا تھا۔ اس کے لائٹ براؤن بال شانے پر بکھرے ہوئے تھے۔ باہر آکر اس نے سر کی خفیف جنبش سے بال چہرے سے ہٹائے اور میری طرف دیکھا تو میں سحر زدہ رہ گیا تھا۔ شفاف بلوری آنکھوں میں جیسے کوئی فسوں تھا۔ نازک سی ستواں ناک اور اس کے نیچے پنکھڑی سے لب تھے اطراف میں بہت صاف اور ہموار گلابی رخسار تھے جن پر پلکیں سایہ فگن تھیں۔ اس کے کانوں میں چھوٹے ٹاپس تھے جن میں زمرد جڑے تھے اور ایسے ہی زمرد کا ایک قیمتی ہار اس کے گلے میں تھا۔ کلائی میں شاید پلاٹینیم کا بریسلیٹ تھا۔ اس نے لباس سے میچ کرتا میرون لیدر کا چھوٹا سا ہینڈ بیگ تھام رکھا تھا۔ ایک لمحے کو مجھے دیکھ کر وہ مڑی تو اس کا نازک بدن شاخِ گل کی طرح لچک گیا تھا۔

ہمم...... تو گویا زوہریہ یہی لڑکی تھی۔

''مجھے یاد آگیا، آگے کہو......'' میں نے جلدی سے کہا۔

''زوہریہ کا وہ باپ تھا۔'' وہ بتانے لگی۔ ''چونکہ میں ہی اس مریض کو زیادہ اٹینڈ کر رہی تھی اسی لیے میری زوہریہ سے بھی دوستی ہوگئی تھی، تاہم دوستی کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے پاس میں نے ابنِ صفی اور اگاتھا کرسٹی کے چند ناول پڑے دیکھے، وہ جاسوسی کہانیوں کی شیدائی تھی حالانکہ خود میں رومانی کہانیاں پڑھنے کی شوقین تھی، مگر اس کے اصرار پر میں.... دو ایک یہ جاسوسی ناول لے لیا کرتی تھی پڑھنے کے لیے......'' وہ ایک لمحے کے لیے رُکی پھر آگے بولی۔

''زوہریہ نے بتایا تھا، چونکہ ان دونوں مریضوں کے روم ساتھ ساتھ تھے۔ اسی لیے زوہریہ کی لامحالہ توجہ دوسرے روم والے مریض پر بھی رہتی تھی۔ خود میں بھی دونوں ہی مریضوں کو ایک ساتھ بھگتاتی تھی۔ میں نے ہی سے بتایا تھا کہ ساتھ والے لبنانی مریض حمیر کا ہوسکتا ہے بون ٹرانسپلانٹ کیا جائے۔ وہ متحیر ہوئی تھی کہ میڈیکل سائنس میں یہ بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنے تجسس کی خاطر میرے ساتھ ہی حمیر کے کمرے میں اس مریض سے ملتی تھی، وہ اسے بیٹی کہنے لگا تھا۔ وہ اس کے ساتھ بھی گھل مل گئی۔ لہٰذا میری غیر موجودگی میں وہ اس کا بھی خیال رکھتی تھی۔ یا یونہی کبھی کبھار چلی جاتی تھی، کیونکہ فارابی کا ایک ہی اٹینڈنٹ تھا جو دور کا رشتے دار تھا اور ادھر ہی کہیں رہتا تھا مگر کم ہی آتا تھا۔

ایک دن...... رات کے وقت جب زوہریہ اپنے باپ والے کمرے میں سو رہی تھی کہ اچانک اس کی آنکھ کھلی۔ اسے باہر کوئی کھٹکا سا محسوس ہوا تھا، وہ تجسس پسند تو تھی ہی اُٹھ کر اس نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور جھری بنا کر باہر جھانکا تو اسے فارابی کے کمرے کے سامنے دو سائے آپس میں دھیمے مگر خاصے تیز سے لہجے میں باتیں کرتے دکھائی دیے۔ زوہریہ اسی طرح جھری بنائے کان لگائے ان کی باتیں سننے لگی۔ ان دونوں کا انداز ہی کچھ ایسا تھا کہ وہ ایسا کرنے پر مجبور ہوگئی تھی۔

اس نے سنا ایک سایہ دوسرے سے کہہ رہا تھا۔

''اوہ...... کیا اسی مریض کو تختہ مشق بنانا ہے؟ لیکن اس کی تو ٹرانسپلانٹیشن ہونی ہے۔ بہت پیسے والا ہے۔ اسپتال کو خاصی رقم ملنے کی اُمید ہے اس مریض سے...... سوچ لو ڈاکٹر صاحب!''

زوہریہ ''ڈاکٹر صاحب'' کے ذکر پر تھوڑا چونکی تھی۔ وہ اب سننے کے ساتھ غور سے ان کی صورتیں بھی دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''بے وقوف......! بھاڑ میں جائے یہ سب...... تم وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔ سنا تم نے...... کل ہی یہ کام نمٹا دو......''

پھر وہ دونوں جدا ہوگئے۔ دونوں ہی اُسے مشکوک لگے۔ ایسے ہی وقت میں زوہریہ نے ان دونوں کے چہروں کو دیکھ لیا جو اس کے لیے ظاہر ہے ابھی اجنبی ہی تھے، لیکن مخصوص یونیفارم میں تھے اسی لیے زوہریہ کھٹکی کہ کہیں یہاں اسپتال میں کسی قسم کی کوئی گڑبڑ تو نہیں ہورہی ہے۔

اگلے دن جب میں اس کے کمرے میں آئی تو اس نے یہی باتیں مجھے بتادیں۔ اچنبھا تو مجھے بھی ہوا، تاہم میں اپنے کام سے کام رکھنے والی ہوں اور ویسے بھی مجھے اس میں کوئی ایسی بات واضح طور پر محسوس نہیں ہورہی تھی کہ کیا خطرے والی بات تھی لیکن...... زوہریہ کا پُرزور اصرار یہی تھا کہ...... یہاں اسپتال میں اسٹاف کے ہی دو افراد

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

مشکوک ہیں اور خفیہ طور پر کچھ گڑبڑ پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تب میں اس سے مجبور ہو کر بولی کہ وہ کسی بہانے میرے ساتھ آئے، وہ تیار ہوگئی، میں..... بہانے سے زوہریہ کو لے کر ٹرانسپلانٹ سرجری کے فلور پر... گئی، کیونکہ دونوں کی مشکوک سرگوشیوں سے یہی اندازہ ہوا تھا مجھے کہ ان کا تعلق کس شعبے کے وارڈ سے ہوسکتا ہے اور پھر اچانک ہی ڈاکٹر رمیش اگروال کو پہچان گئی، ساتھ ہی اس کا ایک سرجیکل ٹیکنیشن تھا...... سومیت کمار...... وہ بھی اس کی طرح انڈین تھا۔''

''ایک منٹ......'' میں نے چونک کر اسے روکا......

ریحانہ خاموش ہوگئی۔ ڈاکٹر رمیش اگروال کے نام سے تو میں چونکا ہی تھا مگر، سومیت کمار میرے لیے نیا نام تھا پھر میں نے اسے یاد کرنے کی کوشش کی تھی مگر نہیں آسکا، ممکن تھا کہ میں اسے 'بائی فیس' پہچان لیتا، کیونکہ کئی ایک میڈیکل اور سرجیکل ٹیکنیشنز نے مجھے بھی ''اسسٹ'' کیا تھا۔

''ہاں! اب آگے بتاؤ'' میں نے ریحانہ سے کہا۔

رومی اور میں اس کی جانب دیکھنے لگے۔ وہ بولی۔

''مجھے بھی ان سارے معاملات میں کوئی پُراسراری گڑبڑ نظر آنے لگی۔ ڈر بھی لگ رہا تھا، یہ بھی ذہن میں خیال آتا کہ کہیں درمیان میں کوئی غلط فہمی تو نہیں پنپ رہی ہے؟ میں تو رومانی ناولز پڑھنے کی شوقین تھی مگر زوہریہ فارابی جاسوسی ناولوں کی شیدائی تھی اسی لیے اس کے اندر یہ کھٹک پیدا ہوچکی تھی، اسپتال میں درونِ خانہ کوئی گڑبڑ ضرور ہو رہی ہے اور اس کا تعلق اسپتال کے عملے بالخصوص...... چند ایک ڈاکٹرز سے ہی تھا۔

انہی دنوں فارابی کا انتقال ہوگیا۔ اس کا الزام تم پر آیا، پولیس تفتیش کے لیے تمہارے پاس آئی تھی، پھر ڈاکٹر سائمن کی وجہ سے تم بچ گئے تھے، خوش قسمتی سے، ورنہ لمبی چوڑی تفتیش میں ہی نہیں بلکہ نجانے کتنی قانونی پیچیدگیوں میں تم پھنس جاتے، خیر، اس کے بعد یہی...... چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ یہاں تمہارا کوئی دشمن ہے۔ زوہریہ کو بھی تمہارا علم ہوا تو اس نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ ڈاکٹر رمیش اگروال اور اس کے ٹیکنیشن سومیت کمار کا نام پولیس والوں کو بتا دے گی، افسوس کہ میں نے ہی اسے منع کر دیا کہ بغیر کسی ثبوت کے وہ اتنا بڑا الزام لگانے کی کوشش نہ کرے، جبکہ اس کا اپنا باپ یعقوب ترمذی بھی یہاں ایڈمٹ تھا۔

القصہ مختصر وہ ... خاموش تو ہوگئی اور اس نے پھر کبھی مجھ سے اس موضوع پر بات نہیں کی اور میں بھی یہی سمجھی اب یہ ''سمجھداری'' کا مظاہرہ کر رہی ہے، لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی، وہ درونِ خانہ خود ہی ان دونوں کی جاسوسی میں لگی ہوئی تھی اور ایک دن میں نے دیکھا کہ وہ خاصی پُرجوش نظر آرہی تھی، بالآخر اس نے مجھ پر یہ دل دہلا دینے والا انکشاف کر ہی ڈالا کہ اسپتال کے چند لوگ انسانی اعضا کی غیر قانونی ٹرانسپلانٹیشن میں مصروف ہیں اور...... کہ عادل نامی لڑکے کے اعضا کا بھی ذکر ہو رہا تھا اور اس کے ساتھ ڈاکٹر سیف کا بھی کہ یہ اسی کا بھائی ہے، وغیرہ۔''

وہ اتنا بتا کر ذرا تھمی تو میرا دل اپنے بھائی کے ذکر پر چونک پڑا، دل بوجھل بھی ہوا مگر جوش بھرے ارتعاش نے مجھے مسرتوں سے بھی دوچار کر دیا کہ بالآخر میں اپنے معصوم بھائی کے سفاک قاتلوں تک پہنچ گیا تھا۔ میں اور بے چین ہوگیا اور ریحانہ سے آگے بتانے کا اظہار کیا تو اس نے آخر میں یہی بتایا کہ تب تک میں جا چکا تھا اور...... زوہریہ کے باپ کو بھی اسپتال سے ڈسچارج کیا جا چکا تھا۔

مگر زوہریہ نے جاتے وقت مجھ سے اتنا ضرور کہا تھا کہ ظلم اور جرم دیکھنے کے باوجود جو انسان خاموش رہے، وہ انسانیت کا قاتل ہوتا ہے۔ وہ خود بھی ظالم ہوتا ہے، اسی لیے مجھے اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھانا چاہیے، وہ چلی گئی، لیکن میرے ضمیر کو بری طرح جھنجوڑ گئی اور میں ہر وقت اسی فکر میں گھلنے لگی کہ میری خاموشی میرا جرم نہ بن جائے۔ وہ بہانے بہانے سے بعد میں یہاں آتی رہی اور مجھے کچھ کرنے پر اکساتی رہی، یہاں تک کہ میرے ساتھ راہ و رسم بڑھاتی رہی، مقصد اس پاگل سی لڑکی کا ایک ہی تھا کہ...... کسی طرح...... اس راز کو... ٹھوس شواہد کے ساتھ آشکارا کیا جائے، اسی دوران نجانے اس نے ایک دن جوش میں آکر کیا کر ڈالا تھا کہ ڈاکٹر رمیش کو اس پر شبہ ہوگیا اور اس نے ایک دن مجھ سے اس کے بارے میں سختی سے باز پُرس کرنا چاہی تھی اور اسے یہاں آنے سے منع بھی کر دیا، مگر بات پھر بھی نہیں دبی اور...... رمیش آج بھی مجھ سے بڑے معاندانہ رویّے سے پیش آتا ہے۔ میں اس سے خوف زدہ رہنے لگی ہوں، خیر...... ایسے میں تم آگئے تو سیف......! خدارا کچھ کرو، میں تو مجبور ہوں...... لیکن تم اور زوہریہ مجبور نہیں، وہ اب بھی کچھ کرنا چاہتی ہے اور باقی کی تفصیل بھی تم اسی سے پوچھ سکتے ہو۔ اسے یقیناً اور بھی بہت کچھ معلوم ہے جو تمہارے لیے مفید ثابت ہو۔''

''مجھے اس کا پتا بتاؤ'' میں نے جلدی سے کہا۔

Nadar Azeem www.pakistanipoint.com

ی طرح رومی بھی خاصی پُرجوش نظر آرہی تھی۔ تقدیر بھی ہمارا ساتھ دے رہی تھی۔ ریحانہ نے اس کا پتا ا دیا اور اس کا کونٹیکٹ نمبر بھی مجھے دے دیا۔

میں اسے کال کرنے لگا تو ریحانہ نے مجھے روک دیا اور بولی۔ ''ٹھہرو، پہلے میں اسے اعتماد میں لے کر تمہارے ے میں بتاتی ہوں، تاکہ ذہنی طور پر وہ تم سے بات نے پر آمادہ ہوجائے، معاملہ حساس ہے اسی لیے یہ کرنا ضروری ہے۔''

مجھے اس کی بات مناسب لگی۔ میں اور رومی اس ے پاس ٹھہرے رہے، اس کے بعد اس نے دو گھنٹے بعد ال کی اور رابطہ ہوتے ہی اس نے اسے میرے بارے ں بتانا شروع کردیا۔ اندازہ ہوا کہ زوہریہ بھی..... اس ت پر حیران اور خوش ہوگئی تھی۔ یہی نہیں اس نے یحانہ سے مجھ سے اسی وقت بات کرنے کی بھی خواہش اظہار کردڈالا۔

پھر ریحانہ نے اپنا سیل فون میری جانب بڑھایا تو ہریہ سے بات کرتے ہوئے میرا دل عجیب انداز میں ڑکنے لگا۔

''ہیلو، ڈاکٹر.....!'' دوسری جانب سے اس کی مترنم ازا اُبھری۔

''جی، ہیلو، میں ڈاکٹر سیف.....! کیسی ہیں پ.....'' میں نے کہا۔

''میں تو ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں؟''

''میں بھی ٹھیک ہی ہوں، آپ کو ان ساری باتوں پر انی ہوئی ہوگی؟'' میں نے سلسلۂ گفتگو کی غرض سے کہا۔

''بالکل، ریحانہ سسٹر نے بھی یقیناً آپ کو میرے ے میں سب کچھ تفصیل سے بتادیا ہوگا۔'' اس کا لہجہ اور ز ایک عجیب طرح کے جوش کا پتا دیتی تھی۔

''جی ہاں! میں تو خود یہاں کسی ایسے ہی فرد کی تلاش تھا جو ہماری کھل کر مدد کرسکے۔ ہم بھی ایسے لوگوں کو کیفرِ دار تک پہنچانے کی کوشش کریں گے، آپ کے توعلم میں ے بھی آہی گیا ہے کہ میرا اپنا بھائی بھی..... ان ں.....''

''آپ ایسا کریں اسی وقت میرے پاس یں.....'' دوسری جانب سے اچانک اس نے میری کاٹ کر کہا تو میں نے اثبات میں جواب دیا۔

تھوڑی دیر بعد میں اور رومی اس کے بتائے ہوئے پر گھر جا پہنچے۔

زوہریہ کی رہائش گاہ دیکھ کر ہی ہم دونوں کی آنکھیں پھٹی..... رہ گئیں.....

جگہ کیا تھی، ایک محل تھا جو یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ لان، اس میں باغات اور درختوں کا ایک جنگل سا نظر آتا تھا، یوں جیسے کوئی چھوٹا گولف کا میدان ہو۔ گیٹ کے باہر ہی کئی گز تک ماربل اور چپس کا فرش تھا۔ سڑک اس سے کافی دور تھی۔ شہر کا آخری حصہ تھا۔ اس کے بعد مضافات کے آثار بھی صاف نظر آتے تھے۔

دور اندر کہیں ایک دومنزل مستطیل سی سفید اور بنفشی رنگ کی رہائشی عمارت نظر آتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ کسی امیر کبیر عرب شیخ کا محل ہو۔

گیٹ پر چار مسلح دربان موجود تھے۔ انہی کے ذریعے ہمیں اندر ایک شٹل گاڑی میں بٹھایا گیا اور عمارت تک کا سفر دس سے پندرہ منٹ میں طے ہوا۔ وہاں میں نے اسی لڑکی کو اپنا منتظر پایا۔ یہ وہی لڑکی تھی جسے میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اس وقت وہ سیاہ رنگ کے اسکن ٹائٹ ٹراؤزر میں تھی۔ اُوپر اس نے پنک کلر کا ڈھیلا ڈھالا کرتہ سا پہن رکھا تھا۔ بال سلیقے سے گوندھ کر چیختے ہوئے عقاب کی چونچ والے کیچر سے باندھ رکھے تھے۔

اس نے بڑے پُرتپاک انداز میں ہم دونوں کا استقبال کیا اور ہمیں اپنے ساتھ ہی اندر لے آئی۔

اندر کا ماحول اور بھی زیادہ خواب ناک، مسحور کن اور..... جدید آرائش، مال و منال سے مزین نظر آتا تھا۔ ہر شے سے امارت ٹپکتی تھی۔ قدِ آدم تصاویر، فانوس، فرنیچر اور سجاوٹ کی مغرب اور مشرقی اشیا کی بھرمار مگر اس طرح کہ ہر شے اپنی جگہ نگینے کی طرح فٹ تھی۔

نوکر چاکر بس گنتی کے ہی نظر آرہے تھے، جو مخصوص یونیفارم میں تھے۔ ان میں دو ایک خواتین بھی تھیں۔ ہم لاؤنج کے ایک ایسے کونے میں جا بیٹھے، جہاں بڑی بڑی ہوادار کھڑکیوں سے باہر گھاس اور باغات کے دلفریب مناظر صاف نظر آرہے تھے۔ اگرچہ یہاں سارا ماحول سینٹرلی ائرکنڈیشنڈ تھا۔

اس گوشے میں ہم کافی قریب قریب ہو کے بیٹھے تھے۔ لاؤنج کے دیگر گوشے بھی اسی طرح تھے۔ مگر وہ زیادہ پھیلے ہوئے اور کشادہ تھے۔

''یہاں میں..... اپنی قریبی سہیلیوں کے ساتھ بیٹھتی ہوں۔'' اس نے مسکرا کر بتایا۔ ''کیونکہ ڈیڈی کے

www.pakistanipoint.com

دوستوں کا کچھ پتا نہیں ہوتا، وہ کب آجائیں اور کب یہاں کاروباری اور دوستانہ میٹنگز شروع ہوجائے۔''

اسی دوران ایک درمیانی عمر کی عورت ایک نفیس قسم کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی آئی۔ اس پر کھانے پینے کا مختلف سامان تھا۔ زوہریہ نے اس سے عربی میں کچھ کہا اور وہ ہولے سے اپنے سر کو مؤدبانہ جنبش دے کر پلٹ گئی۔

''آپ کچھ لیں پلیز، باتیں تو بہت سی ہیں۔'' وہ مسکرا کر ہم سے بولی۔ میں نے پلیٹ میں کچھ ڈرائی فروٹ ایک دو بسکٹ رکھے، وہ کافی بنانے لگی۔ رومی نے بھی اسی طرح کا کچھ لیا۔ یہ اُصول تھا کہ تکلف نہ کیا جائے۔ اسی لیے نہ چاہتے ہوئے بھی تھوڑا بہت لینا پڑا تھا۔

یوں اگلے ایک گھنٹے تک..... میری باتیں سن کر زوہریہ اور زیادہ پُرجوش نظر آنے لگی۔ میں چاہتا بھی یہی تھا کہ اس کا یہ جوش کم نہ ہو، وہ انکریج ہوئی تھی۔ پھر اس نے بھی وہی کچھ بتایا جو ریحانہ بتا چکی تھی، آخری نصف گھنٹے میں جو لائحہ عمل طے پایا اس پر زوہریہ کے ہی مشورے پر ہمیں صاد کرنا پڑا کہ..... ہمیں ایک ذمے دار پولیس آفیسر کو البحر کالونی میں سابقہ پولیس آفیسر خالد کے ساتھ ہونے والے ظلم اور خوں ریزی کے علاوہ سرجن امرناگ اور ڈاکٹر رمیش کے بارے میں بتا دیا جائے۔ یہ قول زوہریہ کے ہی..... اس کے باپ یعقوب ترمذی کا ایک سینئر پولیس آفیسر ابو معد گہرا دوست تھا، بلکہ اس سے تو ان کے خاندانی تعلقات بھی تھے اور زوہریہ انہیں انکل معد کہتی تھی۔

رومی کے ایک سوال پر کہ پولیس کے پاس ایسے کیا ثبوت ہیں ان دونوں کے خلاف جن کی بنا پر انہیں ڈائریکٹ ایکشن لے کر گرفتار کیا جائے تو زوہریہ جواب میں اسرار بھری مسکراہٹ سے بولی۔

''میں نے اسی لیے... یہ بات سسٹر ریحانہ سے بھی شیئر نہیں کی تھی، کیونکہ یہ بہت اہم بات تھی جو میں صرف انکل معد سے ہی کرنا چاہتی تھی، بلکہ ان سے کر بھی چکی ہوں۔ سسٹر ریحانہ کے خوف کو دیکھ کر میں اس سے پیچھے ہٹ گئی تھی، کیونکہ ایسے خطرناک معاملات میں خوف زدہ ہونا خود موت کے منہ میں جانے کے مترادف ہوتا۔''

اس کی بات پر رومی اور میں نے بے اختیار اپنی بھویں اُچکائی تھیں۔ زوہریہ کی کیا عمر ہوگی! بہ مشکل بیس، اکیس سال..... لیکن اس کی ذہنی بالیدگی، سوچ، جذبے اور ذہانت پر میں اش اش کر اُٹھا تھا۔ وہ اسی انداز میں آگے بولی۔

''چودھویں اور پندرھویں فلور کی..... جاسوسی کر چکی ہوں۔ وہاں پر حیرت انگیز طور پر بلکہ خلاف توقع بہت ہی اسٹاف رکھا گیا ہے، حتیٰ کہ دیگر فلورز کے اسٹاف کو بھی وہاں آنے جانے کی اجازت نہیں ہے، لیکن میرے ڈیڈی اس اسپتال کو فنڈ دینے والی کمپنی کے مالک ہیں، اسی لیے میں نے کچھ اس کا اور کچھ اپنی چالاکی سے فائدہ اُٹھا ہوئے..... وہاں کی ریکی کی، ان کے ڈیٹا چیک کیے، اس میں مجھے دو ایسے آدمیوں کے نام مل گئے جنہیں میں خود بھی ڈھونڈنا چاہتی تھی۔'' وہ ذرا رکی۔ مجھے محسوس ہوا تھا کہ میرا عملِ تنفس کچھ زیادہ ہی تیز ہونے لگا ہے، اعصاب تن رہے ہیں اور دل کی دھڑکنیں بھی غیر معمولی طور پر آپ رائٹ ہو رہی تھیں۔

''پہلا نام حمیر فارابی اور دوسرا..... نام.....'' بتاتے ہوئے زوہریہ نے میری طرف دیکھا تھا۔ میری سانس جیسے ایک دم تھم گئی تھی۔ وہ راز آج کھلنے لگا تھا جس کے لیے میں آج تک آبلہ پائی میں صحرا گردی اختیار کیے ہوئے تھا۔

''عادل کا تھا.....''

''میرے خدا.....'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔ رومی بھی دنگ رہ گئی تھی بلکہ میں نے پہلی بار اس کا چہرہ اس قدر جوش سے تمتماتا پایا کہ جیسے وہ ابھی اُٹھ کر کچھ کرنے کے لیے دوڑ پڑے گی۔

''میں اسی لیے ٹھہری ہوئی تھی۔'' زوہریہ آگے بولی۔ ''اور انکل معد نے بھی یہی مجھ سے کہا تھا کہ کسی طرح اب ڈاکٹر سیف کا پتا لگا لو تو پھر..... یہ سب ممکن ہوسکتا ہے بشرطیکہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھا ہو، اسی لیے تو میں اب پُرامید ہوں کہ انکل معد ہی اب اس بیل کو منڈھے چڑھا سکتے ہیں۔''

کہتے ہوئے اس نے یہ بھی کہا کہ میں ابھی انہیں کال کرتی ہوں۔''

اگلے نصف گھنٹے میں ہی وہ آگیا..... بھاری بھرکم اور لحیم شحیم اس سینئر پولیس آفیسر کو دیکھتے ہی مجھے ایک جھٹکا لگا۔

ان دیکھے دشمنی کے جال میں جکڑے
نوجوان کی مزید مشکلات آئندہ ماہ پڑھیں

www.paksociety.com

محبت کی طاقت

منظر امام

جنگیں زورِ بازو سے نہیں جیتی جاتیں... جذبوں کی بھرپور طاقت سے حریف کو زیر کیا جاتا ہے... دلوں کے فاتح وہی قرار پاتے ہیں... علم اور محبت کی قوت بڑے سے بڑے سورما کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتی ہے... جذبوں سے مزین ایک گداز تحریر...

ایک خوب صورت دوشیزہ کے جذباتی و احساساتی معاملاتِ دل

پہلوان نائی کی دکان پر اس وقت بھی کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔

یہ لوگ اس دکان پر کٹنگ کروانے یا شیو بنوانے نہیں آتے تھے بلکہ ان کو باتیں سننے میں مزہ آتا تھا۔ پہلوان بغیر کسی جھجک کے دنیا بھر کے معاملات پر اپنی رائے دیا کرتا تھا۔

چاہے وہ امریکا کی پالیسی ہو یا چین کی سیاست۔ پہلوان سب پر تبصرہ کیا کرتا.... وہ صرف نام کا پہلوان تھا۔ اس میں پہلوانوں والی کوئی بات نہیں تھی۔ دُبلا پتلا جسم، سر کے بال اڑے ہوئے، باتیں کرتے ہوئے کبھی کبھی بُری طرح کھانسنے بھی لگتا تھا۔

اس دکان کے برابر میں ایک سبزی فروش حکیمو کی دکان تھی۔ دکان کیا وہ ایک چھوٹا سا تھڑا تھا۔ جس کے چبوترے پر حکیمو باسی سبزیاں بچھا کر ان پر پانی چھڑکتا رہتا۔ حکیمو کی دکان سے آگے راشن کی ایک چھوٹی سی دکان تھی جو ماجد کی تھی۔

اس دکان میں اس علاقے والوں کی ضرورت کا ہر سامان مل جایا کرتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ماجد ہر سامان کچھ مہنگا بھی دیا کرتا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ یہ سب لاتا بھی تو بہت دور سے ہے۔

”ارے میں نے تو یہ دکان علاقے والوں کی سہولت کے لیے کھولی ہے۔ ورنہ میرا کیا ہے، میں شہر جا کر بھی کاروبار کر سکتا ہوں۔“

ماجد کی دکان کے آگے ایک چھوٹا سا میدان تھا جس کے

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

آخر میں ایک مستری کاکل بیٹھا رہتا تھا۔ اس کی دکان مین روڈ کے ساتھ ہی تھی۔ اسی لیے کبھی کبھی بائیک والے اس کی دکان پر آ کر رک جاتے یا کوئی چھوٹا موٹا کام نکل آتا۔ اس طرح کاکل کا روزگار بھی چل رہا تھا۔

پہلوان کی دکان کے بالکل سامنے ایک چھوٹا سا راستہ تعبیر اسکول کی طرف جاتا تھا۔ تعبیر اس علاقے کا واحد اسکول تھا۔ اس کا نام کسی باذوق قسم کے سرکاری آفیسر نے تعبیر رکھ دیا تھا۔ اس طرح وہ تعبیر گورنمنٹ اسکول ہو گیا تھا۔

اس کی عمارت شیڈ کی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ کسی زمانے میں یہ شیڈ گودام وغیرہ کے کسی کام میں آتا ہو لیکن اب وہ ایک سرکاری اسکول تھا۔

اسکول میں بہت کم طالب علم تھے جن کو ساجد اپنی پوری ایمان داری اور خلوص کے ساتھ پڑھایا کرتا تھا۔ ساجد راشن والی دکان کے ماجد کا بڑا بھائی تھا۔ اس علاقے میں پڑھنے لکھنے کا کوئی خاص رواج نہیں تھا۔ یہ لوگ اپنے بچوں کو رانی پور لے جا کر کوئی کام دلوا دیتے تھے۔

اس اسکول کو بس یوں ہی شاید خانہ پری کے لیے بنا دیا گیا تھا۔ کبھی کبھی کوئی آفیسر آ کر معائنہ کر جاتا۔ اس کے آنے کی اطلاع پہلے سے دے دی جاتی۔ اس اسکول میں صرف سولہ سترہ طالب علم تھے اور صرف تین استاد۔

ساجد ہیڈ ماسٹر بھی تھا اور اسکول کا نگران بھی۔ اس نے اس اسکول کو اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ ہر صبح وہ قومی ترانہ ضرور پڑھا کرتا۔ جسے اسمبلی کہتے ہیں۔ چاہے حاضری ہو یا نہ ہو اسمبلی ضرور ہوا کرتی تھی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس علاقے کے لوگ تعلیم سے دور کیوں بھاگتے ہیں۔ وہ جب بات کرتا تو یہی سننے کو ملتا۔

”رہنے دو ماسٹر صاحب، میرا بچہ روز کے دو سو لے کر آتا ہے۔ گیرج میں کام سیکھ رہا ہے۔“

”اگر وہ یہی کام کچھ پڑھ کر سیکھ لے تو کیا برائی ہے؟“

”برائی تو ہم نے دیکھی ہے نا ماسٹر۔ یاد ہے تم نے اکمل درزی کے بیٹے کو اپنے اسکول میں بٹھایا تھا۔ بے چارے نے تمہارے یہاں سے میٹرک بھی کر لیا لیکن کیا ملا اس کو ابھی تک نوکری کے لیے دھکے کھا رہا ہے۔“

بولنے والے کی تائید میں کچھ اور نے بھی گردنیں ہلا دیں۔ ”ہاں یار فضل دین، تو ٹھیک ہی کہتا ہے بھائی، پڑھ لکھ کر آدمی زیادہ سے زیادہ کسی دفتر میں کلرک بن جائے گا اور کیا ہو گا۔ گورنر تو ہونے سے رہا۔“

”یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ گورنر ہی بن جائے۔“

”کیوں خواب دکھانے والی باتیں کرتے ہو ماسٹر۔ گورنر وہی بنتے ہیں جن کے باپ دادا گورنر رہ چکے ہوں۔“

ان کی باتیں سن سن کر ساجد کو افسوس ہوا کرتا تھا۔ وہ سمجھایا کرتا۔ ”دیکھو بھائی تعلیم نوکری یا عہدے کے لیے نہیں ہوتی۔ تعلیم بذاتِ خود ہی دولت ہے۔ اس کے بعد چاہے کچھ نہ ملے اگر علم کی دولت مل گئی ہے تو اسی کو بہت سمجھو۔“

”رہنے دو ماسٹر۔ ہمارے لیے اتنا ہی بہت ہے کہ میرے دونوں بچے روزانہ چار پانچ سو لے کر آ جاتے ہیں۔“

ساجد افسوس کرتا ہوا وہاں سے چل دیتا۔

بہت پہلے کی بات ہے۔

ساجد کے یہاں صنوبر پیدا ہوئی۔ وہ ایک خوب صورت بچی تھی۔ ماجد اپنے بھائی کو مبارک باد دینے آیا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی سکینہ بھی تھی۔

باتوں کے درمیان سکینہ نے ساجد کی بیوی زلیخا سے کہا۔ ”بھابی اب تو ماشاء اللہ تمہارے یہاں ایک چاندی سی بچی آ گئی ہے۔ اس طرف میرا خالد بھی سات سال کا ہو گیا۔ تو کیوں نا آپس میں منگنی کر دی جائے تاکہ یہ رشتہ اور مضبوط ہو جائے۔“

ان کی یہی روایت تھی بلکہ اس پورے علاقے کا یہی دستور تھا۔

ماجد کے اصرار پر ساجد نے دونوں کی بات طے کر دی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ صنوبر کی خوبیاں سامنے آتی گئیں۔ اس کے ہاتھوں میں بہت ہنر تھا جو بناتی وہ کمال کا ہوتا۔

اس کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ بے انتہا ذہین تھی۔ اس کی دلچسپی کتابوں سے تھی۔ کتابیں اسے اپنی طرف متوجہ رکھتیں۔ یہ سب ساجد کی تربیت کا اثر تھا۔ وہ کہا کرتا۔ ”میرا کوئی بیٹا تو ہے نہیں بس یہ بیٹی ہے۔ یہ میرا نام روشن کرے گی۔ علم کی شمع میں نے روشن کی ہے، وہ اس شمع کو روشن رکھے گی۔“

اس کا بھائی ماجد کبھی کبھی ساجد کی باتوں سے ناراض بھی ہو جاتا۔ ”کیا ہو گیا ہے بھائی صاحب۔ کیا کرنا ہے صنوبر کو پڑھا کر۔ اس کو تو بیاہ کر ہمارے گھر آنا ہے۔ جب ہم ہی نہیں پوچھیں گے تو کون اعتراض کرے گا کہ لڑکی پڑھی لکھی ہے یا نہیں۔“

”ماجد یہی تو سوچ ہے جو مجھ میں ہے اور تم میں نہیں ہے۔ تعلیم اس کے راستے کی رکاوٹ تو نہیں بنے گی نا۔ مجھے تو اس بات کا افسوس ہے کہ تم نے خالد کو بھی کوئی تعلیم نہیں دلوائی ہے۔“

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

"بھائی صاحب، خالد کی زندگی کے لیے ہماری دکان بہت ہے۔ دکان آگے بڑھ رہی ہے۔ اب ہمیں اچھی خاصی آمدنی ہونے لگی ہے۔ میرے بعد خالد ہی کو دکان چلانی ہے۔ اسی لیے اسے کیا ضرورت ہے کہ اسکولوں میں جا کر سر کھپاتا رہے۔"

"افسوس ہوتا ہے تم پر۔" ساجد ایک گہری سانس لے کر رہ جاتا۔ "بہرحال یہ تمہاری مرضی۔ لیکن صنوبر تو تعلیم حاصل کرے گی۔ یہ میرا بھی فیصلہ ہے اور خود اس کی بھی خواہش ہے۔"

ماجد بھڑک کر چلا جاتا۔ یہ سب کچھ ایک معمول سا بن گیا تھا۔

ایک دن صنوبر نے ساجد سے کہا۔ "بابا، مجھے ایک بات بتائیں۔"

وہ جاڑے کی دوپہر تھی۔ دھوپ میں بھی خنکی تھی۔ ساجد کے گھر میں ایک آسانی یہ تھی کہ ایک بڑا سا آنگن تھا۔ جاڑوں میں چارپائیاں ڈال دی جاتیں۔ ساجد صنوبر اور زلیخا اسی آنگن میں بیٹھ جاتے۔ دھوپ سینکتے رہتے۔ صنوبر اپنی کتابیں لے آتی اور ساجد سے سوالات کیا کرتی۔

اس کے سوالوں میں شعور کی پختگی آنے لگی تھی۔

ایک دن اس نے یوں ہی ایک عجیب سا سوال کر دیا۔

"بابا ایک بات بتائیں۔ لڑکی کو تعلیم دینے کا فائدہ کیا ہے؟"

"بیٹا، لڑکیوں میں شعور آجاتا ہے۔"

"بابا اس شعور کی روشنی میں اگر کوئی لڑکی پسند ناپسند کا سوال اٹھائے تو اسے کیا کہا جاسکتا ہے؟"

ساجد کی سمجھ میں آگیا تھا کہ صنوبر کیا کہنا چاہتی ہے۔

"میں سمجھ گیا بیٹا کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟" اس نے کہا۔

"لیکن تم بےفکر رہو۔ تمہاری مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوگا۔"

"بابا مجھے افسوس ہوتا ہے خالد کو دیکھ کر۔" صنوبر اب کھل کر بات کر رہی تھی۔ "میں جب اسے لڑکوں کے ساتھ پتنگیں اڑاتے یا میدان میں بال کھیلتے دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں کہ کیا یہی وہ ہے جس کے ساتھ مجھے زندگی گزارنی ہے۔"

"بدقسمتی ہے بیٹا۔" ساجد نے ایک گہری سانس لی۔

"ماجد کی سمجھ میں نہیں آتا کہ خالد کو کچھ لکھنا پڑھنا ہی سکھا دے۔ وہ میرا اپنا بھائی ہے لیکن تعلیم اور شعور سے کوسوں دور ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کا کاروبار چل رہا ہے اسی لیے اسے کوئی فکر نہیں ہے جب وقت ہوگا تو خالد کاروبار سنبھال لے گا۔"

"کیسی عجیب بات ہے۔ لڑکیاں اس میدان میں آگے جارہی ہیں اور لڑکے تباہ ہو رہے ہیں۔"

"اس پورے علاقے کے لڑکوں اور والدین کا یہی حال ہے۔" ساجد نے کہا۔ "خیر تم فکر مت کرو، تم اپنی مرضی کی مالک ہو۔"

☆☆☆

خالد کو غصہ آرہا تھا۔ اس کا ساتھی اسے باری دیے بغیر بھاگ گیا تھا۔

ہر صبح یہ سب لڑکے میدان میں جمع ہو کر کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔ کرکٹ کا سارا سامان خالد کے پیسوں سے آیا تھا۔ بیٹ، بال، نیٹ، گلوز، سب کچھ۔ یہ پیسے اس کے باپ نے دیے تھے۔

اس نے اپنے علاقے کی ٹیم بنا رکھی تھی۔ اس ٹیم میں محلے کے سارے ناکارہ لڑکے جمع ہو گئے تھے۔ خالد ہی اس ٹیم کا سب کچھ تھا۔ کیپٹن بھی وہی۔ منیجر بھی وہی اور اسپانسر بھی وہی۔ کیونکہ وہی روزانہ پوری ٹیم کو کلو کے ہوٹل کی چائے پلوایا کرتا تھا۔

سب کچھ ٹھیک ہی تھا۔ محلے کے لڑکوں پر اس کا رعب پڑا رہتا تھا۔ اسے بُرا اس وقت لگتا جب اس کے بے تکلف دوست اس کے سامنے اس کی منگیتر صنوبر کی تعریف کیا کرتے۔

"یار تو بڑا خوش نصیب ہے کہ تجھے صنوبر جیسی منگیتر ملی ہے۔"

"لیکن وہ میرے چاچا کی بیٹی بھی تو ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے لیکن اب تو وہ تیری منگیتر ہے۔ اس میں سب کچھ ہے۔ پڑھی لکھی بھی ہے۔ تیری طرح نہیں ہے۔"

"ابے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب سب راضی ہیں تو لکھائی پڑھائی سے کیا ہوتا ہے۔"

خالد بظاہر اپنے دوستوں کی باتوں پر ناراض ہوتا تھا لیکن دل ہی دل میں خوش بھی ہوتا تھا۔ وہ جانتا کہ صنوبر جیسی لڑکی اس علاقے میں کوئی نہیں ہے۔

وہ اس بات پر خوش ہوتا تھا کہ جب وہ میدان میں کرکٹ کھیل رہا ہوتا ہے تو اس وقت صنوبر اس طرف سے گزرتی ہے۔ وہ اسے دیکھ کر خوش بھی ہوتی ہے۔

ایک بار اس نے ایک دوسری ٹیم کے ساتھ کھیلتے ہوئے سورنز بنا لیے۔ اس کی ٹیم کے کھلاڑیوں نے اسے اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ یہ اتفاق تھا کہ اسی وقت صنوبر اس طرف سے گزری، خالد اپنے دوستوں کو چھوڑ کر دوڑتا ہوا اس کے پاس آگیا۔ وہ بہت پرجوش ہو رہا تھا۔ "صنو، صنو تم نے دیکھا۔" وہ صنوبر کو صنو کہا کرتا تھا۔ "تم نے دیکھا، میرے دوست مجھے اٹھائے گھوم

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

رہے تھے۔ میں نے سنچری جوکی ہے۔"

"خالد، تم ایسا کرو میرے گھر آ جاؤ۔" صنوبر نے کہا۔

اس کا لہجہ بہت سنجیدہ تھا۔ "مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔"

"ضروری بات تو مجھے بھی کرنی ہے۔ میں تم کو خوابوں میں جو دیکھتا ہوں۔ میں کسی کو بتاتا نہیں ہوں، بس تم کو بتا رہا ہوں۔"

صنوبر دھیرے سے مسکرا دی۔ "ٹھیک ہے، تم گھر تو آؤ۔"

"ٹھیک ہے کھیل ختم ہونے کے بعد آ جاؤں گا۔"

صنوبر نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ پھر آگے بڑھ گئی۔

خالد بہت اکڑا، اکڑا دوستوں کے پاس واپس آیا تھا خوش قسمت تھا کہ صنوبر جیسی لڑکی اس کی تھی اور ہمیشہ کے لیے اس کی ہونے والی تھی۔

صنوبر گھر واپس آئی تو ساجد اس کا انتظار کر رہا تھا۔ "کیا ہوا بابا؟" صنوبر نے پوچھا۔ "آج اسکول سے جلدی واپس آ گئے؟"

"ہاں بیٹا، 23 مارچ ہے نا۔ تو اس کے لیے تھوڑی تیاری کرنی ہے۔" ساجد نے بتایا۔

"کیا تیاری کریں گے بابا۔ یہاں کون آپ کی بات سنتا ہے؟ پچھلے سال بھی تو آپ نے اتنی مٹھائیاں منگوائی تھیں۔ کون آیا تھا؟ صرف میں تھی۔ اماں تھیں۔ اور گنتی کے سات آٹھ اسٹوڈنٹ تھے۔ کسی نے آپ کی بات سنی تھی؟"

"بیٹا! میں لوگوں کو 23 مارچ کی اہمیت بتانا چاہ رہا تھا۔ یہی وہ تاریخ ہے جب پاکستان کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ آزادی تو چودہ اگست کو ملی تھی لیکن بنیاد اس تاریخ کو ڈالی گئی تھی۔ احساس دلایا گیا تھا کہ ہمیں ایک آزاد ملک کی ضرورت ہے۔"

"جانتی ہوں بابا۔"

"دیکھو بیٹا، اصل سفر ہے آگے بڑھنا۔ ہم آگے بڑھے تھے۔ ایک نئے جوش اور ولولے کے ساتھ۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے نوجوان اسی جذبے کو لے کر آگے بڑھتے رہیں۔ لیکن کیا کیا جائے اس علاقے میں تعلیم کا رواج ہی نہیں ہے۔ جوان، جوان لڑکے فالتو گھومتے رہتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ میرا اپنا بھتیجا تک وقت برباد کر رہا ہے۔"

"آپ پریشان نہ ہوں۔ 23 تاریخ کو میں تو آ ہی جاؤں گی۔"

ساجد مسکرا دیا۔ "ہاں، میری بیٹی تو آ ہی جائے گی۔"

☆☆☆

خالد حیران پریشان کھڑا تھا۔

اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا جس میں ایک خط تھا۔ وہ صنوبر کے کہنے پر اس سے ملنے اس کے گھر پہنچا تھا۔ چاچا اور چاچی کو سلام کرنے کے بعد وہ صنوبر کے کمرے میں دروازے پر جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

اس کی آواز سن کر صنوبر اپنے کمرے سے باہر آ گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک موٹی سی کتاب تھی۔

"میں یہ سمجھ رہی تھی کہ تم نہیں آؤ گے۔" اس نے کہا۔

"یہ لو یہ کیا بات ہوئی۔ تم نے بلایا تھا تو میں کیوں نہیں آتا؟ تم بلاؤ تو میں جہنم میں بھی چلا آؤں۔"

"خیر اب تم کو اتنی دور تو نہیں بلاؤں گی۔" صنوبر نے کہا۔

اسی وقت ساجد کی آواز آئی۔ "بیٹا! میں ذرا ماسٹر کے پاس جا رہا ہوں۔"

ساجد ان دونوں کے پاس آ گیا تھا۔

"خیریت تو ہے ابا؟ کس ماسٹر کے پاس جا رہے ہیں؟"

"ارے ٹیلر ماسٹر کے پاس۔" ساجد نے بتایا۔ "اسے جھنڈا سینے کو دیا تھا۔"

"ابا جھنڈے تو بازار میں بھی مل جاتے ہیں۔"

"ہاں ملتے تو ہیں لیکن ناپ تول کی کمی رہتی ہے۔ کسی میں چاند ٹیڑھا بنا ہوا ہے۔ کسی میں ستارہ اپنے اینگل پر نہیں ہوتا۔ میں نے اپنے طور پر ڈیزائن کر کے بنوایا ہے۔" پھر اس نے خالد کی طرف دیکھا۔ "بیٹا! ماجد سے کہنا مجھ سے مل لے۔ چار قدم کے فاصلے پر ہوتا ہے پھر بھی اس میں ملنے کی توفیق نہیں ہوتی۔"

"بتا دوں گا ابا کو۔"

ساجد کے جانے کے بعد صنوبر نے کہا۔ "چلو اب ڈرائنگ روم میں چلتے ہیں۔ وہیں باتیں کریں گے۔ امی سے کہتی ہوں۔ وہ تمہارے لیے چائے بنا دیں گی۔"

صنوبر اسے ڈرائنگ روم میں لے آئی تھی۔ خالد کے لیے صنوبر کی اتنی توجہ بہت بڑی بات تھی۔ گرچہ وہ اس کی کزن تھی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ منگیتر بھی تھی پھر بھی کبھی اس کی اتنی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ صنوبر سے کھل کر بات کر سکے۔

اسے جھجک سی ہوتی تھی۔ وہ ایک پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ اسے بات کرنے کا سلیقہ آتا تھا۔ جبکہ خالد اس کے سامنے ہکلانے لگتا تھا لیکن آج تو اس کی قسمت زوروں پر تھی۔

"دیکھو خالد جو کچھ میں کہنے جا رہی ہوں، اسے صرف اپنی حد تک رکھنا ہے۔ کسی کو بتانا نہیں ہے۔"

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

خوب صورت و مسحور کن تحریروں سے مرصع ماہِ ستمبر 2020ء کا دلکش شمارہ

گھر کے ہر فرد کے لیے

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

افشاں آفریدی و نایاب جیلانی کے سلسلے وار ناول دلچسپ دوراہے پر

سعدیہ رئیس کا شاہکار...... پڑھیے منی ناول میں انمول کی صورت

مدیحہ شاہد کا سحر انگیز مکمل ناول پریوں کا دیس

عورت کہانی میں فرحین اظفر لائی ہیں ایک اور شاہکار داستان......

اندازِ نو میں

ملیں ایف ایم کے خوش گفتار آر جے

اسد علی چوہدری...... سے

شمعِ ہدایت میں

اختر شجاعت کا تحقیقی مقالہ

رضا...... توفیق الٰہی

کے عنوان سے

اس کے علاوہ

ہما بیگ، ناہید سلطانہ اختر، طیبہ عنصر مغل،

سعدیہ قریشی، افشین نعیم و دیگر لکھاریوں کی لاجواب تحریریں

رنگارنگ مستقل سلسلے، پُر مزاح تراشے اور مسحور کن شاعری......

یہ سب آپ جیسے باذوق اور باشعور پڑھنے والوں کے لیے ہی تو ہے

''نہیں بتاؤں گا۔ تم بتاؤ کس نے تمہیں چھیڑا ہے۔''
صنوبر اس کی سادگی پر مسکرا دی تھی۔
''نہیں خالد تمہیں کسی سے جھگڑا کرنے کو نہیں کہہ رہی۔ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ ہم دونوں کی بات ہے اس لیے صرف اپنے تک رکھنا۔''
''ہاں، اس کا میں وعدہ کرتا ہوں۔'' خالد نے کہا۔
''دیکھو خالد، جب مجھے پتا چلا تھا کہ ہمارے گھر والوں نے ہماری منگنی طے کر دی ہے۔ تو مجھے بُرا لگا تھا۔ کیونکہ تم خود سوچ سکتے ہو کہ ہم دونوں میں کتنا فرق ہے۔ کم از کم تعلیم کا فرق تو ہے نا؟''
''ہاں، یہ فرق تو ہے۔''
''میں بہت بددل ہوئی تھی لیکن جب میں نے تم کو قریب سے دیکھا، تمہاری باتیں سنیں تو مجھے احساس ہوا کہ تم بہت اچھے آدمی ہو۔ اسی لیے تم پسند آگئے اور باقی میں نے اپنے دل کا سارا حال اس میں لکھ دیا ہے۔'' صنوبر نے اپنے ہاتھ میں دبی موٹی کتاب سے ایک لفافہ نکال کر خالد کی طرف بڑھا دیا۔ یہ لو اسے پڑھ لینا۔''
لفافہ لیتے ہوئے خالد کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ بولنا چاہ رہا تھا، بتانا چاہ رہا تھا لیکن اس کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔
''دیکھو، کسی کو بتانا نہیں کہ میں نے تم کو کوئی خط دیا ہے۔''
''ہاں، ہاں۔'' خالد نے اپنی گردن ہلا دی۔
''تمہارے جواب کا انتظار رہے گا ہاں..... مجھے تم سے ایک اور بات کہنی ہے۔''
''ہاں کہو۔''
''ہو سکتا ہے کہ گھر والے میرا رشتہ کہیں اور طے کر دیں۔'' صنوبر نے کہا۔
''کیا؟'' خالد کے پیروں تلے زمین نکل گئی تھی۔ ''صنو یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟''
''ایک بات بتاؤ، اگر ایسا ہو گیا تو کیا اس میں ان کا کوئی قصور ہو گا؟''
''نہیں کوئی قصور نہیں ہو گا۔ کیونکہ میں کسی قابل نہیں ہوں۔''
''لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ ابا میری ہر بات مانتے ہیں، میں ان سے ضد کروں گی اب جاؤ۔''
خالد بہت بوجھل دل سے اس کے گھر سے باہر آ گیا۔ وہ بے حد خوش بھی تھا اور اپنی بے بسی پر رونا بھی آ رہا تھا۔ وہ صنوبر کو کیا بتاتا کہ وہ تو کچھ بھی نہیں جانتا۔ الفاظ اور حروف اس کے لیے اجنبیوں کی طرح ہیں اور ان ہی حروف میں اس کی محبت بھی کہیں چھپی ہوئی ہے۔
پہلی بار اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے کیا حاصل کر ہے۔ اس نے لفافہ کھولا، اس میں صنوبر کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط تھا۔ اس خط میں خوشبو بھی تھی۔ شاید صنوبر نے اس خط میں کوئی پرفیوم اسپرے کر دیا تھا۔
اس نے خط کو چوم لیا۔ بس، اس کے علاوہ وہ کیا کر سکتا تھا۔
اچانک اس کے دوست عمران نے اسے دیکھ کر آواز لگائی۔ ''ارے خالد! یہاں کیوں کھڑا ہے؟''
خالد جانتا تھا کہ عمران کو لکھنا پڑھنا آتا ہے۔ وہ یہ خط پڑھ سکتا ہے۔ اس نے وہ خط عمران کو دینا چاہا پھر اسے صنوبر سے کیا ہوا وعدہ یاد آ گیا۔ صنوبر نے قسم دی تھی کہ وہ اس خط کے بارے میں کسی کو نہ بتائے، اس نے صنوبر کے خط کو اپنی جیب میں رکھ لیا۔
عمران اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔
''کیا بات ہے یار؟'' عمران نے پوچھا۔ ''کیا چیز چھپا رہا ہے؟''
''کچھ بھی نہیں۔''
'یاروں سے بھی چیٹنگ؟''
''میں نے کہا نا کچھ بھی نہیں، جاؤ اپنا کام کرو۔''
''ابے اس میں ناراض ہونے والی کیا بات ہے۔ چل جانے دے، چل میرے ساتھ۔''
''کہاں؟''
''ابے وہ ہادی آباد والے کبڈی کا میچ رکھنے آ رہے ہیں۔''
''تم چلے جاؤ، مجھے کسی کام سے چاچا کے پاس جانا ہے۔'' خالد نے کہا۔
عمران اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ خالد چاچا کے اسکول کی طرف جا رہا تھا۔ چاچا اسکول ہی میں ہو گا۔ وہ چاچا کو اس خط کے بارے میں تو کچھ نہیں بتائے گا لیکن ان سے اتنا ضرور کہے گا کہ وہ اسے تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا تو سکھا دیں تاکہ وہ کوئی خط پڑھنے کے قابل ہو جائے۔
اس نے اپنی زندگی برباد کر دی ہے لیکن اب وہ اپنی محبت برباد کرنا نہیں چاہتا۔ وہ جلد از جلد لکھنا پڑھنا سیکھ کر سب سے پہلے یہ خوشخبری صنوبر کو دینا چاہتا تھا۔
❖❖❖

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

شبِ آزما

حسام بٹ

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

بعض واقعات ایسے درد و کرب میں مبتلا کر دیتے ہیں جو اس کے لیے موت سے زیادہ تکلیف دہ ہوتے ہیں... درد میں کمی شاید اس وقت ہوتی ہے... جب وہ اپنے دل میں چھپی کہانی سناتا ہے... اس درد کی وجہ سے ہی وہ اپنے راستے بدل لیتا ہے... قربت دوریوں میں بدل جاتی ہے... ایک ایسے ہی سانحے سے جڑی دل گداز کہانی... جس کے کردار آہستہ آہستہ عیاں ہو رہے تھے...

رات کی سیاہی میں گم ہو جانے والا عبرت اثر واقعہ.....

دنیا میں خوشیاں کم اور غم بہت زیادہ ہیں اور ان بے شمار غموں میں سب سے بے رحم اور سفاک ہے، غمِ روزگار۔ یہ غم انسان کو خود اُس کی نظر میں گرا دیتا ہے، اس کی زندگی میں خال خال دکھائی دینے والی ننھی منی خوشیوں کو چاٹ کر اُسے جیتے جی مار ڈالتا ہے۔ پھر یہ زندہ لاش کچھ بھی کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے!

وہ پچھلے چھ ماہ سے بے روزگار تھا۔ اس کے پاس تعلیم تھی، ہنر تھا مگر مصلحت نامی منافقت سے عاری تھا اور اس کی

فی زمانہ یہی خامی اسے اس کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ اور اس کے مسائل کا سبب تھی۔ وہ خود کو بدلنے کے بجائے دنیا کو بدلنے کے لیے کوشاں تھا اور گزرتے وقت کے ساتھ یہی کوشش اس کا جرم...... ایک سنگین جرم بن کر رہ گئی تھی!

دن بھر کی خجل خواری کے بعد وہ ناکام و نامراد اپنے گھر کی سمت رواں دواں تھا۔ وہ عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت تھا جسے بہ یک وقت سہ پہر اور شام کہا جاسکتا تھا۔ اس کی جیب میں سو روپے والا آخری نوٹ بچا تھا۔ وہ چاہتا تو کسی بھی بس یا ویگن پر سوار ہوکر گھر پہنچ جاتا لیکن ان لمحات میں وہ ذہنی طور پر بہت زیادہ اُلجھا ہوا تھا اسی لیے وہ مین اسٹریٹ کو چھوڑ کر پوش ایریا کی ایک کشادہ گلی میں سر جھکائے بے دلی سے چلا جارہا تھا۔

دفعتاً اس کے چلتے ہوئے قدموں کو بریک لگ گئے۔ ایک کنگ سائز تولیا اس کے سامنے آکر گرا تھا۔ وہ تولیا چونکہ اوپر سے نیچے آیا تھا لہٰذا غیر ارادی طور پر اس نے گردن اٹھا کر اوپر دیکھا۔ اسے ایک اپارٹمنٹ کی کھڑکی میں ایک دلکش عورت نظر آئی۔ مذکورہ کھڑکی کے باہر کپڑے سکھانے والی مخصوص رسیاں بھی بندھی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں جن پر چند کپڑے ابھی بھی لٹکے ہوئے تھے۔ اسے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ خوب صورت عورت الگنی پر سے کپڑے اتار رہی تھی کہ اس کے ہاتھ سے تولیا نکل کر نیچے گر گیا۔ اگلے ہی لمحے اس کے اندازے کی تصدیق بھی ہوگئی۔

''سوری......'' اس عورت نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''پتا نہیں، یہ تولیا کس طرح میرے ہاتھ سے پھسل گیا۔ اگر آپ کو کوئی زحمت نہ ہو تو آپ اسے اوپر لے آئیں۔ میرے اپارٹمنٹ کا نمبر ٹو زیرو فور ہے......''

بات کے اختتام پر وہ بڑے دل آویز انداز میں مسکرائی بھی تھی۔ ایک تو وہ کافی حسین عورت تھی اور اس کی آواز میں نغمگی بھری شائستگی بھی پائی جاتی، اس پر مستزاد اس کا متبسم اندازِ تخاطب...... اس نے جھک کر تولیا اٹھا لیا اور اپارٹمنٹ بلڈنگ کے گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔

وہ ایک کثیر المنزلہ لگژری اپارٹمنٹ بلڈنگ تھی جس میں بالائی فلورز تک رسائی حاصل کرنے کے لیے لفٹ اور زینے دونوں ذرائع موجود تھے۔ اس نے زینے سے اوپر جانے کا فیصلہ کیا تاکہ کھڑکی میں نظر آنے والی اس مہ جبیں کا سامنا کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ بچار کرلے۔ غور و خوض کی ضرورت اس لیے پیش آگئی تھی کہ اس بظاہر معمولی سے دکھائی دینے والے واقعے نے اس کے ذہن میں ایک غیر معمولی سنسنی خیز کہانی کو تازہ کردیا تھا۔

یہ کہانی اس کے ایک دوست کی آپ بیتی تھی جو کافی عرصے پہلے اس نے بڑے چٹخارے لے لے کر سنائی تھی۔ اس دوست کی بیان کردہ کہانی کے مطابق، ٹی وی اسٹیشن سے تھوڑے فاصلے پر پوش ایریا کی ایک گلی میں آگے جاکر ایک لگژری اپارٹمنٹ بلڈنگ تھی جس کے سیکنڈ فلور پر ایک خوب صورت شوقین مزاج عورت رہتی تھی۔ وہ اپنا شوق پورا کرنے کے لیے اپارٹمنٹ کی کھڑکی سے کوئی کپڑا نیچے گلی میں گزرنے والے کسی مرد کے سامنے پھینک دیتی تھی، پھر اس سے درخواست کرتی تھی کہ وہ شخص مذکورہ کپڑا اس کے اپارٹمنٹ تک پہنچا دے۔ جب وہ بندہ اس عورت کے دروازے تک پہنچتا تو وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے چائے، کافی کے بہانے اپارٹمنٹ کے اندر بلا لیا کرتی تھی...... وغیرہ!

اپارٹمنٹ نمبر دو سو چار کے دروازے تک پہنچنے سے پہلے وہ اس فیصلے پر پہنچ چکا تھا کہ اگر واقعتاً بہتی گنگا سے سامنا ہوا تو وہ بھی اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے ہاتھ دھو لے گا۔ اس فیصلے نے اس کے دل و دماغ میں ایک سنسناہٹ سی دوڑا دی تھی۔ اسے اپنے رگ و پے میں پارے ایسی مچلن محسوس ہو رہی تھی۔ انہی ولولہ انگیز احساسات کے ساتھ وہ مذکورہ دروازے تک پہنچ گیا۔

دروازہ ہلکا سا کھلا ہوا تھا۔ اس نے اطلاعی گھنٹی بجائی اور نہ ہی دستک دی۔ اس کی نیت میں کھوٹ در آئی تھی چنانچہ اس نے چوکنا نگاہ سے کوریڈور میں یہاں سے وہاں تک جھانکا پھر روئے سخن نیم وا دروازے کی جانب پھیرتے ہوئے متوجہ کرنے والے انداز میں کھنکھارا۔

اگلے ہی لمحے کھڑکی میں دکھائی دینے والی وہ خوب رُو عورت دروازے میں جلوہ گر ہوئی پھر بے تکلفی سے بولی۔

''ارے آپ باہر کیوں کھڑے ہیں۔ میں نے آپ ہی کے لیے تو دروازے کو کھول رکھا ہے...... اندر آجائیں۔''

''آپ کا ٹاول......'' وہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے تولیے کو اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

''ہاں، ہاں...... ٹاول کو بھی ساتھ لے آئیں۔'' وہ اس کے لیے اپارٹمنٹ کے اندر داخل ہونے کا رستہ چھوڑتے ہوئے معتدل انداز میں بولی۔ ''آپ کی بڑی مہربانی جو میرا یہ کام کردیا ورنہ مجھے چوکیدار کی منت کرنا پڑتی۔ آپ بھلے آدمی ہیں ورنہ آج کل کون کسی کی پروا کرتا ہے۔ میں آپ کو چائے پلائے بغیر جانے نہیں دوں گی۔''

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

اگرچہ وہ ٹی وی اسٹیشن کے قرب و جوار کا علاقہ نہیں تھا۔ تاہم مرحلہ وار سب کچھ ویسے ہی پیش آرہا تھا جیسا اس کے دوست کی سنائی ہوئی کہانی کا خاصّہ تھا۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ کشاں کشاں اس اپارٹمنٹ کے لاؤنج میں پہنچ گیا۔ میزبان عورت نے اپارٹمنٹ کا داخلی دروازہ بند کرنے کے بعد اسے ایک آرام دہ صوفے پر بٹھایا اور یہ کہتے ہوئے کچن کی سمت بڑھ گئی۔

''آپ آرام سے بیٹھیں، میں پانچ منٹ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔ آپ جلدی میں تو نہیں ہیں نا.....؟''

آخری جملہ اس طرح دار حسینہ نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ادا کیا تھا۔ جواب میں بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

''نن.....نہیں.....بالکل نہیں!''

''میرا نام شہلا ہے۔'' وہ اپنا تعارف کراتے ہوئے بڑے دل فریب انداز میں مسکرائی پھر سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اور آپ.....؟''

''ذاکر!'' اس نے اپنا نام بتادیا۔

''اچھا نام ہے.....'' وہ معنی خیز انداز میں بولی۔ ''ذاکر نام کے لوگ بڑے محنتی اور ہمت والے ہوتے ہیں اور.....اور موقع شناس بھی.....''

وہ اس کی تعریف کر کے لاؤنج سے نکل گئی اور ذاکر خود سے یہ سوال کرنے پر مجبور ہو گیا۔ ''کیا میں واقعی محنتی اور ہمت والا ہوں اور موقع شناس بھی.....؟''

اس کے اندر سے جواب موصول ہوا۔ ''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میں ایک محنتی اور دیانت دار انسان ہوں۔ میں نے ہمیشہ سچائی کا ساتھ دیا ہے لیکن جہاں تک موقع شناسی کا معاملہ ہے تو میں سمجھتا ہوں، اس میدان میں زیرو ہوں۔ موقع شناسی انسان کو مصلحت کوش اور دولت مند بنا دیتی ہے۔ اگر مجھ میں یہ گن ہوتے تو میں آج یوں بے روزگاری کی دلدل میں نہ پھنسا ہوتا۔''

اپنی حالتِ زار کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کے رگ و پے میں تلخی سی گھل گئی جس کی کڑواہٹ اسے حلق تک محسوس ہونے لگی۔ اس نے ان پریشان کن خیالات کو ذہن سے جھٹکا اور آنے والے لمحات کے کیف و سرور کے بارے میں سوچنے لگا۔

''میں موقع شناس بھی بن کر دکھاؤں گا۔'' اس نے خود کلامی کی۔ ''آج میں کوئی غلطی نہیں کروں گا۔ قدرت نے مجھے جو نشاط انگیز موقع فراہم کیا ہے، میں ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر اس موقع کا بھرپور فائدہ اٹھاؤں گا۔''

ذاکر بنیادی طور پر کوئی عیاش طبع شخص نہیں تھا۔ وہ زندگی بھر گناہ سے بہت دور رہا تھا لیکن مسلسل بے روزگاری کے عذاب نے اس کی مستقل مزاجی اور قوتِ ارادی میں دراڑ ڈال دی تھی۔ اس قسم کی سچویشن میں انسان کو کسی سہارے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ وہ ٹوٹنے کے کنارے پر کھڑا تھا۔ وہ ٹوٹ کر بکھرنا نہیں چاہتا تھا اسی لیے اس نے اپنا غم غلط کرنے کے لیے خود کو حالات کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

شہلا چائے لے کر آئی تو کتابِ آداب کو وہ کچن ہی میں چھوڑ آئی تھی تاہم ذاکر کو اس کا ''آپ'' سے ''تم'' پر اتر آنا بھی اچھا ہی لگا تھا۔ وہ اُن انبساط آفریں ساعتوں کے بارے میں سوچ کر جی جان سے خوش تھا جن میں ایسی بے تکلفی حد درجہ اپنائیت کا احساس دلا کر من و تو کے فرق کو مٹا ڈالتی ہے۔

''تمہیں بلڈنگ کے گیٹ پر کسی نے روکا تو نہیں تھا؟'' شہلا نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر استفسار کیا۔

''نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''وہاں پر مجھے کوئی دکھائی نہیں دیا۔ میں چپ چاپ اوپر چلا آیا۔''

''چوکیدار شکور عموماً گیٹ پر ہی ہوتا ہے لیکن ہو سکتا ہے، وہ اپنے کیبن میں اس وقت عصر کی نماز پڑھ رہا ہو۔'' وہ سرسری انداز میں بولی۔ ''میں ایک صحافی کی بیوی ہوں اور اپنے تئیں سوشل ورک کے پراجیکٹ بھی کرتی ہوں اور تم.....؟''

اس نے سوالیہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو ذاکر نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں فی الحال کچھ بھی نہیں کرتا۔''

''ہوں.....'' وہ ہونٹ بھینچ کر ٹٹولنے والے انداز میں مستفسر ہوئی۔ ''اس فی الحال سے پہلے تو کچھ کرتے ہی ہو گے.....ہیں نا؟''

''ہاں!'' اس نے گردن کو اثباتی جنبش دی اور بتایا۔ ''میں سیلز اور مارکیٹنگ کے شعبے سے وابستہ ہوں لیکن میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کسی کو یہاں پر ایمان داری اور نیک نیتی کی ضرورت نہیں ہے اسی لیے میں پچھلے چھ ماہ سے بے روزگار ہوں۔''

''ویری سیڈ.....'' وہ ہمدردی بھرے لہجے میں بولی۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

''یہ دنیا بہت ہی مفاد پرست اور خودغرض ہے ذاکر۔ یہاں کسی کو کسی کی پروا نہیں، بہرحال انسان کو ہمت نہیں ہارنا چاہیے۔ تم ٹرائی جاری رکھو۔ کہیں نہ کہیں تمہیں جاب مل ہی جائے گی۔''

''ہماری فیلڈ بہت محدود ہے۔'' وہ بیزاری سے بولا۔ ''پورے ملک میں تین چار کمپنیز ہی یہ کام کرتی ہیں اور وہاں میرا داخلہ ممنوع ہے۔''

''ارے...... یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' وہ حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولی۔ ''تم نے ان کمپنیز کے ساتھ ایسا کیا کر دیا ہے اور یہ بھی بتاؤ کہ وہ کمپنیز کس قسم کی پراڈکٹس کو ڈیل کرتی ہیں؟''

''تم سننا چاہتی ہو تو سنو......'' وہ بھی شہلا ہی کے طرزِ تکلم پر اتر آیا۔ ''یہ کمپنیز ہائی ٹیک ایکیوپمنٹس امپورٹ کرتی ہیں جو ریسرچ لیبارٹریز میں کام آتی ہیں۔ ہمارے کلائنٹس میں بڑی بڑی یونیورسٹیز اور فارماسیوٹیکلز سرفہرست ہیں۔ عام مارکیٹ میں ان مشینوں کی کھپت نہیں ہے اور جہاں تک تمہارا یہ سوال کہ میں نے ان معدودے چند کمپنیز کے ساتھ ایسا کیا کر دیا ہے تو سنو......'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے رکا پھر ان زہر میں بجھے ہوئے الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''ایک کمپنی کے مالک کے بیٹے نے بعض پے منٹس کے معاملات میں گڑبڑ کی تھی۔ میں نے اس کی چوری پکڑ لی لیکن الٹا اس حرام زادے نے مجھے اس فراڈ میں پھنسا دیا۔ مالک نے اپنے بیٹے کو معتبر جانا اور میری چھٹی کر دی۔ دوسری کمپنی میں اونر کا سالا اسے مسلسل چونا لگا رہا تھا۔ میں نے اس بدعنوان سالے کے خلاف تمام ثبوت اکٹھا کیے اور باس کے پاس پہنچ گیا۔ باس نے میری بات توجہ سے سنی۔ اگلے روز میں آفس پہنچا تو اکاؤنٹنٹ نے میرا حساب کر کے صرف اتنا کہا۔ ''کمپنی کو آپ کی مزید خدمات کی ضرورت نہیں ہے۔'' باقی کے واقعات بھی کچھ ایسے ہی ہیں۔''

''تمہاری پرابلم میری سمجھ میں آگئی ہے ذاکر۔'' وہ گہری نظر سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''دراصل، تم خود کو دنیا کے رنگ میں رنگنے کے بجائے اسے اپنے پیچھے چلانے میں بے دریغ توانائی ضائع کر رہے ہو۔''

''تو کیا تمہارے خیال میں، میں غلطی پر ہوں؟''

''نہیں، میں نے ایسا تو کچھ نہیں کہا۔''

''پھر توانائی ضائع کرنے کا مطلب؟'' ذاکر نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''آخر تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟''

''جاب کرنا تمہیں راس نہیں آتا کیونکہ تم اپنی فطرت سے مجبور ہو۔'' شہلا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کہیں بھی کچھ غلط ہو رہا ہو، تم اسے دیکھ کر نظرانداز نہیں کر سکتے چنانچہ تمہیں نوکری کے پیچھے بھاگنے کے بجائے اپنا کام کرنا چاہیے۔ ایک چھوٹی سی ذاتی کمپنی بناؤ اور اب تک جو پیشہ ورانہ تجربہ حاصل کیا ہے، اسے استعمال کرو۔ جب تم خود ہی باس ہو گے تو تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔''

''تم بڑی گہری نگاہ رکھتی ہو۔'' وہ توصیفی انداز میں شہلا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم نے واقعتاً میری پرابلم تک رسائی حاصل کر لی ہے۔ میں نے بھی تنگ آکر یہی فیصلہ کیا تھا کہ اب مجھے کسی کمپنی کی غلامی نہیں کرنا۔ مجھے ایک مخلص اور ایماندار سلیپنگ پارٹنر بھی مل گیا تھا۔ وہ رقم لگا رہا تھا اور کام مجھے کرنا تھا۔ ہم نے ایک کمپنی بھی رجسٹر کرا لی تھی اور مختلف پارٹیز سے بات چیت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اسی ذیل میں، میں ایک بزنس میٹنگ کے لیے ''عرب لیب'' واقع دبئی بھی جانے والا تھا کہ یہ کورونا وائرس میرے لیے وبال بن کر رہ گیا ہے۔ پوری دنیا کا معاشی اور معاشرتی نظام ٹھپ ہو کر رہ گیا ہے۔ میں نے سنا ہے، پاکستان میں بھی اگلے ہفتے لاک ڈاؤن کا اعلان ہونے والا ہے۔''

''تم نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولی۔ ''میری اطلاعات کے مطابق بیس مارچ کے بعد کسی وقت بھی ایسا اعلان متوقع ہے۔''

''یقیناً تمہاری اطلاعات صد فیصد درست ہوں گی کیونکہ تم ایک جرنلسٹ کی بیوی ہو۔'' وہ معتدل انداز میں بولا پھر پوچھا۔ ''تمہارے شوہر نظر نہیں آرہے۔ یقیناً وہ اس وقت ڈیوٹی پر ہوں گے اور رات گئے لوٹتے ہوں گے۔ وہ صحافت کے کس شعبے سے منسلک ہیں؟''

''تیمور کرائم رپورٹر ہے۔'' شہلا نے بتایا۔ ''اس کی اسٹوریز تہلکہ ڈال دینے والی ہوتی ہیں۔ بڑے بڑے بااثر افراد اس سے کنی کاٹ کر نکل جاتے ہیں کہ تیمور کہیں ان کا جلوس نہ نکال دے۔ تم نے ٹھیک کہا کہ وہ رات کو دیر ہی سے گھر لوٹتا ہے لیکن پچھلے دو روز سے وہ اسلام آباد گیا ہوا ہے، کسی آگ لگا دینے والی گرماگرم اسٹوری کی تلاش میں......''

''زبردست۔'' ذاکر نے جوش بھرے لہجے میں کہا۔

''ایسے رعب داب والے دھانسو قسم کے شخص کی بیوی ہونے میں تمہیں فخر تو محسوس ہوتا ہوگا...... ہیں نا؟''

''ایسا ویسا فخر......'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

Naqar Azeem www.pakistanipoint.com

ذاکر کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کا جواب سچائی کا آئینہ دار تھا یا طنز کا مرقع۔ وہ اس سے وضاحت مانگنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے لگاوٹ سے بولی۔

''ذاکر! میرے پاس تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے۔''

اُس کے دل کی دھڑکن یکا یک تیز ہوگئی اور یادداشت میں دوست کی سنائی ہوئی سنسنی خیز کہانی کروٹ بدل کر بیدار ہوگئی۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

''شہلا! کیسی خوش خبری؟''

''تم اس وقت جاب لیس ہو.....'' وہ بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ ''اور میرے پاس ایک پارٹ ٹائم جاب ہے، اگر تم کرنے کے لیے تیار ہو تو..... معاوضہ تمہارے تصور سے کہیں زیادہ۔ کیا کہتے ہو؟''

''تت..... تم کس ..... جاب کی بات..... کررہی ہو.....؟'' وہ اضطراری انداز میں منمنایا ہوا۔ ''کیا تم مجھے اس پارٹ ٹائم کی کچھ تفصیل بتاؤ گی؟''

''تمہیں میرے ساتھ اس اپارٹمنٹ پر تھوڑا وقت گزارنا ہوگا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''اور میرا ایک چھوٹا سا کام کرنا ہوگا۔ کیا تمہیں ڈرائیونگ آتی ہے؟''

ذاکر کے رگ وپے میں ایک سنسناہٹ سی دوڑ گئی اور خون کن پٹیوں پر ٹھوکریں مارنے لگا۔ ''ہاں، میں کار چلا لیتا ہوں۔'' وہ جذبات سے مغلوب آواز میں بولا اور پوچھا۔ ''کیا اس پارٹ ٹائم جاب کا تعلق کوئی گاڑی چلانے سے ہے؟''

''نہیں۔'' شہلا قطعیت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''یہ تو میں نے بس ایسے ہی پوچھ لیا ہے۔''

''اب یہ بھی بتا دو کہ تم مجھ سے کون سا کام کروانا چاہتی ہو؟'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں یہ بھی جاننا چاہوں گا کہ مجھے اس کام کا کتنا معاوضہ ملے گا؟''

قبل اس کے کہ شہلا اس کے سوالات کے جواب میں کچھ کہتی، ذاکر کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ذاکر نے اُلجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''کال لے لو.....!''

ذاکر نے کال ریسیو کرتے ہوئے سیل فون کو کان سے لگالیا۔

☆☆☆

ذاکر نے اس کال کے جواب میں نہایت ہی مختصر بات کی تھی۔ اس دوران میں شہلا یک ٹک اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے میں مصروف رہی تھی۔

''اگر میں غلط نہیں ہوں اور مجھے یقین ہے کہ میں غلط نہیں ہوں۔'' ذاکر نے جیسے ہی اپنا سیل فون جیب میں رکھا، شہلا نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''تم ایک شادی شدہ شخص ہو اور یہ کال تمہاری بیوی کی تھی؟''

''تمہارا اندازہ صد فیصد درست ہے۔'' ذاکر نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

شہلا نے کریدکا عمل جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا آج کل تم دونوں کے بیچ کوئی ٹینشن چل رہی ہے.....؟''

اس نے گول مول جواب دیا۔ ''ہاں، ایسا ہی سمجھ لو۔''

''مجھے تمہاری نجی زندگی کے بارے میں جاننے کا کوئی حق تو نہیں ہے لیکن ایک خیر خواہ کی حیثیت سے پوچھ رہی ہوں۔'' شہلا نے اپنائیت بھرے انداز میں کہا۔ ''اس ٹینشن کا سبب کیا ہے؟ ہو سکتا ہے، میں تمہارے کسی کام آجاؤں.....''

''بنیادی سبب تو پیسا ہی ہے۔'' وہ بُرا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''جب سے میں بے روزگار ہوا ہوں، جو یہ بے طعنے دے، دے کر میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اسے لگتا ہے، میں سنجیدگی سے کوشش نہیں کر رہا ہوں۔ ایک تو میری نیت پر شک، اوپر سے اس کے بھنڈار مشوروں نے میرا دماغ خراب کر کے رکھ دیا ہے۔''

''بھنڈار مشورے..... بہت خوب.....!'' شہلا نے ذاکر کی بات میں گہری دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ ''ذرا میں بھی تو سنوں کہ جو یہ تمہیں کون سے کیڑا کنڈی، کاٹھ کباڑ منصوبوں پر عمل کرنے کے لیے کہتی ہے؟''

''مثلاً یہ کہ.....'' ذاکر نے کڑوے لہجے میں بتانا شروع کیا۔ ''میں اپنے کام پر فاتحہ خوانی کروانے کے بعد کوئی آٹو لے کر اسے اوبر یا کریم پر چلانا شروع کر دوں۔ وہ اپنے کسی دور کے رشتے دار سے مجھے ماہانہ اقساط پر ایک آٹو رکشا لے کر دینے کے لیے بھی تیار ہے یا پھر میں کوئی پرچون کی دکان کھول لوں۔ اس کے مکے والے جوڑیا بازار میں ہول سیل کی دکانیں کرتے ہیں۔ وہ کہتی ہے، چار پانچ لاکھ کا سودا دکان میں بھروا دے گی، بس میں ایک دفعہ ''ہاں'' تو بولوں.....'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک افسردہ سانس خارج کی پھر بے بسی سے گردن ہلاتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

''بس، جویریہ کے سارے مشورے ایسے ہی لاف و گزاف ہوتے ہیں۔ مجھے تو بتاتے ہوئے بھی شرمندگی محسوس ہو رہی ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔ ازدواجی زندگی میں انسان کو اکثر اوقات ایسی ہی لایعنی صورتِ حال سے گزرنا پڑتا ہے۔'' شہلا نے اس کی دلجوئی کرنے والے انداز میں کہا۔ ''مجھے بتاؤ، کرنٹ سچویشن کیا ہے؟''

''جویریہ ننھے کاشف کو لے کر اپنی امی کے گھر چلی گئی ہے۔ ابھی اس نے یہی بتانے کے لیے کال کی تھی۔'' ذاکر نے دکھی لہجے میں بتایا۔ ''اس نے دوٹوک الفاظ میں مجھے باور کرا دیا ہے کہ جب تک میں برسرِروزگار نہیں ہو جاتا، وہ واپس نہیں آئے گی۔''

''میری نظر میں تمہاری بیوی ایک نافرجام عورت ہے۔'' شہلا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''انسان کو اتنا بھی نامہربان نہیں ہونا چاہیے۔ خیر..... کاشف کی عمر کیا ہے؟''

''ساڑھے تین سال۔'' ذاکر نے بتایا۔

''کیا تمہاری صرف ایک ہی اولاد ہے؟''

''ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''ہماری شادی کو پانچ سال ہو گئے ہیں۔''

''ہماری شادی بھی پانچ سال پہلے ہوئی تھی۔'' شہلا نے سرسری انداز میں کہا۔ ''لیکن ہم ابھی تک اولاد ایسی نعمت سے محروم ہیں۔''

''اوہ.....!'' ذاکر نے متاسفانہ انداز میں کہا۔

''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' شہلا تشفی آمیز لہجے میں بولی۔ ''میں دعوے کے ساتھ کہتی ہوں کہ جویریہ کل واپس تمہارے پاس آجائے گی۔''

''اور اس دعوے کی وجہ؟'' ذاکر نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم اتنے وثوق سے کس طرح یہ بات کہہ رہی ہو.....؟''

''دیکھو ذاکر.....'' وہ سمجھانے والے انداز میں بولی۔ ''جویریہ اس لیے تمہیں چھوڑ کر گئی ہے کہ اس وقت تمہاری جیب خالی ہے۔ کل بلکہ آج نصف شب کے بعد جب تمہاری جیب میں نوٹ بھرے ہوں گے تو وہ کشاں کشاں کھنچی چلی آئے گی۔''

''لیکن میری جیب میں اتنے نوٹ آئیں گے کہاں..... او مائی گاڈ!'' بات ادھوری چھوڑ کر اس نے حیرت بھری نظر سے شہلا کو دیکھا پھر بے حد اضطرابی لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے یاد آ گیا۔ تم نے تھوڑی دیر پہلے بتایا تھا کہ چند گھنٹوں کے کسی کام کے لیے تم مجھے میرے تصور سے کہیں زیادہ معاوضہ دو گی..... ہیں نا؟''

شہلا نے بڑے دل فریب انداز میں مسکراتے ہوئے گردن کو اثبات میں ہلانے پر اکتفا کیا۔

''جویریہ کا فون آجانے کی وجہ سے ہماری بات مکمل نہیں ہو پائی تھی۔ اس نے بے صبری سے اپنے ہاتھوں کو ملتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھے اس کام اور اس کے ہینڈسم معاوضے کے بارے میں کچھ بتانے والی تھیں.....؟''

''کام محنت مشقت اور زور آزمائی کا ہے۔'' شہلا نے اپنے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ سجا کر جواب دیا۔ ''گھنٹے، دو گھنٹے میں ہم فارغ ہو جائیں گے.....''

ذاکر کا دل کن پٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ اسے یقین ہو گیا کہ اس کے دوست نے جو ہیجان خیز کہانی سنائی تھی، اس کے پٹے ہونے کی گھڑیاں آن پہنچی ہیں۔ اس نے پُراشتیاق انداز میں شہلا سے پوچھا۔

''اور معاوضہ.....؟''

''میں تمہیں اس کام کے پورے دس ہزار روپے دوں گی۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔ ''لیکن کام کی تکمیل کے بعد.....''

''تم نے بتایا ہے کہ ہم ایک دو گھنٹے میں اس کام سے نمٹ جائیں گے۔'' وہ اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولا۔ ''میری بیوی گھر چھوڑ کر جا چکی ہے لہٰذا مجھے اب واپسی کی کوئی جلدی نہیں۔ تمہارا شوہر بھی اسلام آباد گیا ہوا ہے۔ اگر تم کہو تو میں پوری رات بھی اس اپارٹمنٹ پر رکنے کو تیار ہوں.....!''

شہلا چند لمحات تک گہری نظر سے اُسے دیکھتی رہی پھر جذبات سے عاری لہجے میں بولی۔ ''میں اس آپشن کے بارے میں سوچوں گی۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو ضرور.....''

''تو پھر کام شروع کریں؟'' ذاکر نے ندیدہ انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں استفسار کیا۔

''میں ایک بات کی وضاحت کر دوں۔'' وہ اس کی سنی اَن سنی کرتے ہوئے ٹھوس انداز میں بولی۔ ''کام کے دوران میں تم مجھ سے کوئی سوال نہیں کرو گے۔ اگر تم نے یہ غلطی کی تو میں تمہیں ضرور جواب دوں گی مگر ہر سوال پر تمہارا معاوضہ آدھا ہوتا چلا جائے گا جیسا کہ پہلے سوال پر معاوضے کی رقم دس ہزار سے گھٹ کر پانچ ہزار رہ جائے گی، دوسرے سوال

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

پر ڈھائی ہزار، تیسرے سوال پر ساڑھے ہزار یعنی ایک ہزار دو سو پچاس روپے..... اب یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے کہ تم یہاں سے کتنا کما کر لے جانا چاہتے ہو۔ مُرتم نے شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی زبان کو بند رکھا اور اپنی کارکردگی سے مجھے خوش کر دیا تو میں طے شدہ اس معاوضے کے علاوہ تمہیں انعام بھی دوں گی۔''

''ڈن..... مجھے تمہاری زبان بند رکھنے والی یہ شرط منظور ہے۔'' ڈاکر نے سینہ ٹھونک کر بڑے اعتماد سے کہا۔

''اب جلدی سے ہمیں کام پر لگ جانا چاہیے۔''

شہلا نے مطمئن انداز میں اس کی طرف دیکھا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''آؤ میرے ساتھ.....''

وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے ایک بیڈروم میں پہنچے جہاں پر لکڑی کی ایک بند پیٹی پڑی ہوئی تھی۔ مذکورہ چوبی صندوق کی پیمائش لمبائی میں پانچ فٹ، چوڑائی میں دو فٹ اور اونچائی یعنی گہرائی میں لگ بھگ ڈیڑھ فٹ رہی ہوگی۔ پیٹی کی کنڈی لگی ہوئی تھی اور اس میں تالا جھول رہا تھا۔

شہلا نے پیٹی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لفٹ کا دروازہ میرے اپارٹمنٹ کے عین سامنے کھلتا ہے۔ تمہیں اس پیٹی کو یہاں سے نکال کر بذریعہ لفٹ اپارٹمنٹ بلڈنگ کے بیس منٹ میں پہنچانا ہے۔ بیس منٹ میں کار پارکنگ ہے جہاں تیمور کی گاڑی کھڑی ہے۔ اس پیٹی کو گاڑی میں رکھنے کے بعد ہم دونوں بلڈنگ سے نکل جائیں گے۔ میں اس پیٹی کو ایک خاص مقام پر پہنچانا چاہتی ہوں۔ اس سلسلے میں تم میری مدد کرو گے، اس طرح کہ میں صرف مورل سپورٹ کے لیے تمہارے ساتھ رہوں گی۔ زور آزمائی کا سارا کام تمہیں ہی کرنا ہوگا..... ہاں..... کہیں کہیں میں بھی ہاتھ لگاتی رہوں گی۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''بس، یہی ہے وہ محنت، مشقت اور زور آزمائی والا کام جس کے لیے میں تمہیں دس ہزار روپے دوں گی۔''

ڈاکر کی حالت دیدنی تھی۔ اس نے پچھلے دو گھنٹوں میں، عیش و نشاط کے دو دور جن خواب بُن ڈالے تھے اور شہلا نے اس کے ارمانوں پر اوس کا چھڑکاؤ کر دیا تھا۔ ان لمحات میں وہ ناآسودگی کے جہنم میں کسی سیخ کباب کے مانند جل بھن رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے اس کا دماغ ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ گومگو کی کیفیت میں اس چوبی صندوق کو یک ٹک گھورے چلا جا رہا تھا کہ شہلا کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

شہر میں موسیقی

شہر میں موسیقی کی ایک بہت بڑی محفل کا اہتمام ہو رہا تھا۔ ایک صاحب پروگرام منیجر کے پاس آئے اور پروگرام میں شرکت کی اجازت چاہی۔

منیجر۔ ''آپ گانا گاتے ہیں؟''

وہ صاحب۔ ''نہیں۔''

منیجر ''سارنگی بجاتے ہیں؟''

وہ صاحب۔ ''نہیں۔''

منیجر۔ ''تو پھر طبلہ بجاتے ہوں گے؟''

وہ صاحب۔ ''نہیں۔''

منیجر (جھنجلا کر) ''تو پھر آپ کیا بجائیں گے؟''

وہ صاحب۔ ''تالیاں۔''

تازیہ علی، لاہور

بُری بات

ایک آرٹس مصلح لوگوں سے کہہ رہا تھا۔ ''شراب نوشی بہت بری عادت ہے۔ نشے میں دھت ہو کر آدمی اپنی بیوی سے لڑنے لگتا ہے، بچوں کو مارتا ہے، پڑوسیوں سے جھگڑنے لگتا ہے، فحش کلامی پر اتر آتا ہے، اپنے مالک مکان پر گولی چلا دیتا ہے اور سب سے بری عادت یہ ہے کہ نشے کی وجہ سے نشانہ خطا ہو جاتا ہے۔''

سکون

ریل میں سفر کا آغاز ہوتے ہی دو عورتوں نے ایک دوسرے سے لڑنا شروع کر دیا۔

ایک کہہ رہی تھی کہ کھڑکی کھولی گئی تو وہ سردی سے ٹھٹھر کر مر جائے گی۔ دوسری بضد تھی کہ کھڑکی بند کی گئی تو اس کا دم گھٹ جائے گا۔

مسافر اس عجیب جھگڑے سے سخت پریشان تھے۔ کسی نے تنگ آ کر گارڈ کو خبر دی۔ اس نے بہت سنجیدگی سے دونوں کا مؤقف سنا پھر مسافروں سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''پہلے کھڑکی کھولو، ایک مر جائے گی۔ اس کے بعد کھڑکی بند کر دو، دوسری کا قصہ بھی تمام ہو جائے گا اور بقیہ لوگوں کا سفر سکون سے طے ہو جائے گا۔''

اوکاڑہ سٹی سے تصویر العین کا فیصلہ

www.paksociety.com

''کیا سوچ رہے ہو۔ اگر کام سمجھ میں نہیں آرہا تو کوئی زبردستی نہیں ہے۔ تم ابھی اور اسی وقت واپس جاسکتے ہو۔ میں اس کام کے لیے کسی اور کی منت کرلوں گی جو پانچ سو روپے میں خوشی خوشی تیار ہوجائے گا۔ تمہاری بے روزگاری کی کہانی نے مجھے متاثر کیا ہے اور میں تو مدد کی نیت سے تمہیں دس ہزار روپے دینا چاہتی تھی ورنہ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ اس مزدوری کا زیادہ سے زیادہ محنتانہ کتنا ہونا چاہیے۔''

ذاکر نے شہلا کی بات پوری توجہ سے سنی۔ وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ اتنی سی لیبر کا دس ہزار روپے معاوضہ ناقابلِ یقین تھا۔ اس نے آج تک جہاں جہاں بھی ملازمت کی تھی، اس کی تنخواہ تیس ہزار سے پچاس ہزار کے درمیان رہی تھی۔ گویا، دو گھنٹوں کی گپ شپ اور دو گھنٹوں کی کڑی محنت کا یہ معاوضہ اس کی کم از کم دس دن کی تنخواہ کے برابر تھا اور اس وقت اسے پیسوں کی اشد ضرورت تھی لہٰذا وہ اس اسائنمنٹ کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ ایسے سنہری مواقع زندگی میں بار بار نہیں ملتے۔

وہ بڑے عزم سے چوبی صندوق کی جانب بڑھا پھر اس نے اپنی اس پارٹ ٹائم جاب کو سمجھنے کی غرض سے صندوق کو ٹٹولنے کے لیے قوت صرف کی۔ اس کے بعد وہ شہلا کی جانب دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''اس صندوق کے اندر تم نے کیا بھر رکھا ہے؟''

''افسوس کہ تم نے پہلے ہی قدم پر ایک سنگین غلطی کردی۔'' شہلا نے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں نے تمہیں سوال کرنے سے منع کیا تھا نا..... سمجھ لو، اب میں طے شدہ اصول کے مطابق تمہیں اس کام کا معاوضہ پانچ ہزار دوں گی..... اگر تم بہ خوشی یہ کام کرنے کے لیے تیار ہو تو.....''

''میں تیار ہوں، اس عزم کے ساتھ کہ یہ میری پہلی اور آخری غلطی ثابت ہوگی۔'' وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ''اب تم بھی اپنے وعدے کے مطابق میرے اس سوال کا جواب دینے کی پابند ہو۔ بتاؤ، یہ صندوق اتنا بھاری کیوں ہے؟ تم نے اس کے اندر کیا کیا ٹھونس رکھا ہے؟''

''میں اپنے الفاظ سے پھرنے والی نہیں ہوں۔'' شہلا ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ''اگر تمہیں اپنے سوال کا جواب چاہیے تو میرے ساتھ دوسرے کمرے میں چلو۔''

''ٹھیک ہے، چلتا ہوں۔'' وہ کسی فرماں بردار بچّے کے مانند جلدی سے بولا۔ ''لے چلو مجھے تم کسی بھی کمرے میں۔''

اب کی بار شہلا اسے جس کمرے میں لائی، وہ اسٹڈی کم بیڈ روم کا منظر پیش کررہا تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ سنگل بیڈ لگا ہوا تھا جس کی پائنتی کی جانب ایک ٹیبل اور چیئر رکھی نظر آرہی تھی۔ ٹیبل پر مختلف قلم، کاغذات اور چند کتابوں کے علاوہ ایک مکمل کمپیوٹر سسٹم بھی موجود تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ کوئی شخص وہاں بیٹھ کر لکھنے پڑھنے کا کام کرتا ہوگا۔ بیڈ کی مخالف سمت والی دیوار پر بک شیلف بنے ہوئے تھے جو کسی مفلس کی جیب کے مانند خالی دکھائی دیتے تھے۔

''یہ سب کیا ہے شہلا۔ تم مجھے یہاں کیوں لائی ہو؟'' ذاکر نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا پھر جلدی سے بولا۔ ''اور تم میرے اس استفسار کو معاوضہ کم کردینے والا کوئی سوال تصور نہیں کرلینا۔ جب تک میرے پہلے سوال کا جواب نہیں دوگی، میں اس ضمن میں دریافت کا عمل جاری رکھوں گا۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے..... زیادہ سینٹی (سینٹی مینٹل) ہونے کی ضرورت نہیں۔'' شہلا نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''میں تمہارے سوال کا تفصیلی جواب دے رہی ہوں۔ پوری توجہ سے سننا کیونکہ میں دہراؤں گی نہیں۔''

''ٹھیک ہوگیا.....'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

''یہ بیڈ روم تیمور کا ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بتانے لگی۔ ''مگر میں اسے اپنی سوتن کا بیڈ روم کہتی ہوں۔ اس کمرے میں نظر آنے والی اور دکھائی نہ دینے والی ہر معمولی اور غیر معمولی چیز میرے لیے ایک سوتن کی حیثیت رکھتی ہے۔ تیمور دوپہر میں بارہ ایک بجے تک سو کر اٹھتا ہے پھر کبھی ناشتا کرکے اور بسا اوقات ناشتا کیے بغیر وہ فیلڈ میں نکل جاتا ہے جہاں سے اس کی واپسی رات گئے ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے اس بیڈ روم میں بند ہوکر کمپیوٹر اور کتابوں کے ساتھ مصروف ہوجاتا ہے یا پھر اپنی اسٹوریز کی نوک پلک سنوارنے میں لگ جاتا ہے۔ میرے لیے اس کے پاس کوئی وقت نہیں ہے۔ مجھے محسوس ہونے لگا ہے کہ میں کوئی زندہ انسان نہیں ہوں بلکہ چلتی پھرتی ایک لاش ہوں جسے تیمور نے ایک شوپیس سمجھ کر اپنے گھر میں رکھا ہوا ہے۔ تیمور کے اس غیر انسانی رویّے نے مجھے اندر باہر سے توڑ کر رکھ دیا ہے اور میں نے ایک عجیب وغریب قدم اٹھانے کا فیصلہ کرلیا ہے..... اپنی ہر سوتن سے بھیانک انتقام لینے کا فیصلہ۔''

شہلا نے لمحاتی توقف کرکے ٹٹولنے والی نظر سے ذاکر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مبسوط جنون کو دیکھ کر ذاکر اندر سے ہل گیا۔ شہلا ان لمحات میں بڑے خطرناک موڈ

www.pakistanipoint.com

میں نظر آتی تھی، کچھ بھی کر گزرنے کے لیے ایک دم تیار.....

ذاکر کے ذہن میں گوناگوں سوالات مچل رہے تھے لیکن اس نے بڑی شدت سے استفساری خواہش کو دبا لیا مبادا اس کا محنتانہ کہیں مزید کم نہ ہوجائے۔

”میری سوتنوں کی فہرست میں سب سے اوپر تیمور کی کتابوں کا نام لکھا ہوا ہے۔“ وہ اپنی وضاحت کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”لہٰذا میں نے وہیں سے ”بسم اللہ“ کی ہے۔ آج کل کوئی بھی کتاب کلو، دو کلو سے کم وزن کی نہیں ہوتی اور بعض ضخیم کتابیں تو پانچ کلوگرام وزن تک بھی جا پہنچتی ہیں۔ میں نے لکڑی کے اس صندوق میں تیمور کی چھوٹی بڑی ساٹھ کتابیں بھر دی ہیں جنہیں میں تمہاری مدد سے سمندر بُرد کرنے جارہی ہوں۔ خس کم، جہاں پاک۔ آج مجھے اپنی سب سے زیادہ خطرناک سوتن سے نجات مل جائے گی۔ باقیوں کی باری بعد میں آئے گی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق، اس چوبی صندوق کا وزن کتابوں سمیت مجموعی طور پر ایک سو کلوگرام کے آس پاس ہوگا۔ میں سمجھتی ہوں کہ میں نے تمہارے سوال کا جواب دے دیا ہے۔ تم جان چکے ہو کہ مذکورہ صندوق اس قدر بھاری کیوں ہے۔ اگر تمہیں میری بات کا یقین نہ ہو تو میں تمہارے اطمینان کے لیے صندوق کھول کر دکھا سکتی ہوں۔ آؤ میرے ساتھ.....“

ذاکر نے تیمور والے اس اسٹڈی کم بیڈروم کی دیوار پر موجود خالی بک شیلف دیکھ لیے تھے۔ یقیناً صندوق میں بھر دی جانے والی ساٹھ کتابیں انہی شیلف کی زینت ہوا کرتی تھیں۔ ذاکر نے کسی تصدیقی عمل کی ضرورت محسوس نہیں کی اور حتمی لہجے میں بولا۔

”مجھے تمہاری بات کا یقین ہے شہلا اس لیے میں صندوق کو کھلوانے کی حاجت محسوس نہیں کرتا۔ میرا خیال ہے، مجھے اس پراجیکٹ پر کام شروع کردینا چاہیے۔“

”ابھی نہیں...... ایک گھنٹے بعد ٹھیک دس بجے۔“ وہ اٹل انداز میں بولی۔ ”اور اس ایک گھنٹے میں ہم سکون سے ڈنر کریں گے۔ فریج میں ایک لارج پزا اور گارلک بریڈ رکھی ہے۔ تم جا کر لاؤنج میں بیٹھو۔ میں مائیکرو میں گرم کر کے لاتی ہوں۔“ کسی فوری خیال کے تحت وہ ٹھٹھکی پھر پوچھا۔ ”ذاکر! تم پزا کھا لیتے ہونا.....؟“

”بڑے شوق سے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”مجھے پزا بہت زیادہ پسند ہے۔ آئی لوو پزا۔“

”دیٹس گریٹ۔“ شہلا نے سراہنے والی نظر سے اس کی جانب دیکھا پھر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ ذاکر اور شہلا اپنا کام نمٹانے کے بعد تیمور کی گاڑی میں واپس آرہے تھے۔ چوبی صندوق کو سمندر بُرد کرنے میں انہیں کسی دقت یا دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ ٹھیک دس بجے شہلا نے لفٹ کو کال کیا تھا۔ اس سے پہلے ذاکر نے اپنی جسمانی توانائی کا بھرپور استعمال کر کے متذکرہ بالا صندوق کو اپارٹمنٹ کے داخلی دروازے تک بہ آسانی پہنچا دیا تھا پھر جیسے ہی لفٹ سیکنڈ فلور پر پہنچی اور اس کا دروازہ کھلا، ذاکر نے صندوق کو گھسیٹ کر لفٹ کے اندر پہنچا دیا۔ اس دوران میں شہلا لفٹ کو اوپن پوزیشن پر روکے کھڑی رہی تھی۔

بیس منٹ میں تیمور کی گاڑی لفٹ کے نزدیک ہی پارک تھی۔ یہ دیکھ کر ذاکر نے اطمینان کی سانس لی کہ وہ پیچھے سے کھلی ایک ہائی لکس ٹویوٹا جیپ تھی۔ اگر وہ کوئی کار ہوتی تو اتنے بڑے صندوق کو اس کی ڈگی میں سیٹ کیا جاسکتا تھا اور نہ ہی کار کے اندر کسی سیٹ پر اسے رکھنا ممکن تھا۔ اگرچہ صندوق کو جیپ کے عقبی اوپن پورشن میں منتقل کرنے میں ذاکر کو دانتوں پسینا آگیا تھا تاہم اس نے کسی نہ کسی طرح صندوق کو لٹا کر، بٹھا کر اور کھڑا کر کے دو تین اسٹیپ میں جیپ پر چڑھا کر ہی دم لیا تھا۔

”تمہاری کارکردگی نے مجھے بہت متاثر کیا ہے اور میں دل سے خوش ہوں۔“ شہلا نے ستائشی نظر سے ذاکر کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”اسی خوشی میں، میں نے ایک انقلابی فیصلہ کیا ہے۔“

ڈرائیونگ سیٹ ذاکر نے سنبھال رکھی تھی اور شہلا اس کے پہلو میں پسنجر سیٹ پر براجمان تھی۔ سمندر کی طرف جاتے ہوئے بھی جیپ کو ذاکر ہی نے ڈرائیو کیا تھا۔

”عمدہ کارکردگی دکھانے پر تم نے مجھ سے کسی خصوصی انعام کا وعدہ کیا تھا۔“ ذاکر ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے بولا۔ ”کیا تمہارے انقلابی فیصلے کا تعلق اسی انعام سے ہے؟“

”صحیح سمجھے ہو۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”اب میں تمہیں پورے دس ہزار روپے دے رہی ہوں۔ پانچ ہزار تمہارا محنتانہ اور پانچ ہزار انعامی بونس۔“

بات کے اختتام پر شہلا نے اپنا پرس کھول کر اندر سے ایک ہزار مالیت کے دس کرارے نوٹ برآمد کیے پھر انہیں ذاکر کی طرف بڑھاتے ہوئے دوستانہ انداز میں کہا۔

''گن کر جیب میں رکھ لو۔''

''تم نے گنے، میں نے گنے...... ایک ہی بات ہے۔''

ذاکر نے وہ رقم شہلا کے ہاتھ سے لے کر اپنی پتلون کی سائڈ پاکٹ میں رکھ لی اور گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''بہت شکریہ۔''

''تمہاری رہائش کس طرف ہے؟'' شہلا نے پوچھا۔

''میں چاہتی ہوں، تمہارے گھر کے نزدیک کہیں ڈراپ کر دوں۔ اتنی رات کو آٹو پکڑنا مناسب نہیں ہوگا۔ آج کل ویسے ہی اسنیچنگ کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوگیا ہے۔''

''میں ادھر جوبلی پر رہتا ہوں۔'' ذاکر نے بتایا۔ ''ہم اس وقت ایم اے جناح روڈ پر ہیں۔ دس منٹ تک ''سعید منزل'' پہنچ جائیں گے۔ پھر تم گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر آ جانا اور میں سعید منزل پر اتر کر واک کرتے ہوئے اپنے گھر چلا جاؤں گا۔''

''ہاں...... یہی ٹھیک رہے گا۔'' شہلا نے معتدل انداز میں کہا۔

سعید منزل پر پہنچ کر ذاکر نے جیپ کو سڑک کے کنارے روک دیا تاہم وہ بدستور ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان رہا۔ شہلا اپنی سائڈ کا دروازہ کھول کر نیچے اترنے لگی تو ذاکر نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''ایک منٹ رک جاؤ۔ مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔''

شہلا نے دروازے کو چھوڑ دیا اور ذاکر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تمہارا محنتانہ تمہاری جیب میں منتقل ہو چکا ہو۔ اب کسی کٹوتی کا خدشہ باقی نہیں رہا۔ پوچھو...... کیا پوچھنا چاہتے ہو؟''

''تیمور اس وقت کہاں ہے؟'' ذاکر نے سرسراتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

''میں نے...... تمہیں...... بتایا تو تھا......'' وہ گڑبڑا کر بولی۔ ''تیمور کسی سنسنی خیز اسٹوری کی تلاش میں اسلام آباد گیا ہوا ہے۔''

''کیا میری پیشانی پر کیپٹل ''سی'' بنا ہوا ہے۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''یا میں شکل سے تمہیں ماموں نظر آتا ہوں؟''

''ذاکر! یہ تم کس قسم کی باتیں کر رہے ہو......؟'' وہ خفگی بھرے لہجے میں بولی۔

''مجھے پیسوں کی اشد ضرورت تھی اس لیے میں اپنی زبان کو حلق سے نیچے اتار کر وہ سب کرتا چلا گیا جو تم نے مجھ سے کرانا چاہا۔'' وہ گمبھیر انداز میں بولا۔ ''اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں کوئی للو ہوں۔ میں سچائی جان چکا تھا لیکن میں نے تمہیں اپنی جانکاری کا احساس نہیں ہونے دیا۔ طوفان گزر چکا ہے۔ تمہارے حق میں بہتر ہوگا کہ مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ۔ میں تمہاری زبان سے اظہارِ حقیقت سننا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد ہمارے راستے الگ ہو جائیں گے...... ہمیشہ کے لیے۔''

شہلا چند لمحات تک سوچتی ہوئی نظر سے ذاکر کو گھورتی رہی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''ٹھیک ہے، میں تمہیں حقیقت بتا دوں گی۔ پہلے یہ بتاؤ، تم کیا جان چکے ہو؟''

''اوکے...... فائن......'' ذاکر نے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔ ''جب میں نے تمہارے اپارٹمنٹ کے بیڈروم میں چوبی صندوق پر زور آزمائی کرنے کے بعد تم سے پوچھا تھا کہ یہ صندوق اتنا بھاری کیوں ہو۔ تم نے اس کے اندر کیا بھر رکھا ہے؟'' تو اس وقت میں رکوع کے بل صندوق پر جھکا ہوا تھا اور اس پوزیشن میں اتفاق سے میری نگاہ بیڈ کے نیچے چلی گئی تھی اور...... میں نے بیڈ کے نیچے ایک سو کے قریب انبار کی صورت بے ترتیب کتابیں رکھی دیکھ لی تھیں۔ یقیناً یہ وہی کتابیں تھیں جن کے بارے میں تم نے مجھے ایک ''بیڈ ٹائم اسٹوری'' سنا کر مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی کہ تیمور کے بک شیلف میں سے اس کی ساٹھ کتابیں نکال کر تم نے صندوق میں بھر دی ہیں تاکہ تم اپنی ان سو کالڈ سوتنوں کو سمندر بُرد کر سکو۔ مجھے اس امر میں کوئی شک نظر نہیں آ رہا کہ گھر پہنچ کر تم ان کتابوں کو دوبارہ بک شیلف میں سجا دو گی...... شہلا! اگر مجھے رقم کی شدید ضرورت نہ ہوتی تو میں تمہاری اس پیشکش کو فوراً قبول کر لیتا جب تم نے بڑے اعتماد سے کہا تھا۔ ''اگر تمہیں میری بات کا یقین نہ ہو تو میں تمہارے اطمینان کے لیے صندوق کو کھول کر دکھا سکتی ہوں۔ آؤ میرے ساتھ......''

ذاکر بات نامکمل چھوڑ کر تیز نظر سے شہلا کو تکنے لگا۔

وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''تو اب کیا......؟''

''کوئی بھی شخص بیڈ کے نیچے آٹھ، دس درجن کتابوں کو اس طرح جمع کر کے نہیں رکھتا الا یہ کہ انہیں چھپانا مقصود نہ ہو اور...... ایسی چھپن چھپائی کسی نیک مقصد کے لیے تو کی نہیں جاتی۔'' ذاکر نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''اب یہ کہ...... مجھے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اس چوبی صندوق کے اندر کتابیں ہرگز ہرگز نہیں تھیں۔ میں تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں کہ ہم ابھی کیا چیز سمندر بُرد کر کے آئے ہیں۔ اگر سچ بولنے کا موڈ ہے تو جواب دینا ورنہ خاموش رہنا۔ اگر تم

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

زبان کھولو گی تو یہ معاملہ یہیں پر رفع دفع ہو جائے گا اور خاموشی اختیار کرنے کی صورت میں، میں کہاں تک جا سکتا ہوں، وہ تمہارے وہم وگمان میں بھی نہیں سما سکتا.....''

شہلا کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں بولنا شروع کیا۔ ''انیلا میری عزیز از جان دوست تھی۔ وہ ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی میں جاب کرتی تھی۔ اس کی جاب رسک پر آ گئی تھی۔ اگر وہ اپنا ٹارگٹ پورا نہ کرتی تو جاب اس کے ہاتھ سے نکل جاتی۔ نوکری کو بچانے کے لیے اسے ایک میگا ایڈ کی ضرورت تھی۔ وہ اسی ہائی پروفائل اشتہار کے حصول کے لیے تگ و دو کر رہی تھی کہ کسی جاننے والے کے توسط سے اس کی سکندر سے بات ہوئی۔'' لمحاتی توقف کر کے شہلا نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

''سکندر ایک ریئل اسٹیٹ ایجنٹ ہے۔ اس نے انیلا کو اپنے آفس میں بلا لیا۔ جب انیلا سکندر کے پاس پہنچی تو وہاں پہلے سے ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ سکندر نے انیلا کا پُرتپاک خیر مقدم کیا اور اسے کولڈ ڈرنک پلانے کے بعد کہا۔

''شعیب بھائی ایک میگا سی اسکیم لانے والے ہیں جس کے لیے بہتر قسم کی پبلسٹی کمپین بنائی گئی ہیں۔ میں آپ کو ایسے اشتہار دلوا سکتا ہوں جو آپ کے کیریئر میں چار چاند لگا دیں گے لیکن ایک چھوٹی سی پرابلم ہے۔''

''کیسی پرابلم؟'' انیلا نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''آپ جانتی ہوں گی کہ شعیب بھائی اس شہر کے کتنے بڑے بلڈر ہیں۔'' سکندر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جو لوگ ان کی ترقی سے جلتے ہیں وہ ان کے حوالے سے طرح طرح کی منفی باتیں کرتے ہیں جن میں شعیب بھائی پر سب سے بڑا الزام ''لینڈ گریبر'' ہونے کا ہے۔ میں شعیب بھائی کو پچھلے بیس سال سے جانتا ہوں۔ وہ بہت ہی سچے اور کھرے انسان ہیں۔ وہ تو کسی لینڈ گریبر (LAND GRABER) سے ہاتھ ملانا بھی پسند نہیں کرتے۔''

''آپ کسی چھوٹی سی پرابلم کا ذکر کر رہے تھے۔'' انیلا نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

''میں اسی طرف آ رہا تھا۔'' سکندر جلدی سے بولا۔ ''میں نے شعیب بھائی سے آپ کے بارے میں بات کی تھی۔ وہ آپ سے رُوبرو ملنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کسی دن ایک گھنٹا نکال سکیں تو میں آپ کو اپنے ساتھ لے چلوں گا۔

اصل میں پچھلے دنوں ان کے ساتھ دو تین فراڈ ہو گئے ہیں۔ بعض شاطر لوگ شعیب بھائی کی سادگی کا ناجائز فائدہ اٹھا لیتے ہیں اسی لیے انہوں نے زیادہ سختی کر دی ہے۔''

انیلا نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی پھر پوچھا۔ ''سکندر صاحب! کیا ہم آج ہی شعیب بھائی سے ملنے نہیں جا سکتے؟''

''میں معلوم کرتا ہوں کہ وہ اس وقت کہاں ملیں گے۔'' سکندر نے ٹیلی فون کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس دوران میں دوسرا شخص، ان دونوں سے لاتعلق بیٹھا اخبار بینی کا شوق پورا کرتا رہا تھا۔ سکندر نے دو تین جگہ فون گھمانے کے بعد انیلا کو خوش خبری سنائی۔

''آپ کے ستارے خاصے موافقت میں چل رہے ہیں۔ شعیب بھائی اپنے آفس میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ پندرہ منٹ میں آنے کو کہا ہے۔ ہمیں فوراً نکلنا ہوگا۔'' پھر وہ اخبار بین شخص کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یار! تم بھی ہمارے ساتھ ہی چلو۔ میں راستے میں تمہیں ڈراپ کر دوں گا۔''

''آئندہ پانچ منٹ میں وہ تینوں نیلی ہائی روف میں بیٹھ کر کسی انجانی سمت میں رواں دواں ہو چکے تھے۔'' شہلا نے اپنے بیان کو سمیٹتے ہوئے کہا پھر ذاکر سے پوچھا۔ ''کیا تم اندازہ لگا سکتے ہو، اس روز نیلی ہائی روف میں کون سا دلدوز واقعہ پیش آیا ہوگا.....؟''

ذاکر نے نفی میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

''اپنا سیل نمبر بتاؤ۔'' شہلا نے اپنے سیل فون کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے کہا۔

ذاکر نے ٹھہرے ہوئے انداز میں اپنا کانٹیکٹ نمبر دہرا دیا۔

''ایک چھوٹا سا ویڈیو کلپ تمہیں بھیج رہی ہوں۔'' وہ زخمی لہجے میں بولی۔ ''تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔''

شہلا کی بات ختم ہوتے ہی مذکورہ ویڈیو کلپ ذاکر کو موصول ہو گیا۔ نیلی ہائی روف ایک ویران علاقے میں کھڑی تھی اور اس کے اندر، دو درندے ایک انسان کو بھنبھوڑ رہے تھے۔ یہ دل خراش منظر اس نے دیکھا اور شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ گھبرا کر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اگلے ہی لمحے شہلا کی ماتمی آواز اس کی سماعت کو چیر گئی۔

''جس بے بس اور لاچار لڑکی کو بیدردی سے تار تار کیا جا رہا ہے وہ میری عزیز از جان دوست انیلا ہے۔ تم نے دیکھا، دو گرسنہ گرگے کس طرح میری انیلا کی عزت کا جنازہ

www.paksociety.com

نکال رہے ہیں...... دیکھا کہ نہیں؟''

''ہاں، دیکھا ہے.....'' ذاکر نے آنکھیں کھول کر افسوس بھرے لہجے میں کہا۔''ان میں سے ایک تو رئیل اسٹیٹ ایجنٹ سکندر ہے مگر تم نے دوسرے بندے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟''

''دوسرا وہی نامراد ہے جس کی لاش کو ہم نے ابھی سمندر بُرد کیا ہے۔'' وہ زہرخند لہجے میں بولی۔

''تمہارا مطلب ہے..... تیمور؟''

''ہاں۔'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

''یہ ویڈیو کلپ تمہیں کہاں سے ملا؟'' ذاکر نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

''دو ماہ پہلے، خودکشی کرنے سے قبل انیلا نے مجھے بھیجا تھا۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔''سکندر اور تیمور نے اس روز انیلا کے ساتھ جو درندگی کی، اس کی ویڈیو بھی بنالی تھی اور سکندر نے یہ ویڈیو انیلا کو بھیجی تھی، اس دھمکی کے ساتھ کہ اگر اس نے اس واقعے کے بارے میں کسی کو بتایا تو وہ لوگ اس ویڈیو کلپ کو آن لائن ڈال دیں گے۔ انیلا بہت ہی معصوم اور بھولی بھالی لڑکی تھی۔ وہ ان لوگوں کی دھمکی میں آگئی۔ اس نے اپنی بے حرمتی کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا بلکہ خود کو بتانے کے قابل ہی نہیں چھوڑا...... اگر انیلا اپنی جان لینے سے پہلے یہ ویڈیو کلپ مجھے نہ بھیجتی تو مجھے کبھی پتا نہ چلتا کہ اس بے چاری کے ساتھ آخر ہوا کیا تھا۔ تیمور کو قرار واقعی سزا دینے کے لیے مجھے بڑی سمجھ داری کے ساتھ منصوبہ بندی کرنا پڑی اور بالآخر میں کامیاب ہوگئی۔''

''تو کیا تیمور کے بعد سکندر کی باری ہے؟'' ذاکر نے گمبھیر انداز میں سوال کیا۔

''چند روز قبل وہ اپنی باری لے چکا۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا...؟'' ذاکر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔''کیا تم نے اسے بھی سمندر بُرد کر دیا ہے؟''

''نہیں۔'' وہ ایک افسردہ سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔''میں نے تو اس کا نمبر تیمور کے بعد لگایا تھا مگر میرے شکار کو قدرت نے اُچک لیا اور تم تو جانتے ہی ہو کہ قدرت کی پکڑ گھن اور گیہوں کو اُن کے میرٹ پر لیتی ہے۔ سکندر حال ہی میں بیرونِ ملک سے لوٹا ہے اور اس کا کورونا وائرس ٹیسٹ پازیٹو آیا ہے۔ اس وقت وہ قرنطینہ میں ہے اور اپنی آخری سانسیں پوری کر رہا ہے۔''

بات کے اختتام پر شہلا کی آنکھوں میں ایک عجیب سی حیوانی چمک نمودار ہوئی۔ ذاکر نگاہ چرا کر ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے اُلجھن زدہ لہجے میں بولا۔

''ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ انیلا تمہاری بڑی کلوز فرینڈ تھی۔ یقیناً وہ اور تیمور ایک دوسرے کو جانتے ہوں گے۔ پھر بھی تیمور نے کچھ خیال نہیں کیا؟''

''اول، وہ دونوں ایک دوسرے کے صورت آشنا نہیں تھے۔'' شہلا معتدل انداز میں بولی۔''کبھی ان کا آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ دوم، اگر وہ ایک دوسرے سے پوری طرح متعارف ہوتے تو تمہارے خیال میں حرص و ہوس کی اس ننگِ انسانیت نگری میں صرف بیوی کی شناسا دوستوں کو ہی استثنیٰ حاصل ہے؟ باقی...... مالِ ناشناسم، دل بے غیرتم......!''

''نہیں، ہرگز نہیں۔'' ذاکر نے زور دے کر چٹانی لہجے میں کہا۔''جو غلط ہے، وہ سر بہ سر غلط ہے۔''

''کچھ اور پوچھنا چاہتے ہو؟'' وہ اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

''بس، آخری سوال......'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔''یہ بتاؤ، تم تیمور کی غیر حاضری کو کیسے جسٹیفائی کرو گی؟''

''ویری سمپل۔'' وہ قاتلانہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔''ایک رپورٹر کے سر پر ہمہ وقت شمشیرِ برّاں لٹکتی رہتی ہے۔ ڈینیل پرل کا حشر لوگوں کی یادداشت میں محفوظ ہے۔ تیمور کو بھی دو تین گروپس کی جانب سے لائف تھریٹس تھیں۔ میں کل صبح اس کے اخبار کے آفس فون کر کے انہیں بتاؤں گی کہ تیمور رات کو گھر نہیں آیا۔ اس کے بعد وسیع پیمانے پر اس کی تلاش کا کام شروع ہو جائے گا۔ پھر جو قدرت کو منظور ۔ جلد یا بہ دیر، اس کی گمشدگی کا راز افشا ہو ہی جائے گا اور اگر ایسا نہ بھی ہوا تو...... آئی ڈونٹ کیئر!''

بات ختم کرتے ہی وہ اپنی سائڈ کا دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکل آئی۔ ذاکر کے پاس اسٹیئرنگ چھوڑنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کے بعد شہلا نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''ڈو یو کیئر......؟''

ذاکر نے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور گردن جھکا کر اپنی راہ ہولیا۔ ہر سوال اس قابل نہیں ہوتا کہ اس کا جواب بھی دیا جائے!

❖ ❖ ❖

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

پہلی محبت

سیریناراض

پہلا قدم... پہلی کامیابی... اور پہلی محبت زندگی کے انمول و یادگار تحفے ہوتے ہیں... گردشِ ایام کے باوجود وہ ذہن و دل میں تروتازہ رہتے ہیں... نوجوانی میں جو کلی کھلتی ہے... وہ ہمیشہ کے لیے اپنی مسحورکن خوشبو جسم میں چھوڑ جاتی ہے... سائنس کے شعبے سے تعلق رکھنے والے ایک لڑکے کا ماجرا... وہ اپنی پہلی محبت کو یادگار سمجھ کر سینے سے لگائے بیٹھا تھا...

ہجر و فراق اور وصال کے مراحل سے گزرتی محبت کا انجام.....

ریٹائرڈ پروفیسر البرٹ فیوری کا شمار کیریئر قریبی مڈل کونیکٹی کٹ اسٹیٹ کالج میں کررہا، وہ بائیولوجیکل کیمسٹری اور مالیکولر فارمالوجی کا استاد تھا۔ وہ ہمیشہ سے اس چار کشادہ کمروں پر مشتمل مکان میں رہ رہا تھا۔ اس کے والد نے یہ مکان اس کی پیدائش سے قبل ہی خرید لیا تھا۔ باپ کا انتقال تو جوانی میں ہی ہوگیا جبکہ دو سال قبل ماں بھی پچاسی برس کی عمر میں چل بسی۔ جن دنوں البرٹ پی ایچ ڈی کررہا تھا تو اس کے لیے اسے

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

گھر سے دور کسی دوسری جگہ رہنا پڑا۔ تاہم وہ اپنی ماں کی خیریت معلوم کرنے ہر ہفتے گھر آیا کرتا تھا۔ پہلے اس کے پاس ایک پرانی واکس ویگن تھی لیکن اب وہ دس سال پرانی وولوو ویگن چلا رہا تھا۔

گزشتہ روز اسے اپنے میل باکس میں ایک ہلکا سا پیکٹ ملا جو کالج والوں نے بھیجا تھا۔ اس نے وہیں پورچ میں کھڑے کھڑے پیکٹ کھولا۔ اس کے اندر ایک لفافے میں ہاتھ سے لکھا ہوا خط تھا۔ اس لفافے پر اس کا نام اور کالج کا پتا درج تھا اور وہ خط چار ماہ قبل سترہ جون کو سپردِ ڈاک کیا گیا تھا۔

البرٹ نے کچن کی میز پر بیٹھ کر وہ خط پڑھنا شروع کیا۔ اس کی عبارت کچھ یوں تھی۔ ''پیارے البرٹ! امید ہے کہ تم مجھے بھولے نہ ہوگے اور میری دردناک کہانی سن کر تم مجھ سے ضرور ہمدردی کرو گے۔ میں نے گزشتہ تیس برسوں میں کسی کو خط نہیں لکھا لیکن تمہارے علاوہ میں کسی اور کو اپنا دکھ نہیں بتا سکتی ورنہ تمہیں بھی خط نہ لکھتی کیونکہ تم ہی میری پہلی محبت ہو۔''

''میرا شوہر مجھے قتل کرنا چاہتا ہے۔ وہ ایسا کرکے راہِ فرار اختیار کرسکتا ہے۔ ہماری شادی کو تیئس برس ہو چکے ہیں۔ اس کا نام فرینک ڈیل ویکیو جونیئر ہے۔ اور اگر تم نیویارک آؤ تو تمہیں بل بورڈز، اخبارات اور ٹی وی کے ذریعے معلوم ہو جائے گا کہ فرینک کون ہے۔ اس وقت مجھے ایک ایسے شخص کی مدد کی ضرورت ہے جس پر بھروسا کرسکوں۔ میں پولیس یا کسی وکیل کی مدد نہیں لے سکتی کیونکہ اس طرح فرینک کو معلوم ہو جائے گا۔ میں جانتی ہوں کہ اتنے سالوں کے بعد تم سے کچھ کہنا بہت عجیب لگ رہا ہے لیکن تم میری زندگی میں آنے والے واحد مرد ہو جس کی سچائی اور خلوص پر مجھے پورا یقین ہے۔ تم نے ہمیشہ میرے ساتھ اچھا کیا جبکہ میرا رویہ اس کے برعکس تھا۔''

اس خط سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس عورت کے پاس بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، صرف پیسا ہی اس کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ اس نے کبھی تنہا سفر نہیں کیا تھا۔ اس لیے باہر کی دنیا اس کے لیے ایک اجنبی اور خطرناک جگہ تھی۔ وہ اپنے شوہر کی قید میں محبوس البرٹ سے مدد اور تحفظ مانگ رہی تھی۔

البرٹ کی ساری زندگی درس و تدریس میں گزری تھی اور وہ صرف اندازہ لگا سکتا تھا کہ کس طرح ایک ضرورت مند عورت کی حفاظت کی جائے گو کہ اسے زندگی کی تمام آسائشیں میسر تھیں۔ شاندار مکان، عمدہ خوراک، بہترین ملبوسات، ذاتی سواری، غرض ہر قسم کا آرام تھا لیکن اس کی زندگی کو لاحق خطرات کی وجہ سے یہ سب آسائشیں اس کے لیے بے معنی ہوگئی تھیں۔

پروفیسر نے فریج سے بیئر کی بوتل نکالی اور دوبارہ خط پڑھنے لگا۔ ''میں نے فرینک کو تمہارے بارے میں نہیں بتایا کہ تم ہی میرے پہلے بوائے فرینڈ تھے اور وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ تم شروع سے ہی کیمسٹری اور میڈیسن کے پروفیسر بننا چاہتے تھے۔ فرینک کو یہ کبھی معلوم نہیں ہوگا کہ تم نے میری مدد کی ہے۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ امید کرتی ہوں کہ تم مجھ سے ملنے پر آمادہ ہو جاؤ گے۔ چار جولائی کو میرا شوہر بہت مصروف ہوگا۔ کیا تم اس روز آسکتے ہو؟ اگر تم وہی البرٹ ہو جسے میں جانتی ہوں اور جس سے میں نے محبت کی تھی تو تم ضرور آؤ گے۔ تمہاری شیلا چینل۔''

اس نے شیلا کے بارے میں سوچا تو اس سے جڑی بہت سی یادیں اس کے ذہن کے پردے پر کسی فلم کی طرح چلنے لگیں۔ اس کے سیاہ بال، خوب صورت چہرہ، بادامی آنکھیں، دراز قد، پتلا متناسب جسم، سب کچھ اس کی نظروں کے سامنے آگیا۔ البرٹ نے پہلی بار اسے ایک پیزا پارلر کے کیش کاؤنٹر پر دیکھا تھا۔ وہ اپنی پڑھائی میں اتنا مگن تھا کہ اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ جب پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے تو اس نے اپنے کاغذات سمیٹے اور تیزی سے لائبریری کی سیڑھیاں اترتے ہوئے پیزا پارلر کی طرف دوڑ لگادی۔ جب وہ وہاں پہنچا تو تمام بوتھ خالی پڑے ہوئے تھے۔ اسے کوئی گاہک نظر نہیں آیا۔

''کیا مجھے بہت دیر ہوگئی؟'' البرٹ نے پوچھا۔

وہ دھیرے سے مسکرادی۔ البرٹ نے دو سلائس کا آرڈر دیا تو اس نے اسے ایک بوتھ میں بٹھایا اور اس کے لیے سلائس لینے چلی گئی۔ البرٹ نے بیگ سے ایک کتاب نکالی اور اسے پڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد شیلا ایک چھوٹی سی ٹرے لے کر آئی اور اس کی میز پر رکھ دی۔ البرٹ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس میں پیزا کے چھ سلائس تھے۔

''لیکن میں نے تو صرف دو سلائس کا آرڈر کیا تھا۔''

''اس وقت یہی بچے ہیں۔'' شیلا نے کہا۔ ''تم انہیں اپنے ساتھ لے جاؤ۔ ان کی کوئی اضافی قیمت نہیں ہوگی۔''

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

البرٹ کی حیرت اب بھی کم نہ ہوئی تھی۔ ''یہ کیا ہے؟'' شیلا نے کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اوہ۔'' البرٹ نے کہا۔ ''یہ تھرموڈائنامکس کے بارے میں ہے جو دراصل سائنس کی تاریخ ہے۔''

''مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ''تم ہمیشہ سوٹ پہنتے ہو؟''

البرٹ کہنے والا تھا کہ یہ سوٹ نہیں ہے لیکن خاموش رہا۔ شیلا نے اس کا چہرہ پڑھ لیا اور بولی۔ ''ٹھیک ہے تم کھانا کھاؤ۔ میں تمہیں پریشان کرنا نہیں چاہتی۔''

البرٹ نے ہمت کر کے کہا۔ ''تم مجھے بالکل پریشان نہیں کر رہی ہو۔''

شیلا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم بہت پیارے ہو۔''

اس سے پہلے ہی البرٹ اس پر مرمٹا تھا۔ اس کے بعد وہ مسلسل کئی ہفتوں تک پیزا پارلر جاتا رہا۔

☆☆☆

البرٹ نے خط لفافے میں رکھا اور شیلا کے بارے میں سوچنے لگا۔ ان کے درمیان تعلق استوار ہوا لیکن اس میں گہرائی نہیں تھی۔ شیلا کی دلچسپی اس میں تھی کہ وہ اس کے لیے کیا کر سکتا ہے۔ اسے اس سے غرض نہیں تھی کہ وہ کون ہے۔ وہ اس کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے آخری حد تک چلی گئی۔ اور وہ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اس کی چاہت میں مبتلا ہو گیا۔

''مجھے تم سے محبت ہے۔'' البرٹ نے کار کی رفتار آہستہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔'' وہ بولی۔ ''مجھے کل تمہاری کار چاہیے۔''

ان کے درمیان معاملات تیزی سے آگے بڑھے۔ وہ اس حد تک ایک دوسرے کے رفیق تھے کہ آپس میں ہنستے بولتے اور ان کے درمیان کبھی جھگڑا نہیں ہوا۔ وہ دن بھر میں ہونے والے واقعات پر گفتگو کرتے لیکن جب البرٹ دونوں کے درمیان قدرِ مشترک تلاش کرتا تو اسے مایوسی ہوتی۔ شیلا کو میگزین اور ٹی وی شوز سے دلچسپی تھی۔ وہ فرصت کے اوقات میں تفریح کرنا پسند کرتی تھی اور اسے یہ اچھا نہیں لگتا تھا کہ البرٹ اپنا سارا وقت سائنس کی کتابوں میں کھپا دے۔ تاہم وہ اس کی پسندیدہ تقریبات میں ساتھ جانے کے لیے تیار ہو جاتی گو کہ اس نے واضح کر دیا تھا کہ ایسی جگہوں پر وہ بے آرامی محسوس کرتی ہے۔

''میرے پاس کوئی مناسب لباس نہیں ہے۔'' اس نے کہا جب البرٹ اسے اپنے ساتھ یونین میگ کیفے لے جانا چاہ رہا تھا۔

''یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' البرٹ نے کہا۔ وہ اسے اپنے ساتھ ایک بڑے اسٹور میں لے گیا اور اس کے لیے لباس، جوتے اور جرابیں وغیرہ خریدیں۔ اس کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ کئی دنوں بعد جب وہ ایک بار پھر کسی تقریب میں جا رہے تھے تو البرٹ نے اسے موتیوں کا ہار تحفے میں دیا اور شیلا نے شکر گزاری کا اظہار کرتے ہوئے اس کے گال چوم لیے۔

''کیا تم ہر ویک اینڈ پر اپنے گھر جاتے ہو؟'' ایک روز شیلا نے اس سے پوچھا۔

البرٹ پہلے ہی اسے بتا چکا تھا کہ اس کی ماں بیمار اور تنہا ہے لہٰذا وہ اس کی خبر گیری کرنے اس کے پاس جاتا ہے۔ اس نے سامنے رکھی ہوئی کتاب پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

''کیا تم میرا گھر دیکھنا پسند کرو گی؟''

شیلا کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''کیا تم واقعی چاہتے ہو کہ میں تمہاری ماں سے ملوں؟''

''کیا اس میں کوئی مسئلہ ہے؟'' البرٹ نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''یہ ایک بڑا قدم ہے۔'' شیلا نے کہا۔

البرٹ کی سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی۔ وہ سوالیہ انداز میں اس کی جانب دیکھنے لگا۔

''میرا مطلب ہے کہ کیا تم میرے کسی دوست کو جانتے ہو؟''

''نہیں۔''

''ٹھیک ہے، میں تمہیں ان سے ملاؤں گی۔''

وہ اسے اپنے پسندیدہ بار میں لے گئی جہاں اس کے دوست بیئر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ شیلا نے بارٹینڈر کو دو بوتلوں کا آرڈر دیا اور اپنے دوستوں کی جانب بڑھ گئی جنہوں نے گلے لگا کر اور بوسوں سے اس کا استقبال کیا۔

بیس منٹ بعد وہ واپس ہوئی تو اس نے البرٹ سے پوچھا۔ ''تم میرے ساتھ کیوں نہیں آئے؟''

''کیا مجھے آنا چاہیے تھا؟'' البرٹ نے پوچھا۔ اس

www.pakistanipoint.com

نے ابھی تک ڈرنک کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

''لگتا ہے کہ تمہارا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔ تم چاہو تو چلے جاؤ۔ میں کل تم سے ملوں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے البرٹ کے گالوں کو چھوا۔ ''بارٹینڈر کو تیس ڈالر دے دینا۔''

البرٹ نے حکم کی تعمیل کی اور سر جھکائے وہاں سے چل دیا۔

دوسرے دن وہ پیزا پارلر گیا اور جب شیلا اس کے لیے سلائس لے کر آئی تو اس نے پوچھا۔ ''تمہارے کیا عزائم ہیں؟''

''میں کسی سائنس داں کی بیوی بننا نہیں چاہتی۔ یہ تمہیں بتا رہی ہوں۔''

البرٹ نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ اس کا لہجہ غیر ضروری طور پر تیز تھا۔

''تم ناراض ہو؟''

اس نے کہنا شروع کیا ''ہاں، میں سمجھتی ہوں کہ وہ ایک تفریح تھی لیکن.....''

''شیلا؟ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'' البرٹ نے کہا۔

شیلا نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس کی خاموشی نے البرٹ کو بہت کچھ بتا دیا تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور سر جھکائے کیمپس کی جانب چل دیا۔

البرٹ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو محبت کا ماتم کریں یا دل میں کسی رنجش کو جگہ دیں۔ عرصہ ہوا وہ شیلا کو بھول چکا تھا۔ اس سے تعلق ختم ہونے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ ایک دوسرے کے لیے مناسب نہیں تھے اور اس نے جو فیصلہ کیا وہ غلط تھا۔ مزاج، عادات اور دلچسپیوں کے اعتبار سے وہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔

اب وہ صوفے پر بیٹھا شیلا کے خط کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ شیلا نے یہ فرض کر لیا تھا کہ وہ اس کی مدد کرنے پر تیار ہو جائے گا۔ وہ حیران تھا کہ اس نے ایسا کیوں سوچا۔ وہ کوئی ہیرو نہیں تھا کہ کسی خطرے کو گلے لگا لیتا۔ نہ ہی اس نے ماضی میں کوئی کارنامہ انجام دیا تھا۔ اس کے برعکس اس نے ایک پُرسکون زندگی گزاری تھی اور شیلا کو یہ بات پہلے ہی جان لینی چاہیے تھی۔ اس نے خط لکھنے سے پہلے البرٹ کے بارے میں ریسرچ بھی کی ہوگی۔ وہ جان گئی ہوگی کہ البرٹ کا پروفیسر بننے کا خواب پورا ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے ایک درسی کتاب بھی لکھی ہے لیکن ان کامیابیوں کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اس کا رجحان کسی خطرے یا جارحیت کی طرف بھی ہو سکتا ہے۔

ننگے پاؤں فرش پر ٹہلتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اس میں ایسی کون سی خصوصیت ہے جو اس کام کے لیے مناسب ہو سکتی ہے۔ اس نے کچن میں جا کر اپنے لیے سوپ بنایا اور وہیں کچن ٹیبل پر بیٹھ کر اسے پینے لگا۔ اسی دوران اس نے حساب لگایا۔ خط پر سترہ جون کی تاریخ درج تھی۔ شیلا نے اس سے چار جولائی کو ملنے کی درخواست کی تھی اور یہ خط اسے اکتوبر کے وسط میں ملا تھا۔

اس نے لیپ ٹاپ کھولا اور جلدی جلدی کونیکٹی کٹ کے اخبارات میں اموات کی خبریں تلاش کرنے لگا۔ اسے شیلا چینل کے متعلق کوئی خبر نظر نہیں آئی۔

پھر اس نے فرینک ڈیل ویکیو کے اشتہارات دیکھنا شروع کیے۔ وہ ہر اشتہار میں موجود تھا اور اپنی گاڑیوں کے نئے ماڈلز کی خوبیاں بیان کر رہا تھا۔

برتن دھونے سے پہلے البرٹ نے ایک بار پھر لیپ ٹاپ کو کھنگالنا شروع کیا۔ اس مرتبہ اس نے سرچ انجن میں فرینک ڈیل ویکیو کے ساتھ شیلا کا نام بھی ٹائپ کیا اور اس سے معلوم ہوا کہ آٹو ڈیلر کی بیوی لاپتا ہے۔ یہ خبر تین اخباروں میں شائع ہوئی تھی جس کے مطابق شیلا اگست کے شروع میں لاپتا ہو گئی تھی۔

پھر اس نے WFSB چینل کا ایک کلپ کھولا۔ اس میں ایک نوجوان رپورٹر ہائی وے کے کنارے کھڑی ہوئی تھی اور اس کے عقب میں ڈیل ویکیو سیارو کا سائن بورڈ نظر آ رہا تھا۔ اچانک ہی پردے پر شیلا کی تصویر ابھری۔ وہی سیاہ بال، متناسب جسم البتہ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے لیکن اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے نیلے رنگ کا گاؤن اور گلے میں نیکلس پہن رکھا تھا۔ البرٹ کے پورے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ گو کہ اس نے اسے برسوں سے نہیں دیکھا تھا لیکن اسے اس کے بدن کی خوشبو اور لمس یاد تھا۔

کیمرے کا رخ بدلا۔ اب فرینک اس رپورٹر سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ حیرت زدہ اور غمگین نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن البرٹ کو اس کے چہرے کے تاثرات مصنوعی لگے۔ وہ اپنے دفتر میں بیٹھا لوگوں سے التجا کر رہا تھا کہ اس کی بیوی کی بازیابی میں مدد کی جائے۔

ایک بار پھر کیمرا شیلا کی تصویر پر فوکس ہو گیا۔ البرٹ کی نظریں اس پر جم کر رہ گئیں، وہ اب بھی پہلے کی طرح خوب صورت تھی لیکن شکست خوردہ نظر آ رہی تھی۔

پروگرام ختم ہوا تو البرٹ نے کمپیوٹر بند کیا اور لیونگ

www.paksitanipoint.com

روم میں آ گیا۔ شیلا کا خط اس کی میز کی دراز میں تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ اس کا شوہر اسے قتل کرنا چاہ رہا ہے۔ البرٹ نے سوچا کہ وہ لاپتا نہیں ہوئی بلکہ مر چکی ہے اور مجھے یقین ہے کہ فرینک نے ہی اسے قتل کیا ہے۔

دوسرے روز صبح وہ اپنی وولوو ویگن میں بیٹھ کر فرینک سے ملنے چل دیا۔ وہ اس سے بالمشافہ گفتگو کر کے اس کے ذہن کو ٹٹولنا چاہ رہا تھا۔ اس نے شیلا کا خط اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ شوروم کے داخلی دروازے پر فرینک بلیو سوٹ میں ملبوس کھڑا ہوا تھا۔ اسے البرٹ کے آنے کی اطلاع مل گئی تھی اور وہ اس کی وولوو کو بغور دیکھ رہا تھا۔ البرٹ جانتا تھا کہ اسے ذرہ برابر بھی اس پر شک نہیں ہوگا کہ وہ ایک ایسے شخص سے مل رہا ہے جس کے پاس اس کی بیوی کے بارے میں معلومات ہیں بلکہ وہ اسے کوئی گاہک سمجھ رہا ہے جو نئی کار خریدنے کا خواہش مند ہے۔ وہ البرٹ کے انتظار میں کھڑا رہا جب تک کہ اسے پارکنگ کے لیے جگہ مل گئی۔

”تمہیں بڑی گاڑی پسند ہے۔“ فرینک نے البرٹ کی جانب مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔“ البرٹ نے جواب دیا اور سوچنے لگا کہ یہ شخص واقعی ایک کامیاب بزنس مین ہے جبھی اس نے اتنی بڑی ایمپائر کھڑی کر لی ہے۔ یہ کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔

”لیکن تم کافی محتاط ہو اور ابھی سوچ رہے ہو۔ شاید تمہیں یہ پرانی وولوو بہت پسند ہے۔“ فرینک نے اس کی ویگن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں کیونکہ یہ اب بھی بہت اچھی چل رہی ہے۔“

”اب بھی۔“ فرینک نے اس کے الفاظ دہرائے۔

”تم ہچکچا رہے ہو۔ بے شک اس طرح کے ماڈل بہت اچھے ہوتے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے لاٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ”لیکن مجھے چیلنج قبول کرنا پسند ہے مسٹر......“

”البرٹ۔“

”فرینک ڈیل ویکیو۔“ اس نے دوبارہ مصافحہ کیا۔

”اندر آ جاؤ۔ کافی پیتے ہیں۔“

وہ اندر چلے گئے۔ کافی پیتے ہوئے البرٹ کی نظر شیلا کی فریم شدہ تصویر پر گئی۔ وہ ایک کشتی پر کھڑی ہوئی تھی اور اس نے نہانے کا لباس پہن رکھا تھا۔ دھوپ کی تپش سے بچنے کے لیے اس نے سر پر ہیٹ اور آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا۔ البرٹ کو اس کے کندھے پر پیدائشی نشان نظر آیا۔ ... سے یاد آ گیا کہ ایک بار جب وہ اس کے زانو پر بیٹھی ... ں نے اس نشان کو چوم لیا تھا۔

فرینک نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا اور اس میں سے ایک چابی منتخب کر کے دفتر کی الماری کا تالا کھول دیا پھر اس نے اپنا رین کوٹ الماری میں لٹکایا اور دروازہ بند کر کے اسے مقفل کر دیا۔ نیوی بلیو سوٹ اس کے جسم پر پوری طرح فٹ تھا۔

”تم کچھ خریدنے آئے ہو یا بیچنے مسٹر البرٹ؟“ فرینک نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ اس نے چابیوں کا گچھا میز پر رکھ دیا تھا۔

”میں فیصلہ نہیں کر پا رہا۔“ البرٹ نے جواب دیا۔

”ہم آپس میں بے تکلفانہ گفتگو کر سکتے ہیں۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟ ہم نے بہت وقت گزار لیا لیکن اب بھی ہم یہاں کھڑے ہیں اور تبدیلی چاہتے ہیں۔“

البرٹ نے اس کی بات غور سے سنی لیکن وہ متاثر نہیں ہوا۔ فرینک نے ہمت نہ ہاری اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ ایک قدرتی امر ہے کہ ہم اپنی زندگی کو بہتر بنانا چاہتے ہیں۔“

البرٹ نے غیر ارادی طور پر اسے گھورا۔ ”یہ دیکھو۔“ فرینک نے اپنی آستین کا کف اوپر کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اس گھڑی کی قیمت نہیں بتانی چاہیے لیکن اس کی حقیقی قیمت کیا ہے؟“

”یہ صحیح وقت بتاتی ہے۔“

”اچھا مذاق ہے۔“ فرینک نے اپنی گولڈ واچ کو آستین سے ڈھانپتے ہوئے کہا۔

”یہ ایک سرمایہ کاری ہے۔ تم اپنا پیسا بینک میں رکھ کر بھی منافع کما سکتے ہو لیکن اگر تم کوئی ایسی چیز خریدو جس سے تمہیں خوشی حاصل ہو اور اس کی قیمت میں بھی کوئی کمی نہ ہو تو اس سے اچھی اور کوئی بات نہیں۔“

”کیا کوئی غمزدہ شخص جس کی بیوی کو لاپتا ہوئے کئی ماہ ہو چکے ہوں، ایسی زبان یا اپنی قیمتی گھڑی کی نمائش کر سکتا ہے؟“ البرٹ نے اپنے آپ سے پوچھا۔ بے شک وہ ایک اچھا سیلز مین ہے لیکن اگر اس کے زخم ابھی مندمل نہیں ہوئے تو کاروبار کرتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں دکھ کا عنصر نمایاں ہونا چاہیے۔

”یہ گھڑی نئی ہے؟“ البرٹ نے پوچھا۔

”تقریباً لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”میں یہی سوچ کر حیران ہو رہا تھا۔“ البرٹ نے

Waqar Azeem www.pakistanpoint.com

جواب دیا۔ ''میں نے سن رکھا ہے کہ ایک نئی کار کی قیمت شوروم سے نکلتے ہی کم ہو جاتی ہے لیکن اس طرح کی گھڑی.....''

''لانگ ٹرم کے بارے میں سوچو مسٹر البرٹ۔ اس گھڑی کی قیمت دو مہینے میں آسمان کو نہیں چھوتی لیکن آج سے پانچ دس سال بعد اس میں حیرت انگیز اضافہ ہو جائے گا۔''

''دو مہینے۔'' البرٹ نے دل میں سوچا۔

''جہاں تک قیمت کے کم ہونے کا سوال ہے تو میں اس طرح نہیں سوچتا۔ لوگ تمہیں نئی گاڑی چلاتے ہوئے دیکھ کر حیران ہو جائیں گے اور سوچیں گے کہ مسٹر البرٹ کے پاس نئی لگژری کار آ گئی۔ اس طرح تمہاری قدر و منزلت میں اضافہ ہو جائے گا۔''

''یعنی میری زندگی میں بہتری آ جائے گی۔'' البرٹ نے نرمی سے کہا۔

''بہتر ہی نہیں بلکہ بہترین۔'' فرینک نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''آؤ میرے ساتھ، ایک نظر ان گاڑیوں پر ڈالو۔''

اسی وقت میز پر رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجی۔ فرینک نے فون اٹھایا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر سختی چھا گئی۔ ''وہ کہاں ہے؟'' اس نے کہا پھر بولا۔ ''نہیں، نہیں اسے جانے مت دینا۔ اسے وہیں روکو۔ میں آ رہا ہوں۔''

فون رکھ کر وہ البرٹ سے مخاطب ہوا۔ ''مجھے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ تم چلے مت جانا۔ شوروم میں ایک فل لوڈ گاڑی کھڑی ہے۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''ہو سکتا ہے کہ میرا کوئی آدمی تمہارا راستہ روکے لیکن اسے بتا دینا کہ تم میرے ساتھ ہو۔''

البرٹ نے رضامندی میں سر ہلا دیا۔ فرینک اتنی جلدی میں تھا کہ اس نے چابیاں اور الماری سے اپنا رین کوٹ بھی نہیں لیا۔ البرٹ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا جب وہ شوروم پار کر کے ہائی وے کی طرف جا رہا تھا پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

البرٹ نے کافی کا گھونٹ لیا اور ایک بار پھر شیلا کی تصویر کو دیکھنے لگا۔ یہ وہ لڑکی نہیں تھی جسے وہ جانتا تھا۔ وہ ایک مظلوم عورت نظر آ رہی تھی۔

ایک نوجوان لڑکی دروازے میں نمودار ہوئی۔ ''کیا میں تمہیں کچھ پیش کروں؟'' اس نے پوچھا۔ ''فریش کافی، ہمارے پاس پیسٹریاں بھی ہیں۔'' اس خوب صورت لڑکی کے چہرے پر دلکش مسکراہٹ تھی۔

''کیا تم مسز فرینک کو جانتی ہو؟'' البرٹ نے شیلا کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تھوڑا بہت۔'' وہ بولی۔ ''میں نہیں جانتی.....''

''میں شرطیہ کہتا ہوں کہ وہ تمہیں پسند کرتی تھی۔'' البرٹ نے کہا۔

''وہ کسی کو پسند نہیں کرتی۔ خاص طور پر لڑکیوں کو۔ اوہ مجھے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔''

''تمہارا اشارہ کس کی طرف ہے؟''

''وہ ٹیمی سے نفرت کرتی ہے۔''

''ٹیمی..... یہ کون ہے؟''

''وہ ٹویوٹا سیکشن کی منیجر ہے۔ بہت ہی اچھی اور خوب صورت۔''

''اوہ، اب میں سمجھا۔''

''محض حسد اور کچھ نہیں۔''

البرٹ نے کہا۔ ''تم نہیں جانتیں کہ لوگ کیا سوچتے ہیں۔''

''مرد اور عورت کا ساتھ کام کرنا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ بہرحال اس نفرت کی کوئی وجہ تو ہو گی؟''

''میں نہیں جانتی۔ میں دوبارہ آؤں گی۔ مسٹر فرینک نے کہا تھا.....''

''میں یہاں کچھ دیر رکوں گا۔ کیا تم مجھے فورڈ اسکیپ کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کر سکتی ہو؟''

لڑکی نے اثبات میں سر ہلایا اور چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد البرٹ نے جھک کر جلدی سے فرینک کی چابیاں اپنی جیب میں رکھ لیں۔ کچھ دیر بعد وہ لڑکی ایک بروشر لے کر آئی اور بولی۔

''یہ ایک مقبول ماڈل ہے۔ میں اپنے لیے بھی ایسی ہی کار پسند کروں گی۔''

البرٹ نے بروشر کے چکنے رنگین صفحات پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''شکریہ، برائے کرم جاتے ہوئے دروازہ بند کر دینا۔ میں اس بروشر میں دی گئی تفصیلات پر توجہ مرکوز کرنا چاہتا ہوں۔''

فرینک کے گچھے میں بہت سی چابیاں تھیں۔ البرٹ کی سمجھ میں ان کا مقصد نہیں آیا۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ

WaqarAzeem www.pakistanipoint.com

فرینک کے بہت سے راز تھے۔ البرٹ کے دماغ میں فوراً ہی ٹیمی کا نام آیا۔ کیا اس طرح فرینک اپنی زندگی میں بہتری لانا چاہ رہا تھا۔ بدکاری کے معاملے میں البرٹ کا تجربہ محض سنی سنائی باتوں تک محدود تھا لیکن اس کی نظر میں فرینک بھی اس کے بہت سے کالج کے ساتھیوں جیسا تھا جنہوں نے اپنی شاگرد لڑکیوں سے ناجائز تعلقات قائم کر رکھے تھے۔

لیکن کیا کوئی شخص اس حد تک بھی گر سکتا ہے کہ محبوبہ سے تعلق استوار کرنے کی خاطر اپنی بیوی کو قتل کر دے؟ البرٹ کو اسی سال کا جواب تلاش کرنا تھا۔

اس کی نظر الماری کے دروازے پر گئی جسے فرینک نے دوبارہ مقفل کر دیا تھا۔ اس بارے میں اس نے اتنی احتیاط کیوں کی جبکہ البرٹ اس الماری سے کئی فٹ کے فاصلے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بروشر میز پر رکھا اور اٹھ کر الماری تک گیا۔ پہلی نظر میں ہی دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کے دروازے کا تالا حال ہی میں تبدیل کیا گیا ہے۔

البرٹ نے چابیاں ٹٹولنی شروع کیں اور اسے ایک نئی چابی نظر آ گئی۔ اس نے وہ چابی دروازے کے تالے میں لگائی اور وہ آسانی سے کھل گیا۔ سب سے پہلے اس کی نظر فرینک کے رین کوٹ پر گئی۔ سب سے اوپر والے شیلف پر ایک چھوٹا سا سیف تھا جس میں کچھ فائلیں اور بروشر رکھے ہوئے تھے۔ نیچے فرش پر دو جوتوں کے ڈبے اور ایک شاپنگ بیگ نظر آ رہا تھا۔ اس بیگ میں ایک خوراک کا ڈبا تھا۔ اس کے علاوہ دستانے اور اسفنج کا ٹکڑا بھی رکھا ہوا تھا۔

البرٹ نے بیگ میں ہاتھ ڈال کر ڈبا نکالا۔ اس کی تہ اور دیواروں میں جگہ جگہ راکھ کے جمے ہوئے ٹکڑے اور چھوٹے چھوٹے ذرات نظر آ رہے تھے۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر شیلا کا خط نکالا اور اس کے لفافے میں بچی ہوئی راکھ محفوظ کر لی۔ اس کے بعد اس نے خط اور لفافہ جیب میں رکھا اور ڈبے کو دوبارہ بند کر کے واپس بیگ میں ڈال دیا پھر الماری کا دروازہ مقفل کر کے اپنی نشست پر واپس آ گیا۔

اس نے جیب سے رومال نکال کر انگلیاں صاف کیں۔ اسے یقین تھا کہ ان پر شیلا کی راکھ کے دھبے لگے ہوں گے۔ اس کے بعد اپنی سانس کو قابو کر کے دوبارہ بروشر اٹھا لیا لیکن وہ اس پر توجہ دینے کے قابل نہیں تھا اور

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ،
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

پاکستان

میں کچھ عرصے سے

مختلف مقامات سے یہ شکایت موصول ہو
رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں
قارئین کو اسٹال پہ پرچا نہیں ملتا اس
سلسلے میں ادارے کے پاس دو تجاویز ہیں۔

آپ اپنے قریبی دکان دار کو ایڈوانس
100 روپے
ادا کر کے اپنا پرچا بک کروالیں۔

یا

ادارے کو 1500 روپے
بھیج کر سالانہ خریدار اور
750 روپے ادا کر کے 6 ماہ
کے لیے بھی خریدار بن سکتے ہیں
اور گھر بیٹھے پورے سال اپنے
پسندیدہ ڈائجسٹ وصول کر سکتے ہیں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ،
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

www.pakistanipoint.com
Nadar Azeem

نہ ہی ایسا ظاہر کرسکتا تھا۔

اس نے اپنے حواس مجتمع کیے اور دفتر سے باہر نکل گیا۔ ''کیا تم مسٹر فرینک کو بتا دو گی کہ مجھے اچانک جانا پڑ گیا؟'' اس نے استقبالیہ پر بیٹھی ہوئی خوش مزاج لڑکی سے کہا۔

''کیا تم واقعی انتظار نہیں کر سکتے؟'' لڑکی نے کہا۔ ''مسٹر فرینک کو مایوسی ہوگی۔''

''میں ان سے دوبارہ مل لوں گا۔'' البرٹ نے جواب دیا۔ ''مجھے یقین ہے کہ ہماری جلد ہی ملاقات ہو گی۔''

البرٹ نے جو راکھ اکٹھی کی، اب وہ اس کھانے کے چمچے میں پڑی ہوئی تھی جسے وہ صبح کافی بنانے میں استعمال کرتا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کی لاش کو جلایا گیا تھا اور اس عمل کے دوران ڈی این اے بھی ضائع ہو گیا۔ اس لیے یہ تصدیق کرنا ممکن نہیں تھا کہ جس لاش کو جلایا گیا وہ شیلا کی ہی تھی۔

اس کے باوجود البرٹ جانتا تھا کہ اس راکھ سے جراثیمی زہر اور دیگر دھاتی زہر مثلاً سرمہ، آرسینک، سیسہ، پارا وغیرہ کی موجودگی کا پتا لگایا جا سکتا ہے لیکن اس کے پاس گھر میں اس راکھ کو ٹیسٹ کرنے کے لیے ضروری آلات نہیں تھے تاہم بہت سی کمپنیاں ایسی کٹ فروخت کرتی ہیں جن سے ان کیمیکلز، زہریلے مادوں اور بھاری دھاتوں کی موجودگی کا پتا لگایا جا سکتا ہے۔ وہ کالج کیمپس کے قریب واقع ایک ایسے اسٹور سے واقف تھا جہاں یہ کٹ ملتی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ اپنی ویگن میں سوار ہو کر اس اسٹور کی طرف جا رہا تھا۔ شیلا کی راکھ اس نے وہیں میز پر چھوڑ دی تھی۔

اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ دکان میں اس کا جاننے والا کوئی شخص موجود نہیں تھا اور نہ ہی وہ کیش رجسٹر پر بیٹھے ہوئے کلرک کو پہچانتا تھا۔ اس نے اپنی شناخت چھپانے کے لیے سامان کی نقد ادائیگی کی اور اس کی رسید اپنے والٹ میں رکھ لی۔

اس کے بعد وہ محتاط انداز میں گاڑی چلاتا ہوا گھر کی جانب روانہ ہوا۔ شام ہونے کی وجہ سے سڑکوں پر ٹریفک کم ہو چکا تھا۔ جب وہ ہائی وے سے اتر کر اپنے قصبے کی طرف جا رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ اس کے برابر سے گزرنے والی اسکول بسیں خالی ہو چکی تھیں اور اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔

گھر پہنچ کر البرٹ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ سب سے پہلے اس نے کٹ کے ساتھ دی ہوئی ہدایات شروع سے آخر تک پڑھیں حالانکہ وہ یہ عمل اپنے بچپن سے کرتا آ رہا تھا جب اس نے چار سال کی عمر میں پہلا کیمسٹری سیٹ لیا تھا پھر اس نے ایک نوٹ بک میں درجہ بدرجہ رہنما اصول لکھے اور جب وہ ٹیسٹنگ کے لیے تیار ہوا تو اس کے کھانے کا وقت گزر چکا تھا۔

ٹیسٹ ٹیوب اور دیگر آلات کے ذریعے اس نے اپنا پہلا تجربہ کیا اور اسے بھاری دھاتوں کی موجودگی کا پتا چلا پھر اس نے مخصوص ٹیسٹ کرنا شروع کیے۔ وہ دو ممکنہ زہر یعنی آرسینک اور پوٹاشیم سائنائڈ کا پتا چلانا چاہ رہا تھا۔ یہ دونوں چیزیں کیڑے مار دواؤں میں استعمال ہوتی ہیں۔

ایک منٹ میں ہی ایک سیمپل میں پوٹاشیم سائنائڈ کی موجودگی ظاہر ہو گئی۔ البرٹ کا منہ بن گیا۔ اگر پوٹاشیم سائنائڈ کسی انسان کے معدے میں چلا جائے تو اس کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو سکتی ہے۔ یہ ہیموگلوبین کو آکسیجن کے ساتھ ملنے سے روکتا ہے جس کی وجہ سے دل اور دماغ کو خون کے ذریعے آکسیجن کی سپلائی متاثر ہوتی ہے اور دل کام کرنا بند کر دیتا ہے۔

اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ شیلا شدید تکلیف میں مبتلا ہو کر مری۔ اسے اس شخص نے دھوکا دیا جو اس کا شوہر تھا اور جس سے اس نے محبت کی تھی۔

اب البرٹ کی سمجھ میں آیا کہ شیلا نے اس سے رابطہ کیوں کیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ البرٹ اپنے تجربے اور مہارت کو استعمال کر کے یہ ثابت کرے کہ فرینک اسے زہر دینا چاہتا تھا۔ اگر البرٹ کو اس کا پیغام بروقت مل جاتا تو وہ اسی وقت اس کے شبہات کی تصدیق کر لیتا لیکن اب وہ شیلا کی راکھ میں مہلک زہر کی موجودگی کی تصدیق کر رہا تھا۔ وہ پولیس کو اطلاع دے سکتی تھی جو البرٹ کی دریافت شدہ معلومات کی روشنی میں کارروائی کرتی اور اس طرح شیلا کی جان بچ جاتی۔

البرٹ کا دماغ گھومنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جب شیلا کو اس کے خط کا جواب نہیں ملا تو اس نے البرٹ کے بارے میں کیا رائے قائم کی ہوگی۔ یہی کہ وہ اسے بھول گیا ہے۔ کیا وہ اس کے خوف کو نظر انداز کر سکتا ہے۔

وہ شیلا کو کیسے بھول سکتا تھا جو اسے پیرا پارلر میں ملی جس سے اس نے کئی برس پہلے محبت کی تھی پھر کسی وجہ سے

www.paksociety.com

ان کے راستے جدا ہو گئے لیکن وہ پہلی عورت تھی جس نے اس کے دل پر قبضہ کیا۔ وہی اس کی پہلی محبت تھی۔ وہ لیونگ روم میں ٹہلتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اس نے شیلا کو مایوس کیا۔ کاش وہ خط اسے پہلے مل جاتا۔

وہ اداس اور دل گرفتہ اپنی کچن ٹیبل پر واپس آیا اور اگلے قدم کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس نے لیپ ٹاپ کھول کر ممکنہ اقدامات کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ یہ ثبوت قانون نافذ کرنے والے اداروں کے حوالے نہیں کر سکتا۔ اس کے پاس ایسی کوئی شہادت نہیں تھی جس سے ثابت ہوتا کہ فرینک نے ہی شیلا کو قتل کیا ہے۔ اس حوالے سے شیلا کا خط ناکافی تھا پھر اس نے سوچا کہ وہ گمنام بن کر کسی بااثر صحافی کو خط لکھے لیکن اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ اپنی ذمے داری اور اس کام کو پورا کرنے میں ناکام ہو گیا ہے جو اس نے خوشی سے قبول کیا تھا۔

شیلا نے اس سے مدد کے لیے کہا تھا اور وہ اس کے لیے پُرعزم تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس معاملے کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا اور نصف شب سے پہلے اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

☆☆☆

اگلے روز وہ ایک بار پھر فرینک کے شوروم کی جانب چل دیا۔ اس نے اپنی گاڑی ٹویوٹا لاٹ پر روکی اور بغل میں ایک فولڈر دبائے دفتر کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ٹیمی ایک کونے میں اپنی میز پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے دیوار پر کمپنی کا لوگو لگا ہوا تھا اور وہ کمپیوٹر پر نظریں جمائے ہوئے بیٹھی تھی۔

اس کے نام کی تختی پر پورا نام تمارا بوئے لکھا ہوا تھا۔ وہ ایک نوجوان پُرکشش عورت تھی اور شیلا کے مقابلے میں کم عمر بھی۔ اس نے سرخ سوٹ اور سنک کا بلاؤز پہن رکھا تھا۔ ہاتھ میں بڑی سی چاندی کی انگوٹھی، بریسلیٹ اور کانوں میں چاندی کی بالیاں تھیں۔

البرٹ نے قریب جا کر کہا۔ ''مس بوئے.....''

وہ مڑی اور اس نے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ البرٹ نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا ٹیمی نے کھڑے ہو کر اس سے مصافحہ کیا۔ البرٹ نے اس کی نیلی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اپنا نام بتایا۔

''کیا میں تمہارا کچھ وقت لے سکتا ہوں؟'' اس نے ٹیمی سے کہا۔

ٹیمی نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولی۔ ''میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں مسٹر البرٹ؟''

البرٹ نے فولڈر کھولا اور اس میں سے اس خط کی فوٹو کاپی نکال کر ٹیمی کو دی جو شیلا نے اسے لکھا تھا۔

وہ اسے خط پڑھتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے گو کہ اس نے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے کندھے بھی ڈھلک گئے۔

''مس بوئے۔'' البرٹ نے نرمی سے کہا۔

ٹیمی نے خط پر سے نظریں ہٹا کر دیکھا۔ وہ اپنے فولڈر سے ایک اور کاغذ نکال رہا تھا۔ یہ رپورٹ اس نے خود ٹائپ کی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ کس طرح اس نے بنیادی سائنسی طریقے کے ذریعے شیلا چینل کی راکھ میں پوٹاشیم سائنائڈ کی موجودگی دریافت کی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے زہر دے کر ہلاک کیا گیا۔

''اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔'' البرٹ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

ٹیمی کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے بے بسی سے البرٹ کی طرف دیکھا اور تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ ''اگر تم مجھے بلیک میل کرنے آئے ہو تو میرے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔''

''اس کے باوجود تم شیلا کے قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچانے میں میری مدد کر سکتی ہو۔'' یہ کہہ کر البرٹ نے اسے ایک تیسرا کاغذ دیا اور پہلے دو کاغذ اس کی میز پر سے اٹھا لیے۔

''یہ ایف بی آئی کے فیلڈ آفس کا فون نمبر ہے۔'' اس نے بقیہ دونوں کاغذ اپنے فولڈر میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا جرم مسٹر فرینک سے بڑا نہیں ہے۔ یاد رکھو کہ جو شخص اپنی بیوی کو قتل کر سکتا ہے وہ اپنے شریکِ جرم کو بھی بہ آسانی راستے سے ہٹا سکتا ہے، اگر تمہیں اپنی زندگی پیاری ہے تو فون کرنے میں دیر نہ کرنا۔''

یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ اسے یقین تھا کہ ٹیمی کی سمجھ میں اس کی بات آ گئی ہو گی اور وہ اپنی زندگی بچانے کے لیے وعدہ معاف گواہ بننے پر تیار ہو جائے گی۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی اطمینان تھا کہ شیلا نے اس سے جو توقع وابستہ کی تھی، وہ اس نے کسی نہ کسی طرح پوری کر دی۔ وہ اپنی پہلی محبت کو کیسے نظر انداز کر سکتا تھا؟

❖❖❖

www.pakistanipoint.com

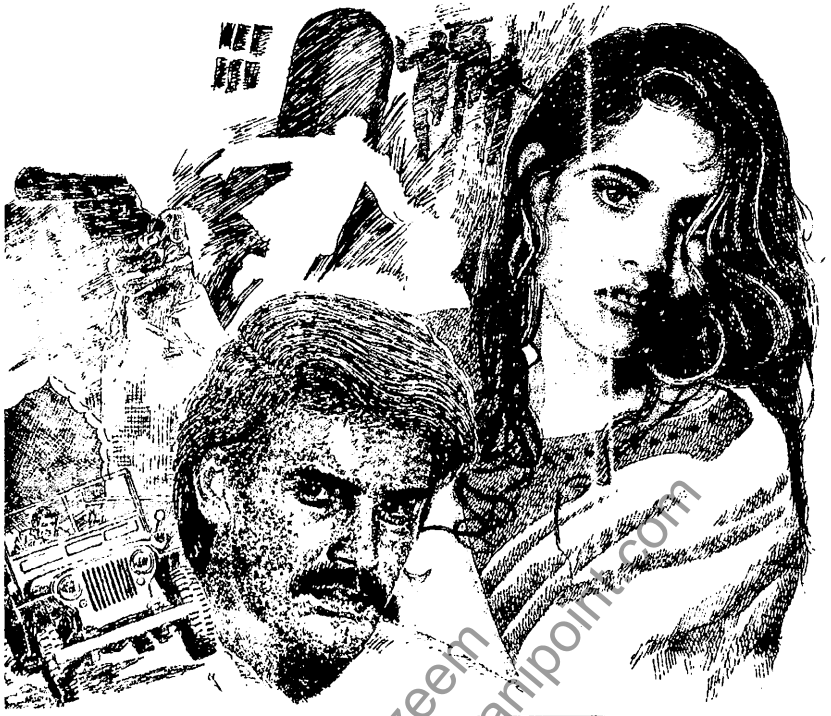

قسط :6

اناگیر

امجد جاوید

زندگی کی کشمکش میں فنا و بقا ایک حقیقت ہے۔ قدرت کا دستور ہے کہ کوئی غیر معمولی طاقت اسی کو ملتی ہے جو اس کا موزوں استعمال جانتا ہے۔ فنا و بقا سے نبرد آزما ہونے والے خود شناس ہوتے ہیں۔ یہ وصف انہی کو حاصل ہوتا ہے جو اناگیر ہوں اور اپنا ادراک رکھتے ہوں... جو ظلم و جبر کے بگولوں کو مات دینا جانتے ہوں... سنہری ریت کے باطن سے اُبھرنے والے ایک نوجوان کی پرت در پرت کھلتی داستانِ دل نواز۔ وہ ریت کی طرح بکھر سکتا تھا مگر ذروں میں بٹ نہیں سکتا تھا۔ دھرتی کی مٹی میں نکھرنے اور سنورنے کا فن بخوبی جانتا تھا... اپنی ذات کو انا کے بھنور سے بچانا جانتا تھا... حالات کی آندھیوں کے سامنے سینہ سپر ہونے کے گر سے آگاہ تھا۔ جانتا تھا کہ بگولے ریت کو اِدھر اُدھر لے جاسکتے ہیں، فنا نہیں کر سکتے۔ ریشمی سراب تھے جو اس کی راہ میں حائل ہو رہے تھے۔

صحرا کے سرابوں سے ایک دیدہ ور دل فگار نوجوان کی ہنگامہ خیزیاں

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

اگرچہ یہ اتنی حیرت انگیز بات نہیں تھی کہ اُس نے میرا فون نمبر کہاں سے لیا تھا لیکن سوچنے والی ضرور تھی۔ کیا وہ ریتو تک پہنچ گیا تھا؟ کیونکہ اب تک میں نے جو چند کالز کی تھیں وہ ریتو کے فون پر ہی کی تھیں۔ ان میں سے ایک دو چاچا عبدالمجید کو کی تھیں۔ میں اس بارے میں بے فکر تھا۔ وہ ایسے نمبر تھے جو کسی نیٹ ورک میں نہیں آتے تھے۔ ریتو کے کال ریکارڈ سے میرا نمبر لینا کوئی مشکل نہیں تھا۔ ان کی اتنی رسائی تو تھی کہ وہ کال کا ریکارڈ لے سکتے تھے۔

میں جانتا تھا وہ اس فون کے ذریعے ہی مجھ تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ اس کے لیے یہی اندازہ کر لینا کافی تھا کہ میری لوکیشن کہاں کی ہے اور کس ٹاور کی رینج میں ہوں۔ میں وہ فون وہاں پر پھینک بھی نہیں سکتا تھا۔ میں فون بند بھی کر لیتا تو پرتاب سنگھ فوراً پرانی فیکٹری تک پہنچ جاتا۔ ابھی رات ہی تو وہاں سے بندے صاف کیے تھے۔ یہ ٹھکانا مشکوک ہو گیا تھا۔ ابھی کچھ دیر بعد تیمور اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہاں پہنچنے والا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ بھی پرتاب سنگھ کی نظروں میں آجائے۔ یہی سوچتے ہوئے میں دفاتر والی عمارت سے باہر آگیا۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ تیمور کو فون کر کے صورت حال معلوم کروں کہ گیٹ پر حرکت ہوئی۔ ایک شخص نے گیٹ کھولا اور پھر ایک فور وہیل اندر آتی ہوئی دکھائی دی۔ چند منٹ میں وہ تیزی سے میرے قریب آکر رک گئی۔ فور وہیل میں تیمور سمیت محض چار افراد تھے۔ پانچواں شخص سیٹوں کے درمیان دبا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ میں سمجھ گیا، وہی گوپال داس ہے۔ تیمور اور اس کے ساتھیوں نے اُسے اُتارا اور اندر لے گئے۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔

''تم فوراً گاڑی واپس لے جاؤ۔''

''خیریت تو ہے نا؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں خیریت ہے، ایک بہت ضروری کام ہے۔'' میں نے کہا۔

''جی ٹھیک ہے، بولیں۔'' اس نے کہا تو میں نے اس کی طرف سیل فون بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ بند نہیں کرنا، بلکہ راستے میں جاتی ہوئی کسی گاڑی یا ٹرک میں پھینک دینا، یہ فون جتنا دور ہو سکتا ہے، ہو جائے۔''

''جی میں سمجھ گیا، آپ کیا چاہتے ہیں۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''بس تو پھر تیزی سے نکل جاؤ۔'' میں نے کہا تو اس نے فون لے کر ڈیش بورڈ پر رکھا اور فور وہیل لے کر نکلتا چلا گیا۔

میں دفاتر کی عمارت میں آکر اسی کمرے میں گیا جہاں سامان رکھا ہوا تھا۔ گوپال داس فرش پر پڑا تھا۔ اس کی آنکھوں پر پٹی ابھی تک تھی۔ وہ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ اس نے دھوتی کے ساتھ سفید کرتہ پہنا ہوا تھا۔ اس کے سر کے بال درمیان سے اُڑے ہوئے تھے۔ اس کے سفید بال جھالر کی طرح تھے۔ تاہم اس کی صحت قابلِ رشک تھی۔ دو بندے اس کے پاس کھڑے تھے جبکہ تیمور مضطرب سا میری جانب دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتا تھا۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے پوچھا لیکن اس نے منع کر دیا۔ تب میں گوپال داس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا تو اس کے بدن میں ذرا سی لرزش ہوئی پھر وہ نارمل ہو گیا۔ تبھی میں پوچھا۔

''گوپال داس جی، یہی نام ہے نا تمہارا؟''

''تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو، سیدھی بات کرو۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تو میں نے بھی وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور پُرسکون لہجے میں کہا۔

''دیکھو بڑے میاں، میں نہیں چاہتا کہ تم پر تشدد کروں۔ تم جانتے ہو کہ یہ ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب کوئی جھوٹ بولے۔ میرے چند سوالات کے جواب دے دو، مجھے تم سے کوئی سروکار نہیں ہوگا۔''

''بولو، کیا پوچھنا چاہتے ہو؟'' اس نے کہا۔

''پرتاب سنگھ کے ساتھ تمہارا تعلق کس حد تک ہے؟'' میں نے پوچھا تو اس نے فوراً کہا۔

''ہم مل کر بزنس کرتے ہیں، وہ میرا بزنس پارٹنر ہے۔''

''بزنس یا دھندا......'' میں نے پوچھا۔

''تم جو بھی سمجھ لو۔'' اس نے کہا۔

''مطلب تم سیدھی بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہو۔'' میں نے دبے دبے غصے میں کہا اور ساتھ اس کی کلائی زور سے پکڑ لی۔ اس کے بدن میں ایک لمحے کو تشنج کی سی کیفیت آئی۔ تبھی اس نے کہا۔

''میں سیدھی بات ہی کروں گا، تم پوچھو۔''

''پرتاب سنگھ کا کون کون سا دھندا دیکھتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہر طرح کا۔'' اس نے مختصراً کہا۔ وہ بہت شاطر لگ رہا تھا وہ مجھ سے اگلوانا چاہتا تھا کہ دراصل میں اس سے کیا پوچھنا چاہتا ہوں۔

''میں جانتا ہوں تمہارے مر جانے سے پرتاب سنگھ

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

کے دھندے پر فرق نہیں پڑنے والا، تمہاری جگہ لینے کے لیے بہتر ے تیار بیٹھے ہوں گے۔ مجھے بھی تمہیں مارنے میں کوئی وقت نہیں لگے گا۔ یہ بتاؤ کون سے بڑے دھندے کو دیکھتے ہو؟''

''سچ پوچھو تو میں اب صرف مشورہ ہی دیتا ہوں، سارا کام تو عام لوگ کرتے ہیں، تم بولو، تمہیں کیا چاہیے۔'' اس نے پھر وہی گول مول بات کر دی۔ وہ میری نفسیات سے کھیل رہا تھا یا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''گوپال داس جی، یہ بتاؤ، رانی بھاگ وتی سے اُس کا کیا تعلق ہے، کیوں دشمنی ہے اس کے ساتھ؟'' میں نے پوچھا۔

''کوئی وقت تھا، وہ دونوں ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ دونوں شادی کرنا چاہتے تھے۔ بھاگ وتی کا باپ نہیں چاہتا تھا کہ یہ شادی ہو، لیکن وہ خود چاہتی تھی۔ دونوں نے خفیہ شادی کر لی، کچھ ہی دن بعد بھاگ وتی کا باپ قتل ہو گیا۔ بھاگ وتی کو یہ باور کرا دیا گیا کہ اس کے باپ کو پرتاب سنگھ نے قتل کروا دیا ہے اور یہ شادی اس کی دولت کے لیے کی گئی ہے۔ ایسی بات سے وہ متنفر ہو گئی۔ تب سے دونوں کے درمیان دشمنی چل رہی ہے۔''

''اس کا چہرہ کیوں بگاڑ دیا گیا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ بہرحال پرتاب سنگھ کی زیادتی تھی لیکن یہ ان دونوں کا معاملہ تھا، کوئی اس میں کیا کر سکتا تھا۔'' اس نے پُرسکون انداز میں بتایا۔

''کیا یہ سچ ہے کہ بھاگ وتی کے باپ کو پرتاب سنگھ ہی نے قتل کروایا تھا۔'' میں نے خود پر قابو رکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' میں نے کہا۔

''میں نے کہا نا میں......'' اس نے کہنا چاہا تو میں نے ٹوکتے ہوئے تیزی سے کہا۔

''یہ بھی کہو گے کہ پرتاب سنگھ نے بھاگ وتی کے باپ کو اپنے ذاتی قید خانے میں نہیں رکھا، جس کے تم نگران ہو۔''

''اس وقت قید خانہ تھا ہی نہیں، جب وہ قتل ہوا تھا۔'' گوپال داس وہ بات کہہ گیا جو میں پوچھنا چاہ رہا تھا۔ میرے بدن میں خون کی روانی تیزی سے بڑھ گئی۔ میں نے خود پر قابو پایا اور سکون سے کہا۔

''تو گوپال داس جی، تمہارے اس قید خانے میں ہمارے دو آدمی قید ہیں۔ ہمیں وہ چاہئیں، اس کے بعد ہماری دشمنی ختم سمجھو۔'' میں نے کہا تو اس نے پوچھا۔

''کون سے دو آدمی؟''

''میں ابھی ان کے بارے میں بتا کر ان کے نام ظاہر نہیں کروں گا، تم مجھے یہ بتاؤ، وہ بندے کس طرح ہمارے حوالے کرو گے؟'' میں نے خود پر قابو پا کے اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے کہا۔

''تم کس طرح لینا چاہتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ تو تم کو ہی بتانا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے پھر مجھے وہاں تک لے جاؤ اور اپنے بندے لے لو۔'' اس نے بڑے آرام سے کہا۔

''کہاں ہے تمہارا قید خانہ، بولو۔'' میں نے پوچھا۔

''تم وہاں تک نہیں پہنچ پاؤ گے۔ اگر پہنچ بھی گئے تو قید خانے کے اندر گھسنا تو در کنار، اس کی چار دیواری کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتے۔'' اس نے کچھ اس اعتماد سے کہا کہ مجھے ایک دم سے غصہ آ گیا۔

''گوپال داس، ہم اگر تمہیں اغوا کر سکتے ہیں تو قید خانے تک بھی پہنچ جائیں گے، یہ......''

''تمہاری بھول ہے۔ میں مانتا ہوں کہ میرا اغوا تم لوگ اس لیے کر پائے ہو کہ یہ میری غلطی تھی۔ میں اپنی سیکیورٹی کی طرف سے غافل ہو گیا تھا۔ تم لوگ میرے قیمتی بندے مارنے میں اس لیے کامیاب ہو گئے کہ وہ غافل تھے۔ ورنہ ہمارے قریب تو چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھی۔''

''مجھے آخری بار پوچھنا ہے کہ تمہارا قید خانہ کہاں ہے؟''

''اگر میں نے بتا دیا، تم اسی وقت مجھے ختم کر دو گے۔'' اس نے یقین بھرے لہجے میں کہا۔

''نہ بتاؤ مگر اب مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ سوری تمہاری چِتا کو آگ نہیں لگ پائے گی، تمہیں میرے کتے کھا جائیں گے۔'' یہ کہہ کر میں نے یوں کہا جیسے کسی کو حکم دے رہا ہوں۔ ''ڈال دو اسے کتوں کے آگے۔''

''اگر میں بتا دوں تو......'' اس نے تیزی سے کہا۔

''تو یقین جانو، میں تمہیں اس وقت تک زندہ رکھوں گا جب تک وہاں سے اپنے لوگ نہیں لے آتا۔ اس کے بعد میں تمہیں چھوڑ دوں گا، یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔'' میں نے پورے اعتماد سے کہا تو چند لمحے خاموش رہا پھر بڑے اعتماد سے بولا۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

''شہر کے جنوب مغرب میں جو پہاڑی سلسلہ شروع ہوتا ہے، وہیں سے ایک بہت کھلا راستہ اوپر کی طرف جاتا ہے۔ یہ قدرتی نہیں، خود بنایا ہوا راستہ ہے۔ وہ سڑک ایک مندر کے قریب سے گزرے گی۔ وہ مندر دراصل اس قید خانے کی چوکی ہے۔ اسی کے بالکل سامنے وہ قید خانہ ہے۔''

''اب تمہاری زندگی اور موت کا انحصار اس بات پر ہے کہ تم جھوٹ بولتے ہو یا سچ، دو گھنٹے میں تمہارا فیصلہ ہو جائے گا۔'' میں نے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

''ایک بات کہوں.....''

''کہو.....'' میں نے کہا۔

''مجھے مارو مت، میرے ساتھ ڈیل کرو۔ تمہارے لوگ تم تک پہنچ جائیں گے۔''

''میں تمہارے سچ اور جھوٹ کو دیکھ لوں، اگلے دو گھنٹوں میں ہو سکتا ہے میں تمہارے ساتھ ڈیل کر لوں۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے اعتماد سے کہا تو میں نے تیمور کو اشارہ کیا۔ اس نے گوپال داس کے ہاتھ باندھے اور وہیں چھوڑ دیا۔

ہم چاروں باہر آ گئے۔ تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں فوروھیل لے کر آ گیا۔ ہم اس میں بیٹھ کر وہاں سے چل دیے۔ تیمور سمجھ چکا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے اپنا فون نکالا اور اپنے ساتھ جڑے کسی مقامی بندے کو کال کرنے لگا۔ اس نے پوری بات بتائے بغیر صرف اس مندر کے بارے میں تصدیق کرنے کے لیے کہا اور فون بند کر دیا۔

''تیمور، یہ فوروھیل مشکوک ہو چکی ہے۔ ہم اسے کہیں بھی پارک کر کے اپنے اپنے ٹھکانوں کی جانب نکل جائیں گے۔''

''اس گوپال داس کا کیا کرنا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ایک آدھ دن میں نہیں مرنے والا، دیکھتے ہیں کیا کرنا ہے اس کے ساتھ، تم تصدیق کر کے بتاؤ ممکن ہے اسے اٹھا کر اس قید خانے تک لے جانا ہی پڑے۔'' میں نے کہا اور فوروھیل کی رفتار بڑھا دی۔

☆☆☆

رانی بھاگ وتی کے بنگلے کے آہنی گیٹ کے سامنے میں آٹو رکشے سے اترا۔ میں نے رکشے والے کو کرایہ دیا۔ وہ آگے بڑھا تو میں گیٹ کی جانب چل پڑا۔ انہی لمحات میں مجھے بھاگتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں نے آواز کی سمت مڑ کر دیکھا تو چند لوگ دیوانہ وار میری جانب بھاگے چلے آ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ڈنڈے، ہاکیاں اور پتا نہیں کیا کیا تھا۔ آہنی گیٹ بند تھا۔ اسے سیکیورٹی والوں نے تصدیق کے بعد ہی کھولنا تھا۔ جبکہ حملہ آور مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر پہنچ چکے تھے۔ میرے پاس ایک پسٹل تھا۔ میں اس سے انہیں ڈرا سکتا تھا۔ وہ میرے سر پر پہنچ چکے تھے۔ میں اگر پسٹل نکال کر فائر بھی کرتا تو ایک آدھ ہی نشانہ بنتا، باقی مجھے پکڑنے میں کامیاب ہو جاتے۔ اتنے آدمیوں کے چنگل سے نکلنا بہت مشکل ہو جاتا۔ میرے پیچھے آہنی گیٹ تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ میرے لیے فوری نہیں کھل سکتا تھا اور یہی گیٹ میرے لیے دیوار بن جانے والا تھا۔ میں اگر دائیں نکلتا یا بائیں تبھی میری.. بچت ہو سکتی تھی۔ ممکن ہے وہ بھی یہی سوچ رہے ہوں، میں نے اپنے پیر مضبوطی سے سڑک پر جمائے اور پھر انہی کی جانب تیزی سے بڑھا۔ وہ اپنی جانب آتا دیکھ کر ایک لمحے کو ٹھٹکے تب تک میں ان کے سروں کے اوپر پہنچ چکا تھا۔ میں نے ایک بندے کے سر پر ہاتھ رکھ کر سہارا لیا اور ہوا میں تیرتا ہوا ان کے پیچھے جا پہنچا۔ جیسے ہی میرے قدم سڑک پر لگے، میری نگاہوں کے سامنے ایک ہاکی والا تھا۔ جب تک وہ پلٹتے، میں نے ایک جھٹکے سے وہ ہاکی چھین لی۔ میں الٹے قدموں پیچھے ہٹا اور ان سے مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔

دس سے بارہ افراد میرے سامنے تھے۔ وہ حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھ رہے تھے اور میں اسی طرح پیچھے ہٹ رہا تھا۔ نگاہوں ہی نگاہوں میں انہیں تول رہا تھا کہ اگر مجھے حملہ کرنا پڑے تو کدھر سے کروں گا۔ وہ جتھے کی صورت میں تھے اور آہستہ آہستہ دائرے کی صورت میں پھیل رہے تھے۔ یہ میرے لیے خطرناک تھا۔ میں رک گیا تو ایک بندے نے بڑھ کر ڈنڈے سے مجھ پر حملہ کیا جو میں نے ہاکی سے روک لیا۔ انہی لمحات میں کئی ڈنڈے ابھرے اور مجھ پر آن پڑے، میں نے لاشعوری طور پر اپنے سر کو بچایا تھا۔ میرے ہاتھوں بازوؤں اور کمر سے اٹھنے والی ٹیسوں نے مجھے ادھ موا کر دیا تھا۔ میں ہاکی لیے پھرکی کی طرح گھوم گیا۔ میں نے یہ دیکھا ہی نہیں کہ کس کے کہاں پڑ رہی ہے اور نہ میں نے یہ پروا کی کہ میرے کہاں کہاں پڑ رہی ہیں۔ چشم زدن میں چند لوگ زمین پر پڑے تھے۔ میں اپنے ایک ہلے میں سمجھ گیا تھا کہ اگر کامیاب ہو بھی گیا تو اس وقت تک میں بہت زیادہ زخمی ہو جاؤں گا۔ میرے بدن پر لگنے والی ضربیں اتنی شدید تھیں کہ میں مزید کچھ دیر ہی ان کے

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

مقابلے میں ٹھہر سکتا تھا۔ میں نے اسی لمحے فیصلہ کیا اور فوراً الٹے قدموں بھاگا، چند قدم کے فاصلے تک جاتے ہوئے میں نے ہاکی پھینک کر اپنا پسٹل نکال لیا۔ میں اپنے پاؤں پر مڑا اور فائر کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک چیخ بلند ہوئی۔ ایک بندہ سڑک پر گر کر تڑپنے لگا تھا۔

میں بھاگتا ہوا سڑک کے دوسرے کنارے ایک درخت کے پیچھے جا پہنچا۔ وہیں سے میں نے تاک کر دوسرا فائر کیا۔ بلاشبہ وہ کسی کے لگا تھا، ایک شور مچ گیا۔ اس کے ساتھ ہی سامنے سے فائر ہوا۔ پھر یکے بعد دیگرے کئی فائر ہو گئے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ہجوم سے ایک ہی شخص فائر کر رہا تھا، میں نے اس کا نشانہ لیا اور تین فائر کیے۔ اس کا ہاتھ بلند ہی رہ گیا اور وہ سڑک پر گر گیا۔

انہی لمحات میں رانی بھاگ وتی کے بنگلے کا آہنی گیٹ کھلا اور چند سیکیورٹی والے باہر آ گئے۔ انہوں نے آتے ہی ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔ ان کا مقصد ہجوم کو ڈرانا دھمکانا تھا۔ وہ جو چند افراد وہاں کھڑے تھے، وہ دائیں بائیں بھاگنے لگے۔ چھ کے قریب سڑک پر پڑے تھے۔ سیکیورٹی گارڈز نے فائرنگ بند کر دی تھی۔ میں نے جب یہ تسلی کر لی کہ ان میں سے کوئی نہیں اٹھے گا، میں درخت کی اوٹ سے نکلا اور سڑک پر آ گیا۔

میں تیزی سے آہنی گیٹ تک جا پہنچا۔ سیکیورٹی والوں نے مجھ پر گنز تان لیں۔ میں بڑے اعتماد سے ان کے قریب چلا گیا۔

''کون ہو تم؟'' ایک سیکیورٹی والے نے تحکمانہ انداز میں پوچھا۔

''اپنی رانی سے کہو، رانا ویر سنگھ ہوں۔'' میں نے سختی سے کہا۔

''کیا آپ رانی سے ملنا چاہتے ہو؟'' اس نے پوچھا تو میں نے جھنا کر کہا۔

''ابے جلدی کر، ورنہ یہیں کوئی فائر کر دے گا مجھ پر۔''

یہ کہتے ہوئے میں گیٹ کے اندر کی جانب چلا گیا۔ وہاں پر ایک کرسی پڑی تھی، میں اس پر بیٹھ گیا۔ ایک سیکیورٹی والا اندر کہیں بات کر رہا تھا۔ میرے پاس ریتو کا فون ہوتا تو میں اب تک اندر پہنچ چکا ہوتا اور کوئی بھی یہاں سے بچ کر نہ جا تا لیکن وہ فون اب تک نجانے کہاں تھا۔

مجھے وہاں بیٹھے دس منٹ سے بھی زیادہ ہو گئے تھے۔ میں حیران تھا کہ اتنا وقت کیوں لیا جا رہا ہے۔ تبھی میں نے ایک چھوٹی سی کار گیٹ کی طرف آتے ہوئے دیکھی، وہ مجھ سے ذرا فاصلے پر رک گئی۔ اس میں ریتو بیٹھی ہوئی تھی۔ کار رکتے ہی وہ تیزی سے میری جانب آئی۔

''کن لوگوں نے حملہ کیا؟''

''مجھے نہیں پتا، شاید وہ میری تاک میں یہاں موجود تھے۔'' میں نے اسے بتایا تو وہ سرسراتے ہوئے بولی۔

''یہ پرتاب سنگھ ہی کے لوگ تھے۔ وہ مجھے کئی بار فون کر چکا ہے۔''

''کیا کہتا ہے؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''وہ تمہارے بارے ہی میں پوچھ رہا تھا، وہ تمہیں بتاتی ہوں، چوٹ زیادہ تو نہیں لگی؟'' اس نے تیزی سے پوچھا۔

''اوئے چوٹ نہیں چوٹیں کہو۔ اس پسٹل نے بچا لیا ورنہ.....'' میں نے کہا تو وہ مڑتے ہوئے بولی۔

''آؤ چلیں۔''

میں اس کے ساتھ کار میں آ بیٹھا تو وہ چل دی۔

''کیا کہتا رہا ہے پرتاب سنگھ تمہیں.....'' میں نے پوچھا۔

''وہ صرف تمہارا پوچھ رہا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''تم نے کیا بتایا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی کہ میں نہیں جانتی، تم کون ہو۔'' اس نے بتایا۔

''اس نے رانی سے کوئی بات کی؟'' میں نے پوچھا۔

''پتا نہیں، بس اتنا پتا چلا ہے کہ وہ ابھی تک یہاں دیوگڑھ نہیں پہنچا، اس کے آنے سے کوئی بات شاید بڑھے۔'' وہ سکون سے بولی، پھر جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو۔

''تم نے مجھے فون کیوں نہیں کیا؟''

''سارا فساد تمہارے فون کا ہے، تمہارے نمبر سے وہ مجھ تک پہنچا ہے، اس نے مجھے کال کی تھی۔ یہی کہا کہ وہ مجھ تک پہنچ رہا ہے، میں نے تمہارا فون ضائع کر دیا۔''

''اوہ..... میرا یہ فون بھی اب خطرناک ہے۔'' اس نے سرسراتے ہوئے کہا تو میں خاموش رہا۔ میرے بدن کی ٹیسیں مجھے بے چین کر رہی تھیں۔ میں خود پر قابو رکھا ہوا تھا۔ وہ مجھے اسی رہائش گاہ لے گئی جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔ چھوٹے سے لاؤنج میں آتے ہی بولی۔

''شرٹ اتار کے لیٹو یہاں، دیکھوں کہاں کہاں چوٹ آئی ہے۔''

میں نے شرٹ اتاری اور صوفے پر لیٹ گیا۔ وہ کافی دیر تک مجھے ہر طرح سے ٹٹول کر دیکھتی رہی۔ اس دوران میں بیل بجی تو وہ دروازے تک گئی۔ واپسی پر اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ وہ وہیں بنگلے میں ملازم تھا۔ اس نے

www.paksociety.com

بھی مجھے ہر طرح سے ٹٹول کر دیکھا، پھر فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی۔''

''ہاں وہ میں نے بھی دیکھ لیا ہے۔'' ریتو نے کہا۔

''چوٹیں ہیں، ایک دو دن میں آرام آجائے گا، یہ دوائیں دے دو۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے کچھ اسٹرپس نکالے اور ریتو کو تھما دیے۔ جس وقت تک میں نے کپڑے پہنے، وہ جا چکا تھا۔

''رانی کو میری آمد کا نہیں پتا؟'' میں نے پوچھا۔

''پتا ہے، اسی نے کہا کہ پہلے میں تمہیں دیکھ لوں، پھر فریش ہو کر اس کے پاس جانا ہے۔'' ریتو نے کہا تو میں باتھ روم کی جانب بڑھ گیا۔ جیسے ہی میرے بدن پر پانی پڑا، مجھے یوں لگا جیسے میرے بدن میں آگ لگ گئی ہے۔ میں بڑی مشکل سے نہایا۔ باہر آکر میں کتنی دیر تک صوفے پر پڑا رہا۔ ریتو میرے دوا لگاتی رہی۔ جب میں کافی حد تک خود کو پُرسکون محسوس کرنے لگا تو میں ریتو کے ساتھ رانی بھاگ وتی کی جانب چل پڑا۔

رانی بھاگ وتی نے ہمیں اپنے کمرے ہی میں بلا لیا تھا۔ وہ صوفے پر براجمان تھی۔ اس نے سیاہ ساڑی پہن رکھی تھی، زلفیں یونہی کھلی چھوڑ رکھی تھیں۔ میں نے جب بھی اسے دیکھا تھا، اس کے ساڑی پہننے کا انداز ایک جیسا تھا، صرف رنگ بدلتا تھا۔ وہی تنگ سا، کسا ہوا سلیولیس بلاؤز، ساڑی کے پھیر سے بے نیاز کمر اور لپکتا ہوا پلو۔ میں اس کے چہرے کی جانب دیکھ رہا تھا جہاں تذبذب بکھرا ہوا تھا۔ وہ نچلے ہونٹ کا دائیں کونا بار بار دانتوں سے دبا رہی تھی۔ میں چاہ رہا تھا کہ وہ خود بات کرے۔ کافی دیر خاموشی کے بعد اس نے دھیمے سے کہا۔

''رانا جی تم نے ایک بڑے امتحان میں ڈال دیا۔''

''تو ٹھیک ہے، میں اپنی قربانی دے دیتا ہوں، بڑی بی کو جیسے لایا ہوں، ویسے ہی ان کے ہاں چھوڑ آتا ہوں۔'' میں نے بڑے تحمل سے کہا تو وہ بے ساختہ تیزی سے بولی۔

''نہیں ایسا نہیں، اب ایسا نہیں ہو سکتا۔ کچھ بھی ہو جائے، میں تم پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔''

''پھر آپ اتنا.....'' میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات سنے بغیر بولی۔

''میں جو دھیرے دھیرے جنگ لڑنا چاہ رہی تھی، تم نے ایک ہی ہلّے میں اس کا رخ بدل دیا ہے۔ کسی کی ہمت نہیں تھی کہ وہ میرے بنگلے کے آس پاس بھی پھٹک جائے لیکن انہوں نے تم پر حملہ کر دیا۔ ان کی اتنی ہمت ہو گئی۔''

''بڑی بی کیا کہتی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ اب پرسکون ہے۔ اسے یقین ہو گیا ہے کہ کوئی اسے نقصان نہیں پہنچائے گا، وہ کہیں ایسی جگہ نہیں جہاں اس سے کوئی اونچی آواز میں بھی بات کر سکے، میں نے اسے سمجھا دیا ہے۔'' رانی نے سکون بھرے انداز میں کہا تو میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''تو پھر پریشانی کیا ہے؟''

''یہی کہ آج تم پر حملہ کیا ہے، کل وہ اپنے غنڈوں کے ساتھ یہاں بھی آجائے گا۔'' اس نے پریشان لہجے میں کہا۔

''میں نے کہا نا آپ نے بساط تو بچھائی مگر آپ کو مہرے چلنا نہیں آتے، نہ ہی آپ کو جنگ لڑنا آتی ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے سانس لیا پھر پوچھا۔ ''پرتاب سنگھ کا کوئی فون آیا؟''

''کئی بار آچکا ہے مگر میں نے اس کا فون نہیں سنا۔''

''فون سنیں اور جتنا بڑا مطالبہ ہو سکتا ہے، وہ کریں۔ بڑی بی والا مہرہ جتنا کھیل سکتی ہیں، کھیلیں۔ ایسا موقع پھر کبھی نہیں ملے گا۔'' میں نے قدرے تلخ لہجے میں کہا تو وہ دھیمے سے بولی۔

''بات تو تمہاری بالکل ٹھیک ہے، میں ایسا سمجھتی بھی ہوں، لیکن.....''

''آپ پرتاب سنگھ سے بات نہیں کر پا رہی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ایسا ہی کچھ سمجھ لو۔'' اس نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے اپنا مطالبہ بتاؤ، میں بات کر لیتا ہوں۔'' میں نے حتمی انداز میں کہا تو وہ چند لمحے سوچتی رہی، پھر بولی۔

''میرا ایک ہی مطالبہ ہے، میں اسے اپنے قدموں پر ڈھیر کرنا چاہتی ہوں، اس کے سوا مجھے کچھ نہیں چاہیے۔''

''اگر میں یہ کر دوں.....'' میں نے اعتماد سے کہا تو اس نے چونک کر میری جانب دیکھا، پھر چمکتی ہوئی آنکھوں سے بولی۔

''تم جو مانگو گے، دوں گی۔''

''تو پھر یہ کھیل مجھے خود کھیلنے دو۔ اپنے لوگوں کو میرے بارے میں بتا دو، ایسا نہ ہو کہ میں گیٹ پر آجاؤں اور کوئی مجھے پہچانے بھی نہیں۔''

''اب ایسا نہیں ہوگا، تمہیں اجازت ہے۔'' اس نے کہا ہی تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

ایک ملازمہ اندر آگئی۔ اس نے رانی کی طرف دیکھ کر نرم سے انداز میں کہا۔

''گیٹ پر پولیس کمشنر ہے۔ وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔''

''پولیس کمشنر......؟'' رانی نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔ ''بلاؤ۔''

ملازمہ واپس چلی گئی۔ رانی میری جانب سوالیہ نشان سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے بڑے سکون سے کہا۔

''وہ اگر بڑی بی کو لے جانے کے لیے سرچ وارنٹ لے کر آیا ہوگا تو بڑی بی کسی بھی صورت واپس نہیں جانی چاہیے۔ اگر وہ چلی گئی تو پرتاب سنگھ بڑے غضب کے ساتھ حملہ آور ہوگا، مجھے صرف ایک دن چاہیے، پھر دیکھنا حالات کیا بنتے ہیں۔''

''میں دیکھتی ہوں۔'' اس نے کہا اور اٹھ کر باہر کی جانب چل دی۔ ریتو اس کے ہمراہ چلی تو میں بھی پیچھے ہولیا۔ رانی اور ریتو لاؤنج میں چلی گئیں، جبکہ میں باہر ہی رہا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ پولیس کمشنر اپنے ایک ماتحت کے ساتھ رانی کو دیکھ کر احترام میں کھڑا ہوگیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو نمسکار کیا تو رانی نے اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تشریف رکھیں۔''

وہ بیٹھ گئی تو پولیس کمشنر نے بیٹھ کر کہا۔ ''میں اس لیے آیا تھا، ابھی کچھ دیر پہلے یہاں بنگلے کے باہر فائرنگ ہوئی ہے، کہیں وہ آپ کو نقصان پہنچانے کے لیے تو حملہ نہیں ہوا؟''

''نہیں، ایسا نہیں ہے۔'' رانی نے متانت سے کہا، پھر لمحہ بھر رک کر بولی۔ ''وہ کوئی راہ گیر تھا جس پر کچھ لوگوں نے حملہ کیا تھا، وہ اپنی جان بچانے گیٹ کے اندر آگیا تھا۔''

''اب وہ کہاں ہے؟''

''مجھے سیکیورٹی والوں نے بتایا ہے کہ وہ چلا گیا ہے۔'' رانی نے سکون سے کہا تو پولیس کمشنر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''چلیں، میں اب چلتا ہوں۔''

''بیٹھیں، چائے پی کر جائیں۔'' رانی نے کہا۔

''نہیں بس، میں چلتا ہوں۔'' اس نے کہا پھر رک کر بولا۔ ''شہر میں اچانک ہی وارداتیں بڑھ رہی ہیں۔ ممکن ہے وہ راہ گیر نہ ہو، یا معاملہ کچھ بھی ہو آپ کو بہر حال محتاط رہنا ہے۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' رانی نے کہا۔

''کسی بھی صورت میں ہمیں اطلاع ضرور دیں۔'' اس نے کہا اور تیزی سے نکلتا چلا گیا۔

کمشنر کی گاڑی جیسے ہی پورچ سے چلی، میں لاؤنج میں چلا گیا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی بات کرتا، رانی خود ہی بول اٹھی۔

''کمشنر کا مقصد وہ نہیں تھا جو اس نے کہا، بات کوئی دوسری ہے۔''

''میں سمجھ رہا ہوں۔ یہ سب آپ کے فون نہ سننے کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اب اگر کال آئے تو آپ کو بات کرنی ہے۔'' میں نے کہا تو وہ میرے چہرے پر دیکھ کر بولی۔

''کیا کہوں گی میں......؟''

میں چند لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر دھیمی سی مسکان کے ساتھ اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''آپ بہت اچھی طرح سمجھتی ہیں، بس کہیں بھی جذباتی نہیں ہونا، اکثر جذباتی فیصلے پچھتاوے کا باعث بنتے ہیں۔''

میری بات کا اس نے جواب نہیں دیا۔ وہ اٹھ کر اندر جانے لگی تو اسی دوران اس کا فون بج اٹھا۔ اس نے اسکرین پر دیکھا پھر چونک کر بولی۔

''لو یہ آگیا فون......''

''تو پھر کریں بات۔'' میں نے کہا تو وہ چند لمحے اسکرین پر دیکھتی رہی، پھر اس نے کال ریسیو کر کے اسپیکر آن کر دیا۔

''دھنے واد مہارانی جی، تم نے میرا فون سننے کی زحمت کی۔'' دوسری طرف سے طنزیہ لہجے میں کہا گیا۔

''کام کی بات کرو۔'' رانی نے جھڑکنے والے انداز میں کہا۔

''کمشنر آیا ہے تو فون سنا، ورنہ......''

''کہا نا، کام کی بات کر......'' اس نے اسی لہجے میں کہا۔

''سن، ماتا جی کو جس طرح لے کر گئے ہو، اس طرح نہیں، بلکہ خود لے کر آجاؤ، میرے شہر میں پہنچنے سے پہلے پہلے، اور ہاں ساتھ میں وہ دونوں مجھے چاہئیں، جو ماتا جی کو لے کر گئے ہیں۔ انہیں بھی ساتھ لے کر آنا، ورنہ تمہیں پتا ہے، میں کیا کر سکتا ہوں۔''

''تم کچھ بھی نہیں کر سکتے ہو۔'' رانی نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''ہاں تمہارے لیے تو کچھ بھی نہیں کر سکا لیکن اپنی ماتا جی کے لیے تو اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔'' اس نے اعتماد سے کہا۔

''تو پھر جان ہی دے کر دکھاؤ، اگر تم میں ہمت ہے تو

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

اپنی ماتا جی کو میرے ہاں سے لے جا کر دکھاؤ، میں دیکھتی ہوں تم کتنے سورما ہو۔'' رانی نے طنزیہ انداز میں کہا تو دوسری جانب سے قہقہہ بلند ہو گیا۔

''دیکھ میں نہیں چاہتا کہ ماتا جی کو لے کر بات میڈیا تک چلی جائے، اگر چلی بھی گئی تو کوئی بات نہیں، جو کچھ لوگ تمہارے بارے میں نہیں جانتے، وہ بھی جاننے لگ جائیں گے۔ سو بھلائی اسی میں ہے کہ میرے شہر پہنچنے سے پہلے خود......''

''تم سے بھلائی کی امید نہیں ہے مجھے پرتاب سنگھ، ایک بار کہا ہے، اگر تم میں ہمت ہے تو اپنی ماتا جی کو لے جاؤ، میں بھی تمہیں وچن دیتی ہوں، مر جاؤں گی، مار دوں پر......'' یہ کہتے ہوئے وہ خاموش ہو گئی۔

''تم ایسے نہیں مانو گی، چل میں آ رہا ہوں، دیکھتا ہوں، تم کیا کرتی ہو۔ تم اور تمہارا وچن گیا بھاڑ میں......'' ایک دم اس نے انتہائی غصے میں کہا اور فون بند کر دیا۔ رانی بھاگ وتی چند لمحے فون اسکرین کو دیکھتی رہی پھر کوئی بات کیے بنا لاؤنج سے نکلتی چلی گئی۔

یہ وہ وقت تھا جب میں رانی کو پرتاب سنگھ کے خلاف مزید بھڑکا سکتا تھا۔ اسے حوصلہ دے کر بڑی بڑی باتیں کر کے مزید مضبوط کر سکتا تھا لیکن میں خاموش رہا۔ میں رانی کی نفسیاتی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ میں اس کے اندر کی نفرت کو دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کس حد تک ہے۔ اگلے چند گھنٹوں میں سب واضح ہو جانے والا تھا۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ ریتو کا سیل فون بجا، اس کے ساتھ ہی وہ بڑبڑانے والے انداز میں بولی۔

''لو یہ پرتاب سنگھ کا فون......''

''لاؤ مجھے دو۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا تو ریتو نے فون میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے کال ریسیو کی اور بڑے سکون سے ہیلو کہہ دیا۔

''ریتو، تم اپنی رانی کو......''

''میں بات کر رہا ہوں رانا ویر سنگھ۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا تو وہ ایک دم سے خاموش ہو گیا پھر غراتے ہوئے بولا۔

''اچھا ہوا تم سے بات ہو گئی۔ میں سمجھ گیا ہوں تم شاطر بھی ہو اور تربیت یافتہ بھی، مگر تم نہیں جانتے کہ......'' وہ کہہ رہا تھا لیکن میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

''میں جانتا ہوں، تم صرف فون پر دھمکیاں دے سکتے ہو۔''

''تم نے میرا دل اپنی مٹھی میں کر لیا ہے، ورنہ اب تک تیرے جیسے کو میں کئی ٹکڑوں میں بانٹ چکا ہوتا۔'' اس نے انتہائی غصے میں کہا۔

''ماتا جی کو بھول جاؤ، وہ اس وقت تک تمہیں نہیں مل سکتی، جب تک میں نہیں چاہوں گا۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا تاکہ اس کا غصہ مزید بڑھے لیکن اگلے ہی لمحے وہ بڑے سکون سے بولا۔

''تم کیا چاہتے ہو؟''

''تمہارا خاتمہ۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''تم خواب دیکھ رہے ہو یا پھر پاگل ہو، رانی میرے سامنے ایک لمحے کو بھی نہیں ٹک سکتی اور تم اس کے پالتو بن کر مجھ پر بھونک رہے ہو۔ تم اپنی اوقات میں رہو، میرے شہر آنے سے پہلے یہ شہر چھوڑ کر چلے جاؤ۔ اسی میں تمہاری زندگی ہے، ورنہ بہت سسکا سسکا کر ماروں گا۔'' اس نے لفظ چبا چبا کر کہا۔

''میں تمہارا ہی انتظار کر رہا ہوں۔ میدان تمہاری پسند کا ہوگا، وہیں تمہیں ماروں گا۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا تو ایک لحہ کو خاموش ہوا، پھر قہقہہ لگانے لگا۔ اس کے ساتھ اس نے کال ختم کر دی۔ میں نے فون ریتو کی طرف بڑھا تو اس نے پوچھا۔

''کیا کہہ رہا تھا؟''

''وہی دھمکیاں۔'' میں نے اختصار سے کہا تو بولی۔

''تمہیں اس کی قوت کا اندازہ نہیں ہے۔ ہم دونوں کا کچھ نہیں بگاڑ پائیں گے۔'' اس نے کہا تو مجھے ریتو پر بے تحاشا پیار آیا۔ وہ خود کو مجھ سے الگ نہیں سمجھ رہی تھی۔ اس "ہم دونوں" کہنا، اس سوچ کا غماز تھا۔ میں نے سامنے کھڑی ریتو کو ایک نگاہ دیکھا، پھر اس کا ہاتھ پکڑ بڑے ہی جذباتی انداز میں کہا۔

''ریتو، انسان قوت سے نہیں، حوصلے سے لڑتا جب تک بڑی بی یہاں پر ہے، وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''

''میں جانتی ہوں رانی اس کے سامنے پگھل سکتی ہے'' ریتو نے خوف زدہ لہجے میں کہا تو میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''تم رانی کو حوصلہ دیتی رہو اور بڑی بی کی نگرانی یہیں بنگلے کے اندر رہو۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔ مجھ

بھروسا رکھو۔''

''تم پر بھروسا ہے۔'' اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''اب جاؤ، بڑی بی کے آس پاس رہو۔'' میں نے کہا اور پلٹ کر بنگلے سے نکلتا چلا گیا۔

اس وقت میں رہائش گاہ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ جب تیمور کا فون آ گیا۔ میں نے اس کی کال ریسیو کی تو وہ بولا۔

''جہاں سے پہاڑی سلسلہ شروع ہوتا ہے وہاں سے ایک راستہ اوپر کی جانب جاتا ہے۔ وہاں پر ایک چھوٹا سا مندر ہے۔ چند پجاری قسم کے لوگ بھی موجود ہیں۔''

''کیا تم خود وہاں پر ہو یا.....'' میں نے پوچھتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی، اس پر وہ بولا۔

''نہیں، میں اس طرف نہیں گیا۔ ایک مقامی اور دوسرا اپنا ساتھی وہاں گئے ہیں۔ ابھی انہوں نے کال کی ہے۔''

''وہاں کسی کو شک نہ ہو جائے۔'' میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

''وہ وہاں پر یوں گئے ہیں جیسے راستہ بھول گئے ہوں، وہ بس دو چار منٹ ٹھہرے ہیں اور پھر واپس آ رہے ہیں۔'' اس نے تفصیل بتائی۔

''شام تک پوری طرح تیار رہنا، آر یا پار.....'' میں نے کہا تو وہ تیزی سے پُرسکون لہجے میں بولا۔

''بالکل، میں تیار ہوں۔''

''او کے ڈن۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

اسی لمحے مجھے گوپال داس کا خیال آیا۔ وہ پرانی فیکٹری میں پڑا تھا۔ بلاشبہ اس نے سچ بولا تھا لیکن یہ ایسا وقت تھا کہ نہ تو میں اسے جا کر چھوڑ سکتا تھا اور نہ ہی میں اسے مار سکتا تھا۔ میں نے چند لمحے سوچا اور پھر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

☆☆☆

میں رہائش گاہ پر پہنچ چکا تھا۔ میں چاہ رہا تھا کہ کچھ کھا پی کر تھوڑی دیر آرام کر لوں، پھر مجھے ہر حال میں شام کے وقت یہاں سے نکلنا تھا۔ مجھے یہاں سے کوئی گاڑی یا اسلحہ نہیں چاہیے تھا۔ اس کا سارا انتظام تیمور کر چکا تھا۔ مجھے بس یہاں سے اسی طرح نکلنا تھا کہ کسی کی نگاہوں میں نہ آؤں۔ سب یہی سمجھیں کہ میں بنگلے پر ہوں۔ اسی مقصد کے لیے میں نے ریتو کو بھی بنگلے کے اندر رہنے کا کہا تھا۔ یہی سوچتے ہوئے میں نے فریج کھولا، اس میں سے تھوڑے پھل نکالے۔ میں ابھی بیٹھا بھی نہیں تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ساتھ ہی ریتو کی آواز ابھری۔

''رانا، دروازہ کھولو۔''

میں نے تیزی سے دروازہ کھولا تو سامنے ریتو کھڑی تھی۔ اس کی مٹھی میں فون تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے تشویش سے پوچھا۔

''خیر تو ہے نا ریتو.....؟''

''ہاں خیر ہی ہے، آؤ بیٹھو تمہیں بتاؤں۔'' اس نے اندر بڑھتے ہوئے کہا اور پھر ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں اس کی طرف دیکھتا ہوا اس کے پاس بیٹھ گیا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ خود کہے جو کہنا چاہ رہی تھی۔ تبھی اس نے الجھتے ہوئے کہا۔

''وہ تم نے ایک بات یا کہاوت یا جو بھی ہے سنی ہے کہ دوست کا دوست، دوست ہوتا ہے اور دشمن کا دشمن، دشمن.....''

''میں سمجھا نہیں تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟'' میں نے کہا۔

''پرتاب سنگھ کے بھی دوست نہیں ہیں، جنہیں اس نے کچلا ہے، وہ دشمن آج بھی اسے ختم کرنے کی حسرت دل میں لیے ہوئے ہیں۔ وہ کوئی شریف شرفا لوگ نہیں ہیں، وہ بھی جرم کی اسی دنیا کے لوگ ہیں۔''

''تم سیدھی بات کہو، کہنا کیا چاہتی ہو۔''

''میں ساری بات تم سے کہہ دوں گی لیکن پہلے مجھے یہ بتاؤ، گوپال داس کو کس نے اغوا کیا ہے، تم نے یا.....؟'' اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے ایک بھی لمحہ سوچے بغیر کہا۔

''ہاں، میں نے اسے اغوا کیا ہے۔''

''ایسا کب ہو گیا؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''جب ہم بڑی بی... کو اغوا کر کے لا رہے تھے۔'' میں نے سکون سے بتا دیا تو اس نے سوچتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''تو اس کا مطلب ہے تمہارے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہیں؟''

''ہاں میرے ساتھ لوگ ہیں۔'' میں نے اسے سچ بتا دیا تو ایک دم سے اس نے اپنے تنے ہوئے بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وہ چند لمحے میری جانب دیکھتی رہی پھر انتہائی سنجیدگی سے بولی۔

''مجھے شک تو پہلے ہی سے تھا، اب تم نے سچ بول کر میرا دل جیت لیا ہے۔ مجھے لگا، تم میرے ساتھ دھوکا نہیں کر رہے ہو۔''

''ریتو، مجھ سے مزید کچھ نہیں پوچھنا، اسی میں تمہاری

www.pakistanipoint.com

بہتری ہے۔''

''میں سمجھ گئی ہوں،'' اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد کہتی چلی گئی، ''ہاں، سنو اب میری بات، یہاں کسی دور میں جگدیش لعل جسے سب یہاں جگو دادا کے نام سے جانتے تھے، اس کا طوطی بولتا تھا۔ وہ پرتاب سنگھ کی طرح طاقت ور تو نہیں تھا اور نہ سیاست داں کا روپ دھارے ہوئے تھا لیکن یہاں اور آس پاس کے علاقوں پر اس کا راج تھا۔ پرتاب سنگھ اپنی جگہ بنانے کے لیے اسے ختم کرنا چاہتا تھا۔ دونوں طرف سے لڑائی فساد چلتا رہا۔ یہاں تک کہ پرتاب سنگھ نے اس کے دونوں بیٹے قتل کروا دیے، تبھی جگو دادا زیر زمین چلا گیا۔ کتنا عرصہ اس کا پتا ہی نہیں چلا۔ تقریباً ایک برس سے وہ میرے ساتھ رابطے میں تھا۔ آخری بار بات ایک ماہ پہلے ہوئی تھی اس کے بعد ابھی کچھ دیر پہلے مجھے اس کا فون آیا ہے۔''

''جگو دادا...... یہ اچانک، ممکن ہے جگو داد کے نام سے کوئی چال چل رہا ہو، تم اسے کیسے جانتی ہو اور وہ تم تک کیسے پہنچ گیا؟'' میں نے ایک ہی سانس میں کئی سارے سوال کر ڈالے۔

''کیا میں نے تمہیں بتایا نہیں کہ میں کالج دور میں منشیات بیچتی رہی ہوں۔ میں بھی ایک نیٹ ورک کا حصہ تھی، ایک برس سے میں اس کے ساتھ رابطے میں ہوں اور......'' اس نے تیزی سے کہا۔

''ہاں، تم نے بتایا تھا۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

''وہ جگو دادا ہی کا نیٹ ورک تھا۔ میں اسے بہت اچھی طرح جانتی ہوں اور وہ بھی مجھے جانتا ہے۔ اگر پرتاب سنگھ میرے فون سے تم تک پہنچ سکتا ہے تو کیا جگو دادا کو شہر میں ہونے والے حالات کا نہیں پتا؟'' اس نے دلیل دیتے ہوئے کہا۔

''کیا گوپال داس کے بارے میں اس نے تمہیں بتایا؟'' میں نے پوچھا تو وہ تیزی سے بولی۔

''ہاں، وہی نہیں، یہاں کی زیر زمین دنیا میں گوپال داس کے اغوا سے ہلچل مچی ہوئی ہے۔ شاید کسی کو پتا نہ چلتا لیکن یہ جو گیٹ پر تمہارے ساتھ مارا ماری ہوئی ہے تبھی اسی سے جوڑ رہے ہیں۔ پرتاب سنگھ کے لوگوں میں بھی یہی بات پھیلی ہوئی ہے کہ گوپال داس کو اغوا کرنے والا رانی بھاگ وتی کا کوئی کارندہ ہے جس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسے اغوا کیا۔''

''تو جگو دادا مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، وہ پرتاب سنگھ کو ختم کرنے کے لیے ہمارا ساتھ دینا چاہتا ہے۔'' اس نے اصل بات بتادی۔

''کیا ہم اس پر بھروسا کر سکتے ہیں؟'' میں نے ریتو کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا تو وہ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی، پھر آنکھیں بند کر کے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تب میں نے کہا۔ ''لاؤ میری اس سے بات کراؤ۔''

''ابھی کرواتی ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے فون پر موجود نمبر پش کیے اور رابطے کا انتظار کرنے لگی۔ پھر کال ملتے ہی بولی۔ ''دادا، یہ کرو بات۔'' یہ کہہ کر اس نے فون میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے ہیلو کہا تو دوسری طرف سے بھاری آواز سنائی دی۔

''داد دیتا ہوں تمہیں۔ جی خوش کر دیا، کوئی تو ہے جو راون کی لنکا ڈھانے آ گیا ہے۔''

''دادا، یہ بولو، میں تمہارے کس کام آ سکتا ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''چھوٹا منہ بڑی بات...... میں اب تک پڑا اپنے زخم چاٹ رہا ہوں۔ یہ تو مجھے پوچھنا ہے کہ میں تمہاری کیسے مدد کر سکتا ہوں۔ میں اگر چھپ کر بیٹھا ہوں تو غافل نہیں ہوں۔ میری اردگرد پر نگاہ ہے۔ بس قوت نہیں ہے۔ گوپال داس کو قابو کرنے کا مطلب تم نے پرتاب سنگھ کی شہ رگ پکڑ لی ہے۔'' اس نے ایک ہی سانس میں ساری بات کہہ دی۔ اسی بات میں سب کچھ تھا۔ تبھی مجھے خیال آیا تو میں نے سکون بھرے لہجے میں کہا۔

''اگر میں گوپال داس تمہیں سونپ دوں تو کیا تمہیں کوئی فائدہ ہوگا؟''

''مجھے فائدہ ہو نہ ہو، اس کے ساتھ کھیل کھیلا جا سکتا ہے۔ ویسے بھی اسے قتل کر کے مجھے سکون ملے گا۔'' اس نے گہرے لہجے میں کہا۔

''دادا، چلو پھر جو کھیلنا ہے کھیلو، جی بھر کے کھیلو، راون کی لنکا میں جہاں چاہے آگ لگاؤ، میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' میں نے خوش کن لہجے میں کہا۔

''اس کا ایک ہی بیٹا ہے اور مجھے اسے مارنا ہے بس۔'' اس نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

''جو دل چاہے کرنا، ریتو تمہیں بتا دیتی ہے کہ گوپال داس کہاں ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے فون اسے تھما دیا۔ اسے بالکل نہیں پتا تھا کہ گوپال داس کو کہاں رکھا ہے اس لیے سوالیہ آنکھوں سے میری طرف دیکھا تو میں نے دھیمے سے

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

کہا۔ ''پرانی فیکٹری، دفتر کا کمرا'' میرے اتنا کہنے پر وہ سمجھ گئی۔ اس نے دادا کو فون پر اچھی طرح سمجھا دیا کہ گوپال داس کہاں مل سکتا ہے۔ اس نے فون بند کیا اور میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر حیرت ملی مسکراہٹ تھی۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتی تم پرانی فیکٹری کو اس طرح استعمال کرو گے۔''

''اگر تم نہیں سوچ سکتی ہو تو پرتاب سنگھ کے لوگ کیسے سوچ سکتے ہیں۔'' میں نے کہا تو وہ تشویش زدہ لہجے میں بولی۔

''کیا وہ زندہ مل جائے گا وہاں پر.....؟''

''زندہ یا مردہ، دونوں حالتوں میں وہ دادا کے کام آسکتا ہے اگر دادا میں تھوڑی بہت بھی عقل ہوئی تو۔'' میں نے کہا تو ریتو کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔ تبھی میں نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''ریتو، اگر زندگی رہی تو اب تم صرف ایک نٹ کی بیٹی نہیں رہو گی جو زندگی اور موت کے کھیل میں سانس لے رہی ہے۔ ایک بھرپور زندگی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ بس ایک دو دن.....''

میرے یوں کہنے پر وہ میرے چہرے پر دیکھتی رہی، پھر ایک دم سے میرے سینے کے ساتھ آلگی۔ وہ رو دی تھی۔ روتے ہوئے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں، نجانے اسے زندگی کی کون سی تلخی یاد آگئی تھی۔ میں نے اپنی بانہوں کے حصار میں لے کر اسے رونے دیا۔ میں چاہتا تھا کہ یہ بادل بھی چھٹ ہی جائیں۔ شاید وہ میری صورت میں ایک ہمدرد پا چکی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ مجھ سے الگ ہوئی اور اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولی۔

''آؤ میں تمہیں سب سیکیورٹی گارڈ سے ملوادوں، انہیں میں نے ایک جگہ اکٹھا کر رکھا ہے۔''

''چلو۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ میز پر پڑے پھلوں کو دیکھ کر بولی۔

''انہیں واپس رکھ دو، ابھی ہم کھانا کھاتے ہیں۔''

میں نے پھل فریج میں رکھے اور اس کے ساتھ چل دیا۔

☆☆☆

شام ڈھل چکی تھی۔ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ میں بنگلے کے عقبی دروازے سے نکل کر باہر سڑک پر آچکا تھا۔ میں وہاں رکا نہیں بلکہ ایک سمت چلتا چلا گیا۔ بنگلے کے پیچھے والا روڈ چھوٹا تھا۔ اس طرف سے بڑی گاڑیاں نہیں گزر رہی تھیں۔ چھوٹی کاریں، موٹر سائیکل، سائیکل یا پھر پیدل لوگ۔ اس

امتحان

سردار جی کے صاحب زادے خاندانی روایات کے عین مطابق لکھائی پڑھائی میں بالکل کورے تھے۔ امتحانات سر پر آئے تو کتابوں میں سر کھپانے کے بجائے پرچے آؤٹ کرنے کے چکر میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ کسی نے بتایا کہ انگریزی کے پرچے میں ''میرا دوست'' کے عنوان پر مضمون لکھنا ہوگا۔ ابا جی کو خوش خبری سنائی تو انہوں نے کسی کی مدد سے ایک مضمون لکھوا کر اپنے ہونہار فرزند کو رٹانا شروع کر دیا۔

پرچے میں ممتحن نے دوست کو باپ سے بدل دیا۔ ''مائی فادر'' یعنی میرا باپ پر مضمون لکھنا تھا۔ صاحب زادے چکرا گئے کہ اب کیا کریں۔ عقل نے دوڑ لگائی تو ترکیب سوجھ ہی گئی۔ انہوں نے رٹے ہوئے مضمون میں دوست کی جگہ باپ کا لفظ ڈال کر سب کچھ چھاپ ڈالا۔ اس نادر مضمون کا ابتدائی پیراگراف کچھ یوں تھا۔

''دنیا میں ہر ایک کے بہت سے باپ ہوتے ہیں لیکن سب قابلِ ذکر نہیں ہوتے۔ ان میں سے ایک آدھ ہی اچھا ہوتا ہے۔ ویسے تو میرے دسیوں باپ ہیں لیکن مجھے اسد بہت پسند ہے۔ وہ روزانہ کئی مرتبہ ہمارے گھر آتا ہے۔ دوسروں کو میری ماتا جی منہ نہیں لگاتیں، اس سے بہت محبت کرتی ہیں۔ میری غیر حاضری میں بھی گھنٹوں اُس سے باتیں کرتی رہتی ہیں...''

کراچی سے میمونہ عزیز کا امتحان

فرق

نیویارک کے ایک اسکول میں استانی نے ایک شاگرد سے قتلِ عام اور جنگ کا فرق بیان کرنے کے لیے کہا۔

لڑکے نے بلا تردد کہا۔ ''جب کوئی ریڈ انڈین قبیلہ دو چار سفید فاموں کو پکڑ کر مار دیتا ہے تو اسے قتلِ عام کہتے ہیں اور اگر دو چار سفید فام مل کر پورے ریڈ انڈین قبیلے کو مار ڈالتے ہیں تو اسے ہم جنگ کہتے ہیں۔''

کراچی سے عبداللہ کا انکشاف

www.paksociety.com

روڈ پر موجود چند دکانوں کی روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ میں ان کے سامنے سے گزرتا ہوا، بڑی سڑک پر آ گیا۔ یہاں کافی ٹریفک تھا۔ میں اس مخصوص کار کو دیکھنے کی کوشش میں تھا جس نے مجھے پک کرنا تھا۔ میں پیدل چلتا گیا، یہاں تک کہ میں اس بڑے کراس تک جا پہنچا جہاں کافی رش تھا۔

میرے حساب سے اب تک گاڑی مجھ تک پہنچ جانی چاہیے تھی، لیکن مجھے اس کے دور دور تک آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔ میرے پیچھے لوہے کی گرل لگی ہوئی تھی۔ میں وہاں رک کر تیمور کو فون کرنا چاہتا تھا۔ میں نے فون نکالا اور بے خیالی میں فون کرنے لگا۔ انہی لمحوں میں میرا سیل فون بجنے لگا۔ میں نے دیکھا، وہ اجنبی نمبر تھے۔ میں نے کال ریسیو کر کے ہیلو کہا تو دوسری طرف ہمارا ہی ایک ساتھی بات کر رہا تھا۔

''کہاں ہو تم؟'' میں نے پوچھا۔

''یہاں پر سب سے بڑا بل بورڈ دیکھیں، جس پر سیاہ کپڑوں والی دوشیزہ آپ کو دیکھ رہی ہے۔'' اس نے شوخی سے کہا تو میں نے اردگرد دیکھا۔ مجھے وہ بل بورڈ دکھائی دے گیا۔ وہ اسی کراس میں ایک بڑے بل بورڈ کے نیچے فوروہیل لیے کھڑا تھا۔ وہ میرے دائیں جانب کھڑا تھا۔ میں نے کال بند کی اور عام سے انداز میں چلتا ہوا اس کے پاس جا پہنچا۔ میں اس کے ساتھ پسنجر سیٹ پر جا بیٹھا۔ میرے بیٹھتے ہی وہ چل پڑا۔

''اتنی دیر کیوں لگا دی؟'' میں نے سامنے سڑک پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بس یہ فوروہیل اٹھانے میں ذرا دیر لگ گئی۔'' اس نے سکون سے کہا تو میں نے اسے یاد دلاتے ہوئے کہا۔

''او یار، ان میں ٹریکر ہوتے ہیں، فوراً پتا چل.....''

''او سرمت گھبرائیں، اس کا ٹریکر جام ہو چکا ہے، یہ دیکھیں۔'' اس نے ڈیش بورڈ کی جانب انگلی کا اشارہ کیا۔

وہاں ایک سیاہ رنگ کی ڈبیا سی چپکی ہوئی تھی۔ میرے علم میں تھا کہ یہ ڈیوائس جہاں بھی لگا دی جائے، وہاں جیمر لگ جاتا تھا۔ اگر کوئی ہمیں کال بھی کرنا چاہتا تو اس کی کال نہیں لگتی۔ تبھی میں نے تیزی سے کہا۔

''تم نے مجھے کال کی، تب یہ.....''

''اس وقت نہیں لگایا تھا۔ ابھی یہاں سے چلتے ہوئے لگایا ہے۔ کسی کو بھی اس فوروہیل کا یہیں تک سراغ ملے گا۔ اگر آپ نے کال کرنی ہو تو مجھے بتانا، یہ بھی اسی میں ہے۔'' اس نے بتایا اور ڈیوائس پر لگے ہوئے بٹن کی جانب اشارہ کیا۔ میں اسے سمجھنا نہیں چاہتا تھا اس لیے میں نے ''اوکے'' کہا اور سامنے سڑک پر دیکھنے لگا۔ میں تھوڑا بے چین ہو گیا تھا کہ اگر تیمور نے مجھے فون کیا تو اسے میرا فون بند ملے گا۔ اتنی اہم کارروائی کے دوران اس کا پریشان ہونا کوئی اچھی بات نہیں تھی۔

تقریباً آدھا گھنٹا چلتے رہنے کے بعد وہ ایک جگہ آ کر رک گیا۔ اس نے فوروہیل سڑک کنارے کھڑی کر دی پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔

''اُتریں سر۔'' میں اتر گیا تو اس نے پچھلی سیٹ پر سے بیگ نکالا، اس میں سے چھوٹا سا بم نکالا، پھر اسے ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے ایڈجسٹ کر دیا۔ میں یہ سب تماشا دیکھ رہا تھا، بلاشبہ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور رہی ہو گی۔ اسی لیے میں خاموش تھا۔ وہ بم لگا چکا تو اس نے کہا۔ ''چلیں سر۔''

''یہ سب کیوں کیا؟'' میں نے اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اس وقت ہمارا ایک ساتھی ہمیں دیکھ رہا ہے، وہ اسی پہاڑی پر موجود ہے۔ اگر کوئی پولیس، یا کوئی اور یہاں اس راستے سے اوپر جانے کی کوشش کریں گے تو وہ اپنے پاس رکھے ریموٹ کنٹرول سے یہ گاڑی اڑا دے گا۔''

''کس لیے.....؟'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''اس سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک ہمیں پتا چل جائے گا کہ گاڑی پھٹی ہے تو ضرور کوئی خطرہ ہے۔ دوسرا تھوڑی دیر تک ہی سہی آنے والوں کا رستہ رک جائے گا۔'' اس نے تفصیل سے سمجھایا تو میں نے غور سے دیکھا۔ اس نے اوپر جانے والے راستے کے بالکل کنارے پر فوروہیل کھڑی کی تھی۔ میں ان کی شاندار پلاننگ پر خوش ہوا۔ تبھی میں نے اوپر کی طرف جاتے ہوئے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''پتا نہیں تیمور پہنچا ہے کہ نہیں؟''

''تیمور یہاں پہنچ چکا ہے۔ اس کی نشانی یہ ہے کہ وہ دیکھیں، وہ پیچھے فوروہیل کھڑی ہے۔ وہ اسی پر آئے ہیں۔ باقی آپ اسے فون کر لیں لیکن اب ہمیں اس راستے پر نہیں جانا، ہٹ کر جانا ہے۔'' اس نے بھی دھیمی آواز میں کہا تو میں نے فون نکال کر تیمور سے رابطہ کیا۔ وہ پہنچ چکا تھا۔ میں نے فون جیب میں رکھا اور اس کے ساتھ تیزی سے پہاڑی چڑھنے لگا۔

وہ سب ایک اونچی جگہ پر یوں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک طرف بڑی سی آڑ تھی۔ میرے جاتے ہی ذرا سی ہلچل ہوئی تو میں نے تیمور سے صورتِ حال پوچھی۔ اس نے ایک

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

نوجوان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ دوپہر سے یہاں موجود ہے اور میرا اس سے مسلسل رابطہ رہا ہے۔ یہ تفصیل سے صورتِ حال بتاتا ہے۔"

"سر، میں دوپہر سے یہاں ہوں۔" اس نے تیزی سے کہا، پھر سانس لے کر کہتا چلا گیا۔ "وہ سامنے جو مندر دکھائی دے رہا ہے، وہ جہاں دیے روشن ہیں، وہاں پانچ سے چھ بندے، پجاریوں کے روپ میں موجود ہیں۔ یہاں سارے دن میں پوجا کرنے والا کوئی نہیں آیا۔ وہ یہیں ہیں اور بیٹھے گپیں لگاتے رہتے ہیں۔ تین بندے مطلب پجاری ہمہ وقت موجود رہتے ہیں۔"

"کوئی مزید ہلچل......" میں نے پوچھا۔

"جب شام ڈھل رہی تھی تو وہاں مندر کے بالکل سامنے سے دو بندے یہاں مندر پر آئے تھے۔ کچھ دیر ٹھہر کر واپس چلے گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اندر جانے کا یہی ایک راستہ ہے۔"

"لیکن ہم سب اس ایک راستے سے نہیں جائیں گے۔" میں نے تیمور سے کہا۔ "بلکہ ہم میں سے آدھے اسی طرح اوپر سے چلتے ہوئے آگے وادی تک جائیں گے، وہاں سے اگر کوئی راستہ ملا تو ٹھیک ورنہ وہ واپس یہیں آئیں گے۔ ایک حصہ سامنے سے جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" تیمور نے کہا تبھی ایک نوجوان نے مجھے جیکٹ دی۔ وہ سب بھی جیکٹ پہنے ہوئے تھے۔ میرے پاس پسٹل اور فالتو میگزین تھے۔ ان سب کے پاس بھی اسلحہ تھا۔ ہم پوری طرح تیار تھے۔ میں نے سب کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"کسی کو کوئی شک؟"

"کوئی شک نہیں۔" سب نے دھیمے سے کہا۔

"میں نیچے جا رہا ہوں، پہلے ان پجاریوں سے نمٹ لوں، پھر وہیں سے آگے بڑھتے ہیں، تم انہیں لے کر نکلو۔" میں نے تیمور سے کہا تو وہ ایک ٹکڑی کے ساتھ اوپر ہی اوپر چل دیے، جبکہ میں چند ساتھیوں کے ساتھ مندر کی جانب بڑھا۔ جو ہمارے نشیب میں تھا۔

میں اس مندر کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔ میرے سامنے اندھیرے میں وہ چھوٹا سا مندر تھا۔ اس پر ٹین کی چھت تھی اور نیچے کافی دِیے روشن تھے۔ جن کی روشنی میں جو مجسمہ دکھائی دے رہا تھا، اس کی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کس بھگوان کا ہے۔ اس کے سامنے تین پجاری بیٹھے تھے۔ وہ کسی پوجا میں مصروف نہیں تھے بلکہ یونہی باتیں کر رہے تھے۔

میں نے کچھ دیر تک انتظار کیا، میں دیکھنا چاہتا تھا کہ ان کے باقی ساتھی کہاں ہیں۔ چند منٹ تک ان کے علاوہ کوئی بھی دکھائی نہیں دیا، نہ ہی کسی کے ہونے کا احساس ہوا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور خود آگے بڑھا۔ میں اندھیرے میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ میں ان کے بالکل قریب پہنچ گیا۔

ان میں ایک پجاری مقامی زبان میں کوئی کہانی سنا رہا تھا، باقی دو انہاک سے وہ کہانی سن رہے تھے۔ میں اچانک ان کے سر پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھنے لگے تو میں نے ایک کو دبوچ لیا۔ باقی دو بھی میرے ساتھیوں کی گرفت میں تھے۔ میں نے جس کا سر نیچے فرش پر لگایا ہوا تھا، اس نے مزاحمت کرتے ہوئے پوچھا۔

"کون ہو تم......؟"

"یہی سوال میں تم سے کرنا چاہتا ہوں، تم پجاری ہو یا......"

"پجاری ہی ہوں۔" اس نے خود کو چھڑانے کے لیے زور لگایا تو میں نے اسے ذرا سا ڈھیلا چھوڑا۔ اس نے سر اوپر کیا تو میں نے اس کا سر زور سے فرش پر دے مارا۔ اس سے پہلے کہ اس کی چیخ نکلتی، میں نے اس کا منہ دبا دیا۔ میری دیکھا دیکھی میرے ساتھیوں نے بھی باقیوں کے سر فرش پر پٹخ دیے۔

"سچ بولو۔" میں نے غراتے ہوئے کہا۔

"سچ ہی تو بول رہا ہوں۔" اس نے زور سے کہا۔

"ابھی تم سچ نہیں بول رہے ہو۔" میں نے اپنی پنڈلی سے خنجر نکالتے ہوئے کہا۔

دِیوں کی روشنی میں چمکتا ہوا خنجر ویسے ہی خوفناک لگ رہا تھا۔ میں نے خنجر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا تو وہ اسے دیکھنے لگا میں نے اسے اس کی گردن پر رکھ دیا۔ وہ گھگیانے لگا۔

"سس......چ......بتا......رہا......ہوں......"

اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ میں نے خنجر اس کی گردن پر پھیر کر اسے دور پھینک دیا۔ وہ خرخر کی خوفناک آواز نکالتے ہوئے تڑپنے لگا۔ باقی دونوں کے چہروں پر خوف لہرانے لگا تھا۔ میں نے ان کی طرف دیکھا تو ان میں سے ایک تیزی سے خوف بھرے لہجے میں بولا۔

"ہم پجاری نہیں، یہاں سیکیورٹی گارڈ ہیں۔"

"یہاں ایسا کیا ہے، جس کی سیکیورٹی پر لگے ہوئے

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

ہو۔'' میں نے پوچھا۔

''یہاں جیل ہے، وہ سامنے پہاڑی میں۔'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا تو میں نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر کہا۔

''اس نے سچ بولا ہے، اسے چھوڑ دو۔''

وہ اسے چھوڑ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ وہ پجاری وہیں دبکا بیٹھا رہا، اسے شاید یہ یقین ہو گیا تھا کہ ہم اسے مزید کچھ نہیں کہیں گے۔

''کیا جیل کا یہی ایک راستہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی راستہ ہے، دراصل یہ ایک غار ہے جو دوسری جانب جا کر کھل جاتا ہے۔'' اس نے تیزی سے بتایا۔

''کتنا لمبا ہے یہ غار؟'' میں نے پوچھا۔

''کافی طویل ہے۔'' اس نے کہا۔

''اندر نفری کتنی ہے؟'' جیسے ہی میں نے یہ پوچھا، اس نے چونک کر ہماری جانب دیکھا، اسی ایک سوال سے وہ سمجھ گیا کہ ہم اندر جانا چاہتے ہیں۔ اب اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے ساتھیوں کو اشارہ کیا تو انہوں نے اپنے اپنے خنجر نکالے اور دونوں کو اسی طرح گردن سے وار کر کے دور پھینک دیا۔ ہم نے خنجر واپس رکھے اور ان تینوں کو گھسیٹ کر ایک جانب یوں چھپا دیا کہ فوراً ان پر نگاہ نہ پڑے۔ اس کے بعد کچھ دیر تک وہیں دبکے ہوئے غار کی جانب دیکھتے رہے۔ مجھے امید تھی کہ کوئی نہ کوئی باہر ضرور نکلے گا لیکن آدھے گھنٹے سے بھی زیادہ کا وقت ہو گیا تھا۔ اندر سے کوئی بھی نہیں نکلا تھا۔ تب میں نے اندر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

میں غار کے پاس پہنچ چکا تھا۔ میرے ہاتھ میں پسٹل تھا اور اس کا سیفٹی کیچ ہٹا ہوا تھا۔ سامنے یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے وہ ایک چٹان ہے، لیکن اس کا راستہ بائیں جانب سے تھا، جہاں کوئی گیٹ نہیں لگا ہوا تھا۔ میں انتہائی محتاط انداز میں آگے بڑھا اور قدم اندر رکھ دیے۔ پہلی نگاہ میں اندھیرا ہی معلوم ہوا لیکن کافی آگے جا کر تھوڑی سی روشنی ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا، جیسے کسی نے ٹارچ روشن کر رکھی ہو۔ میں نے ایک چھوٹا سا پتھر غار میں لڑھکا دیا۔ ہلکی سی آواز کے ساتھ وہ پتا نہیں کتنی دور تک گیا تھا۔ پتھر کی آواز کے ردِ عمل میں کچھ بھی نہیں ہوا۔ ایک ذرا سی بھی آواز نہیں آئی تھی۔ میں نے اپنے سارے حواس مجتمع کیے اور اندر چل پڑا۔

میں بہت محتاط انداز میں چل رہا تھا۔ ایک ساتھی کو غار کے باہر رہنا تھا، باقی میرے پیچھے پیچھے آ گئے تھے۔ میں اس دھیمی سی روشنی کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ واقعی ایک چھوٹی ٹارچ تھی جو سامنے ایک راستے کو روشن کرنے کے لیے دیوار پر لگائی گئی تھی۔ دراصل وہاں سے غار میں موڑ پڑتا تھا۔ سامنے راستہ بند تھا۔ جیسے ہی میری نگاہ اس راستے پر پڑی، میرا دل تڑپ کر رہ گیا۔ وہاں لوگ زنجیروں سے بندھے پڑے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے گوشت پوست کے مجسمے سکھا کر وہاں ڈال دیے گئے ہوں، یا پھر بغیر پٹیوں کے ممیاں وہاں رکھ دی گئی ہوں۔ انہیں دیکھتے ہوئے مجھے دیکھی ہوئی ویڈیوز یاد آنے لگیں۔ میں جس طرف سے اندر داخل ہوا تھا اور جس جگہ کھڑا ہوا تھا یہ ویڈیوز میں بالکل آخر میں تھیں۔ گویا، ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیگم یہیں کہیں تھے۔ میں نے غور سے ایک ایک کو دیکھا، وہ سب یوں مدہوش پڑے تھے جیسے ان میں زندگی کی کوئی رمق بھی نہ ہو۔

مجھے حیرت ہوئی کہ اب تک وہاں کوئی سیکیورٹی والا دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ کہاں ہیں؟ کیا یہاں کوئی نہیں ہوتا یا پھر بھی کہیں ہماری تاڑ میں تو نہیں کہ ایک دم ہم ان کے جال میں آ جائیں؟ ایک دم سے کئی سوال میرے دماغ میں گھوم گئے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو دیکھا، وہ سب غار کی دیوار کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ میں روشنی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ ممکن ہے کہیں کیمرا لگا ہو اور میں اس میں دیکھ لیا جاؤں مگر یہ رسک مجھے لینا تھا۔ میں نے اشارہ کیا اور آگے بڑھنے کے لیے قدم بڑھا دیے۔ میرے دو ساتھی میرے کور پر میرے ساتھ چل دیے۔

میرے حواس پوری طرح بیدار تھے۔ میں کسی متوقع آواز پر چوکنا تھا۔ میری نگاہ غار کی دیوار کے ساتھ پڑے قیدیوں پر بھی تھی کہ ممکن ہے ان میں ڈاکٹر صاحب ہوں۔ میں دھیرے دھیرے بڑھتا چلا گیا۔ اس غار کا فاصلہ کوئی دو ڈھائی سو فٹ کے قریب ہو گا لیکن میں نے اسے بیس منٹ میں طے کیا یہاں تک کہ میں غار کے اس دہانے پر پہنچ گیا جو دوسری جانب تھا۔

میرے سامنے کا منظر بڑا عجیب سا تھا۔ دو چھوٹے چھوٹے بلب روشن تھے۔ شاید وہ کسی بیٹری پر لگائے گئے تھے۔ ان کی روشنی پھیلی ہوئی نہیں تھی۔ ایک بڑا سا میدان تھا جس کے ایک طرف باڑے کی طرح لکڑیاں لگائی گئی تھیں۔ ان میں کئی عورتیں اور مرد قیدی کھڑے تھے۔ اس باڑے کے بالکل سامنے چند لوگ موجود تھے۔ ان کے

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

سامنے بڑے بڑے پتیلے دھرے ہوئے تھے۔ اس میں تین افراد کھانا تقسیم کررہے تھے۔ باقی وہیں لکڑی کے بینچوں پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

یہ میرے لیے کوئی تائید غیبی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ میں اس وقت یہاں پہنچا ہوں جب یہ لوگ کھانا کھا رہے ہیں۔ باڑے میں سے ایک قیدی نکلتا، وہ اپنے برتنوں میں کھانا لیتا اور واپس چلا جاتا، تب کوئی اور قیدی نکل کر باہر آجاتا۔ میں نے غور سے ان قیدیوں میں ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیگم کو دیکھا، وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دیے تھے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا، کہیں وہ اس قید خانے کی سختیاں برداشت کرتے ہوئے اس دنیا سے تو رخصت نہیں ہوگئے؟ ممکن ہے ویڈیوز اس وقت بنائی گئی ہوں، جب وہ زندہ تھے۔ اب وہ نہ رہے ہوں۔ ایک لمحہ مجھے یوں لگا جیسے میری اب تک کی ساری ریاضت کسی بھی کام نہ آئی ہو۔

''کیا بات ہے سر۔'' میرے پیچھے کھڑے نوجوان نے کہا تو مجھے ہوش آگیا۔ میں نے ہولے سے پوچھا۔

''کیا ہوا؟''

''آپ کے منہ سے دردناک آواز نکلی تھی۔'' اس نے بتایا تو میں واقعتاً ہوش میں آگیا۔ مجھے خبر بھی نہیں ہوئی تھی کہ میں اس حد تک کھو گیا ہوں۔ میں نے اسی لمحہ فیصلہ کرلیا کہ اگر ڈاکٹر صاحب نہیں رہے تو یہ بھی نہیں رہیں گے۔ ان لوگوں کا اور ہمارا فاصلہ کوئی بیس فٹ کے قریب رہا ہوگا۔ میں نے فاصلے کو نگاہوں میں تولا اور ہولے سے کہا۔

''اچانک ان کے سر پر پہنچنا ہے۔''

''اوکے۔'' میرے پیچھے سے آواز آئی تو میں نے اگلے ہی لمحے باہر چھلانگ لگا دی۔ میں نے زمین پر قدم رکھا اور پھر گھومتا ہوا ان کے سر پر جا پہنچا۔ ہم ان کے لیے یوں ثابت ہوئے جیسے آسمان سے اترے ہوں۔ وہ پوری طرح کھڑے بھی نہیں ہو پائے تھے۔ میں نے جاتے ہی زوردار انداز میں کہا۔

''کوئی ہلنے کی غلطی نہ کرے۔''

اسی لمحے ایک بندے نے انتہائی سرعت سے گن سیدھی کی ہی تھی کہ یکے بعد دیگرے کئی فائر اس کا بدن چھلنی کر گئے۔ وہ چیختا ہوا زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔

''سب زمین پر لیٹ جاؤ، جلدی۔'' میرے ساتھی نوجوان نے کہا تو سبھی زمین پر لیٹنے لگے۔ ایک نے ذرا سستی دکھائی تو میرے ساتھی نے دہاڑتے ہوئے اس پر کئی فائر جھونک دیے۔ وہ بھی زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ میں نے ایک بندے کے پاس جا کر اسے اٹھایا اور پوچھا۔

''تمہارے باقی لوگ کہاں ہیں؟''

''یہی ہیں سب۔'' اس نے خوف زدہ آواز میں بتایا۔

''دیکھ جھوٹ بولے گا تو.....'' میں نے کہتے ہوئے بات ادھوری چھوڑی اور ان دو بندوں کی طرف اشارہ کیا جو زمین پر تڑپ رہے تھے۔

''یقین جانیں آج اتنے ہی ہیں، چار پانچ اور ہوتے ہیں، انہیں آج شہر بلا لیا گیا ہے۔ آج ہم اتنے ہی ہیں۔''

''باندھ دو ان سب کو۔'' میں نے کہا اور قریب کھڑے ایک قیدی سے کہا۔ ''ہم تم لوگوں کو آزاد کروانے آئے ہیں۔ آج سے تم سب آزاد ہو۔''

''تم سچ کہہ رہے ہو؟''

''ہاں میں سچ کہہ رہا ہوں، بس اتنا بتا دو، ان کے مزید ساتھی ہیں، تاکہ انہیں پکڑ لیں اور تم لوگوں کو لے جاؤں۔'' میں نے پوچھا تو اس نے کہا۔

''دو بندے وہاں ہیں۔'' اس نے آنکھوں سے اشارہ کیا تو میں نے اس طرف دیکھا، اسی لمحے وہاں شعلہ لپکا، ایک فائر ہوا، تب تک میں قیدی کو لیے نیچے گر چکا تھا۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی میرے ساتھی اس جانب بڑھ گئے۔ سامنے سے دو ہی فائر ہوئے تھے، پھر انہیں مہلت نہیں ملی۔ میرے ساتھیوں نے ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ انتہائی سرعت سے اس جگہ پہنچے جہاں سے فائر ہو رہے تھے۔ اگلے چند منٹ میں وہ وہاں سے دو تڑپتے ہوئے جسم لے کر باہر آگئے۔ انہیں لا کر پتیلوں کے پاس پھینکا تو میں اس بندے کے پاس جا کھڑا ہوا جس نے جھوٹ بولا تھا۔

''تم نے جھوٹ بولا تھا نا؟'' میں نے پوچھا، لفظ ابھی میرے منہ ہی میں تھے کہ اس نے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ میں ایسے ہی کسی ردعمل کا منتظر تھا، میں نے اس کا وار بچایا۔ وہ اپنی جھونک میں آگے بڑھا تو میں نے اس کی کمر پر لات رسید کی، وہ لڑکھتا ہوا زمین پر جا گرا، تبھی میں نے اس پر فائر کیے۔ وہ تڑپنے لگا۔

میں نے اس کی طرف مزید نہیں دیکھا بلکہ اس باڑے کی جانب چلا گیا جہاں قیدی موجود تھے۔ میں ٹارچ روشن کر کے سب کو دیکھنے لگا۔ اس وقت میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا جب میں نے باڑے کے ایک کونے میں ڈاکٹر صاحب اور ان کی بیگم کو زمین پر پڑے دیکھا۔ میں انتہائی تیزی سے ان کی جانب لپکا۔ میں نے اُن کے چہرے پر روشنی کی تو دونوں حسرت سے میری جانب دیکھ رہے تھے۔

www.paksociety.com

صاف و شفاف چہرے مٹی میں اَٹے ہوئے تھے۔
ڈاکٹر صاحب کے سر کے بالوں سمیت شیو بڑھی ہوئی تھی۔ وہ پہچانے نہیں جا رہے تھے، ان کے ساتھ بیٹھی ڈاکٹر فائزہ، جو میری ماں کی طرح تھیں وہ یوں مجھے دیکھ رہی تھیں جیسے مجھے پہچان نہ پا رہی ہوں۔ میں نے دونوں کو سینے سے لگایا تو اچانک ڈاکٹر صاحب نے نحیف سی آواز میں پوچھا۔
''علی زین ہو نا۔''
''ہاں میں وہی بدبخت ہوں جو آپ کی حفاظت نہیں کر پایا، بس اب چلیں، دشمن سر پر ہے، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''
''ان سب کو لے جاؤ۔'' ڈاکٹر فائزہ نے کہا تو میں تیزی سے بولا۔
''ہاں ہاں سب کو لے جائیں گے، آپ اٹھیں۔''
میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اٹھایا۔ وہ نقاہت کے باعث چل نہیں پا رہی تھیں۔ میں نے فون پر تیمور سے رابطہ کیا تو اس نے مجھے بتایا کہ اندر کی صورتِ حال کے بارے میں اسے ساتھ ساتھ اطلاع مل رہی تھی۔ وہ واپس باہر کے دہانے کی طرف آ رہا ہے۔ اب نوجوان کو کہا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کو اٹھائے، ڈاکٹر فائزہ کو میں نے اٹھایا اور تیزی سے غار میں داخل ہوئے۔
میں دہانے پر آیا تو تیمور وہاں تک آ چکا تھا۔
''تم ڈاکٹر صاحب کو لے چلو، یہاں میں دیکھتا ہوں۔''
''اندر کم از کم پچیس سے تیس قیدی ہیں۔'' میں نے کہا۔
''اتنے لوگ ہم رکھیں گے کہاں؟'' اس نے انتہائی تشویش سے کہا تو میں بھی ایک دم سے چکرا گیا۔
یہاں تو وہ لوگ ہیں جنہیں یہاں رکھنے میں خود ریاست ملوث تھی، وہ تو پھر قید ہو جائیں گے؟
''تم انہیں نکال کر لاؤ، نیچے سڑک پر جا کر دیکھتے ہیں۔'' میں نے کہا۔
''او کے۔'' اس نے کہا تو ہم دونوں پہاڑی سے نیچے اترنے لگے۔
وہ نوجوان بھاگتا ہوا میرے پیچھے آ رہا تھا جو فوروہیل ڈرائیو کر کے یہاں تک مجھے لایا تھا۔ وہ مجھے کراس کر کے آگے نکل گیا۔ وہ فون پر اس نوجوان سے رابطے میں تھا جس کے ہاتھ میں ریموٹ تھا۔
جب تک میں فوروہیل تک پہنچا، تب تک وہ دونوں وہیں کھڑے تھے۔
''بم ہٹا دیا ہے۔'' میں نے جاتے ہی پوچھا۔
''ہاں، میں نے اسے وہاں پہاڑی پر رکھ دیا ہے۔''
میں نے بیگم صاحبہ کو اتارا، نوجوان نے ڈاکٹر صاحب کو فوروہیل میں بٹھایا تو بیگم صاحبہ بھی بیٹھ گئیں۔ تبھی میں نے فوروہیل سے کچھ فاصلے پر جا کر تیمور کو فون کیا۔
''میں نکل رہا ہوں، تم جب تک ان سب کو نیچے لاؤ گے، میں شہر پہنچ جاؤں گا، وہاں جا کر میں کچھ کرتا ہوں ان کے لیے۔''
''ہاں تم نکلو، تم کچھ بھی کرو، لیکن یہ ذہن میں رہے کہ مجھے سامنے نہیں آنا، ہم یہیں سے نکل جائیں گے۔'' اس نے تیزی سے کہا۔
''بالکل ٹھیک ہے، تم لوگ گم ہو جاؤ، لیکن وہ جو یہاں پر سیکیورٹی والے ہیں، انہیں ختم کر دو، وہ بھی.....''
''ختم کر دیے ہیں میں نے۔'' اس نے تیزی سے بتایا۔
''اچھا کیا، میں نکلتا ہوں۔'' یہ کہتے ہی میں نے فون بند کیا۔
ڈرائیور سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ میں نے فوروہیل میں بیٹھتے ہی اسے چلنے کو کہا تو وہ طوفانی انداز میں چل پڑا۔ تب میں ڈاکٹر صاحب کی طرف متوجہ ہوا۔
''سر، آپ کو ان لوگوں نے بہت تکلیف دی ہوگی؟''
''ہاں شاید جانوروں کو زیادہ اچھا رکھا جاتا ہوگا۔'' انہوں نے دردناک لہجے میں کہا تو دکھ کی ایک لہر میرے اندر پھیل گئی۔
''تم آگئے ہو نا بیٹا تو سارے دکھ بھول جائیں گے ہم۔'' بیگم صاحبہ نے رو دینے والے انداز میں کہا تو میرا دل رونے لگا۔
''بس، مجھے تھوڑی سی مہلت دے دیں، ہم شہر تک بحفاظت پہنچ جائیں۔'' میں نے یہ کہہ کر نوجوان سے پوچھا۔ ''کیا تھوڑی دیر کے لیے یہ ڈیوائس ہٹ سکتی ہے نا؟''
''ہاں جی، بتایا تھا نا، بس اسے بٹن سے آف کرنا ہوگا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے بٹن آف کیا تو میرے سیل فون پر سگنل آنے لگے، تبھی میں نے ریتو کے نمبر ملائے تو کال جاتی رہی۔ کچھ دیر بعد فون ریسیو ہوا تو میں نے ہیلو کہا۔
''تم ویر سنگھ کہاں ہو؟''
''کیوں کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔
''یہاں پرتاب سنگھ نے قیامت ڈھا دی ہے۔ وہ شہر

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

کے چند لوگ لے کر بنگلے کے لان میں بیٹھا ہوا ہے۔ وہ رانی جی سے ملنا چاہتا ہے لیکن رانی اس سے ملنے ابھی تک نہیں گئی۔''

''اُسے صرف آدھا گھنٹا مزید روکو، میں پہنچتا ہوں۔''

''تم ہو کہاں؟'' اس نے روہانسا ہوتے ہوئے کہا۔

''میں آدھے گھنٹے کے بعد تمہارے پاس ہوں گا، تم ایک کام کرو، پچھلے دروازے کو کھول کر رکھنا، تمہارے سوا وہاں پر کوئی نہ ہو، مجھے انتہائی خفیہ انداز میں رہائش گاہ تک جانا ہے، پھر میں دیکھ لیتا ہوں اس سورما کو۔''

''ویر سنگھ کوئی خاص بات.....'' اس نے تجسّس سے پوچھا۔

''سب کچھ تمہارے سامنے آجائے گا، ابھی تم ایسا کرو جگو دادا کو فون لگا کر اسے کانفرنس کال میں لو، تم بھی سن لینا۔'' میں نے کہا۔

''ایک منٹ۔'' اس نے کہا اور پھر کال ملانے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ لائن پر تھا۔ تبھی میں نے پوچھا۔

''بولو دادا، گوپال داس کا کیا بنا؟''

''ارے میرے لعل، کیا بات ہے تیری، جس طرح مکھن سے بال نکلتا ہے، ایسے میں اسے وہاں سے اٹھا لایا، یہ تو بڑا کام کر دیا تو نے۔'' اس نے تیزی سے بتایا۔

''اب سن، ایک اور بڑا کام دے رہا ہوں، سارے حالات ہی بدل جائیں گے۔ سمجھو پرتاب سنگھ زمین پر گر گیا ہے۔'' میں نے تجسّس پھیلاتے ہوئے کہا، میں اس کی فطرت سمجھ گیا تھا اس لیے بات کو بڑھا کر بتایا۔

''ایسا کیا ہے؟'' اس نے تیزی سے پوچھا۔

''تم شاید نہیں جانتے ہو، پرتاب سنگھ نے اپنا ایک قید خانہ بنا رکھا تھا، میں نے اس کے سارے قیدی آزاد کر دیے ہیں اور وہ اس وقت سڑک پر ہیں۔ سارا پریس وہاں پر لے جاؤ اور حالات اپنے کنٹرول میں لے لو، اس سے بڑا چانس تمہیں کبھی نہیں ملے گا۔''

''ارے باپ رے، اتنا بڑا جھٹکا۔'' اس نے حیرت سے کہا۔

''وقت نہیں ہے دادا، نکل لو بس۔''

''چل رکھتا ہوں۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ تبھی ریتو بولی۔

''پرتاب سنگھ کو تو جھٹکا لگ گیا سمجھو مگر ریاست کے لوگ.....'' اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''وہ دیکھ لوں گا۔ تمہیں جو کہا ہے، وہ کرو۔ باقی سمجھاتا ہوں آکر۔''

''اوکے، جلدی پہنچو۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے فون بند کر دیا۔ اسی لمحے ایک خیال میرے دماغ میں رینگ گیا، میں نے تیمور کو فون ملا دیا۔

''ہاں بولو۔'' اس نے کہا۔

''تمہارے پاس کوئی دستی بم ہے، ایک بم تو پہاڑی پر رکھا ہے ایک ساتھی نے۔'' میں نے پوچھا۔

''ہاں ہے میرے پاس۔'' اس نے کہا۔

''نکلنے سے پہلے جتنے بھی بم ہیں تمہارے پاس، سب چلا دینا، آس پاس کے لوگ خود ہی یہاں پہنچ جائیں گے۔'' میں نے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

''میں سمجھ گیا۔''

''نکلتے ہی چاچا عبدالمجید کو بتا دینا۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ڈیوائس کا بٹن آن کر دیا۔

☆☆☆

میں بنگلے کے عقب میں پہنچ چکا تھا۔ میں نے ڈیوائس کا بٹن بند کیا اور ریتو کو کال کر دی۔ وہ دیوار کے پار موجود تھی۔ چند لمحوں بعد اس نے دروازہ کھول دیا۔ میں نے پہلے ڈاکٹر صاحب کو اتارا پھر بیگم صاحبہ کو۔ ڈرائیور نے ڈاکٹر صاحب کو سہارا دیا اور میں نے بیگم صاحبہ کو۔ اگلے دس منٹ میں کسی کی نگاہوں میں آئے بغیر ہم اس رہائش گاہ تک جا پہنچے جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔ ساتھی ڈرائیور نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور نکلتا چلا گیا۔ ریتو پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُن دونوں کو دیکھ رہی تھی، اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ دو ادھیڑ عمر لوگوں پر اتنا تشدد بھی کیا جا سکتا ہے۔

''ریتو، فوراً ان کے لیے کپڑوں اور کھانے کا بندوبست کرو، باقی میں سنبھالتا ہوں پرتاب سنگھ کو، اپنا فون دو مجھے۔'' میں نے کہا تو ریتو کو جیسے ہوش آگیا۔ اس نے مجھے اپنا فون دیا اور انہیں بیڈ روم میں لے گئی۔

میں نے پہلی کال جگو دادا کو کی۔ اس نے فوراً فون پک کر لیا۔ ''دادا، کیا صورتِ حال ہے؟''

''میں اُدھر ہی جا رہا ہوں، ادھر تو بڑے بم دھماکے ہوئے ہیں، پریس کو میں نے کہا ہے وہ اُدھر ہی جا رہے ہیں۔''

''دیکھ دادا، اگر یہ حالات سنبھال گیا نا تو شہر پر تیرا راج ہوگا۔ بہت حاضر دماغی سے۔'' میں نے کہا تو وہ تیزی سے

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

بولا۔

''تم فکر نہ کرو، اب دیکھو میں کرتا کیا ہوں۔''

''وہ لوگ بہت بیمار ہوں گے، انہیں اسپتال لے جانا۔'' میں نے کہا۔

''ایسا ہی کروں گا۔'' اس نے کہا تو میں نے کال ختم کر دی۔ اس کے ساتھ ہی اگلی کال میں نے رانی بھاگ وتی کو کی۔ اس نے فوراً ہی میری کال ریسیو کر لی۔ وہ ریتو کی کال سمجھی تھی لیکن جیسے ہی میں بولا تو اس نے تلخی سے کہا۔

''کہاں ہو ویر سنگھ، تمہیں پتا ہے اِس وقت.....''

''میں جانتا ہوں رانی جی، میں بھی اِدھر ہی ہوں، آپ نے پرتاب سنگھ سے نہیں ملنا، میں دیکھتا ہوں مگر آپ نے گھبرانا نہیں۔'' میں نے کہا۔

''مگر وہ باہر شہر کے معززین لے کر بیٹھا ہوا ہے۔'' رانی نے غصے میں کہا۔

''ابھی کچھ دیر بعد وہ خود ہی باہر نکل جائے گا، میں اسے نکال لوں، پھر آتا ہوں آپ کے پاس۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے جلدی نکالو اسے۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں نے پرتاب سنگھ کو کال ملالی۔ اس نے کال ریسیو کر کے ہیلو کہا تو میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''ابے او تو کیا رانی جی کے ہاں ڈیرے لگا کر بیٹھا ہے؟''

''تم، یہ تم کس طرح بات کر رہے ہو؟'' اس نے دہاڑتے ہوئے پوچھا۔

''تو میرے سامنے نہیں ہے، ورنہ تجھے زمین پر لٹا کر جوتے مارتا، یہ تو ابھی میں نے تجھے کچھ بھی نہیں کہا۔''

''تم ایک بار میرے سامنے آجاؤ، میں.....'' اس نے دانت پیستے ہوئے کہا تو میں نے ٹھہر ٹھہر کر اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''اگر تجھ میں ہمت ہے تو اسپتال آجا، وہاں تیرے قید خانے کے سارے قیدیوں کی ٹریٹ منٹ ہو رہی ہے، میں بھی وہیں ہوں، آجا۔''

''کیا کہہ رہے ہو تم؟'' اس نے دہاڑتے ہوئے کہا۔

''آجا، خود دیکھ لے، تو کتنا بے وقوف ہے، ابھی تک تیرے لوگوں نے تجھے یہ تک نہیں بتایا؟'' میں نے حقارت سے کہا۔

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' اس نے دبے ہوئے انداز میں کہا۔

''سن، ان قیدیوں میں میرا باپ اور میری ماں بھی ہے۔ تم نے ان پر جتنا تشدد کیا ہے، جتنی اذیت تو نے انہیں دی ہے، اس کے بدلے اگر میں تیری ماں کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے چوک میں بھی پھینک دوں تو میرا بدلہ نہیں پورا ہونے والا۔ ابھی تو تیرا سارا خاندان ختم کرنا ہے مجھے۔ اب اگر تو اگلے منٹ میں اٹھ کر واپس نہ گیا تو تیری ماں کے بدن کا پہلا ٹکڑا باہر پھینک دیا جائے گا۔ اگر آزمانا چاہتا ہے تو آزما لے۔'' میں نے کہا تو نجانے میرے لہجے میں اتنی نفرت، حقارت اور درد کہاں سے آگیا تھا۔

''نہیں تم کچھ بھی نہیں کرو گے۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''میں خود تیری ماں کے بدن کا ٹکڑا لے کر آتا ہوں۔ مجھ سے مل بھی لینا کیونکہ میں نے اسی وقت کے لیے تیری ماں کو یہاں رکھا تھا۔'' میں نے کہا تو وہ چیختے ہوئے بولا۔

''نہیں، میں جاتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''سن، مجھے تجھے بھی مارنا ہے، تو جتنا بچ سکتا ہے بچ جا۔'' میں نے کہا تو اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ اس نے فون بند کر دیا تھا۔ ریتو میری بات سن رہی تھی۔ اسے سمجھ آگئی کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''میں رانی کے پاس جا رہا ہوں۔''

''لیکن جلدی آنا۔'' اس نے کہا۔

''تم میرے ماں باپ کا خیال کرو، میں آتا ہوں۔'' میں نے کہا اور تیزی سے نکلتا ہوا باہر چلا گیا۔

رانی اپنے بیڈ روم میں صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ بیڈ پر بڑی بی بڑی نمکنت سے براجمان تھی۔ میں نے جاتے ہی دونوں ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرتے ہوئے بڑی بی سے پوچھا۔

''کیسی ہو آپ؟''

''بھلی چنگی ہوں۔ تم کیسے ہو؟'' بڑی بی نے کہا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' میں نے کہا پھر یونہی بات بڑھاتے ہوئے پوچھا ''ماتا جی سنا ہے آپ اپنے دور میں کھانا بہت بڑھیا بنایا کرتی تھیں؟''

''ارے ہاں، ہمارا تو مقابلہ ہی نہیں تھا۔''

اس دوران رانی بھاگ وتی اٹھ گئی۔ اس نے مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا تو میں نے بڑی بی سے کہا۔

''دیکھا آپ کی بہو آپ سے جل گئی۔'' میں نے کہا اور بڑی بی کی کوئی بات سنے بغیر اس کے پیچھے چل دیا۔

وہ دھیمے قدموں سے چلتی ہوئی کاریڈور کے آخری سرے

www.pakistanipoint.com
Waqar Azeem

..... پر چلی گئی تھی۔ وہاں کافی اندھیرا تھا۔ شاید لائٹ نہیں جلائی گئی تھی اور جان بوجھ کر اندھیرا کیا ہوا تھا۔ وہاں سے باہر لان دکھائی دے رہا تھا۔ یہ اندھیرا تھا ہی اس لیے کہ یہاں اندھیرے میں کھڑے ہو کر باہر دیکھا جاسکے۔ لان میں اب کوئی نہیں تھا، خالی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ تبھی رانی نے ہولے سے کہا۔

''ایسا کیا کہا تم نے کہ وہ فوراً ہی یہاں سے چلا گیا؟''

''بڑی بی کو پتا ہے کہ باہر پرتاب سنگھ.....؟'' میں نے جواب دینے کے بجائے پوچھا تو وہ درشت لہجے میں بولی۔

''نہیں اسے نہیں پتا، تم میری بات کا جواب دو۔''

''میں نے اسے دھمکی لگادی تھی کہ اگر وہ نہ گیا تو اس کی ماں کی لاش جائے گی یہاں سے۔'' میں نے سکون سے کہہ دیا۔

''اور وہ خاموشی سے چلا گیا؟ یہ بات دماغ میں نہیں اترتی ویر سنگھ جی۔'' اس نے میری طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ میرا طریقہ ہے کہ میں اُس کے.....'' میں نے کہنا چاہا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکتے ہوئے پوچھا۔

''سچ کیا ہے؟''

''اگر آپ سچ جاننا چاہ رہی ہیں تو کچھ دیر ٹھہر جائیں، مجھے چند گھنٹے دے دیں، میں سب تفصیل سے بتادوں گا۔''

''ویر سنگھ، تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو؟'' رانی نے کہا۔

''ہاں، میں چھپا رہا ہوں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی آپ اسے نہ جانیں تو بہتر ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔

''ویر سنگھ، میں جانتی ہوں تم جو کہتے ہو وہ کر گزرتے ہو، مجھے تم پر یقین ہے۔ بس اپنا خیال رکھنا۔''

''جی ٹھیک ہے رانی جی، یاد رہے، جب تک یہ بڑی بی آپ کے پاس ہے، آپ کی زندگی کی ضمانت ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں جانتی ہوں،'' یہ کہہ کر اس نے ایک طویل سانس لی پھر ہولے سے بولی۔ ''میں تمہارا انتظار کروں گی۔''

ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی تھی۔ چند لمحے یونہی کھڑے رہے تو میں نے بے دھڑک رانی کا ہاتھ پکڑ لیا، بڑے نرم سے انداز میں اسے دبایا اور پھر احترام سے بوسہ دے کر چھوڑ دیا۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت رانی کی حالت کیا ہوئی ہوگی۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا کہ بھوسے کے ڈھیر میں جلتی ہوئی دیا سلائی پھینک دینا۔ بھوسے میں آگ نہیں بھڑکتی لیکن اس طرح سلگتا ہے کہ اندر ہی دور تک ایسی آگ بھڑکتی چلی جاتی ہے جو بجھائے نہیں بجھتی۔ میں تیزی سے پلٹا اور کاریڈور پار کرتا ہوا نیچے جانے والی سیڑھیاں اترنے لگا۔

میں تیزی سے واپس رہائش گاہ آگیا تھا۔ ڈاکٹر کامران اور ڈاکٹر فائزہ فریش ہو کر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ کھا پی چکے تھے۔ جب میں وہاں پہنچا تو ریتو برتن اٹھا رہی تھی۔ میں نے ریتو کا فون اسے واپس کیا اور ان کے پاس قالین پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''اب کیسی طبیعت ہے؟''

''میں بہت اچھا محسوس کر رہا ہوں۔'' انہوں نے بتایا تو بیگم صاحبہ بولیں۔

''اچھی خاصی توانائی آگئی ہے۔ یہاں کچھ میڈیسن مل جائیں گی؟''

''بالکل، میں دیکھتا ہوں۔'' میں نے کہا تو ریتو بولی۔

''میں ابھی دیتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے بیٹی۔'' بیگم صاحبہ نے کہا تو وہ بیڈ روم کا دروازہ بند کر کے باہر چلی گئی۔ میں ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا، مجھے خود یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ میرے سامنے ہیں۔ میں نے چند لمحے سوچا اور پھر چاچا عبدالمجید کو فون کر دیا۔ اس نے چند لمحوں میں ہی فون ریسیو کر لیا۔

''ہاں بول میرے بچے۔''

''تیمور نے بتادیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، بتادیا تھا، اب کہاں ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔

''ابھی تک ہم بالکل محفوظ جگہ پر ہیں۔'' میں نے بتایا۔

''تم بالکل فکر نہ کرو، میری دلی سفارت خانے سے بات ہوگئی ہے۔ ہائی لائن پر بھی معاملات چل رہے ہیں۔ دو تین گھنٹے مشکل ہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' انہوں نے بتایا تو میں نے کہا۔

''لیں ڈاکٹر صاحب سے بات کریں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے فون ڈاکٹر صاحب کو دے دیا۔ انہوں نے تھوڑی سی بات کی اور پھر فون مجھے دیا۔ میں نے الوداعی بات کر کے فون بند کر دیا۔ ایسے میں ریتو چائے کے ساتھ ایک بیگ میڈیسن کا لے آئی۔ اس نے چائے رکھی اور بیگ بیگم صاحبہ کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''اس میں دیکھ لیں اگر کوئی آپ کے کام کی ہو۔''

www.pakistanipoint.com

وہ میڈیسن دیکھنے لگیں تو میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا۔

''کیا ہوا تھا پتایا میں، کس لیے اغوا کیا تھا، کون تھے وہ لوگ؟''

میرے پوچھنے پر وہ چند لمحے خاموش رہے پھر کہتے چلے گئے۔

☆☆☆

وہ تین دن کے لیے پتایا میں کانفرنس تھی۔ اصل میں وہ کانفرنس حکومتی سطح پر نہیں تھی۔ وہ ایک عالمی تنظیم ہے جو دنیا میں اسلحہ سازی کے خلاف ہے۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ دنیا میں جو یہ اسلحہ بڑھ رہا ہے اور اس ٹیکنالوجی میں جدید سے جدید ہتھیار لائے جا رہے ہیں یہ دراصل ہم انسان خود ہی اپنی تباہی کا سامان کر رہے ہیں۔ دنیا بھر میں چند اسلحہ بنانے والے سرمایہ داروں نے دنیا کو جنگی جنون میں مبتلا کر دیا ہے۔ کوئی جارحیت کے لیے اسلحہ خرید رہا ہے تو کوئی اپنے دفاع کے لیے۔ جبکہ اس جنگی جنون میں انسان مر رہا ہے، انسانیت مر رہی ہے۔ کب تک یہ سلسلہ چلے گا؟ ایک دن ایسا آئے گا کہ ہم انسان ہی اس زمین کو تباہ کر دیں گے۔ اسی مقصد کو لے کر ہم نے یہ سوچا تھا کہ اس جنگی جنون کو کم کیا جائے یہاں تک کہ ختم ہو جائے۔ تسخیر کائنات کے اور بہت سارے راز ہیں جنہیں حل کیا جا سکتا ہے۔ ان پر کام کی ضرورت ہے۔ بیماریوں کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ یہی سوچ بچار کرنا تھا وہاں پر۔ میں اس لیے وہاں گیا تھا.....

میرے ساتھ کچھ اور..... لوگ ایسی ٹیکنالوجی پر کام کر رہے تھے، جن سے میزائل اور اسی طرح کے دوسرے اسلحہ کو ناکارہ بنایا جا سکے۔ اگر کوئی جنگی جنون لیے ایسا اسلحہ چلانا بھی چاہے تو نہ چلا سکے۔ ہم اس میں کافی حد تک کامیاب بھی ہو چکے تھے۔ ہم باقاعدہ اپنی مہم کا آغاز کرنا چاہ رہے تھے۔ اگرچہ ہم یہ کام بڑی رازداری سے کر رہے تھے لیکن دوسری قوتیں بھی اپنا کام کر رہی ہیں۔ انہیں اس راز کی بھنک مل گئی تھی۔ اصل میں ہو کیا رہا ہے، یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔

بظاہر وہ کانفرنس بیماریوں کے خلاف میڈیکل کے جدید رجحانات کے بارے میں تھی۔ تین دن تک وہاں باتیں ہوتی رہیں لیکن ہم کچھ لوگ اپنے طور پر خفیہ انداز میں سوچ بچار کرتے رہے تھے۔ مجھے وہاں پر جو سیکیورٹی مہیا کی گئی تھی۔ اس میں میرے ساتھ چند لوگ اور تھے۔ وہاں کے مقامی گارڈ بھی تھے۔ آخری دن جب ہم کانفرنس سے واپس آ رہے تھے تو ڈرائیور نے بجائے ہوٹل لے جانے کے، کسی دوسرے راستے پر کار ڈال دی تھی۔ مجھے اس کا بالکل بھی اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔ میرے لیے وہ شہر بالکل اجنبی تھا۔ مجھے پتا اس وقت چلا، جب وہ ایک گھر میں مجھے لے گئے۔ اصل میں وہ ڈرائیور ان اغوا کرنے والوں کے ساتھ مل گیا تھا۔ اسی کی مدد سے گارڈ وہاں سے زبردستی ہٹا دیے گئے۔ ان کی جگہ اغوا کرنے والوں نے لے لی اور ہمیں قید کر لیا گیا۔

ہم دو دن تک وہیں پڑے رہے۔ ہر دو چار گھنٹے بعد دو بندے ہمارے پاس آ جاتے اور یہی سوال کرتے رہے کہ اصل میں اس کانفرنس کا ایجنڈا کیا تھا؟ کسی نے کوئی پُرتشدد بات نہیں کی۔ دو دن بعد ہمیں یہ کہا گیا کہ وہ ہمیں وطن واپس بھیج رہے ہیں۔ ہمیں ائرپورٹ تک لے جایا گیا۔ سارے مراحل انہوں نے خود پورے کیے اور ہمیں ایک چارٹرڈ جہاز تک لے جایا گیا۔ ایک بار مجھے شک تو ہوا کہ یہ درست نہیں، ہمیں عام پرواز سے واپس وطن بھیجنا چاہیے تھا۔ میں نے اس پر احتجاج بھی کیا۔ میں نے کہا کہ وہ ہمیں تھائی حکومت کے حوالے کر دیں مگر میری کسی نے نہیں سنی۔ میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ میرے ساتھ ٹھیک نہیں ہو رہا۔ وہ ہمیں زبردستی اس چارٹرڈ جہاز میں بٹھا کر نامعلوم منزل کی جانب چل پڑے۔

چند گھنٹوں کی پرواز کے بعد ایک ویران سے ائرپورٹ پر ہمیں اتارا گیا۔ وہاں سے ایک گاڑی کے ذریعے ہمیں ایک گھر میں لے گئے۔ وہاں تک ہمیں یہی بتاتے رہے کہ ہم پاکستان پہنچ چکے ہیں۔ ضروری کارروائی کے بعد ہمیں جانے دیں گے لیکن شام سے رات ہو گئی، کسی نے ہمیں نہیں پوچھا۔

اگلے دن صبح چند لوگ آئے اور انہوں نے ہم پر سوال و جواب کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ یہی پوچھنا چاہتے تھے کہ ہم کس طرح کی ٹیکنالوجی متعارف کروا رہے ہیں۔ مجھے پتا چل گیا کہ ہمارا راز کہیں نہ کہیں سے افشا ہو گیا ہے۔ وہ پوری کوشش کرتے رہے جبکہ میرا جواب نہ میں تھا۔ میں نے انہیں ذرا سی بھی بھنک نہیں لگنے دی۔ وہاں مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میں اپنے وطن میں نہیں کہیں دوسری جگہ ہوں پھر یہ راز بھی کھل گیا۔ انہوں نے ہمیں واضح بتا دیا کہ ہم بھارت میں ہیں۔ وہ مجھے ہر طرح کا لالچ دینے لگے کہ نہ صرف انہیں سب کچھ بتا دوں بلکہ یہیں اس ملک میں رہ کر کام کروں تو میں جو اُن سے مانگوں وہ مجھے دیں گے مگر ہمارے لبوں پر انکار ہی رہا۔

www.pakistanipoint.com

مرحبا پاکستان
مرحبا
SINCE 1975
ISPAGHOL HUSK
صحت ہے انمول
مرحبا اسپغول
PAKISTAN'S No. 1 SELLING ISPAGHOL BRAND
MARHABA NATURAL PRODUCTS
ISPAGHOL HUSK
FECAL BULKING AND CHOLESTEROL LOWERING NATURAL FIBROUS DRUG
/marhabalaboratoriespk
/marhabapakistan
www.marhaba.com.pk

دو ہفتے اسی کوشش میں گزر گئے۔ آخر وہ ہم سے تنگ آ گئے انہوں نے ہمیں جان سے مار دینے کی دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ ہمارا کھانا ایک وقت کا کر دیا۔ میں تب بھی نہ مانا تو انہوں نے ہمیں اس قید خانے میں لا کر پھینک دیا جہاں سے آج ہم آزاد ہوئے ہیں۔''

وہ اپنی رُوداد سنا چکے تو صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ تب میں نے دکھی لہجے میں پوچھا۔

''کیا انہوں نے قید خانے میں آپ پر تشدد کیا؟''

''وہاں ہونے کا مطلب ہی تشدد تھا، انہوں جسمانی تشدد تو کیا سو کیا، لیکن وہ جو ذہنی اذیت دیتے تھے، اس سے میں اندر تک ٹوٹ پھوٹ چکا ہوں۔'' انہوں نے روہانسا لہجے میں کہا تو میرے اندر تک دکھ پھیل گیا۔ میں نے ہمت کر کے پوچھا۔

''وہ آپ سے چاہتے کیا تھے؟''

''یہی کہ جس مشن پر میں کام کر رہا ہوں، اس کی تفصیلات بتا دوں، یا پھر ان کے لیے کام کروں۔ اس کے عوض جو چاہوں ان سے لے سکتا ہوں لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ وہ مجھے یہاں قید خانے میں رکھ کر اس لیے اذیتیں دے رہے تھے کہ میں کبھی نہ کبھی تو مان ہی جاؤں گا۔ اور شاید میں مان بھی جاتا۔'' یہ کہتے ہوئے ان کا لہجہ دکھ سے بھر گیا۔

''ایسا کیا ہو گیا تھا۔'' میں نے تیزی سے پوچھا۔

''فائزہ کی وجہ سے ..... وہ اس کی بہت بے عزتی کرتے تھے، ذہنی اذیت کے علاوہ وہ .....'' یہ کہتے ہوئے ان کا گلا رُندھ گیا، وہ کوئی لفظ نہ کہہ پائے۔ مجھے لگا جیسے میری سگی ماں کے بارے میں کوئی بتا رہا ہو کہ اس کی سرِعام بے حرمتی کی گئی ہے۔ ایک لمحے میں بہت سی ایسی تصویریں میرے دماغ میں گھوم گئیں، جن سے میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے ڈاکٹر فائزہ کی طرف دیکھا اور پھر انتہائی شرمندگی سے بولا۔

''سوری ماں، میں جلدی نہیں پہنچ پایا، میں اس پر شرمندہ ہوں۔''

''نہیں میرے بچے، اس میں تمہارا کیا قصور، بس اب یہی خواہش ہے کہ جلد از جلد ہم وطن واپس پہنچ جائیں۔''

''میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہی یہی ہے۔'' میں نے کہا تو ڈاکٹر صاحب نے سوچتے ہوئے کہا۔

''بیٹا، تم ہمیں قید خانے سے تو نکال لائے ہو، یہ بہت بڑی کامیابی ہے لیکن اس ملک سے نکلنا بہت مشکل ہوگا، کیونکہ اب یہ صرف اسی ملک کا معاملہ نہیں رہے گا، وہ قوتیں بھی حرکت میں آ جائیں گی جو ان کے پیچھے ہیں۔ یہاں صرف ہم ہی نہیں دوسرے بہت سارے لوگ بھی تھے۔''

''میں کوشش کر رہا ہوں، آگے جو قدرت کو منظور ہوگا۔ آپ بس بھروسا رکھیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' میں نے انہیں حوصلہ دیتے ہوئے کہا اور اٹھ گیا۔ میں نے چاہا تھا کہ وہ تھوڑی دیر سکون سے نیند لے لیں۔

میں اٹھ کر لاؤنج میں آ گیا۔ میرے لیے لمحہ قیمتی تھا۔ میں جانتا تھا کہ صرف یہی ملک اغوا میں ملوث نہیں تھا، اس میں دوسری بھی قوتیں شامل تھیں لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ ہم تنہا تھے۔ اگر ہمارے دشمن تھے تو ہمارے دوست بھی موجود تھے۔ اوپری سطح پر کیا ہو رہا تھا، میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا لیکن اب ڈاکٹر صاحبہ اور بیگم صاحبہ کی ذمے داری میری تھی۔ میں اپنے خیالات سے اس وقت چونکا، جب ریتو میرے پاس صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''میں جگو دادا سے پوچھوں، کیا صورتِ حال ہے؟''

''ہاں پوچھو۔'' میں نے بے خیالی میں کہا تو اس نے اپنے فون سے کال ملا دی۔ رابطہ ہو جانے پر اس نے پوچھا۔

''کیا صورتِ حال ہے؟''

''یہاں تو ایک جم غفیر اکٹھا ہو گیا ہے۔ پریس کے ساتھ نجانے کہاں کہاں کے لوگ ہیں۔ پولیس بھی آ گئی ہے۔''

''تم کہاں پر ہو.....؟'' میں نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''میں بھی وہیں ہوں، لیکن پولیس والے آگے ہو گئے ہیں، وہ انہیں اپنے حصار میں لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' اس نے تیزی سے بتایا۔

''پھر تمہارا وہاں کیا فائدہ، شور مچاؤ کہ انہیں پہلے اسپتال لے کر جاؤ، کسی بھی طرح انہیں تھانے مت لے جانے دینا، ورنہ یہ پھر قید خانے میں چلے جائیں گے۔ انہیں.....''

''میں سمجھ گیا۔'' اس نے کہا اور کوئی مزید بات کیے اس نے فون بند کر دیا۔

مجھے تشویش ہو گئی تھی۔ وہ قیدی نجانے کون کون تھے اور کہاں کے تھے۔ یہ تو طے تھا کہ انہیں غیر قانونی طور پر قید کیا ہوا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ بے چارے بھی کسی طرح آزاد ہو جائیں۔

''پتا نہیں انہیں لائیو دکھایا بھی جا رہا ہوگا کہ نہیں؟'' میں

نے بڑبڑاتے ہوئے کہا تو ریتو اٹھی اور اس نے ٹی وی کو آن کر دیا۔ وہ مختلف چینل دیکھنے لگی۔ ایک نیوز چینل پر وہاں کا منظر دکھایا جا رہا تھا۔ ایک آدمی بڑے دردناک انداز میں کہہ رہا تھا۔

”یہ بے بیمار ہیں، ان سے اٹھا نہیں جا رہا، پتا نہیں کس نے انہیں یہاں قید کیا ہوا تھا، انہیں پہلے اسپتال لے کر جانا چاہیے۔“

”یہ جگو دادا ہے۔“ ریتو نے پُرجوش انداز میں میری طرف دیکھ کر کہا۔ وہاں پر کافی لوگ ان کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ وہ تیز تیز انداز میں کہتا چلا جا رہا تھا۔ جگو دادا ادھیڑ عمر تھا۔ اس کے تیکھے نقوش تھے۔ سفید بال شانوں تک پھیلے ہوئے تھے، بڑی بڑی بے ترتیب مونچھیں اور داڑھی تھی لیکن اس کی آواز بہت رعب دار تھی۔ میں وہاں کے مناظر دیکھنے میں محو تھا کہ میرا فون بجا۔ اسکرین پر دیکھا، وہاں کوئی نمبر نہیں تھے۔ میں نے کال پک کی تو دوسری طرف چاچا عبدالمجید تھے۔

”دلی سے ایک ہیلی کاپٹر اُڑ چکا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ گھنٹے تک وہاں پہنچ جائے گا۔ ایک نمبر لکھو، وہ تمہیں فون کرے گا۔ اس کے علاوہ کسی پر بھی اعتبار مت کرنا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا تو چاچا نے فون کال بند کر دی۔ مجھے حوصلہ ہو گیا کہ تھوڑا سا وقت رہ گیا ہے۔ میرا خون تیزی سے گردش کرنے لگا تھا۔ میرے لیے مشکل ترین مرحلہ یہی تھا کہ ہیلی کوپٹر جہاں بھی لینڈ ہوا، وہاں تک پہنچنا کیسے ہے۔ اس دوران کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر انہیں میں بتا دوں کہ میں رانی بھاگ وتی کے بنگلے میں چھپا بیٹھا ہوں تو وہ عتاب میں آ جاتی۔ خودغرضی تو یہی تھی کہ میں رانی بھاگ وتی کی پروا کیے بغیر وہاں سے نکل کر ہیلی کاپٹر تک چلا جاتا۔ لیکن نجانے کیوں میرے اندر کا انسان یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا کہ میں محسن کشی کروں۔ نجانے وہ انسان کیسے ہوتے ہیں جو کسی کے دَر کا کھا کر بھی انہیں زخم لگاتے ہیں، وہ کتوں سے بھی بدتر ہوتے ہیں۔ کتے میں بھی قدرت نے یہ صفت رکھی ہے کہ وہ جس دَر کا کھا لیں، وفاداری ضرور نبھاتے ہیں۔ میں رانی بھاگ وتی کو دھوکا نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اسے سب کچھ بتا دوں گا۔

”ریتو، میں ذرا رانی بھاگ وتی کے پاس جا رہا ہوں۔“

”خیر ہے یوں اچانک.....“ اس نے پوچھا۔

”میں اُسے سب بتا دوں گا پھر جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تو وہ کاندھے اچکاتے ہوئے بولی۔

”یہ تمہاری مرضی، تم جو چاہو۔“

میں اٹھا اور لاؤنج سے باہر نکل گیا۔ میں جس طرح قید خانے سے یہاں تک آیا تھا، اسی طرح تھا۔ یہاں تک کہ میں نے نہ تو ہتھیار رکھے تھے اور نہ ہی کپڑے بدل کر ایزی ہونے کا کوئی موقع ملا تھا۔ جب میں کچھ دیر پہلے رانی بھاگ وتی سے ملنے گیا تھا، تب منہ صاف کیا تھا اور خود پر سے مٹی جھاڑی تھی۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوں رانی بھاگ وتی کے بیڈروم کی طرف چل پڑا۔ میرے پاس وقت کم تھا اور ایک ڈیڑھ گھنٹے میں مجھے بہت کچھ کرنا تھا۔ میرا دماغ مختلف آپشنز پر سوچ رہا تھا۔ ذہن میں یہی تھا کہ اگر رانی نے تعاون نہ کیا تو پھر مجھے کیا کرنا ہوگا۔

خلاف توقع لاؤنج کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ میں نے ان چند دنوں میں یہی دیکھا تھا کہ اگر وہاں پر کوئی بھی نہیں ہے تو لاؤنج ہمہ وقت روشن رہتا تھا، چاہے اس کی بتیاں دھیمی ہی کیوں نہ ہوں۔ میں نے محتاط انداز میں اندر قدم رکھا ہی تھا کہ ایک شخص انتہائی سرعت سے میری جانب لپکا۔ میں نے لاشعوری طور پر خود کو بچانے کی کوشش کی تھی مگر نہیں بچ سکا۔ وہ مجھے لیتا ہوا قالین پر گر گیا۔ جس وقت ہم گتھم گتھا گر رہے تھے لاشعوری طور پر میں نے خود کو اس پوزیشن میں لے لیا کہ وہ میرے نیچے آ جائے۔ ایسا ہی ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ ایک طاقتور آدمی تھا۔ مجھے خود کو چھڑانے میں بڑی محنت کرنا پڑی تھی۔ تاہم چند لمحوں بعد میں اپنے ہاتھ آزاد کروانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے مجھے کمر سے پکڑ رکھا تھا۔ میں نے ذرا سا اٹھ کر اپنا گھٹنا اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان مارا تو ایک لمحہ کو وہ سکڑ کر رہ گیا، تبھی میں نے خود کو آزاد کروا لیا۔ میں اسے مزید مہلت نہیں دینا چاہتا تھا، اس سے پہلے کہ وہ اٹھتا، میں نے اس پر گرتے ہوئے اپنی کہنی اس کے سینے پر ماری، وہ تڑپ کر رہ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے پوری قوت سے ایک مُکّا اس کی ناک پر مارا، وہ بے دم سا ہو گیا۔ اس کی ناک سے خرخراہٹ کی آواز نکلنے لگی۔ وہ پوری قوت لگا کر میرے نیچے سے نکلا تو میں نے اسے کمر سے دبوچ لیا۔ میں نے پیچھے کی جانب زور لگایا تو اس نے خود کو چھڑانے کے لیے آگے زور آزمایا، تبھی میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ لڑکھڑا گیا، تبھی میں نے گھوم کر ایک کک اس کی گردن کے قریب ماری۔ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

نہ رہ سکا۔

ابھی میں اس سے نبرد آزما تھا کہ مجھے قدموں کی آواز سنائی دی، میں نے اوپر دیکھا تو کاریڈور کی روشنی میں مجھے رانی بھاگ وتی دکھائی دی۔ اس کے ساتھ دو بندے تھے، اور اس کے پیچھے بڑی بی کو پکڑے ایک بندہ مزید آرہا تھا۔ میں لمحوں میں سمجھ گیا کہ یہ کارروائی چل رہی ہے۔ میرے پاس صرف اتنا وقت تھا، جب تک وہ نیچے نہیں آجاتے۔ میں نے انتہائی سرعت سے اس آدمی کے منہ پر ہاتھ رکھا کہ وہ کوئی آواز نہ نکالے۔ اسی دوران میں نے اپنا پسٹل نکالا اور پوری قوت سے اس کے سر پر دے مارا۔ وہ ایک بار کسی مچھلی کی طرح مچلا اور پھر بے سدھ ہوگیا۔

میں اسے چھوڑ کر قالین پر لیٹ گیا۔ میں دیکھ رہا تھا، رانی بھاگ وتی آہستہ سے اتر رہی ہے لیکن وہ دونوں مرد اسے کھینچ کر نیچے لانے کی کوشش کررہے تھے۔ ظاہر ہے ان کے پاس کوئی نہ کوئی ہتھیار ضرور ہوگا، ورنہ رانی یوں ان کے ساتھ نیچے نہیں آسکتی تھی۔ اس کے پیچھے جو بندہ تھا، وہ بڑے ادب اور احترام سے بڑی بی کو نیچے لا رہا تھا۔ لازم تھا کہ اس کے پاس بھی ہتھیار ہوں گے لیکن اس کے ہاتھوں میں کچھ نہیں تھا۔ میں نے ایک لمحے میں صورتِ حال کا اندازہ کیا اور فیصلہ کرلیا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔

وہ دونوں دائیں بائیں تھے اور رانی ان کے درمیان تھی۔ میں قالین پر دم سادھے یوں تیار تھا کہ جیسے ہی وہ میرے برابر سے نکلیں میں ان پر حملہ کردوں۔ اس میں رسک یہی تھا کہ کسی سے بھی پسٹل چل سکتا تھا۔ وہ میرے برابر آکر دو قدم آگے چلے گئے۔ سامنے لاؤنج کا داخلی دروازہ تھا، باہر چاندنی کے علاوہ بنگلے میں موجود برقی قمقموں کی روشنی ہورہی تھی۔ دونوں کے ان ہاتھوں کا اندازہ ہوگیا کہ پسٹل کس پوزیشن میں ہیں۔ ایک نے رانی کا دائیں بازو پکڑا ہوا تھا اور اس کے دائیں ہاتھ میں پسٹل تھا، جبکہ دوسرا ایک قدم پیچھے دائیں ہاتھ میں پسٹل پکڑے ساتھ جارہا تھا۔ اچانک وہ رک گئے۔ ان میں سے ایک، جس نے رانی کا بازو پکڑا ہوا تھا، اس نے اپنی جیب میں سے فون نکالا اور تیزی سے نمبر پش کرنے لگا۔ میں نے بڑی بی کی جانب دیکھا، اسے بھی وہیں پیچھے روک لیا گیا تھا۔ میرے ذہن میں یہی آیا کہ وہ کسی نہ کسی گاڑی والے کو کال کررہے ہیں۔ کیونکہ باہر پورچ میں کہیں بھی گاڑی نہیں تھی۔ اگلے ہی لمحے میرے خیال کی تصدیق ہوگئی۔ وہ مقامی زبان میں کسی کو فوراً گاڑی لانے کا کہہ رہا تھا، یہی وہ لمحہ تھا جب میں انتہائی سرعت سے اٹھا، فون والے شخص پر فائر کیا اور وہ سیدھا اس بندے کو لیتا ہوا نیچے گر گیا، جو ساتھ چل رہا تھا۔ میں نے اسے مہلت نہیں دی۔ اس کے سر پر نال رکھی اور فائر کردیا۔ اگلے ہی لمحے میں نے وہاں سے جگہ چھوڑ دی۔

''خبردار اگر ذرا بھی ہلے تو.....'' میں نے کہا اور ایک ہی ہلے میں اس پر جا پڑا۔ ابھی اس نے فائر کردیا جو میرے تو نہیں لگا، بلکہ عین اسی جگہ پڑا تھا جہاں سے میں نے آواز نکالی تھی۔ میں اسے لیتا ہوا قالین پر گر گیا۔ وہ مجھ سے گتھم گتھا ہوگیا تھا۔ میں اسے زیادہ مہلت نہیں دینا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ باہر گاڑی آجائے گی اور اس میں کوئی نہ کوئی تو ہوگا، ممکن ہے زیادہ لوگ ہوں۔ میں نے اس کی گردن دبوچی اور پسٹل کا دستہ اس کے سر پر مارا۔ جب وہ ساکت ہوا تو میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''رانی، ابھی لائٹ مت جلانا۔ دروازے کی اوٹ میں ہوجاؤ۔''

شاید وہ سمجھ گئی تھی یا میری بات مانی تھی، وہ دروازے کی اوٹ میں ہوگئی۔ میں بھی بھاگتا ہوا دروازے کے ساتھ لگ گیا۔ اتنی دیر میں ایک فوروھیل باہر پورچ میں آرکی۔ اس میں ایک ہی شخص ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ فوروھیل روک کر اندر کی جانب دیکھ رہا تھا، تبھی میں نے اس پر فائر کردیا۔ وہ فائر اسے نہیں لگا، اس نے فوروھیل بڑھانا چاہی لیکن شاید اس سے گیئر نہیں لگا، یا اسے سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے دوسرا فائر کردیا، پھر فائر کرتا ہوا باہر کی جانب چل پڑا۔ وہ دوسری جانب سے نکل کر بھاگنے کی کوشش میں باہر نکلا، چند قدم ہی چلا تھا کہ میں نے اس کی ٹانگوں پر فائر کردیے، یہاں تک کہ میگزین خالی ہوگیا۔ وہ سڑک پر گر گیا تھا۔ میں نے وہ پسٹل اُڑسا اور دوسرا نکالتے ہوئے واپس پلٹا۔ میں نے باہر ہی سے کہا۔

''رانی لاؤنج کی روشنی آن کرو۔''

اس نے قریب کہیں بٹن سے روشنی کی تو میں اس وقت تک اندر پہنچ چکا تھا۔ میرے سامنے دو لاشیں پڑی تھیں اور دو بندے بے ہوش تھے۔ رانی بھاگ وتی کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ ان سب کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے انہیں پہلی بار دیکھ رہی ہو۔

''ناقابلِ یقین.....'' اس نے حیرت میں ڈوبی آواز میں کہا۔

''کس کا یقین نہیں آرہا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی، یہ دو بندے تو یہاں بنگلے پر سیکورٹی گارڈ ہیں۔''

www.pakistanipoint.com

اس نے قالین پر پڑے لوگوں کو دیکھتے ہوئے کہا، جن میں ایک بندہ مر چکا تھا اور دوسرا بے ہوش تھا۔ تبھی میں نے کہا۔

''آپ بڑی بی کو لے کر اوپر جاؤ، میں دیکھتا ہوں۔''

''اب تو ان سیکیورٹی والوں پر بھی بھروسا نہیں رہا۔'' وہ شک بھرے لہجے میں بولی۔

''اس لیے کہہ رہا ہوں بڑی بی کو لے کے اوپر جاؤ۔ یہ اس وقت سب سے زیادہ قیمتی مہرہ ہے۔''

''نہیں میں یہیں رہوں گی، ورنہ یہ تمہیں نقصان پہنچائیں گے۔''

مجھے اس کی بات سمجھ میں آگئی۔ وہ بڑی بی کے ساتھ وہیں کھڑی رہی۔ میں نے ایک مرے ہوئے شخص کی قمیص پھاڑی اور اسے دو ٹکڑوں میں کر کے بے ہوش پڑے بندوں کے ہاتھ باندھنے لگا۔ پھر دوسری کی شرٹ اتار کر ان کے پاؤں باندھ دیے۔ اسی دوران میں باہر بھاگتے قدموں کی آواز آئی۔ میں نے پسٹل ہاتھ میں لیا تو چند سیکیورٹی گارڈ مجھے باہر دکھائی دیے۔ جو بھی اندر دیکھتا، وہ حیرت زدہ رہ جاتا۔ ایسے میں سیکیورٹی گارڈز کا ہیڈ پھولے ہوئے سانس کے ساتھ لاؤنج میں داخل ہوا۔ اس نے ایک نگاہ ماحول پر ڈالی اور پھر رانی کی طرف دیکھا تو وہ غضب ناک انداز میں بولی۔

''تم میں سے اور کون کون ہے پرتاب سنگھ کا وفادار؟''

''رانی جی کیا ہوا؟'' اس نے تیزی سے پوچھا۔

''یہ لوگ مجھے اغوا کرنے آئے تھے اور تم سب کہاں مر گئے ہو۔'' اس بار وہ ہذیانی انداز میں چیخی۔ تب میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک کر سیکیورٹی ہیڈ سے کہا۔

''وہ باہر جو بندہ پڑا ہوا ہے، زندہ ہے یا مر گیا؟''

''پتا نہیں، میں دیکھتا ہوں۔'' اس نے تیزی سے کہا تو میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''کوئی بندہ بھیجو، اسے پرتاب سنگھ کی حویلی میں چھوڑ آئے۔ کسی اسپتال میں مت لے جانا۔''

''جی بہتر۔'' اس نے سعادت مندی سے کہا۔

''ساتھ میں یہ لاشیں بھی وہیں پھینک آنا۔'' میں نے قالین پر پڑی ہوئی لاشوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس نے فوراً سیکیورٹی گارڈ بلائے اور اگلے چند منٹ میں وہ لاشیں وہاں سے اٹھالی گئیں۔

بڑی بی سارا تماشا دیکھ رہی تھی۔ اس نے لرزتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''کیا یہ بندے پرتاب سنگھ نے بھیجے تھے؟''

''ہاں، اسی نے بھیجے تھے۔'' رانی بھاگ وتی نے تلخی سے کہا۔

''اس نے.....'' وہ کہتے ہوئے خاموش ہوگئی، اسے سمجھ آگئی تھی کہ یہ سب تماشا کیوں ہو رہا تھا۔ وہ بے دم سی ہو کر ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں نے بے ہوش پڑے ایک بندے کو ٹھوکر ماری تو وہ کسمسا کر ہوش میں آگیا۔ وہ جیسے ہی پوری طرح ہوش میں آیا تو بدلا ہوا ماحول دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ بندہ وہیں بیٹھے پر سیکیورٹی گارڈ تھا۔ اس نے ایک نگاہ رانی بھاگ وتی کو دیکھا، پھر اس نے نگاہیں جھکا لیں۔ دوسرا بندہ بھی ہوش میں آچکا تھا۔ اس کا بھی وہی حال تھا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا تو سمجھ گیا کہ وہ پھنس چکا ہے۔ اس نے میری طرف دیکھا تو میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں پوچھا۔

''ایک ہی سانس میں بتا دو، کس نے بھیجا ہے؟''

اس نے ایک بار پھر سب کی طرف دیکھا اور پھر دھیمے سے لہجے میں بولا۔ ''پرتاب سنگھ نے۔''

''کس لیے آئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''ماتا جی کو لینے۔ ساتھ میں رانی جی کو بھی.....'' وہ کہتے ہوئے خاموش ہوگیا تو میں نے کہا۔

''جانتے ہو، اب تمہیں کیا سزا ملنے والی ہے؟''

''نہیں جی۔'' اس نے کہا تو میں نے قریب کھڑے سیکیورٹی والوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ان دونوں کو لے کر باہر جاؤ، میں بتاتا ہوں ان کے ساتھ کیا کرنا ہے۔''

وہ انہیں گھسیٹ کر باہر کی جانب لے گئے۔ میں نے رانی کے چہرے پر دیکھا، جہاں اب تک وحشت تھی۔ اس کی ساڑی کئی جگہ سے مسلی جا چکی تھی۔ اس کی آنکھیں غصے سے پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔

''دیکھا، وہ ایسا بھی کر سکتا ہے؟''

''لیکن میں کیا کر سکتا ہوں، رانی جی تم نے یہ نہیں دیکھا۔'' میرے یوں کہنے پر وہ جیسے ہوش میں آگئی۔

''اگر تم بروقت نہ آتے تو شاید.....'' وہ کہتے ہوئے رک گئی۔ تب میں نے بے پروائی کے سے انداز میں پوچھا۔

''تمہارا فون کہاں ہے؟''

''وہ شاید بیڈ روم میں۔''

''چلو پھر بیڈ روم میں، وہیں بات کرتے ہیں۔'' میں نے کہا تو اس نے بڑی بی کی جانب دیکھا، میں نے اسے بھی

www.pakistanipoint.com

ساتھ لے جانے کا اشارہ کیا تو رانی نے اسے بازو سے پکڑا اور اپنے ساتھ لے جانے لگی۔ اس بار رانی کے انداز میں جارحیت تھی۔

تھوڑی دیر بعد میں بیڈ روم میں پہنچا تو رانی بڑے غضب میں بڑی بی پر دہاڑ رہی تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی خاموش ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ سائڈ ٹیبل پر فون پڑا تھا۔ میں نے وہ اٹھایا اور اسے دیتے ہوئے کہا۔

''پرتاب سنگھ کا نمبر ملا کر دو۔''

اس نے تیزی سے نمبر دیکھا، پھر وہ نمبر پش کر کے فون میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے رابطہ ہونے کا انتظار کیا، کچھ ہی لمحوں میں پرتاب سنگھ کی آواز گونجی۔

''ہیلو رانی......''

''تمیز سے بات کرنا، تمہاری ماتا جی بھی سن رہی ہیں۔'' میں نے کہا تو اگلے ہی لمحے اس نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''تم، یہاں ہو بنگلے میں......؟''

''میں کہیں بھی ہو سکتا ہوں، تم اسپتال نہیں آئے تو میں واپس آ گیا۔'' میں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

''تم نے جو کچھ کیا ہے نا، اس کی معافی نہیں مل سکتی، میں وہاں تک تمہیں ختم کر دوں گا جہاں تک تمہاری جڑیں ہیں۔'' اس نے غضب ناک انداز میں کہا تو میں طنزیہ انداز میں بولا۔

''کیا ماتا جی کے ساتھ رانی جی پہنچ گئی ہیں تمہارے پاس؟''

''کیا مطلب......؟'' اس نے تیزی سے پوچھا۔

''تم نے بندے بھیجے تھے نا، ان کی لاشیں آ رہی ہیں تمہارے پاس، انہیں ریسیو کر لینا۔'' میں نے کہا۔

''میں صرف ماتا جی کی وجہ سے تمہیں بخش رہا ہوں ورنہ......''

''تم اب کچھ بھی نہیں کر سکتے ہو، میں نے تمہاری جڑیں اکھاڑ دی ہیں، قید خانے سے آزاد ہونے والے قیدی تم نے ابھی تک نہیں دیکھے۔'' میں نے کہا تو وہ چند لمحے خاموش رہا پھر مفاہمانہ انداز میں بولا۔

''دیکھو، میری ماتا کو ایک خراش بھی نہیں آنی چاہیے۔ اس کے بدلے تم جو کہو، میں ماننے کو تیار ہوں۔''

''اس کے لیے میری ایک ہی شرط ہے، تم خود آؤ اور اپنی ماتا جی کو لے کر چلے جاؤ، میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔''

''تم کہو تو میں ابھی آ جاتا ہوں۔'' اس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

''میں نہیں سمجھتا کہ اس وقت تم اتنے غافل ہو، تمہارے جیسے لوگ اپنی ماں کو بھی بیچ دیتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم اس وقت کیا کر رہے ہو۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ تم اس وقت صفر ہو چکے ہو۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں تمہاری ماتا کے ٹکڑے کر کے سڑک پر بھی پھینک سکتا ہوں اور تم مجھے نہیں روک سکتے ہو۔'' میں نے غضب ناک انداز میں کہا۔

''بتاؤ تم چاہتے کیا ہو؟''

''دو گھنٹے کے بعد تم سے بات کروں گا۔ میرے بات کرنے سے پہلے اگر تم نے کچھ بھی کیا تو سمجھو یہ میری آخری وارننگ ہے۔'' میں نے کہا اور فون کال بند کر دی۔ میں نے بات ختم کر کے خود پر قابو پایا تو میری نگاہ بڑی بی پر پڑی، وہ خوف زدہ انداز میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس وقت بڑی بی کا خوف زدہ ہونا اچھا نہیں تھا۔ میں نے فون رانی بھاگ وتی کی طرف بڑھایا اور خود گھٹنوں کے بل بڑی بی کے پاس بیٹھ گیا۔ میں اس کے چہرے پر دیکھتا رہا جہاں خوف پھیلا ہوا تھا۔ تبھی میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''آپ یہاں پر ہیں، کسی نے ایک بھی سخت لفظ کہا؟''

''نہیں، کسی نے نہیں۔'' اس نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تو پھر آپ پریشان نہ ہوں، ایک خراش تو کیا آپ سے اب بھی کوئی سخت لفظ نہیں بولے گا۔'' میں نے اعتماد سے کہا۔

''پر بیٹا یہ سب کیا چل رہا ہے؟'' اس نے تھوڑا ہمت کر کے پوچھا۔

''آپ جانتی ہو کہ آپ کا بیٹا مجرم ہے، وہ مجرمانہ زندگی گزار رہا ہے، اس نے کئی قتل کیے ہیں، ڈرگز کی صورت میں موت بانٹ رہا ہے۔ لیکن مجھے اس سے کوئی غرض نہیں، اس نے ایک بہت بڑا جرم کیا ہے، اس نے میری ماتا اور پتا کو اپنے قید خانے میں بند کر کے ان پر ظلم اور تشدد کرتا رہا ہے۔'' میں نے کہا تو رانی بھاگ وتی نے تقریباً چیختے ہوئے پوچھا۔

''تمہارے ماتا پتا......؟''

''ہاں میرے ماتا پتا۔ آپ کا بیٹا تو اپنی ماتا کے لیے اتنا تڑپ رہا ہے، کیا میں بیٹا ہو کر اپنے ماتا پتا کے لیے نہیں تڑپ سکتا۔'' میں نے کہا تو بڑی بی نے انتہائی جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔

''لاؤ مجھے فون دو، میں ابھی اس سے کہتی ہوں کہ

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

وہ......"

"ضرورت نہیں ہے اُسے کہنے کی۔ میں نے اپنے ماتا پتا اس قید خانے سے چھڑوا لیے ہیں۔ اس کے ساتھ کئی اور لوگ ہیں، زندگی اور موت کے درمیان جی رہے ہیں اور یہ سب آپ کا بیٹا کرتا رہا ہے۔" میں نے حقارت سے کہا تو بڑی بی یوں خاموش ہو کر بیٹھ گئی جیسے اس نے موت دیکھ لی ہو۔

"مجھے بتاؤ ویر سنگھ، کہاں ہیں تمہارے ماتا پتا؟" رانی نے کہا۔ میں اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

"آپ یہاں آرام کریں۔ صبح پرتاب سنگھ کو یہاں بلائیں گے تب آپ چلی جانا، کوئی بھی نہیں روکے گا۔"

"میں یہیں ہوں۔" بڑی بی نے کہا اور میں تیزی سے باہر نکل گیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ رانی میرے پیچھے آئے گی۔ میں کمرے سے باہر آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہی ہوا، چند لمحوں بعد رانی کمرے سے باہر آ گئی، مجھے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ مسکرا دی جیسے اسے بھی یقین ہو کہ میں باہر ہی ہوں گا۔ اس نے آتے ہی میرا ہاتھ پکڑا اور کاریڈور کے اسی کونے میں لے کر چل دی جہاں ہم کچھ دیر پہلے کھڑے باتیں کر چکے تھے۔

"ویر سنگھ، اصل بات کیا ہے؟ کیا سچ مچ تمہارے ماتا پتا......"

"رانی جی، میرے ماتا پتا، اسی کے قید خانے میں تھے۔" میں نے اعتراف کرتے ہوئے کہا تو اس نے شکوہ بھرے انداز میں تیزی سے پوچھا۔

"تو اس کا مطلب ہے تم یہاں پر اپنے ماتا پتا کے لیے آئے تھے؟"

"ہاں، ایسا ہی ہے۔" میں نے سچ کہہ دیا تو اس نے میرے ہاتھوں کو مضبوطی سے تھام لیا۔ کچھ دیر بعد بولی۔

"میں جانتی ہوں، اتنی جلدی، اتنا تلپٹ کر دینے والا، کوئی مجرمانہ ذہنیت والا بندہ نہیں ہو سکتا۔ تم ایک مقصد لے کر یہ سب کر رہے تھے۔ خیر، میں تمہارا دکھ سمجھتی ہوں۔" اس نے کہا اور میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"رانی جی، تم نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا، کیا ہمارا تعلق اب نہیں رہا۔" میں نے کچھ ایسے انداز میں کہا کہ اس نے ایک سسکاری لی، پھر آگے بڑھ کر میرے ساتھ لگتے ہوئے بولی۔

"نہیں ویر سنگھ جی، زندگی میں بہت مرد دیکھے ہیں لیکن پتا نہیں کیوں تم پر دل ٹھہر سا گیا تھا، خیر، تم جاؤ اپنا فرض

انتقام

ٹریفک پولیس والا اسپتال میں اپنڈکس کے آپریشن کے لیے داخل ہوا۔

آپریشن کے بعد ڈاکٹر نے پولیس آفیسر کو آپریشن کی کامیابی کے بارے میں بتایا اور جلد صحت یابی کے لیے دعا کی۔ پولیس والے کے سینے پر ایک چوڑی پٹی لگی ہوئی تھی جو اس کے سینے کے بالوں کو ہر حرکت کے ساتھ نوچ رہی تھی۔ وہ پریشان تھا کہ کہیں غلطی سے اس کا دوسرا آپریشن تو نہیں کر دیا گیا جس کی وجہ سے تکلیف ہے۔ صبح تک کچھ اس کے جسم میں جان آئی تو اسپتال کے لباس کو ہٹا کر دیکھا کہ کیا چیز اس کو تکلیف دے رہی ہے۔

دیکھنے پر پتا چلا کہ اس کے بالوں والے سینے پر بہت مضبوطی سے تین انچ چوڑی پٹی پر گوند لگا کر چپکا دیا گیا تھا جو سوکھنے کے بعد بہت مضبوط ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سے رقعہ لگا ہوا تھا۔

"میری دعا ہے کہ جلد صحت یاب ہو جاؤ اور تمہاری پٹی اتار دی جائے... نیک خواہشوں کے ساتھ وہی نرس جس کا تم نے پچھلے ہفتے چالان کیا تھا۔"

اقتباس: سید اکبر شاہ، اوگی مانسہرہ

نبھاؤ۔" اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

"مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہو گی۔"

"میں دل و جان سے حاضر ہوں، بولو کیا کرنا ہے، بتاؤ۔" اس نے بڑے مان سے کہا۔

"ابھی کچھ دیر میں بتاتا ہوں۔" میں نے کہا اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر ان پر بوسہ دیا۔ اس میں سوائے عقیدت کے کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ چھوڑے اور کاریڈور سے نکلتا چلا گیا۔

☆☆☆

ہیلی کاپٹر شہر میں موجود ایک کھیل کے میدان میں اُتر چکا تھا۔ مجھے مخصوص نمبر سے کال آ گئی تھی۔ اس کے باوجود چاچا عبدالمجید نے بھی مجھے فون کر کے بتا دیا تھا۔ میں نے ایک گاڑی لی اور اپنی رہائش گاہ پر آ گیا۔ ریتو ڈاکٹر صاحب اور

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

بیگم صاحبہ جھکولے کر نیچے آچکی تھی۔ میں نے ان دونوں کو پچھلی نشست پر بٹھا کر ریتو سے کہا۔
''ڈرائیو کرو۔''
میں نے کہا تو وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی اور گیئر لگا کر گاڑی آگے بڑھا دی۔ میں نے اسے پورچ میں لے جانے کو کہا۔ اس نے وہاں لے جا کر گاڑی کھڑی کر دی۔ تبھی لاؤنج کے داخلی دروازے سے رانی بھاگ وتی اور بڑی بی باہر آگئیں۔ اس نے اندر جھانک کر دیکھا، پھر سرسراتے ہوئے لہجے میں بولی۔
''یہ ہیں تمہارے ماتا پتا؟''
''ہاں، یہی ہیں۔'' میں نے کہا تو رانی نے انہیں دیکھ کر نمسکار کہا۔ انہوں نے بھی آگے سے ہاتھ جوڑ دیے۔ بڑی بی نے بھی ایسا ہی کیا۔ تب رانی نے بڑے دھیمے انداز میں پوچھا۔
''اب مجھے بتاؤ تمہیں جانا کہاں ہے؟''
''یہاں سے تین کلومیٹر دور جو کھیل کا میدان ہے، وہاں پر اس وقت شہر کے تمام آفیسرز اور پولیس کمشنر موجود ہیں۔ بس وہیں تک جانا ہے۔'' میں نے کہا تو وہ حیرت سے بولی۔
''اگر اتنے حکام تھے تو صبح سکون سے کیوں نہیں......''
''اس بارے میں تمہیں پتا چل جائے گا۔'' میں نے کہا تو وہ خاموش ہوگئی۔ میں نے بڑی بی سے کہا۔
''معاف کرنا آپ کو کشٹ دیا، بس اپنے بیٹے کو سمجھا دینا۔''
''جاؤ بیٹا، بھگوان تمہاری رکھشا کرے۔'' اس نے کہا تو میں نے رانی کی جانب دیکھا، اس کی آنکھیں نم تھیں۔ میں نے اپنی انگلی سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔
''زندگی رہی تو اپنا وعدہ ضرور پورا کروں گا۔''
''جاؤ، مجھے بہلاؤ مت۔ میں چاہوں گی کہ تم کبھی لوٹ کر واپس نہ آؤ، میں سمجھوں گی، اِک خواب دیکھا تھا۔'' اس نے کہا اور میرا ہاتھ نرمی سے جھٹک دیا۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ریتو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکی تھی۔ میرے اشارے پر وہ چل دی۔ آہنی گیٹ سے نکلنے کے بعد رانی بھاگ وتی کا بنگلا دھیرے دھیرے نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔
تین کلومیٹر کا یہ راستہ دراصل خطرناک ترین راستہ تھا۔ اس راستے میں ہونے کو تو کچھ بھی ہوسکتا تھا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ تقریباً دس منٹ میں یہ رستہ کٹ گیا۔
اس کھیل کے میدان میں ہر طرف پولیس نفری لگی ہوئی تھی۔ ایک بار تو مجھے لگا کہ جیسے ہمارا یہاں سے نکلنا ناممکن ہو گا۔ لیکن ہمیں کسی نے نہیں روکا، میں اس مخصوص نمبر پر مسلسل رابطے میں تھا۔
میں کھیل کے میدان کے اندر جا پہنچا تھا۔ وہاں عارضی لائٹ لگائی ہوئی تھی جس کی تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے ہیلی کاپٹر کھڑا تھا۔ گاڑی سے ہیلی کاپٹر کا یہ سفر ایک پل صراط کے مانند تھا، مجھے نہیں معلوم تھا کہ ارد گرد کون، کہاں، کتنے لوگ کھڑے ہیں۔ سامنے ایک لمبے قد کا جوان کھڑا تھا۔ اس نے سیاہ سوٹ پہنا ہوا تھا، جس پر گہرے نیلے رنگ کی ٹائی سج رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ اس نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا۔
''کہاں ہیں ڈاکٹر صاحب؟''
''گاڑی میں ہیں۔'' میں نے کہا تو اتنے میں ریتو اُتر آئی۔ اس نے دروازہ کھولا اور ڈاکٹر صاحب اور بیگم کو باہر نکال لیا۔ وہ جوان انہیں لے کر تیزی سے ہیلی کاپٹر کی جانب بڑھا۔ میں نے اپنا بیگ اٹھایا اور گاڑی سے باہر نکل آیا۔ باہر ریتو کھڑی تھی۔ میں نے اسے گلے لگاتے ہوئے ہولے سے اس کی گردن پر ہونٹ رکھ دیے۔ وہ پوری جان سے لرز گئی۔ تب میں نے کہا۔
''ریتو، بہت جلد ملاقات ہوگی۔''
''بس اپنا خیال رکھنا۔'' اس نے کہا اور مجھے چھوڑ دیا۔ میں تیزی سے مڑا اور ہیلی کاپٹر کی جانب بڑھ گیا۔
میں جیسے ہی بیٹھا، ہیلی کاپٹر اسٹارٹ ہوگیا۔ ہم پانچ افراد تھے۔ ڈاکٹر صاحب، بیگم صاحبہ، نوجوان، پائلٹ اور میں۔ جیسے ہی ہیلی کاپٹر زمین کو چھوڑ کر ہوا میں بلند ہوا تو میں نے نوجوان سے کہا۔
''تھوڑا سا آگے جائیں گے تو رستے میں دریائے کھاری آتا ہے۔ مجھے وہیں تک آپ سب کے ساتھ جانا ہے۔''
''کیوں......؟'' نوجوان کے بجائے ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔
''مجھے یہاں ابھی کئی کام سمیٹنے ہیں، آپ جائیں، اس وقت آپ محفوظ ہاتھوں میں ہیں۔'' میں نے کہا۔
''نہیں بیٹا، ایسا نہ کرو، بس بہت ہوگیا۔'' ڈاکٹر صاحب نے اصرار بھرے انداز میں کہا تو میں نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔
''کہا نا ابھی بہت سارے کام ادھورے ہیں، اگر زندگی رہی تو آپ سے مل لوں گا۔'' یہ کہہ کر میں نے پائلٹ سے

کہا۔ ''ذرا سا غوطہ [illegible] ''

''مجھے تو دریا [illegible] سامنے ایک لکیر کی جانب اشارہ [illegible] کہا۔

''بس وہیں۔'' میں نے کہا اور گیٹ کے پاس چلا گیا۔

''بیٹا اب بھی رُک جاؤ۔'' ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

''مجھے روکیں مت، بس دعا دیں۔'' میں نے کہا تبھی پائلٹ کی آواز ابھری۔

''تین......''

اس کے ساتھ ہی اس نے غوطہ لگایا تو میں نے گیٹ کھولا۔

''دو......''

میں نے بیگ کو کندھوں پر لیا اور کودنے کے لیے تیار ہو گیا۔

''ایک......''

میں نے نیچے جھانکا تو لکیر نزدیک آ رہی تھی۔

''ڈن......''

میں نے چھلانگ لگا دی۔

میں ہوا میں تیرتا ہوا تیزی سے نیچے کی طرف جا رہا تھا۔ مجھے صرف ہیلی کاپٹر کی آواز معدوم ہوتی سنائی دے رہی تھی۔ اچانک ایک دھچکا لگا اور میں پانی میں گرتا چلا گیا۔ پانی کی گہرائی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ ایک بار تو مجھے لگا کہ میں اس پانی میں ہی کہیں گم ہو جاؤں گا۔ سینے میں سانس کی گھٹن ہونے لگی تھی۔ میں کب تک سانس روک سکتا تھا۔ میں دوبارہ پانی کی سطح پر آیا تو مجھے یوں لگا جیسے میں دوبارہ زندہ ہو گیا ہوں۔ میں نے تیزی سے سانس بحال کی اور پھر تیرتا ہوا دریا کنارے کی جانب بڑھ گیا۔

کافی دیر تک تیرتے رہنے کے بعد میں دریا کنارے آ لگا۔ میں دریا سے باہر نکلا، بیگ اتار کر ایک جانب رکھا اور کنارے پر لیٹ گیا۔ میں بہت زیادہ تھک چکا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میرے جسم میں جان ہی نہ رہی ہو۔ کتنی ہی دیر تک میرا سانس بحال نہ ہو سکا۔ چاندنی رات میں آس پاس کی جھاڑیوں اور درختوں کے ہیولے بڑے خوف ناک لگ رہے تھے۔ میں اس وقت تک وہاں پڑا رہا جب تک میری توانائی بحال نہیں ہو گئی۔ کچھ دیر بعد میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے بیگ میں سے سیل فون نکالا، جو میں نے بہت احتیاط سے پلاسٹک کے لفافے میں بند کیا تھا۔ میں نے وہ پلاسٹک اتارا اور فون کو دوبارہ آن کیا۔ اس کی اسکرین روشن ہو گئی۔ میں نے جگو دادا کے نمبر ملائے۔ کچھ ہی دیر بعد رابطہ ہو گیا۔ اس نے ہیلو کہا تو میں نے پوچھا۔

''کہاں ہو تم لوگ؟''

''میں پل کے پاس ہوں۔ تم کہاں ہو؟'' اس نے جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے خود معلوم نہیں، میں سمت کا تعین کر کے تم سے دوبارہ رابطہ کرتا ہوں۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں نے فون میں موجود کمپاس کی مدد سے سمت کا تعین کیا اور دریا کنارے چل پڑا۔ تقریباً آدھا گھنٹا چلتے رہنے کے بعد مجھے پل کے آثار دکھائی دینے لگے۔ میں نے فون پر جگو دادا سے رابطہ کر لیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کی تگ و دو کے بعد مجھے وہ سڑک کنارے گاڑی لیے دکھائی دے گیا۔ اس کے ساتھ ایک ڈرائیور اور مزید ساتھی تھا۔ میں اس کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھ گیا تو گاڑی چل دی۔ وہ میرے لیے خشک کپڑے لے کر آیا تھا۔ کپڑے تبدیل کرتے ہی مجھے سکون آ گیا۔ تبھی میں نے پوچھا۔

''سناؤ، قیدیوں کا کیا بنا؟''

''میں نے بہت شور مچایا تو وہ انہیں اسپتال لے جانے پر راضی ہو گئے۔ وہ انہیں اسپتال لے بھی گئے لیکن اس کے بعد یوں ماحول بنا دیا جیسے کرفیو لگ گیا ہو، کوئی بھی اندر نہیں جا سکتا تھا۔'' اس نے بتایا۔

''تم کیا سمجھتے ہو، ایسا کیوں ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں جب وہاں پہاڑی کے پاس سڑک پر پہنچا تو بم دھماکے ہو چکے تھے۔ اِدھر اُدھر سے کافی لوگ جمع تھے۔ میں نے ان قیدیوں سے ہمدردی جتاتے ہوئے انہیں حوصلہ دیا۔ تب ان سے پوچھا بھی کہ وہ کہاں کے ہیں۔ ان میں سے کچھ بھارتی تھے، زیادہ تر ان میں دوسرے ممالک کے لوگ تھے۔'' جگو دادا نے کافی حیرت سے مجھے بتایا۔

''اور وہ سب غیر قانونی انداز میں پکڑے ہوئے تھے۔ ایسے قید خانے کہیں اور بھی لازمی ہوں گے۔ ان میں اگر کوئی مر بھی جائے تو کوئی الزام نہیں آتا۔ ایسا وہ تنظیمیں کرتی ہیں جو ریاست کے ساتھ مل کر دوسرے ملکوں میں کارروائیاں کرتی ہیں۔'' میں نے اسے بتایا۔

''تبھی وہاں اسپتال میں کرفیو لگ گیا تھا۔ بس وہی خبریں چل سکی تھیں جو پولیس وغیرہ پہنچنے سے قبل انہوں نے بنا لی تھیں، پھر یہ خبریں بھی ٹی وی سے غائب ہو گئیں۔ یوں جیسے کوئی واقعہ ہی نہیں ہوا۔'' جگو دادا نے مجھے بتایا۔

''ریاستی اداروں نے سنبھال لیا نا انہیں۔'' میں نے کہا اور چند لمحوں بعد میں نے پوچھا ''کیا خیال ہے جگو دادا، شہر

Wadar Azeem www.pakistanipoint.com

سنبھال لو گے؟‘‘

’’ہاں، کیوں نہیں۔ ایک وقت تھا، میں نے اس شہر پر راج کیا ہے۔‘‘ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا، جس میں حسرت بھی تھی، نوحہ بھی تھا اور امید بھی تھی۔

’’پرتاب سنگھ کی قوت اب وہ نہیں رہے گی، شہر پر راج کرنے میں تمہیں ریاستی اداروں کے ساتھ ملنا ہوگا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔‘‘ میں نے کہا۔

’’ہاں بس اب پرتاب سنگھ کے لوگوں سے تھوڑی بہت جنگ تو ہوگی، انہیں صاف کرنے میں تھوڑا وقت تو لگے گا۔‘‘ اس نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا تو میں سمجھاتے ہوئے بولا۔

’’دیکھو جگو دادا، تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں، ایک وہ جو اپنے مالک کے بڑے وفادار ہوتے ہیں، جو اپنی جان پر بھی کھیل کر مالک کے مفادات کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہی آٹے میں نمک کے برابر اور بہت مشکل لوگ ہوتے ہیں، دوسرے وہ جو صرف طاقت کے ساتھ ہوتے ہیں، انہیں جب یقین ہو جاتا ہے کہ طاقت اب کسی دوسرے پلڑے میں ہے تو وہ آسانی سے اُدھر لڑھک جاتے ہیں۔ انہیں صرف اپنے مفاد سے غرض ہوتی ہے۔ اور تیسرے وہ جو اپنے مالک سے دل ہی دل میں غصہ رکھتے ہیں لیکن طاقت کی وجہ سے کچھ کر نہیں پا رہے ہوتے، جیسے ہی انہیں کسی دوسری جانب طاقت دکھائی دیتی ہے وہ خاموشی سے اس جانب ہو جاتے ہیں، ایسے ہی لوگ غدار ہوتے ہیں۔ جنگ اس طرح لڑنا کہ لوگوں پر اپنی طاقت کی دھاک بٹھانا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔‘‘

’’میرا خیال ہے پرتاب سنگھ تو اب منظر سے ہٹ جائے گا؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’نہیں، وہ ایک سیاست داں کے طور پر سامنے رہے گا، ہاں کچھ دیر کے لیے اسے منظر سے ہٹایا جائے گا، لیکن تم فکر نہ کرو، ہم اسے خود منظر سے ہٹائیں گے۔‘‘ میں نے کہا تو سوچتے ہوئے بولا۔

’’ہاں اب اسے ہٹانا ہی پڑے گا۔‘‘

’’گوپال داس کا کیا کیا تم نے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’وہ مردہ گھوڑا تھا، بس اس کا سودا کر لیا، دو کروڑ دیا اس کے بیٹوں نے اور میں نے اسے دے دیا۔‘‘

’’اچھا کیا، اب دھیان رکھنا، وہ چار کروڑ کے چکر میں رہیں گے۔‘‘ میں نے کہا تو جگو دادا ... کسمسا کے رہ گیا۔ ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی۔ پھر وہ اپنے بارے میں، اپنے ماضی کے بارے میں اور اس وقت اس کے پاس کیا کچھ تھا، اس بارے مجھے بتاتا چلا گیا۔ میں چپ چاپ سنتا گیا۔

اُس وقت صبح کے آثار نمودار ہونے لگے تھے جب ہم دوبارہ شہر میں داخل ہوئے۔ شہر میں ایک سناٹا تھا۔ یا شاید مجھے ہی لگا تھا۔ جگو دادا نے ڈرائیور کو سمجھا دیا کہ وہ رانی بھاگ وتی کے بنگلے کی پچھلی جانب چلے۔ تبھی میں نے ریتو کو فون کر دیا۔ بیل جا رہی تھی، کچھ ہی دیر بعد اس کی خمار آلود آواز سنائی دی۔

’’ہاں پہنچ گئے ہو دلّی؟‘‘

’’نہیں، دلّی نہیں بلکہ تیرے دل کے قریب ہوں۔‘‘ میں نے کہا تو اس نے انتہائی غصے میں اکتائے ہوئے کہا۔

’’مذاق مت کرو، بولو فون کیوں کیا؟‘‘

’’پچھلا دروازہ کھولو، میں باہر کھڑا ہوں۔‘‘ میں نے کہا۔

’’پھر وہی مذاق.....‘‘ اس نے اکتاہٹ سے کہا۔

’’میں کہہ رہا ہوں نا، چپ چاپ، خاموشی سے آؤ میں باہر ہوں۔‘‘ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ جیسے ہی گاڑی رکی، دروازہ کھل گیا۔ میں تیزی سے دروازے میں چلا گیا۔ گاڑی آگے بڑھ گئی۔ ریتو میری طرف یوں دیکھ رہی تھی جیسے میں کوئی سچ مچ کا انسان نہیں کوئی جن بھوت ہوں۔

’’زیادہ حیران مت ہو..... یہاں سے چلو، کوئی دیکھ بھی سکتا ہے۔‘‘ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بے یقینی سے واپس پلٹ گئی۔ وہ تیز تیز قدموں سے میرے آگے چلتی چلی گئی۔

ہم رہائش گاہ کے لاؤنج میں پہنچے تو ریتو میری طرف یوں دیکھنے لگی تھی، جیسے میں اب تک اسے دھوکا ہی لگ رہا ہوں۔ میں نے اسے پکڑا اور اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ کافی دیر تک میرے ساتھ لگی لرزتی رہی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ رو رہی ہو۔ میں نے اسے الگ کیا تو اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

’’یہ برسات کیوں ریتو؟‘‘

’’مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ تم ہمیں یوں چھوڑ کر جا سکتے ہو۔ میرا یقین سچا نکلا۔‘‘ اس نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

’’آؤ، بیٹھو۔‘‘ میں نے اسے ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

’’نہیں تم فریش ہو جاؤ، میں تمہیں کپڑے دیتی ہوں۔ پہلے ناشتا بنا لوں، پھر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔‘‘

www.paksociety.com

''تم مجھے یہ بتاؤ، پرتا[illegible] گھ [illegible] بڑی بی......''

''نہیں، ابھی تک نہیں آیا؟''

''تم تو یہاں تھیں اور......'' میں نے شک بھرے لہجے میں پوچھا۔

''رانی نے مجھے خود کہا تھا کہ اگر وہ آیا تو مجھے کال کر دے گی۔'' ریتو نے بتایا تو میں نے تیزی سے کہا۔

''تم رانی کو کال کر کے پوچھو، میرے خیال میں پرتاب سنگھ کو اب تک آجانا چاہیے تھا۔''

''میں پتا کرتی ہوں۔'' اس نے کہا اور فون نمبر پش کرنے لگی، کچھ ہی دیر بعد رابطہ ہو گیا تو اس نے پوچھا۔

''رانی جی سب خیریت ہے نا؟''

''کیوں کیا ہوا؟'' اس نے پوچھا تو ریتو نے تیزی سے کہا۔

''بس مجھے وہم سا ہو رہا تھا کہ کہیں پرتاب سنگھ نہ آیا ہو۔''

''نہیں، وہ کچھ دیر بعد آئے گا، جب ماتا جی بیدار ہو جائیں گی۔ اس نے تھوڑی دیر پہلے فون کیا تھا۔''

''مجھے لگتا ہے آپ سوئی نہیں؟'' ریتو نے پوچھا۔

''بس نیند نہیں آئی، اب فریش ہو کر میں ماتا جی کے بیدار ہونے کا انتظار کر رہی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے، مجھے کال کر دیں جب......'' اس کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ رانی نے فون بند کر دیا۔

''لگتا ہے رانی پریشان ہے۔'' میں نے تبصرہ کرنے والے انداز میں کہا۔

''ہاں، جس طرح میرا دل ٹوٹ گیا تھا تمہارے جانے سے اسی طرح، اس نے بھی جو سوچا تھا وہ نہ ہوا۔ اس کا دل بھی تو ٹوٹا ہو گا نا۔'' ریتو نے سمجھانے والے انداز میں کہا تو میں نے کچھ سوچا اور پھر پوچھا۔

''اگر تم کہو تو میں رانی کو حوصلہ دے دوں؟''

''میرے خیال میں یہ ٹھیک رہے گا۔ ابھی دن نہیں چڑھا، تم خاموشی سے بنگلے میں جا سکو گے، میں دیکھتی ہوں کوئی راستے میں ہے تو نہیں۔'' اس نے کہا اور باہر کی جانب چل دی۔ میں نے بیگ وہیں رکھا اور پلٹ کر اس کے پیچھے نکلتا چلا گیا۔

ریتو میرے ساتھ لاؤنج تک آئی۔ میں اندر داخل ہوا تو وہ پلٹ کر واپس رہائش گاہ تک چلی گئی۔ میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا رانی بھاگ وتی کے کمرے کے سامنے جا رکا۔ اندر بالکل خاموشی تھی۔ میں نے ہلکی سی دستک دی پھر دروازے کو اندر کی جانب دھکیلا۔ دروازہ کھلتا چلا گیا۔ سامنے بیڈ پر رانی بیٹھی تھی۔ اس نے جب مجھے دیکھا تو اس کی نگاہیں پھیل گئیں۔ وہ میری طرف یوں دیکھنے لگی تھی جیسے کسی اجنبی کو دیکھتے ہیں۔ پھر وہ اضطراری انداز میں اٹھ کر بیڈ سے اتر آئی۔ وہ میرے اس قدر قریب آگئی کہ اس کے بدن کی مہک نے مجھے مسحور کر دیا۔ تبھی اس نے سرسراتے ہوئے پوچھا۔

''تم گئے نہیں؟''

''رانی، تمہیں چھوڑ کر کون کافر جا سکتا ہے۔'' میں نے کہا تو اس نے انتہائی جذباتی انداز میں گلے لگا لیا۔ وہ مجھے بھینچتی رہی پھر الگ ہو کر بولی۔

''یقین نہیں آرہا۔''

''یقین کر لو اور اسے خفیہ رکھنا ہے، صرف تمہیں اور ریتو کو معلوم ہے۔''

''میں اب تمہیں چھپا کر ہی رکھوں گی۔'' اس نے کہا اور پھر دروازہ بند کر کے لاک کر دیا۔ میں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور بیڈ تک لے جا کر بولی،

''تھوڑا آرام کر لو۔''

کمرے میں اندھیرا کر کے رانی خود بھی بیڈ پر بیٹھی، پھر میرے پہلو میں لیٹ گئی۔ وہ میری گردن، بازو اور سینے پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ مجھے بہت سکون محسوس ہوا۔ میں نے اسے اپنے قریب کر لیا۔ کچھ دیر بعد ہمارے درمیان تمام تکلفات دور ہو گئے۔

میں گہری نیند میں تھا۔ اچانک مجھے لگا جیسے میرے جسم پر کچھ رینگ رہا ہے، میں ایک دم سے بیدار ہو گیا۔ کمرے میں اجالا پھیلا ہوا تھا اور میرے سامنے ریتو تھی۔ اس کے چہرے پر مسکان تھی۔

''اُٹھو، فریش ہو جاؤ، ابھی تھوڑی دیر میں پرتاب سنگھ اپنی ماتا جی کو لینے آرہا ہے۔'' اس نے ہولے سے کہا۔

''رانی کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ ماتا جی کے کمرے میں ہیں۔'' اس نے بتایا تو میں اٹھ گیا۔ باتھ روم میں میرے لیے کپڑے موجود تھے۔ مجھے ریتو پر بے حد پیار آنے لگا تھا۔ وہ کس قدر مجھے سمجھنے لگی تھی۔

میں ایک ایسی جگہ کھڑا تھا، جہاں سے میں لاؤنج کا منظر پوری طرح دیکھ سکتا تھا۔ میں ان سب سے پہلے نیچے آکر وہاں کھڑا ہو گیا تھا۔ ریتو لاؤنج میں کھڑی تھی۔ کچھ دیر بعد رانی بھاگ وتی اور بڑی بی سیڑھیاں اتر کر نیچے لاؤنج میں آگئی تھیں ایسے میں پورچ کی طرف سے گاڑی رکنے کی

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

آواز آئی، اس کے تھوڑی دیر بعد پرتاب سنگھ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا یوں اندر داخل ہوا جیسے کوئی فاتح اس جگہ پر آئے جسے اس نے فتح کر لیا ہوتا ہے۔ رانی بھاگ وتی اسی طرح صوفے پر بیٹھی رہی۔ وہ اس کی طرف یوں دیکھ رہی تھی جیسے اس کا مذاق اُڑا رہی ہو۔ تبھی پرتاب سنگھ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''تم جب اس قابل ہو جاؤ کہ خود شکار کر سکو، تب میری طرف اپنے تیر چلانا، مانگی ہوئی تلواریں... واپس لے لی جاتی ہیں۔''

''تم اتنا تکبّر مت دکھاؤ مجھے، یہ میں ہی ہوں جس نے تجھے زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا ہے۔'' رانی نے گرجتے ہوئے کہا تو ایک خوشگوار احساس میرے اندر اتر گیا۔ میرے ہونے سے وہ اس قدر حوصلہ پکڑے گی، یہ مجھے اندازنہیں تھا۔ پرتاب سنگھ اس کی طرف دیکھ رہا تھا، پھر اسی طنزیہ لہجے میں بولا۔

''وہ جس کے بل بوتے پر تم نے جو کیا، سو کیا، اب تم وہی رانی ہو، اپنی اوقات میں رہو اور مجھ سے تمیز سے بات کرو۔''

''تم بھی وہ پرتاب سنگھ نہیں ہو، تم اب زمین پر رینگنے والے کیڑے ہو، وہ تمہیں ایسا بنا کر گیا ہے۔ میں جو چاہوں اب تمہارے ساتھ کر سکتی ہوں۔ تم بھی اب اپنی وقات میں رہ کر بات کرو۔'' اس نے غضب ناک انداز میں کہا۔

''میں اچھے دنوں کی خیرات کے طور پر تمہیں کچھ نہیں کہہ رہا، ورنہ.....'' وہ کہتے کہتے رک گیا تو رانی نے کہا۔

''تم کچھ نہیں کر سکتے ہو، ہاں اگر کرنا چاہو تو تمہیں اجازت ہے۔''

''چلو، دیکھ لوں گا میں تمہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے بڑی بی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''چلیں ماتا جی۔''

''پہلے... میرے پاؤں پڑو، گھٹنے ٹیک کر مجھ سے التجا کرو، پھر لے جانا۔'' رانی نے تحکمانہ انداز میں کہا تو پرتاب سنگھ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر ہنستے ہوئے بولا۔

''دن میں خواب مت دیکھ بھاگ وتی، تو میرے غصے کو جانتی ہے، اب ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو.....''

''کیا ہوگا، تم مجھے مار دو گے، قتل کر دو گے میرا، چل یہ بھی کر کے دیکھو، ہاتھ لگاؤ اپنی ماں کو، میں راجپوت کی بیٹی نہ ہوئی اگر یہیں تم دونوں کو قتل نہ کیا۔'' رانی نے غضب ناک لہجے میں کہا تو پرتاب سنگھ لمحہ بھر کو حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے ایک طویل سانس لیا پھر رانی کے سامنے گھٹنے ٹیک کر دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''رانی جی مجھے معاف کر دو، میری ماتا جی مجھے دان کر دو۔''

''اب اس التجا کو یاد بھی رکھنا.....'' رانی نے کہا اور اٹھ کر بڑی بی کی طرف چل دی۔ وہ اس کے سامنے کھڑی ہوئی، اسے نمسکار کیا اور جانے کا اشارہ کر دیا۔ بڑی بی نے اسے ایک بار دیکھا اور باہر کی جانب چل دی۔ تبھی رانی بھاگ وتی نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔

''اب اگر میری زمین جائداد پر خود ہی قبضہ چھوڑ دو گے تو معافی رہے گی، اگر آج شام تک قبضہ نہ چھوڑا، تو یہ معافی ختم ہو جائے گی۔''

آواز کی بازگشت گونج کر رہ گئی۔ پرتاب سنگھ نے باہر جاتے ہوئے رک کر اس کی بات سنی، پھر اپنی ماں کو لیتا ہوا باہر کی جانب چل دیا۔ اس نے اپنی ماں کو گاڑی میں بٹھایا، پھر اس کے ساتھ بیٹھا اور وہاں سے نکلتا چلا گیا۔ ریتو نے پورچ میں جا کر سب گارڈز کو اپنی ڈیوٹی پر بھیج دیا۔ جب رہائش گاہ کی طرف جانے والے راستے میں کوئی نہ رہا تو اس نے مجھے نکلنے کا اشارہ کیا میں وہاں سے رہائش گاہ تک جا پہنچا۔ اب وہی میرا ہیڈ کوارٹر تھا۔

میں بیڈ روم میں آ کر بڑے سکون سے لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد ریتو بھی آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں چائے کے مگ تھے۔ اس نے ایک مگ میری جانب بڑھایا اور اپنا سائڈ ٹیبل پر رکھ کر میرے ساتھ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ میں اٹھا اور بیڈ پر آلتی پالتی مارتے ہوئے بیٹھ گیا۔ میں نے مگ لیا اور سپ لے کر کہا۔

''ریتو، جگو دادا کو بس حوصلے کی ضرورت تھی، دیکھو، شہر میں کیسا بھونچال لایا ہے وہ۔'' میں نے کہا اور چائے کا سپ لے لیا۔

''اس کے لیے تمہیں میرا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں نے مگ سائڈ ٹیبل پر رکھا اور اس کا سر اپنی گود میں رکھتے ہوئے بڑے ہی جذباتی لہجے میں بولا۔

''ریتو، تم وہ ہو جس کا جتنی بار بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔''

''میں اچھی لگتی ہوں نا؟'' اس نے پوچھا۔

''بہت زیادہ۔'' میں نے کہا تو ہنستے ہوئے بولی۔

''پھر چائے پیو اور مجھے بھی پینے دو۔''

www.pakistanipoint.com

اس کے یوں کہنے پر میں قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

دوپہر ہو گئی تھی۔ میں بیڈ روم میں پڑا جگو دادا سے رابطے میں لگا رہا۔ شہر بھر میں اس نے اپنے بندے پھیلا دیے تھے۔ جہاں بھی پتا چلتا کہ یہاں کوئی سلسلہ پرتاب سنگھ کا ہے، وہ وہیں دھاوا بول دیتے۔ دونوں طرف پانچ بندے قتل ہو چکے تھے اور کافی سارے لوگ زخمی تھے۔ شہر میں کہرام برپا تھا۔ جس پر پولیس نے قابو پا لیا تھا۔ جگو دادا کو ئی اتنی زیادہ کامیابی حاصل نہیں کر پایا تھا لیکن وہ خوش تھا، اس نے اپنے ہونے کا احساس دے دیا تھا۔

ایسے میں چاچا عبدالمجید کا فون آ گیا۔ ڈاکٹر صاحب اور بیگم صاحبہ وطن پہنچ کر محفوظ مقام پر پہنچ گئے تھے۔ میں نے شکر ادا کیا کہ جس مقصد کے لیے میں یہاں تک آیا تھا وہ پورا ہو گیا تھا، وہ مجھ سے وہیں رہ جانے کی وجہ پوچھنے لگے تو میں نے پھر کسی وقت بتانے کا کہہ کر فون بند کر دیا۔ کیونکہ اب جو میں نے ہدف بنایا تھا وہ بالکل میرا اپنا ذاتی تھا۔ جب تک میرے سامنے کوئی منظر واضح نہیں ہو جاتا، میں انہیں کچھ بھی نہیں بتا سکتا تھا۔

☆☆☆

رات کا دوسرا پہر چل رہا تھا، جب میں پچھلے دروازے سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔ جگو دادا میرے انتظار میں تھا۔ میرے بیٹھتے ہی گاڑی چل دی۔ ڈرائیور کے ساتھ ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ ہم پچھلی نشست پر تھے۔ جگو دادا نے میری طرف ایک قیمتی پسٹل بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ دیکھو، کیسا ہے؟''

میں نے اندر کی لائٹ جلائی، اسے غور سے دیکھا، پھر لائٹ بند کر کے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا ہے۔''

''یہ اس کے لیے کچھ فالتو میگزین۔'' اس نے میگزین میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا تو میں نے وہ پکڑ لیے، پھر انہیں محسوس کر کے اپنی جیکٹ میں رکھ لیے۔

''تمہیں یقین ہے کہ وہ وہاں پر پہنچ چکا ہو گا؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے لوگوں کے مطابق تو ایسا ہی ہے۔ یہ پکی خبر ہے کہ ان کی میٹنگ ہونے والی ہے۔'' جگو دادا نے کہا۔

''اگر ایسا ہے تو سمجھو، آج کے بعد تمہارا راج ہو گا اس شہر پر۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا تو وہ خاموش رہا۔ ڈرائیور بڑی سڑک پر گاڑی بھگائے چلا جا رہا تھا۔ اچانک اس نے رفتار کم کی اور دائیں جانب مڑ کر ایک چھوٹی سڑک پر آ گیا۔ ذرا سا آگے گئے تو میری نگاہ بائیں جانب جھیل پر پڑی۔ مجھے یاد آ گیا۔ یہ تو وہی جھیل تھی جو تیمور سے ملتے وقت مجھے دکھائی دی تھی۔ میرے ذہن میں شہر کی لوکیشن تھی، اسی مناسبت سے میں سمجھ گیا کہ آگے تھوڑی سی آبادی ہو گی اور پھر کھیت شروع ہو جائیں گے۔ کافی آگے جا کر ڈرائیور پھر دائیں جانب ہی مڑ گیا۔ یہ راستہ بھی جھیل کے ساتھ ساتھ ہی جا رہا تھا۔ وہ تھوڑا سا آگے جا کر رک گیا۔ تبھی جگو دادا نے کہا۔

''وہ بائیں جانب تین منزلہ بلڈنگ دیکھ رہے ہو نا۔''

''ہاں، دیکھ رہا ہوں۔''

''اسی میں پرتاب سنگھ اور اس کے ساتھی جمع ہو رہے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''یہ پتا کرو کہ وہ پہنچ چکے ہیں یا آنے والے ہیں؟'' میں نے دھیمے سے کہا تو اس نے اپنا فون نکال لیا۔ کچھ دیر بعد رابطہ ہو جانے پر اس نے کسی سے پوچھا، جواب سننے کے بعد اس نے فون کان سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

''پرتاب سنگھ ابھی نہیں پہنچا۔''

''تو ایسا نا کریں اسے اس بلڈنگ کے باہر ہی دیکھ لیں۔'' میں نے ہر طرف کا جائزہ لے کر سکون سے کہا۔

''وہ کیسے؟'' اس نے پوچھا تو میں اسے سمجھانے لگا۔ باقی لوگ بھی میری بات سن رہے تھے۔ میں ابھی انہیں سمجھا ہی رہا تھا کہ ایک گاڑی تیزی کے ساتھ ہمارے قریب سے گزری۔ آگے بیٹھے ہوئے نوجوان نے کہا۔

''پرتاب کی گاڑی.....''

اسی لمحے ڈرائیور نے گاڑی بڑھا دی۔ جب تک پرتاب سنگھ والی گاڑی اس بلڈنگ کے پاس جا کر رکی، تب تک ہم بھی پہنچ گئے۔ پرتاب سنگھ نے گاڑی سے باہر قدم نکالا ہی تھا کہ ہم تینوں گاڑی سے باہر آ گئے۔ اس کی گاڑی کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ وہ اندر کی جانب قدم بڑھانے والا ہی تھا کہ ہم نے فائرنگ شروع کر دی۔ اس کے ساتھ ہی میں پوری قوت سے آگے کی جانب بھاگا۔ میں اسے اس بلڈنگ میں داخل نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ فائرنگ اتنی شدید تھی کہ اس کی گاڑی سے کوئی بھی نہیں نکل سکا۔ مجھے بس یہی ڈر تھا کہ اندر بیٹھے کوئی نہ کوئی فائر کرے گا۔ وہ میں نے جگو دادا پر چھوڑا اور خود دروازے کے سامنے جا پہنچا۔ وہ میری جانب حیرت سے دیکھ رہا تھا، اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''تم یہاں.....''

www.paksitanipoint.com

میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا بلکہ لپک کر اسے گردن سے پکڑا اور پسٹل کنپٹی پر رکھتے ہوئے کہا۔

''تھوڑی سی بات کرنی ہے چلو گے یا یہیں مرو گے؟''

میں اسے مزاحمت کا وقت نہیں دینا چاہتا تھا، میں نے اسے گھسیٹا اور اپنی ڈھال بنا لیا۔ پھر الٹے قدموں اسے لانے لگا، وہ میرے ساتھ آتا چلا گیا۔ میں نے اسے گاڑی میں پھینکا تو جگو دادا بھی دوسری جانب سے آن بیٹھا۔ ڈرائیور نے کمالِ مہارت سے گاڑی پیچھے لی اور پھر چیختے ہوئے ٹائروں کے ساتھ یوٹرن لے کر گاڑی بھگا دی... میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، ایک گاڑی ہمارے پیچھے لگ چلی تھی۔ اس میں سے مسلسل فائرنگ ہونے لگی۔

''انہیں سمجھاؤ، یہ تمہاری موت چاہتے ہیں۔'' میں نے پرتاب سنگھ سے کہا جو میرے اور جگو دادا کے درمیان پھنس کر بیٹھا تھا۔

''سر سمجھانے کی ضرورت نہیں، میں انہیں دیکھ لیتا ہوں۔'' ڈرائیور نے کہا تو میں خاموش ہو گیا۔ وہ انتہائی خطرناک رفتار سے کار چلائے جا رہا تھا، وہ چھوٹی سڑک کا پہلا موڑ مڑا تو پھر رفتار تیز کر دی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ لمحوں میں بڑی سڑک تک آ گیا ہو۔ پیچھے آنے والی کار نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

وہ ایک گنجان آباد علاقہ تھا۔ وہاں پرانے طرز کے بڑے بڑے گھر تھے۔ انہی میں سے ایک گھر کے سامنے گاڑی روکی تو گیٹ کھل گیا۔ ڈرائیور گاڑی سمیت اندر چلا گیا۔ وہ ڈیوڑھی سے ہوتا ہوا صحن پار کر کے برآمدے کے پاس جا کر رک گیا۔ برآمدے میں چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ہمیں دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ ہمارے نکلتے ہی نوجوان نے پرتاب سنگھ کو باہر نکالا اور اندر کی جانب لے کر چل دیا۔

وہ ایک پرانا سا بوسیدہ کمرا تھا جس کا فرش اکھڑا ہوا تھا۔ وہاں ایک پیلا بلب روشن تھا جس کی روشنی ہانپ رہی تھی۔ پرتاب سنگھ کو ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر بٹھا کر نوجوان باہر چلا گیا۔ ایسی ہی ایک ٹوٹی کرسی پر میں بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ جگو دادا اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ میں کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر بڑے سکون سے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب اور بیگم صاحبہ کو تم نے قید کیوں کیا تھا؟''

''گاہے بگاہے، لوگ قید خانے میں رکھنے کے لیے میرے پاس بھیجے جاتے رہے ہیں اور میں انہیں قید خانے میں رکھوا دیتا تھا، ایسے ہی یہ لوگ بھی آ گئے۔'' اس نے سکون سے جواب دیا۔

''کس نے بھجوایا تھا ان کو؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہارا یہ سوال بے وقوفانہ ہے۔ جو تم پوچھنا چاہتے ہو اس کے بارے تمہیں کبھی بھی پتا نہیں چل سکتا۔'' اس نے اکتاہٹ بھرے انداز میں کہا۔

''لیکن مجھے پتا لگانا ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ ہنس دیا پھر بولا۔

''تم بے وقوفی والی باتیں کر رہے ہو، جب ایک بہت بڑے نیٹ ورک میں کام ہوتا ہے تو سب کے بارے میں کسی کو پتا نہیں ہوتا کون، کہاں پر کیسے کام کر رہا ہے۔ تم نے جو انجانے میں زیرزمین کارروائیاں کر کے کامیابی حاصل کی ہے نا، یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں، یہ تو ان تنظیموں کے لیے کھیلنے والی بات ہے جنہیں چلانے والے عالمی سطح پر بیٹھے ہوئے ہیں۔'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا تو میں نے پھر سکون سے پوچھا۔

''چلو وہ لوگ ہی بتا دو۔ یا ان کی نشاندہی کر دو، جنہوں نے تم تک ان دو افراد کو بھیجا تھا۔ باقی میں جانو میرا کام۔''

''میں اب بھی تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ ایسی آگ سے مت کھیلو جس میں تمہاری خاک بھی اُڑ جائے۔'' اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

''یار مجھے نصیحت نہ کرو بلکہ وہ بتانے کی کوشش کرو، جو میں پوچھنا چاہ رہا ہوں۔ میں جو تم سے بڑے سکون سے بات کر رہا ہوں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم مجھے ڈرانا شروع کر دو۔ مجھے دوسرا طریقہ آزمانے پر مجبور نہ کرو۔'' میں نے سرد سے لہجے میں کہا وہ پھر اسی اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''جاؤ ریاست کے گلے پڑو پھر جا کر، اس سے پوچھو انہوں نے ایسا کیوں کیا؟''

''تمہارا مطلب ہے کہ یہ سب ریاست نے کیا۔ انہیں قید کرنے کا حکم ریاست کی طرف سے تمہیں ملا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، ایسا ہی ہے۔'' اس نے کہا۔

''اچھا چلو یہ بتاؤ، یہ کلیان جی والا کیا معاملہ ہے، تم یہاں کے کلیان جی ہو تو تمہارا اس نیٹ ورک سے بھی تعلق ہے، کیا تم جسے ریاست کہہ رہے ہو، یہ کلیان جی ہے؟'' میں نے کہا تو وہ ایک بار چونکا، چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

دل پزیر مضامین سے سجا اکتوبر 2020ء کا متاثر کن شمارہ

گھر کے ہر فرد کے لیے

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

نایاب جیلانی، افشاں آفریدی اور **سعدیہ رئیس** کی قسط وار پُراثر کہانیاں

پڑھیے مکمل ناول **پریوں کا دیس** ...... **مدیحہ شاہد** کا دلنشیں فنِ تحریر

عورت کہانی میں **فرحین اظفر** لائی ہیں ایک اور بہترین کہانی...... **ع عورت ق قفل**

پاکیزہ کے مہمان میں

شائستہ زریں متعارف کرواتی ہیں

کھانا گھر کی منتظم **پروین سعید** سے

شمع ہدایت......

اختر شجاعت کا تحقیقی مقالہ......

حُبِّ مال ...... آزمائش الٰہی

ان کے علاوہ

فرح بھٹو، دردانہ نوشین خان، شمیم فضل خالق اور **پروین عذرا تشنہ**

کی دل رُبا تحریروں کے ساتھ ساتھ مزید پڑھیے نئے قلم کاروں کے حسین نثر پارے

آپ جیسے باذوق قارئین کے مطالعے کے لیے شعر و شاعری، خوش ذائقہ، حسن نکھارئیے، معلومات سے پُر تراشے اور گوشہ ظرافت جیسے خوب صورت سلسلے......

Waqar Azeem
www.paksitanpoint.com

''یہی سمجھ لو، اس کی ایک ذیلی تنظیم ہے۔'' اس نے اشارے میں کہا تو میں سمجھ گیا۔ جس طرح مختلف ملکوں میں خفیہ ایجنسیاں اپنی طرف سے مختلف تنظیمیں کھڑی کر کے اپنے مقاصد حاصل کرتی ہیں، وہ کلیان جی بھی ایک ایسی ہی تنظیم ہو سکتی تھی۔ میں کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔

''یہ کام کلیان جی تنظیم کا ہے یا ریاست کا؟'' میں نے پوچھا۔

''تم جو مرضی کر لو، میرا وہی جواب ہے۔ تم کبھی بھی ان تک نہیں پہنچ سکتے۔ انہیں چھوڑو، میرے ساتھ جو طے کرنا ہے کرو۔ تم رانی بھاگ وتی کے وفادار ہو، اس کے لیے جو چاہتے ہو، مجھے بتاؤ۔''

''تم رانی کی بات مت کرو، وہ اب ماضی ہو چکی، جتنا کام مجھے اس سے لینا تھا، لے لیا۔ جو میں پوچھ رہا ہوں وہ بتاؤ۔'' میں نے کہا تو وہ خاموش رہا، میں نے چند لمحوں بعد اسے پھر کہا وہ تب بھی خاموش رہا تو میں اٹھ گیا۔ میرا یہی خیال تھا کہ اب اسے دوسرے طریقے سے سمجھاتا ہوں۔ میں ابھی کھڑا ہی ہوا تھا کہ جگو دادا کا فون بج اٹھا۔ اس نے فون نکال کر اسکرین پر دیکھا اور پھر کال ریسیو کرتے ہوئے اسپیکر آن کر دیا۔ دوسری جانب سے کسی نے بھیرے لہجے میں کہا

''جگو دادا، تم چاروں طرف سے گھیرے جا چکے ہو، یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اس لیے چپ چاپ پرتاب سنگھ جی کو لے کر باہر نکل آؤ، تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔''

''تم کون ہو اور یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟''

''اوئے، تمیز سے بات کر، میں تیرا باپ بات کر رہا ہوں۔ اور سن، وہ ایجنٹ، جو تیرے ساتھ ہے، وہ ہمیں زندہ چاہیے۔ ہمیں پرتاب سنگھ کی اتنی پروا نہیں ہو گی جتنی اس ایجنٹ کی ہے۔ امید ہے تم ہمارے ساتھ تعاون کرو گے۔ فوراً باہر نکل آؤ۔''

میں اس کی بات سن رہا تھا۔ میں نے جگو دادا کو فون بند کر دینے کے لیے کہا تو اس نے کال بند کر دی تبھی پرتاب سنگھ نے زور کا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''بے چارہ ویر سنگھ۔ آ گئے نا میرے جال میں۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے صبح اسی وقت شک ہو گیا تھا جب بھاگ وتی بڑے اونچے سُروں میں ڈائیلاگ بول رہی تھی۔ وہ ایسا بول ہی نہیں سکتی تھی۔ مجھے شک ہی نہیں یقین ہو گیا تھا کہ تم یہیں کہیں ہو۔'' اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا، پھر میرے سامنے تن کر بولتا چلا گیا۔ ''جیسے بھی ہوا، میں ماتا جی کو لے کر نکل گیا۔ پھر دو پہر تک میرے ذرائع نے مجھے کنفرم کر دیا کہ تم دِلّی کے سفارت خانے نہیں پہنچے ہو۔ تب مجھے پکا یقین ہو گیا کہ تم یہیں ہو۔ یہ جو سارا دن جگو دادا نے مار ماری کی ہے۔ اس کی بھی ہمت نہیں تھی کہ میرے سامنے سر اٹھا سکے۔ تب میں نے فیصلہ کر لیا کہ فساد کی جڑ کو ہی ختم کر دوں اور اب..... تم میرے جال میں پھنس چکے ہو۔'' یہ کہہ کر وہ مڑا اور جگو دادا کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ ''تمہارے رابطے میرے لوگوں میں ہو سکتے ہیں تو جگو دادا تمہارے ہاں میرے رابطے نہیں ہو سکتے۔ چند لوگوں کی مبہم اطلاع پر تم نے اتنا بڑا رسک لے لیا، مجھے اغوا کرنے کا سوچا تم لوگوں نے۔ اب بھگتنا تو پڑے گا نا۔''

''پرتاب سنگھ، لاشیں بولتی نہیں ہیں۔ سوچو کچھ دیر بعد تم بولنے کے قابل نہیں رہو گے۔'' جگو دادا نے پسٹل نکالتے ہوئے کہا۔

''نہ میری جان نہ، میرے مرنے یا نہ مرنے سے اب کوئی فرق نہیں پڑنے والا، فرق تو یہ پڑتا ہے کہ تم ملک کے لیے غدار ہو چکے ہو۔ تم نے ایک دشمن ملک کے بندے کو پناہ دے رکھی ہے۔ یہ ویر سنگھ نہیں ہے، بلکہ ایک مسلمان خفیہ ایجنٹ ہے۔ جسے مارنا اب مجھ پر فرض ہو چکا ہے۔ میں مر بھی گیا تو کوئی بات نہیں لیکن میرے مرنے کے بعد تم اور رانی بھاگ وتی غدار کہلاؤ گے اس کی سزا تو تم لوگوں کو ملے گی۔''

''تم بکواس کر رہے ہو؟'' جگو دادا نے کہا۔

''نہیں، میں بکواس نہیں کر رہا، بلکہ تم غدار بننے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اس وقت رانی بھاگ وتی کو بھی پکڑ لیا ہو گا۔ ہاں تم اگر بچنا چاہتے ہو تو اسے باہر آئے لوگوں کے حوالے کر دو، بچ جاؤ گے، یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔'' پرتاب سنگھ نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو میں نے جگو دادا کے چہرے پر پسینہ اُترتے ہوئے دیکھا۔ اس نے سوچتے ہوئے میری جانب یوں دیکھا جیسے تذبذب کی کیفیت میں ہو۔ تب پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میں کہاں پر غلطی کر گیا ہوں کہ یہ لوگ مجھ تک آن پہنچے ہیں۔ میرے سامنے پرتاب سنگھ کھڑا مسکرا رہا تھا اور جگو دادا کی سوچ وہی تھی جس کے بارے میں اسے میں نے سمجھایا تھا کہ لوگ طاقت کی طرف جھک جاتے ہیں۔

حالات کی تند و تیز آندھیوں کی زد میں آجانے والے نوجوان کی سنسنی خیز داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ پڑھیے

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

جھوٹا

سرور اکرام

کہتے ہیں کہ جھوٹ کی نائو نہیں ہوتی... یعنی ایسی باتیں جس کی کوئی بنیاد نہ ہو... مگر یہ بھی ایک فن ہے... کاریگری ہے لفظوں کی... وہ صاحب بھی ایسی بے بنیاد باتیں کرنے میں کمالِ فن رکھتے تھے... سننے والا سنتا اور حیرت زدہ رہ جاتا... اور پھر اپنا سر تھام لیتا...

اس جھوٹے کا فسانہ ہوٹل کی چائی میں کھرا تھا...

چائے کے ہوٹل میں معمول کے مطابق رش تھا۔ دن بھر یہ ہوٹل عام طور پر ویران ہی رہتا تھا۔ بس کبھی کبھی کوئی چائے پینے کے لیے آجاتا۔ ورنہ شام ہوتے ہی لوگوں کا رش بڑھنا شروع ہو جاتا۔ ہوٹل والوں کو ایک فائدہ یہ ملا تھا کہ ہوٹل کے سامنے ہی ایک پارک تھا۔ جو بھی پُر رونق رہا ہوگا لیکن اب ہر طرف ویرانی تھی۔

ہوٹل کی کرسیاں اسی پارک کے ایک حصے پر لگا دی جاتی تھیں۔ بلب روشن ہو جاتے اور رات گئے تک ہوٹل میں

لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا۔ اس ہوٹل میں ایک کردار بہت دلچسپ تھا۔

امیر خان۔ بے چارے غریب آدمی تھے لیکن نام کے امیر تھے۔

ایک بار میں اس ہوٹل میں بیٹھا تھا کہ امیر خان ہوٹل میں داخل ہوئے اور مجھے دیکھ کر میرے قریب چلے آئے۔

''ارے بھائی وسیم صاحب، میں تو خدا سے دعا کر رہا تھا کہ کوئی سمجھدار آدمی مل جائے۔ تو اسے اپنی کہانی سناؤں۔''

''آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں سمجھدار آدمی ہوں؟'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ارے بھائی۔ کیوں کسرِ نفسی سے کام لے رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کہانیاں لکھتے ہیں اور معاشرے میں آپ کی ایک ساکھ ہے۔''

''چلیں ٹھیک ہے۔ فرمائیں۔ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''بھائی! تم میرا مذاق تو نہیں اڑاؤ گے؟'' امیر خان نے پوچھا۔

''ارے نہیں جناب، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''تم نے نیلم پری کا نام سنا ہے؟'' امیر خان نے رازداری سے پوچھا۔

میں نے مسکرانا چاہا۔ تاہم خاموشی سے صرف ان کو دیکھتا رہا۔

''بتاؤ کیا آپ نے نیلم پری کا نام سنا ہے؟''

''کئی بار۔ داستانوں میں کہانیوں میں کئی بار سُن چکا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''بات یہ ہے بھائی کہ وہ نیلم پری کئی بار میرے پاس آچکی ہے۔ کل رات بھی آئی تھی۔''

اس بار میں پہلو بدل کر رہ گیا۔ ان کی دماغی صحت پر شبہ ہونے لگا تھا۔ میں نے پھر بھی دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''اجی امیر صاحب۔ کیا کہہ رہی تھی وہ؟''

''بھائی میں جانتا تھا آپ کو یقین نہیں آئے گا۔''

''ایسی بات نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے۔ کیونکہ میں کہانیاں لکھتا ہوں۔ واقعات کی ایک زنجیر ہے میرے پاس۔ اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہے۔''

''خدا آپ کا بھلا کرے اسی لیے تو میں آپ کی تلاش میں تھا۔''

''اب بتائیں۔ وہ کس طرح آتی ہے آپ کے پاس۔'' میں نے استفسار کیا۔

''بھائی۔ میری عادت ہے کہ میں عام طور پر کھڑکی کھلی رکھ کر سوتا ہوں۔'' امیر خان نے کہا۔ ''اس رات بھی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ میں جاگ رہا تھا کہ اچانک کھڑکی پر کوئی نمودار ہوا یقین کریں ایسے لگا جیسے کھڑکی سے چاند نکل رہا ہو۔ وہ ازلی ہوئی کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہوئی۔ میں خوف زدہ تو تھا لیکن اس کے حسن کے سحر میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اتنا حسن کہ پورے کمرے میں روشنی سی پھیل گئی تھی۔ اس نے میرے پاس آکر کہا۔ ''پریشان مت ہو۔ میں کوئی نقصان پہنچانے نہیں آئی۔''

میں نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ ''تو..... تم کون ہو؟''

اس نے کہا۔ ''تم نے میرا نام سنا ہوگا۔ میں نیلم پری ہوں۔''

میرے تو ہوش اڑ گئے۔ نیلم پری کا نام تو بچپن سے سنتا چلا آرہا تھا۔ دادی اماں سنایا کرتی تھیں کہ نیلم پری کوہ قاف کی سب سے خوبصورت پری ہے اور وہی پری اس وقت میرے کمرے میں میرے سامنے موجود تھی۔''

امیر خان نے مجھے نیلم پری کے بارے میں بہت کچھ بتایا اور میں سنتا رہا۔

میں ان کی پریشانی سمجھ چکا تھا۔ اس بیماری کو مالیخولیا کہتے ہیں۔ اس میں اسی قسم کے مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ وہ ایک نفسیاتی مریض تھے۔ میں نے ان کے بارے میں محلے کے ایک آدمی سے دریافت کیا تو وہ ہنس پڑا۔ ''بھائی کیا تم کو بھی کوئی کہانی سنادی؟''

''تم کو بھی سے کیا مطلب؟ کیا وہ اس قسم کی کہانی سناتے رہتے ہیں؟''

''ارے بھائی۔ وہ ایک نمبر کے جھوٹے انسان ہیں۔ ایسی ایسی گپیں ہانکتے ہیں کہ کچھ مت پوچھو۔ تم کو کیا بتاؤں۔ دنیا بھر کے اخبارات میں آتا رہتا ہے کہ فلاں نے ہمالیہ سر کر لیا۔ فلاں ہمالیہ کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ ہر جگہ اس کی تعریف ہوتی ہے۔ اس کو انعامات دیے جاتے ہیں۔ کیا کسی نے آج تک دنیا کو میرے بارے میں بھی بتایا؟''

''کیوں خان صاحب۔ کیا آپ نے بھی ہمالیہ سر کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''دو بار۔ امیر خان نے بتایا۔ ''اور وہ بھی بغیر کسی سلنڈر کے۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہاں تو بغیر آکسیجن سلنڈر کے رہ نہیں سکتے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' امیر خان نے کہا۔ ''اس کا مجھے اندازہ تھا اسی لیے میں اپنے پھیپھڑوں میں اتنی آکسیجن

www.pakistanipoint.com

ذخیرہ کر کے اوپر گیا تھا۔"

"خان صاحب! یہ تو ناممکن ہے۔ اتنی آکسیجن کا ذخیرہ کیسے کیا ہوگا؟"

"بھائی تم نے حبسِ دم کے بارے میں کچھ سنا ہے؟"

"جی ہاں سانس روکنے کی مشقیں۔"

"خدا تمہارا بھلا کرے، بالکل وہی۔ مجھے اس کی پریکٹس رہی ہے۔ چار چار گھنٹوں تک سانسیں روک لیتا تھا۔"

"چلیں۔ کیا ہمالیہ پر بھی اس کا تجربہ کیا؟"

"وہی تو بتا رہا ہوں بھائی۔ چار گھنٹوں کے لیے سانسیں روک کر اوپر چلا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ذخیرہ بھی کر لیتا تھا۔ اوپر جا کر جب اسٹاک ختم ہو جاتا اور ضرورت پڑتی تو دوبارہ نیچے آ کر ایک بار بھی چار گھنٹوں کا اسٹاک کر کے چلا جاتا تھا۔"

"اب آپ خود ہی اندازہ لگا لیں کہ وہ کس معیار کے جھوٹے انسان ہیں۔"

"کمال کے آدمی ہیں۔"

"ایسے ویسے۔ ان کے دو بیٹے ہیں۔ دونوں بہت معقول پڑھے لکھے لڑکے ہیں۔ بہت اچھی جاب کرتے ہیں لیکن وہ بھی اپنے باپ کی ان باتوں کی وجہ سے شرمندہ رہتے ہیں۔"

"ظاہر ہے ان بے چاروں کو شرمندہ تو ہونا ہی ہے۔"

"محلے والے ان کے سامنے تو کچھ نہیں کہتے لیکن ان کی غیر موجودگی میں ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ اسی لیے بھائی جب وہ کچھ کہنے لگیں تو چپ چاپ سنتے رہیں۔ کسی بات پر ٹوکیں نہیں۔ ورنہ وہ ناراض بھی ہو جاتے ہیں۔"

اس دن مجھے امیر خان صاحب کی عادت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ یہ بھی ایک طرح کا مرض ہی ہے۔ اصل میں جو چیز بھی اعتدال سے آگے نکل جائے وہ بیماری بن جاتی ہے۔ میرے ایک دوست تھے۔ پرفیسر شمیم۔

وہ ایک کالج میں نفسیات پڑھایا کرتے تھے۔ ایک دن میں ان کے پاس ان کے کالج پہنچ گیا۔ اس دن ان کے دو پیریڈ تھے۔ وہ لیکچر دے کر فارغ ہو چکے تھے۔

وہ مجھے اسٹاف روم میں لے آئے۔ "ہاں بھائی۔ آج اس طرف کیسے راستہ بھول آئے؟"

"شمیم بھائی! میں ایک کیس لے کر ... آیا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اوہو۔ اب تم کو بھی کیس ملنے لگے؟"

"یار سنجیدہ ہو کر بات سنو۔" میں نے کہا۔ "میرے محلے کے ایک بندے کا کیس ہے۔"

"تمہارے نئے محلے کا؟"

"ہاں، نئے محلے کا۔" میں نے بتایا۔

"اب میں ایک بات بتاؤں۔ تم خود بھی ایک کیس بن چکے ہو۔ جب دیکھو۔ محلہ بدلتے رہتے ہو۔ اور ہر محلے میں کوئی کردار تمہارے سامنے آ جاتا ہے اور تم ان کی کہانیاں لکھنے بیٹھ جاتے ہو۔"

"ارے ایسے اتفاق ہی سمجھ لو۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس قسم کا اتفاق بھی ان ہی کے ساتھ پیش آتا ہے جو جستجو میں رہتے ہیں۔ ہر ایک کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا۔"

"یہ تو ہے۔ خیر اب بتاؤ۔ اب کون سا کردار تمہارے سامنے آیا ہے؟"

میں نے انہیں امیر خان کے بارے میں بتا دیا۔

"دلچسپ۔" وہ مسکرا دیے۔ "ویسے یہ ایک عام سا کیس ہے۔ اس قسم کے لوگ اپنے خیالوں کی دنیا میں رہتے ہیں۔ ان کے سامنے مناظر نمودار ہوتے ہیں اور وہ ان کو سچ سمجھنے لگتے ہیں۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔"

میں اور کچھ دیر تک شمیم صاحب کے ساتھ بیٹھا رہا۔ ہمارے درمیان مختلف باتیں ہوتی رہیں۔ پھر میں ان سے

خدمت

ایک متمول شخص صحت یاب ہونے کے بعد اسپتال سے رخصت ہونے لگا تو وہاں کے خدمت گار سلام کرنے اور انعام پانے کے لیے اکٹھے ہو گئے۔ اس نے ہر ایک کو انعام دیا مگر چار ایسے آدمی تھے جو باقی رہ گئے۔ جنہیں اس نے دیکھا تک نہیں۔ اس نے کہا۔ "آپ چاروں نے میری کوئی خدمت نہیں کی تو پھر انعام کیسا؟"

انہوں نے کہا۔ "سرکار نے موقع ہی نہیں دیا ہم تو ہر وقت حاضر تھے۔"

پوچھا۔ "وہ کیونکر؟"

"سرکار ہمارے ذمے مرنے والوں کی لاشوں کو ٹھکانے لگانا ہے۔" انہوں نے منہ بسورتے ہوئے جواب دیا۔

ساہیوال سے احمد علی کا جواب

www.pakistanipoint.com
Waqar Azeem

اجازت لے کر واپس آ گیا۔ چلتے ہوئے انہوں نے ایک بات کی۔ ”بھائی! میں ایک بار اس بندے سے ملنا چاہتا ہوں۔ ایسے لوگ ذرا کم ہی ملتے ہیں۔“

میں واپس آ گیا۔ دوسرے دن پھر امیر خان سے ملاقات ہوئی۔ اس بار ایک نئی کہانی ان کے پاس تھی۔ ”بھائی! آپ بھی کہتے ہوگے کہ کیا پاگل بندہ ہے۔ کیسی کیسی باتیں کیا کرتا ہے لیکن کیا کروں کس کو یقین دلاؤں۔“

”ارے نہیں خان صاحب۔ میں آپ پر یقین کرتا ہوں۔ کیونکہ میں ایک مختلف انسان ہوں۔“

”یہ بات ہوئی نا۔ اسی لیے تو میں آپ کو اتنی راز کی بات بتاتا ہوں۔“

”کیا پھر کوئی بات ہوگئی؟“ میں نے پوچھا۔

”یار! وہی نیلم پری والا معاملہ ہے۔“

”اب کیا ہوگیا؟“

”یار کیا بتاؤں۔ بتاتے ہوئے بھی عجیب سا لگ رہا ہے کہ کیسا آدمی ہے۔ جو اس قسم کی کہانیاں سنا رہا ہے۔“

”نہیں نہیں، بتائیں کیا بات ہے؟“

”بھائی! کل رات تو عجیب بات ہوئی۔ نیلم پری پھر میرے پاس آئی تھی لیکن اس بار وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ اس کی دوست بھی تھی۔ جس کا نام اس نے سبز پری بتایا تھا۔ وہ بھی اتنی ہی خوبصورت تھی۔ جتنی نیلم پری تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ دونوں مجھے تحفے میں دی گئی ہیں۔“

”یعنی دونوں آپ کی ہوگئیں؟“

”ہاں بھائی میں یہی تو بتا رہا ہوں۔“ امیر خان نے کہا۔ ”اتنا ہی نہیں...... بلکہ اس نے کہا کہ وہ میرے لیے ایک جوڑا بھی لے کر آئی ہیں۔“

”کیسا جوڑا؟“

”یار ویسا ہی جیسا دولھا کو پہنایا جاتا ہے۔“ امیر خان نے بتایا۔ ”لیکن بہت خوبصورت اور شاندار بنا ہوا۔ کیا بتاؤں۔ اس جوڑے کو پہن کر مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں کسی ملک کا شہزادہ ہوگیا ہوں۔ کیا شان تھی میری۔“

میں حیرت سے امیر خان کو دیکھتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ اب ان کے دورے کی نوعیت اور شدید ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ایک ایسی کہانی سنا رہے تھے۔ جو شہزادہ افراسیاب وغیرہ کے دور کی تھی۔ یا تو انہوں نے الف لیلہ کی کہانیاں پڑھ لی تھیں اور ان کہانیوں کے ٹرانس میں آ گئے تھے۔ یا پھر بُری طرح مالیخولیا کے مریض ہوگئے تھے۔

میں نے انہیں ایک مشورہ دیا۔ ”خان صاحب۔ اگر میں کچھ کہوں تو آپ بُرا تو نہیں مانیں گے؟“

”نہیں بھائی۔ آپ ہی اس محلے میں ایک معقول آدمی معلوم ہوتے ہو۔ اسی لیے آپ کو سنایا کرتا ہوں۔ بتائیں۔ کیا مشورہ ہے؟“

”آپ مجھے تو سنا رہے ہیں۔ کیونکہ میں یہ سب جانتا ہوں۔ لیکن کسی اور کو مت بتائیے گا۔“

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“ امیر خان نے کہا۔ ”مجھ میں اب عقل آ گئی ہے۔ کیونکہ مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ لوگ مجھے جھوٹا سمجھنے لگے ہیں۔ حالانکہ میں سچ کے سوا کچھ نہیں بولتا۔“

”میں نے تو سنا ہے کہ آپ نے ہمالیہ پہاڑ سر کر لیا تھا؟“

”ارے بھائی۔ یہ سب چھوٹی موٹی باتیں ہیں۔ اب ان کا ڈھنڈورا کیا پیٹنا۔“

میں اپنا سر تھام کر رہ گیا۔

ہر دن ان کے لیے ایک نئی کہانی کا تھا۔ میں ان کے بیٹوں کو نہیں جانتا تھا لیکن ایک دن ان میں سے ایک سے ملاقات ہوگئی۔ اس کا نام صفدر تھا۔ میں نے جب اپنا تعارف کروایا تو وہ کہنے لگا۔ ”جناب۔ آپ کی تو تلاش تھی مجھے۔ لیکن فرصت ہی نہیں مل رہی تھی۔“

”خیریت، آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”والد صاحب آپ کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔“

”کیا کہتے ہیں میرے بارے میں؟“

”آپ کی تعریف کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس محلے میں ایک آپ ہی ہیں جو ان کو سمجھ سکتے ہیں اور ان کو جھوٹا نہیں سمجھتے۔ ورنہ یہاں تو ہر بندہ ان کا مذاق اڑایا کرتا ہے۔“

”جاہل لوگ ہیں۔ انہیں انسان کی ذہنی دشواریوں کا اندازہ ہی نہیں ہے۔“

”آپ بتائیں۔ کیا ہوا ہے والد صاحب کو؟ وہ کیوں ایسی باتیں کرنے لگے ہیں؟“

”کچھ بھی نہیں۔ یہ ایک نفسیاتی مرض ہے۔ اس میں طرح طرح کے خواب دکھائی دیتے ہیں۔ آوازیں سنائی دیتی ہیں۔“

”تو اس کا کوئی علاج نہیں ہے؟“ اس نے پوچھا۔ وہ بے چارہ بہت متفکر دکھائی دے رہا تھا۔

”کیوں نہیں۔ کسی ماہر سائیکاٹرسٹ سے رجوع کرو۔ وہ ٹھیک کردے گا۔“

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

''لیکن ہمارا تو کوئی ایسا جان پہچان والا نہیں ہے۔''

''میں اپنے دوست سے بات کروں گا۔ وہ ماہر نفسیات ہیں۔'' میں نے بتایا۔

☆☆☆

اسی محلے میں ایک بیوہ عورت رہتی تھی۔ بہت غربت کے دن گزار رہی تھی۔ اس کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ محلے کے کچھ گھروں نے اس کے لیے وظیفہ سا مقرر کر رکھا تھا۔ ہر مہینے وہ لوگ اسے کچھ پیسے دے دیتے تھے۔ جس سے اس کی گزر بسر ہو رہی تھی۔

اس کے بارے میں سنا تھا کہ کبھی اس نے اچھے دن بھی دیکھے تھے۔ اس کا شوہر کسی فرم میں کام کرتا تھا پھر اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اس عورت پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ گئے تھے۔ آمدنی کا کوئی وسیلہ نہیں تھا۔ دو بچے بھی تھے۔ ایک دس سال کا ہوگا۔ دوسرا آٹھ سال کا تھا۔ دونوں اسکول جاتے تھے۔

میں نے ان دونوں کو دیکھ رکھا تھا۔ دونوں ہی بہت پیارے بچے تھے۔ خود اس عورت کی کیفیت یہ تھی کہ پورا محلہ اس کی عزت کرتا تھا۔ وہ ایک پڑھی لکھی عورت تھی۔ بس تقدیر کی گردش میں آ گئی تھی۔ ورنہ اس کے دن بہت اچھے گزر رہے تھے۔

وہ بچوں کو خود بھی گھر پر پڑھایا کرتی تھی۔ کچھ بچے جمع ہو گئے تھے۔ وہ ان کو اپنے شوق میں پڑھایا کرتی۔ ہو سکتا ہے کہ ان بچوں کے والدین اسے کچھ دے بھی دیتے ہوں لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔

یہ اچھا تھا کہ اس کا مکان اپنا تھا۔ ورنہ اور نہ جانے کتنی دشواریاں ہو جاتیں۔

وہ میری بہت عزت کرتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ میں لکھنے پڑھنے سے تعلق رکھتا ہوں۔ وہ میرے گھر بھی آیا کرتی۔ میری بیوی زہرہ اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ کچھ نہ کچھ بچوں کے لیے دے دیا کرتی۔

ایک دن میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ وہ اس عورت کو ہر مہینے تین ہزار دے دیا کرے۔ جس طرح محلے کے دوسرے گھروں نے باندھ رکھا ہے۔

''کیا آپ جانتے ہیں کہ وہ ان پیسوں کے بدلے ان گھروں کو کیا دیتی ہے؟ بہت ہی خوددار قسم کی عورت ہے۔ یک تو ان گھروں کے بچوں کو پڑھا دیتی ہے۔ اس کے علاوہ ن کے گھروں کے درجنوں کام بھی کر دیتی ہے۔ ہر پریشانی بس ان کے ساتھ کھڑی ہوتی ہے۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ چلو پھر بھی اس سے بات کر کے دیکھ لو۔ اب ہمارے پاس بچے تو ہیں نہیں کہ جن کو پڑھوانے بھیجیں۔''

ایک دن اس محلے میں اچانک شور شروع ہو گیا۔

میں بھی گھبرا کر گھر سے باہر آ گیا۔ ایک حادثہ ہو گیا تھا۔

محلے کے بہت سے لوگ جمع تھے۔ پتا چلا کہ اس عورت کا ایک بچہ بجری کے ٹرک کے سامنے آنے والا تھا کہ اچانک کسی فرشتے کی طرح امیر خان نے جھپٹ کر اس بچے کو بچا لیا۔

بچے کی جان تو بچ گئی لیکن خود امیر خان بچ نہیں سکے۔ وہ ہلاک ہو گئے۔ ان کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے لے گئے ہیں۔

محلے میں ایک کہرام سا برپا تھا۔ امیر خان ایک مقبول شخص تھے۔ ان کا جھوٹ ایک طرف مگر لوگ ان سے باتیں کرنا اور ان کی باتیں سننا پسند کرتے تھے۔

امیر خان نے اس بچے کی جان بچا کر ایک مثال قائم کر دی تھی۔

میں اس دن اپنے دفتر بھی نہیں جا سکا۔ محلے والے سب امیر خان کے گھر کے باہر جمع تھے۔ ایک ٹینٹ لگا دیا گیا تھا۔ میں نے اس عورت کو بھی دیکھا۔ جس کے بچے کو بچاتے ہوئے امیر خان نے اپنی جان دے دی تھی۔

اس کے جو تاثرات تھے، اس کے بارے میں کیا کہا جائے۔ وہ رو رہی تھی۔ ایک تو اس کے آنسو بچے کی جان بچ جانے کی شکر گزاری میں تھے اور دوسری طرف امیر خان کی موت پر رو رہی تھی۔

تین بجے کے قریب امیر خان کی لاش اسپتال سے واپس آ گئی تھی۔

محلے کی مسجد میں ان کی نماز ادا کی گئی۔ میں نے بھی ان کا چہرہ دیکھا۔ میں نے بہت کم ایسے چہرے دیکھے ہوں گے۔ کیسا اطمینان تھا ان کے چہرے پر۔ میں نے ان کے پاس جا کر دھیرے سے کہا۔ ''خان صاحب۔ مبارک ہو۔ آپ کا چہرہ یہ بتا رہا ہے کہ نیلم پری اور سبز پری آپ کے پاس ہی کھڑی ہیں۔ خان صاحب۔ آپ چاہیں زندگی بھر جھوٹ بولتے رہے ہوں لیکن یہ نیلم پری اور سبز پری کی داستان جھوٹ نہیں تھی۔ مبارک ہو خان صاحب۔ مبارک ہو۔''

میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکا۔ ان کے مطمئن چہرے کو دیکھتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔

❖❖❖

www.pakistanipoint.com

سازش

طاہر جاوید مغل

سازشوں کے جال بُننے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ جال بوسیدہ ہو کے کھل بھی جاتے ہیں... وقت کے ساتھ جال کی گرہیں بالآخر ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتی ہیں... ایسے ہی سازشی فریب کاروں کی [illegible] کاری... وہ دردِدل سے آشنا تھے... ایک بیوہ عورت کی بےچارگی... مفلوک الحالی اور شناسائی کی آڑمیں پلنے والے انتقام کی منصوبہ سازی...

جانے پہچانے کرداروں کے معمولات...... بیتے ہوئے خوشگوار لمحوں کی سوغات......

سخت سردی تھی۔ ہلکی بارش بھی ہو رہی تھی۔ موسم سرما میں چند روز تو ایسے ضرور آتے ہیں جب سورج مسلسل اپنی شکل گم رکھتا ہے اور وسطی پنجاب کے لوگ گھروں میں دبکے رہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ وہی دن تھے۔ میں عمران ''ٹو'' کے ساتھ اندرونی شہر کے اسی مکان میں موجود تھا جہاں اٹھارہ بیس سال پہلے ہماری محفلیں جما کرتی تھیں۔ لگتا تھا کہ وہی سہانے دن پھر سے لوٹ آئے ہیں۔ ایک شخص کے آنے سے سب کچھ ہی بدلا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

تین روز پہلے بھی میں اور عمران ''ٹو'' ایک ریسٹورنٹ میں اسی ارادے سے بیٹھے تھے کہ ایک دوسرے کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا سکیں لیکن تب مجھے اپنے ایک آفیسر کی طرف سے ضروری کال آ گئی تھی اور ہماری نشست بغیر کسی بات چیت کے اختتام پذیر ہو گئی تھی۔ آج یہ دوسری نشست عمران کے گھر میں طے ہوئی تھی۔ یہاں کا ہر ہر منظر وہی تھا جو عمران ون کے دور میں تھا۔ وہی گھر کی بے ترتیبی، وہی بے تکلف یاروں کا ہلاّ گلا، دروازے پر ہونے والی دستکوں کی نوعیت بھی وہی تھی جو سترہ اٹھارہ سال پہلے ہوا کرتی تھی۔ کبھی کوئی پڑوسی آکر ہانک لگا دیتا تھا۔ کبھی محلے کا کوئی دکان دار اپنے پہلے بچے کی مسلمانی کی خبر سناتے پہنچ جاتا تھا، کبھی کوئی بوڑھا، دروازے پر آکر ''عمران پُتر'' کا نعرہ لگاتا تھا اور اسے بتاتا تھا کہ محلے میں فلاں جگہ جھگڑا ہو گیا ہے، اسے بیچ بچاؤ کرانے کے لیے وہاں جانا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔

میں نے کہا۔ ''بھئی، یہ کام تو بڑا مشکل ہے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ ہم کہیں مچھلی منڈی میں جا کر بات چیت کر لیں۔''

وہ اسی دلکش انداز میں مسکرایا جس کی یادیں ابھی تک میرے دل و دماغ میں تازہ تھیں۔ اس نے اٹھ کر کمرے کے دروازے کو اندر سے بولٹ کر دیا۔ اس کے بعد اس نے اپنا موبائل فون بھی آف کر دیا اور میری طرف دیکھ کر حتمی انداز میں بولا۔ ''لو چاچا جانی! بس، اب ہم تم ہوں گے یا دل ہوگا...... یوں سمجھو کہ جنگل ہوگا۔ اب ہم صرف اپنے دکھ سکھ بولیں گے۔ اب آپ جناب فرمائیں کہ پہلے آپ کچھ کہیں گے یا میں اپنی بکواس شروع کروں؟'' میں نے اسے شروع کرنے کو کہا۔

اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر لمبی سانس لی اور جیسے ماضی کے دریچے میں جھانکنے لگا مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا بیرونی دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی کسی لڑکے کی باریک سی آواز آئی۔ ''ہیرو بھائی، دروازہ کھولیں۔ عزیز اجی آئے ہیں۔''

''اوہ خدایا۔'' عمران نے سر پکڑ لیا۔ اور مجھے ''سوری'' کہتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ان لمحوں میں مجھے اس کی آنکھوں میں وہی دردمندی کروٹ لیتی نظر آئی جو کبھی عمران کی آنکھوں میں نظر آیا کرتی تھی۔ وہ گلی کوچوں میں بسنے والے لوگوں کے چھوٹے بڑے مسائل میں گھرا رہتا تھا۔

کچھ ہی لمحوں بعد عمران ایک مرد اور عورت کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ دونوں ہی مقامی تھے اور متوسط طبقے سے لگتے تھے بلکہ عورت کی حالت زیادہ خراب لگ رہی تھی۔ بندہ دُبلا پتلا اور شریف صورت نظر آ رہا تھا۔ عمران نے تعارف کراتے ہوئے بتایا۔ ''یہ عزیز صاحب ہیں انہیں لوگ اپنائیت سے عزیز اجی کہتے ہیں۔ بازار میں ان کی چاولوں کی دکان ہے، تھوک اور پرچون دونوں بیچتے ہیں۔''

عورت کا تعارف عزیز اجی نے خود کرایا، بولے۔ ''یہ زلیخا بی بی ہے۔ میں نے اسے بہن بنا رکھا ہے۔ اس بے چاری کا شوہر کوئی دو سال پہلے فوت ہو گیا تھا۔ تین چھوٹے بچے ہیں۔ ان کا پیٹ بڑی مشکل سے پال رہی ہے۔ بیوگی کا دکھ ہی کچھ کم نہیں تھا اب اس بے چاری کے ساتھ اور بڑی ٹریجڈی ہو گئی

www.pakistanipoint.com

ہے۔ ''عزیز اجی کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

میں نے اس زلیخا نامی عورت کی طرف دیکھا۔ عمر بمشکل پینتیس سال رہی ہوگی۔ متوازن جسم کے سبب عمر سے کچھ چھوٹی نظر آتی تھی۔ اس نے اپنا نصف چہرہ چادر کے نقاب میں چھپا رکھا تھا۔ جتنا چہرہ نظر آ رہا تھا، وہ یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ وہ خاصی خوب صورت ہے۔

''باجی کا مسئلہ کیا ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

عزیز اجی نے میری طرف دیکھا اور پھر سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھنے لگا۔ وہ بولا۔ ''یہ اپنے چاچو جی ہیں۔ آپ کو جو بھی کہنا ہے ان کی موجودگی میں بلا جھجک کہہ سکتے ہیں۔''

عزیز اجی اور ان کی ساتھی خاتون دونوں متذبذب نظر آئے مگر جب عمران نے انہیں دوبارہ تسلی دی تو عزیز اجی نے اپنی زبان کھول دی۔ ''ہیرو بیٹا! علاقے میں لوگ تمہاری بات مانتے ہیں اور تمہارے کہے کو اہمیت دیتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم اس بے چاری کی کچھ نہ کچھ مدد ضرور کر سکتے ہو۔''

عمران نے وضاحت چاہی۔ بڑی مشکل سے عزیز اجی نے اپنی بات کو آگے بڑھایا۔ ''ہیرو بیٹا! یہ کمیسوں صدی ہے۔ سائنس اور انٹرنیٹ کا زمانہ ہے اور یہ کوئی گاؤں بھی نہیں ہے، لاہور شہر ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہاں بھی لوگ اس انداز سے، ایسے ڈھنگ سے سوچ سکتے ہیں۔'' انہوں نے چند لمحے توقف کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ ''اکیلا کفیل موت کے منہ میں چلا گیا ہے۔ فیکٹری میں کام کرتا تھا، وہیں ایک حادثے میں جان چلی گئی۔ یہ تو اللہ نے اس بے چاری کی سنی کچھ مقامی ناظم نے بھی کوشش کی اور فیکٹری مالکان کی طرف سے شوہر کی جان کا معاوضہ اس بے چاری کو بیس لاکھ روپیہ مل گیا۔ اس کو میں نے ہی یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنا خستہ حال گھر گرا کر اس پر اچھی سی تعمیر کر لے، اوپر نیچے چار پانچ چھوٹے پورشن بنا لے اور انہیں کرائے پر چڑھا دے..... اس نے یہ سب کچھ کیا۔ جتنا ہو سکا میں نے بھی اس کا ہاتھ بٹایا۔ خدا خدا کر کے گھر بنا مگر.....'' اس کے چہرے پر تاسف کے سائے لہرا گئے۔ زلیخا کی حسین آنکھوں میں بھی آنسو جھلملانے لگے تھے۔

اس کے بعد عزیز اجی نے جو کچھ بتایا، اس سے انکشاف ہوا کہ..... علاقے میں مشہور ہو گیا ہے کہ اس گھر پر سایہ ہے۔ پہلے کچھ لوگ یہ باتیں کرتے تھے مگر اب یہ بات پورے علاقے میں پھیلتی چلی جا رہی ہے۔

اس موقع پر عمران نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں..... اڑتی اڑتی سی یہ بات تو میں نے بھی سنی تھی کہ شیراز کالونی والی گلی میں کسی گھر کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں ہو رہی ہیں..... دو تین

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

مہینے پہلے دو مزدور بھی مر گئے تھے وہاں؟‘‘

’’وہ نہیں ہیرو بھائی ایک مرا تھا۔‘‘ عورت نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ’’وہ بھی کوئی چرسی تھا۔ زیادہ نشے کی وجہ سے جان گئی تھی اس کی..... اس کے کچھ ہی دنوں بعد باتیں نکلنا شروع ہو گئیں اور پھر نکلتی چلی گئیں۔‘‘ اس کی آواز بھرا گئی۔ سسک کر بولی۔ ’’یہ سب کچھ کوئی جان بوجھ کے کر رہا ہے۔ کسی کی شرارت ہے اس کے پیچھے۔ مجھ غریب سے اور میرے بچوں سے..... ہمارا یہ آخری آسرا بھی چھینا جا رہا ہے۔‘‘

اس بیوہ والا معاملہ واقعی افسوسناک تھا۔ عمران بھی سنجیدہ نظر آ رہا تھا، بولا۔ ’’باجی! مجھے بتائیں میں اس سلسلے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔‘‘

زلیخا کے بجائے عزیز اجی نے کہا۔ ’’میں نے کہا ہے نا، لوگ تمہاری بات کو.....‘‘

’’مگر تایا جی! یہ ٹیٹوا اور طرح کا ہے۔‘‘ عمران نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ’’ایسی باتوں کو پر لگ جاتے ہیں۔ آسانی کے ساتھ دلوں سے نکلتیں نہیں۔‘‘

زلیخا نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا تھا۔ اس کے ہاتھ کانپتے جا رہے تھے۔ اس کی حالت دیکھ کر عمران نے اسے تسلی تشفی دی اور اس سے کہا کہ وہ اسے سوچنے کے لیے تھوڑا سا وقت دیں۔ وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔

ہلکی بارش ابھی تک جاری تھی۔ وہ دونوں جس طرح بھیگتے ہوئے آئے تھے اسی طرح بھیگتے ہوئے واپس چلے گئے۔

☆☆☆

یہ اگلے روز کی بات ہے، میں گلبرگ میں واقع اپنی رہائش گاہ پر موجود تھا۔ دسمبر بھیگا ہوا تھا اور ایک عجیب سی اُداسی دل میں گھر کیے ہوئے تھی۔ کل عمران کے گھر میں رات کے کھانے کے بعد ہی مجھے اور عمران کو کچھ تنہائی ملی تھی۔ عمران یعنی عمران ٹو نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، اس سے کچھ اہم اور نہایت سنسنی خیز انکشافات ہوئے تھے۔ میں ابھی تک ان انکشافات پر سو فیصد یقین تو نہیں کر پایا تھا لیکن دل گواہی دے رہا تھا کہ عمران ٹو یا عمران جونیئر جو کچھ کہہ رہا ہے، وہ بہت حد تک درست ہے۔

فوج چھوڑنے کے بعد جن دنوں عمران (عمران دانش) نے ذاتی حیثیت سے انڈیا میں آمد و رفت شروع کی تھی اور اپنی والدہ کی موت کا بدلہ چکانے کے لیے بھارتی جیل خانہ جات کے افسران کو گنگی کا ناچ نچانا شروع کیا تھا، انہی دنوں اس کو ایک ناگہانی صورتِ حال میں ایک ناگزیر کام کرنا پڑا تھا اور وہ کام تھا ایک مسلم لڑکی افشاں سے نکاح۔ یہ نکاح جھانسی کے شہر میں ہوا تھا۔ افشاں سے ایک بیٹا پیدا ہوا تھا اور عمران ہی کی خواہش پر اس کا نام عمران رکھا گیا تھا۔ بظاہر یہ عجیب لگتا تھا مگر اس کا کون سا ایسا کام تھا جو عجیب نہیں ہوتا تھا جب عمران اپنے آخری سفر پر انڈیا گیا اس کے بیٹے عمران کی عمر قریباً سات برس تھی۔ تب اس نے ایک سربمہر خط اس کی والدہ افشاں کو دیا تھا اور اس سے ایک وعدہ لیا تھا۔ اس وعدے کی نوعیت سے یوں ظاہر ہوتا تھا کہ عمران کو اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کی زندگی اب زیادہ طویل نہیں ہے۔ اس نے افشاں سے کہا تھا کہ وہ اس خط کو اسی صورت میں کھولے گی کہ وہ زندہ نہ رہے۔ یہ سب کچھ داستانی لگتا ہے لیکن وہ خود بھی تو سراپا ایک داستان ہی تھا..... اور پھر وہ واقعی داستان بن گیا تھا۔ قریباً دو ماہ بعد ہمارے ساتھ انڈیا کے شہر رتنا گری سے واپس پاکستان کی طرف آتے ہوئے وہ بارڈر کے قریب شدید زخمی ہوا تھا اور پھر اپنے ہزاروں مداحوں کو اشک بار چھوڑ کر منوں مٹی کے نیچے چلا گیا تھا۔ قریباً پندرہ سال پہلے کے وہ سارے واقعات ہمیشہ کے لیے میرے دل و دماغ پر نقش ہو چکے تھے۔ اپنی بیوی افشاں کو دیے جانے والے طویل خط میں عمران دانش نے جہاں اور بہت کچھ لکھا تھا، وہاں اپنی ایک دلی تمنا بھی ظاہر کی تھی۔ اس نے ایک جگہ لکھا تھا..... میرا دل پاکستان کے شہر لاہور کے ساتھ دھڑکتا ہے۔ میری زندگی کا بیشتر حصہ لاہور کے گلی کوچوں میں گزرا ہے۔ وہاں میرے بہت سے رشتے دار ہیں۔ یہ شتے دار لاہور کی پُرپیچ گلیوں، گنجان بازاروں اور غریب آبادیوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ وسطی لاہور ان کا مرکز ہے۔ وہاں کے فٹ پاتھ، مارکیٹوں کے برآمدے اور کچے پکے گھر ان کا مسکن ہیں۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو وہ مجھے بہت مس کریں گے اور شاید..... میں بھی بہت مس کروں گا۔ میری روح بے قرار رہے گی۔ افشاں میری آخری خواہشیں تو ایک سے زیادہ ہیں لیکن سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ میرا عمران جونیئر جب جوان ہو جائے تو اسے یہ سب کچھ بتانا..... اور میری طرف سے اس سے یہ درخواست کرنا کہ وہ ’’میرے لاہور‘‘ چلا جائے..... میرے اپنوں کے پاس، وہ ان کا کھوج لگائے..... اور ان کی وہ کمی پوری کرنے کی کوشش کرے جو میری جدائی کی صورت میں وہ محسوس کریں گے..... اور افشاں میرے عمران جونیئر کو اس شخص کے بارے میں بھی سب کچھ بتا دینا جو مجھے شہر لاہور میں سب سے زیادہ عزیز ہے اور تم بھی جانتی ہو وہ کون ہے؟ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ وہ ہمارے عمران جونیئر کو لاہور ہی میں کہیں ملے گا..... خدا اس کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

میں کل عمران یعنی عمران جونیئر کے پاس یہ طویل خط دیکھ چکا تھا اور کئی بار پڑھ بھی چکا تھا۔ رات کا بیشتر حصہ بھی میں نے جاگتے اور اس خط کے بارے میں سوچتے ہوئے ہی گزارا تھا۔ اس

www.pakistanipoint.com

خط کو پڑھنے اور عمران جونیئر سے ملنے کے بعد میرے اندر ایک عجیب سی ترنگ پیدا ہو گئی تھی۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ میرا عمران ایک نئے روپ میں میرے پاس لوٹ آیا ہے۔

سیل فون کی بیل نے مجھے خیالوں سے چونکایا، دوسری طرف عمران ہی تھا۔ چھوٹتے ہی بولا۔ ”چاچو ڈارلنگ، میں نے رات کو تمہارے مشورے پر بہت غور کیا ہے، اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ واقعی لوگوں کا خوف دور کرنے کا اس سے بہتر طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ خود اس گھر میں رہ کر دکھایا جائے اور یہ ثابت کیا جائے کہ وہاں ہوائی چیزوں کا کوئی عمل دخل نہیں ہے.....“

”تو ٹھیک ہے، عزیزا جی سے بات کرو نا اور ہمت کر کے دو چار دن وہاں رہ لو۔ ایک دو دوستوں کو بھی اپنے ساتھ رکھ لو۔“

”چاچو جانی مشورہ تم نے دیا ہے تو اب اس پر عمل بھی تمہارے ذریعے ہی ہووے گا۔ سچی بات یہ ہے کہ ان معاملوں میں، میں کچھ زیادہ بہادر نہیں ہوں۔ یہ نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔ میں مردہ حالت میں اسی جگہ پایا جاؤں جہاں وہ مزدور پایا گیا تھا اور رہی سہی کسر بھی نکل جائے۔ خوف سے انسان کو ہارٹ اٹیک کا ”دورہ“ بھی پڑ جاتا ہے، پچھلے ہی دنوں یہ بات مشہور لیڈی ڈاکٹر لتا منگیشکر نے بھی کہی تھی۔“

میں نے اسے بہت ٹالنا چاہا مگر ایک گھنٹے بعد وہ بنفسِ نفیس میری رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔ وہ مجھے لینے آیا تھا اور آیا بھی کس چیز پر تھا۔ ایک پرانے ماڈل کی کھٹارا بی ایم ڈبلیو موٹر سائیکل پر۔ بہت سی بھولی بسری یادیں وہ زندہ حالت میں اپنے ساتھ لیے پھرتا تھا۔ یہ موروثی عادات کا عمل دخل تھا، جینز کی کرشمہ کاری تھی یا پھر خون میں نسل در نسل چلنے والی مماثلت تھی۔ جب میں یہ سب کچھ دیکھتا تھا تو مجھے عمران اور عمران جونیئر (عمران ٹو) میں بہت کم فرق محسوس ہوتا تھا۔ اس کی چرب زبانی الامان تھی۔ وہ میری رہائش گاہ پر آیا تو پھر مجھے راضی کر کے ہی واپس گیا۔

پروگرام کے مطابق میں اگلے روز اندرونِ شہر اس کے گھر پہنچا۔ ہم دونوں کو مصیبت زدہ بیوہ زلیخا کے اس گھر میں چند روز قیام کرنا تھا جو بدقسمتی سے آسیب زدہ مشہور ہو گیا تھا۔ میں عمران کے پاس پہنچا تو وہاں پہلے سے محلے کی مسجد کے امام صاحب موجود تھے۔ وہ پختہ عمر کے تھے۔ ان کا نام قاری حمیداللہ معلوم ہوا۔ قاری حمیداللہ کو معلوم ہو چکا تھا کہ عمران چند روز، بیوہ زلیخا کے مکان میں رہنے کا ارادہ کیے ہوئے ہے۔

قاری حمید کے چہرے پر دردمندی کے آثار نظر آتے تھے اور وہ بڑے پُرخلوص انداز میں عمران کو سمجھا رہے تھے کہ وہ اس قسم کے ایڈونچر سے باز رہے۔ انہوں نے کہا۔ ”عمران جادو برحق ہے اور ہوائی چیزوں کے وجود سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا، اس گھر میں کچھ نہ کچھ انوکھا ہے ہی تو باتیں پھیلی ہیں نا۔ پہلے ایک مزدور کی جان گئی پھر گھر میں رنگ روغن کرنے والے کاریگر کو غشی کا دورہ پڑا اور وہ اسپتال پہنچ گیا۔ گھر کے دروازوں پر خون کے چھینٹے میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ پڑوسی کہتے ہیں کہ کبھی بھی گھر میں اچانک آگ بھی بھڑک اٹھتی ہے۔“

وہاں قاری حمید اور عمران کے پاس بیٹھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ قاری حمید سارا زورِ بیان اس بات پر صرف کر رہا ہے کہ اس گھر میں واقعی کوئی بات معمول سے ہٹ کر ہے اور عمران یا اس کے ساتھیوں کو وہاں رہائش رکھنے کا رسک ہرگز نہیں لینا چاہیے۔

عمران، قاری حمید سے اختلاف کرنے کے بجائے زور و شور سے اس کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ خوف بھی نظر آ رہا تھا۔ پتا نہیں کہ یہ اس کی اداکاری تھی یا وہ واقعی اس قسم کے حالات میں خود کو ایزی محسوس نہیں کرتا تھا۔ بہرحال اس کے ”پریشان ردِعمل“ سے یہ ضرور ہوا کہ قاری حمید زیادہ وثوق کے ساتھ اپنی بات پر زور دینے لگا۔ جوشِ خطابت میں اس نے ایک دو باتیں ایسی بھی کہہ دیں جو کسی صورت یقین کرنے والی نہیں تھیں اور اس کے سارے بیانیے کو کمزور کر رہی تھیں۔

اس نے ہاتھ میں تسبیح گھماتے ہوئے کہا۔ ”زلیخا بی بی کے گھر کے سامنے والا خالی پلاٹ جنات کا اکھاڑا ہے اور جنات کے بچے ہر روز فجر سے پہلے وہاں کسرت وغیرہ کرتے ہیں.....“

یہ بات اب واضح ہوتی چلی جا رہی تھی کہ قاری حمید، عمران کو اس گھر سے دور رکھنا چاہ رہا ہے۔ غالب گمان یہی تھا کہ اس میں اس کا کوئی مفاد وابستہ ہے اور یہ بھی عین ممکن تھا کہ اس نئے تعمیر شدہ گھر کے حوالے سے جو افواہیں پھیلی ہیں، ان کے پیچھے قاری حمید کا ہی ہاتھ ہو۔

اگلے چوبیس گھنٹے میں، میں نے پولیس کے ایک مقامی انفارمر (مخبر) کو حرکت دی اور اس نے مجھے آگاہ کیا کہ گھر کے حوالے سے افواہیں پھیلانے میں کافی سے زیادہ ہاتھ قاری حمید کا بھی ہے۔ اس نے اپنے طالب علموں کے ذریعے خون کے چھینٹوں والی بات بہت سے لوگوں تک پہنچائی ہے۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ قاری حمید نے عزیزا جی اور زلیخا بی بی سے کہا ہے کہ اس گھر میں اللہ کا کوئی خاص بندہ ہی رہائش رکھ سکتا ہے..... اور یہاں کے ”دلدر“ دور کر سکتا ہے۔ مزید برآں یہ پتا بھی چلا کہ قاری حمیداللہ کو خود بھی کافی عرصے سے ایک مستقل رہائش کا مسئلہ درپیش ہے اور وہ کوئی چھوٹا موٹا گھر خریدنے کا ارادہ بھی رکھتا ہے۔

اب کچھ باتیں واضح ہوتی جا رہی تھیں۔ اس گھر کے آسیب زدہ ہونے میں قاری حمید کا مفاد سامنے آ رہا تھا۔ میں

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

نے عمران سے کہا۔ ”اب کیا خیال ہے کیا کرنا چاہیے ہو؟“ ہم دونوں عمران کے گھر میں ہی بیٹھے تھے۔

وہ کسی صورت بنا کر بولا۔ ”سامنے نظر آنے والے دشمن کی بات اور ہے لیکن نادیدہ دشمن سے میری بڑی جان جاتی ہے۔“

”بکواس بند کرو۔ مجھے بتاؤ کہ اس گھر میں دو چار دن گزارنے کا ارادہ ہے یا نہیں؟ میری رائے پوچھو تو ہمیں ایسا کر لینا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ اس غریب عورت کا کوئی فائدہ ہو جائے۔“

”جو کافی خوب صورت بھی ہے۔“ عمران نے میری بات مکمل کی پھر میرے تاثرات دیکھے تو جلدی سے بات بدل کر بولا۔ ”چاچو، دل تو میرا بھی چاہتا ہے کہ اس کے لیے کچھ کیا جائے، پر پتا نہیں کیوں اب اس گھر کا سن کر میرے پیٹ کے اندر کچھ گھوں گھوں سا ہونا شروع ہو جاتا ہے..... لل..... لیکن اگر تم ساتھ ہو گے تو پھر..... میں بھی ہمت کر ہی لوں گا۔“

☆☆☆

اب اس معاملے میں مجھے بھی دلچسپی پیدا ہونے لگی تھی۔ قاری حمید کی باتوں نے مجھے بہت مایوس کیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ ایسے لوگ دوسروں کو نرا الو کا پٹھا سمجھتے ہیں۔ تیسرے روز میں اور عمران، زلیخا بی بی کے اس دو منزلہ مکان میں موجود تھے۔ یہاں مختلف دروازوں کے ساتھ تعویذ لٹکائے گئے تھے۔ ایک دو جگہوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں آگ بھڑکی ہے اور اسے بجھایا گیا ہے۔ ایک اونچی دیوار پر ابھی تک خون کے کچھ چھینٹے نظر آرہے تھے۔

گھر کے اندر دو چارپائیاں اور لحاف وغیرہ رکھ دیے گئے تھے۔ ایک الماری میں ہم دونوں کی ضروریات کا سامان تھا۔ وسطی کمرے میں ایک عام سے ٹی وی سیٹ کے علاوہ مٹی کی بڑی سی انگیٹھی اور خشک لکڑیاں موجود تھیں۔ ہم آگ جلا کر اس نوتعمیر شدہ ٹھنڈے ٹھار کمرے کو گرم رکھ سکتے تھے۔ بے شک یہ ایک گنجان علاقہ تھا مگر بدقسمت بیوہ کے اس بدقسمت گھر میں عجیب سی ویرانی تھی اور سناٹا سنسنا رہا تھا۔ کہتے ہیں کہ آسیب، قدیم اور پرانے گھروں میں ہوتے ہیں، یہاں معاملہ بالکل الٹ تھا۔ اس گھر میں تو ابھی باقاعدہ رہائش کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے دیکھا، گھر کے اس کمرے کو باقاعدہ مقفل کر دیا گیا تھا جہاں دو تین مہینے پہلے پُراسرار طور پر ایک مزدور کی موت واقع ہوئی تھی۔

سخت سردی اور بارش کا تسلسل آج، چوتھے، پانچویں روز بھی موجود تھا۔ رات گیارہ بجے کے بعد اردگرد بالکل خاموشی محسوس ہونے لگی۔ اس خاموشی میں بس بوندیں گرنے کی آواز تھی یا کسی وقت باہر گلیوں میں دو چار آوارہ کتے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے تھے۔ ہم نے آگ جلا رکھی تھی اور باتوں میں مصروف تھے۔ میں عمران سے ابھی بھی بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر وہ چکنے گھڑے کی طرح تھا، مجھے ٹالنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ ہی لیتا تھا۔ اس وقت بھی اس کے چہرے پر خوف کے سائے تھے اور وہ بار بار قاری حمید اللہ کی کہی ہوئی باتیں دہرانے لگتا تھا۔ ”چاچو! تم مذاق سمجھتے ہو لیکن میں واقعی ڈرا ہوا ہوں۔ جادو تو برحق ہے نا۔“

”اگر میں تمہیں تھپڑ مار دوں تو یہ بھی برحق ہی ہوگا۔ تم یہ اوور ایکٹنگ چھوڑو اور انسانوں کی طرح بات کرو۔ یہاں اب کوئی قاری حمید نہیں ہے۔“

”قاری حمید نہیں ہے؟ اس سے کیا مطلب؟“ وہ معصومیت سے بولا۔

”میں جانتا ہوں، اس سے الٹی سیدھی باتیں کہلوانے کے لیے ہی تم اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے ہو۔ ورنہ سامنے والے پلاٹ میں ننگ دھڑنگ جنات کی پہلوانی کے بارے میں تم بھی اتنا ہی یقین رکھتے ہو جتنا میں رکھتا ہوں۔“

”کہا ہے نا کہ تم مذاق سمجھ رہے ہو، جو مجھ پر بیت رہی ہے، میں جانتا ہوں۔ ذرا سوچو چاچو یار! اگر یہاں جنوں کے بجائے پری زاد ہوئے اور پریاں ہوئیں تو کیا ہوگا؟ آپ تو تقریباً شباب کے دور سے گزر چکے ہو مگر میں تو جوانِ رعنا ہوں، اوپر سے یہ نگوڑی وجاہت ٹوٹ کر برس رہی ہے۔ غالب امکان یہی ہے کہ ایک آدھ پری مجھ پر عاشق ہو جائے گی۔ یہ رومانس چل نکلا تو اس بے چاری مہوی کا کیا ہوگا..... یا اللہ!“ اس نے عالمِ اضطراب میں دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

”مہوی؟ یہ کون ذات شریف ہے؟“

اس نے تعجب سے میری طرف دیکھا۔ ”ہائیں، مہوی کو تم نہیں جانتے۔ ارے چاچو یار! وہی اپنی مہوش حیات، فلموں ڈراموں والی..... وہ تو ایک منٹ نہیں لگائے گی زہر کھانے میں۔ پچھلے آٹھ مہینے سے اس نے میرا جینا حرام کر رکھا ہے۔ کسی عام لڑکی کا سایہ بھی مجھ پر نہیں پڑنے دیتی، اگر کسی پری کا سایہ پڑ گیا تو..... توبہ توبہ۔“ اس نے گال پیٹے۔

وہ خوف زدگی کی ایکٹنگ کرتے ہوئے میرے قریب سمٹا آرہا تھا۔ ٹھیک ٹھاک اداکار تھا۔ میں نے اس کے چوڑے چکلے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے پیچھے دھکیلا۔ ”تم پاکستان کیوں چلے آئے۔ انڈیا کی اتنی بڑی فلم انڈسٹری ہے۔ تمہیں کہیں نہ کہیں مسخرے کا رول مل ہی جانا تھا۔“

وہ بولا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ آج رات دہشت کے سبب میرے ”دل“ کو ہارٹ اٹیک ہو گیا تو بھی تم اسے ایکٹنگ ہی سمجھتے رہو گے چاچو یار۔“

www.pakistanipoint.com

میں واقعی جھنجلا گیا ''بلو عمران! مجھے کچھ زیادہ اچھا نہیں لگتا تم مجھے اس طرح چاچو یار نہ کہا کرو۔''

وہ اپنے باپ کے انداز میں پُرلطف قہقہہ لگا کر بولا۔ ''تم چاچو یار کہہ رہے ہو، میرا تو من چاہتا ہے کہ تمہیں صرف یار کہا کروں۔''

''اور میرا بھی من چاہتا ہے کہ مُکّا مار کر تمہاری ناک کا پکوڑا بنا دوں۔''

اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''ہاں یہ تو مجھے پتا ہے۔ تمہارے مکے لوہے کی ناک کا بھی کچومر نکال سکتے ہیں چاچو یار...... مم میرا مطلب ہے چاچو جانی۔'' اس کا انداز ایسا تھا کہ میرا غصہ زور پکڑنے کے بجائے ٹھنڈا پڑتا چلا گیا۔ ہاں...... عمران دانش کے زمانے میں بھی تو یہی ہوا کرتا تھا۔

وہ میرا محسن تھا اگر آج میں زندہ تھا تو یہ رب العزت کے بعد عمران دانش ہی کی مہربانی تھی (ورنہ میں تو ایک وقت موت کو گلے لگانے کا تہیہ کر چکا تھا) اور آج کئی برس بعد اس کا ہنستا مسکراتا بیٹا اپنے سینے میں میرے لیے بے پناہ اپنائیت اور محبت لیے میرے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ ہو بہو اسی کی تصویر۔ بعینہٖ وہی آدرش بالکل وہی امنگ ترنگ۔

فون کال کے میوزک نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ یہ کال عمران کے سیل فون پر آئی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھ کر اسپیکر آن کر دیا۔ دوسری طرف سے زلیخا بی بی کی سہمی سہمی آواز ابھری۔ ''السلام علیکم عمران نے سلام کا جواب دیا۔ وہ بولی۔ ''تم...... خیریت سے تو ہو نا ہیرو؟''

''ہیرو ہمیشہ خیریت سے ہوتا ہے اور خیریت سے ہی رہے گا انشاء اللہ۔ آپ خواہ مخواہ پریشان نہ ہوں۔'' وہ مطمئن انداز میں بولا۔

''میں مسلسل جاگ رہی ہوں۔ ان لوگوں نے خواہ مخواہ دل میں ایک ڈر سا بٹھا دیا ہے۔ ورنہ...... وہاں کچھ بھی نہیں ہے، میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ اللہ سوہنا یہ رات خیر خیریت سے گزار دے۔''

''یہ رات خیر خیریت سے گزرے گی اور آئندہ راتیں بھی خیریت سے گزریں گی۔''

وہ بولی۔ ''عزیز بھائی بھی عشا کے بعد سے مصلّے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے بڑا دکھ لیا ہوا ہے میرے اس گھر کا۔ کسی وقت تو ڈرتی ہوں کہ بیمار ہی نہ پڑ جائیں۔''

میں نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''زلیخا! بات تو یہی سمجھ میں آ رہی ہے کہ اس گھر کو خوف کی جگہ بنانے میں قاری حمید اور اس کے کچھ شاگردوں کا ہاتھ بھی ہے۔ تمہارے خیال میں اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟''

''جی...... میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ ویسے تو قاری حمید اچھا بندہ ہی لگتا ہے، پر دل کی باتیں کون جانتا ہے۔ ایک دن وہ عزیز بھائی سے کہہ رہا تھا کہ یہ گھر کوئی آدھی قیمت پر بھی لے لے تو اسے بیچ دینا چاہیے۔'' زلیخا کی آواز دکھ کے بوجھ سے ٹوٹ سی گئی۔ اس کا دکھ سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ اپنی ساری پونجی کو اس بے چاری نے بڑی امیدوں کے ساتھ، اس گھر کی دیواریں کھڑی کرنے میں لگایا تھا اور اب یہ گھر مٹی کا ڈھیر بنتا جا رہا تھا۔

زلیخا سے بات ختم ہوئی تو عمران دلچسپ نظروں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ ''چاچو یار! اس بات کا دکھ تو اپنی جگہ ہے کہ آپ کی شریکِ حیات آپ کو داغِ مفارقت دے گئی لیکن کوئی ایسا بڑھاپا تو نہیں آیا جناب پر۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''آواز سنی ہے بی بی زلیخا کی، جیسے کسی نے چشمے کے پانی میں مصری گھول دی ہو۔ اوپر سے اتنے پیارے نین نقش۔ اگر میں آٹھ دس سال پہلے پیدا ہو گیا ہوتا تو ضرور سنجیدگی سے سوچتا۔ لیکن چاچو یار...... مم میرا مطلب ہے چاچو جانی! تم تو اس کی ایج گروپ کے ہو۔ ابھی بھی لال ٹائی لگا کر سامنے لیپ ٹاپ رکھ لو تو نوجوانوں کے پروگرام کے اینکر لگو گے...... اگر اپنے محمد علی، ندیم وغیرہ اپنی آخری عمر میں بھی ہیرو آ سکتے ہیں تو تم تو پھر......''

اچانک اس نے اپنی زبان کی قینچی کو ٹکا ٹک چلنے سے روک لیا۔ میں بھی کچھ چونک سا گیا۔ باہر کہیں ایک مدھم سی آہٹ سنائی دی تھی، جیسے کوئی فرش پر پاؤں گھسیٹتا ہوا گزرا ہو۔ عمران نے احتیاط سے دروازہ کھولا پھر ہم دونوں تیزی سے باہر نکلے مگر چھوٹا سا برآمدہ اور صحن بالکل خالی تھے۔ بس ہوا چل رہی تھی اور ہلکی بوندیں گر رہی تھیں۔

وہ رات خیریت سے گزر گئی مگر اگلی رات صورت حال کچھ مختلف رہی۔ شام تک بارش رکی رہی تھی مگر اندھیرا ہوتے ہی پھر مینہ برسنے لگا تھا۔ رات کوئی گیارہ بجے کا وقت ہو گا۔ ٹی وی آف کر کے ہم سونے کا ارادہ کر رہے تھے، جب پھر کل جیسی آہٹ سنائی دی اور کچھ گرنے کی آواز بھی آئی۔ عمران نے دروازے کی کنڈی پہلے ہی گرا رکھی تھی، وہ بڑی پھرتی سے باہر نکلا۔ میں اس کے پیچھے گیا۔ ایک سایہ سا دیوار کی طرف گیا۔ اس نے جست لگا کر چار دیواری کا بالائی کنارہ تھاما، عمران کو دو سیکنڈ کی تاخیر ہوتی تو وہ دیوار پھلانگ کر اوجھل ہو جاتا۔ عمران نے آخری لمحے میں اسے پنڈلی سے پکڑا اور گھما کر فرش پر دے مارا۔ ردِعمل ہماری توقع سے کہیں سخت تھا۔ فرش پر گرتے ہی وہ شخص ایک پھنکار کے ساتھ اٹھا۔ اس نے برق رفتاری سے

Nadia Azeem www.pakistanipoint.com

عمران کے سینے پر ٹکر ماری۔ عمران لڑکھڑا کر دو تین قدم پیچھے گیا۔ یہ درمیانے قد اور نہایت گٹھے ہوئے جسم والا پھرتیلا شخص تھا۔ میں اس کی طرف گیا تو اس نے اپنا الٹا ہاتھ گھمایا۔ نگاہوں کے سامنے ایک چمک سی لہرا گئی۔ میں بمشکل بچ پایا تھا۔ اس شخص کے ہاتھ میں لمبے پھل کا چاقو تھا۔

اس دوران میں عمران سنبھل چکا تھا۔ اس نے مدِمقابل کو بانہوں میں لیا اور پھر پلک جھپکتے میں اڑنگا لگا کر اوندھے منہ گرا دیا۔ اس کا چاقو والا ہاتھ عمران کی گرفت میں آ چکا تھا۔ جب یہ شخص گرا تو اس کے کندھے سے اتر کر کوئی بوتل نما چیز گری اور دور تک لڑھک گئی۔ وہ شخص بھاری آواز میں پھنکارا۔ ''مار دوں گا...... جان سے مار دوں گا۔'' ٹھیک ٹھاک درندگی تھی اس کے لہجے میں۔

وہ عمران کی گرفت میں بے طرح مچلا مگر اس نے چند سیکنڈ میں اس کے دونوں ہاتھ پشت کی طرف موڑ کر اپنی پینٹ کی بیلٹ سے کس دیے۔ بارش نے ہمیں تربتر کر دیا تھا۔ بجلی چمکی اور میں نے وہ بوتل نما شے دیکھی جو فرش پر لڑھکتی تھی۔ یہ پلاسٹک کی ایک ویسی ہی تھرماس تھی جو بچے پانی کے لیے اسکول میں لے کر جاتے ہیں۔ مجھے سامنے ایک دروازے پر خون کے بہت سے چھینٹے بھی نظر آئے۔ (جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا پلاسٹک کی اس بوتل میں ایک دو مرغیوں کا خون تھا)

عمران نے گٹھے ہوئے جسم والے شخص کو بازوؤں میں بھر کر اٹھایا۔ وہ بری طرح ٹانگیں تو چلا رہا تھا مگر شور نہیں مچا رہا تھا۔ عمران نے اسے وسطی کمرے میں لا کر انگیٹھی کے سامنے پٹخ دیا۔ یہاں بلب کی روشنی موجود تھی۔ اس شخص کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ ماتھے پر ایک پرانے زخم کا گہرا نشان تھا۔ عمر پینتیس سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ صورت سے ہی خطرناک لگتا تھا۔ عمران نے اس کے پاؤں بھی ایک مفلر میں اچھی طرح کس دیے۔ جب اس نے مغلظات بکیں تو اس کے منہ میں کپڑا بھی ٹھونس دیا گیا۔

میں نے اشارے کے ساتھ عمران کو کمرے سے باہر بلایا۔ کم از کم تین دروازوں اور ایک دیوار پر خون کے تازہ چھینٹے موجود تھے۔ بات سمجھ میں آ رہی تھی اور یہ بھی سمجھ میں آ رہا تھا کہ ہو نہ ہو یہ بندہ قاری حمید کے کارندے کے طور پر یہاں پہنچا ہے مگر یہ بھی صاف پتا چل رہا تھا کہ یہ کوئی پیشہ ور مجرم ہے اور اس سے کچھ اگلوا لینا آسان نہیں ہوگا۔ میں نے اس کا گرا ہوا چاقو اٹھایا اور عمران کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ بند منہ کے ساتھ بھی گالیاں بک رہا تھا جو اس کے منہ کے اندر ہی گونج رہی تھیں۔ آنکھوں میں انگارے دہک رہے تھے۔

مگر پھر اچانک کچھ ایسا ہوا کہ ہم دونوں ششدر رہ گئے۔

میں اس کے قریب بیٹھا اور اس نے دھیان سے میری طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں سرخی کی جگہ ایک دوسری طرح کا رنگ اتر گیا۔ وہ یک ٹک میری طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ سانولے چہرے پر تاثرات بدل رہے تھے۔ ''اوئے باگڑ بلے! کیا میرے چاچو کو ہپناٹزم کرنے کا ارادہ ہے؟'' عمران بولا۔

اب وہ شخص کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا اور بے قراری سے اپنے سر اور بازوؤں کو حرکت دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اب جارحیت بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

''عمران، اس کے منہ سے کپڑا نکالو۔'' میں نے کہا۔

عمران نے کپڑا نکال دیا۔ وہ میری طرف دیکھ کر عجیب لرزاں آواز میں بولا۔ ''میں آپ کو پہچانتا ہوں، میں پہچانتا ہوں آپ کو...... آپ...... تابش ہیں ناں...... تابش تابی۔''

''کیسے جانتے ہو مجھے؟''

''سر...... سر آپ مجھے کھولیں، میں سب کچھ بتاتا ہوں آپ کو۔''

میں نے اور عمران نے اسے کھول دیا، اگلا منظر زیادہ تعجب خیز اور غیر متوقع تھا، اس نے جیسے تڑپ کر میرے پاؤں پر سر رکھ دیا۔ پھر میرے ہاتھوں کو چومنے کی کوشش کی۔ کسی عقیدت مند کی طرح اس کے آنسو جاری ہو گئے تھے۔ ''سر! میں نے آپ پر ہاتھ اٹھایا، کاش میرے ہاتھ ٹوٹ جائیں، کسی وقت...... آپ ہی کے قدموں میں بیٹھ کر لڑتے مرنے کا ڈھنگ سیکھا اور آج آپ پر ہی اپنا ہاتھ اٹھایا۔'' اس نے پھر میرے پاؤں پکڑنے کی کوشش کی۔

اگلے ایک گھنٹے میں وہ سب کچھ بے حد آسان ہو گیا جو شاید کئی گھنٹوں کی کوشش کے بعد بھی نہ ہو سکتا۔ میں اس لالو نامی شخص کو نہیں جانتا تھا لیکن یہ اس وقت سے جانتا تھا جب اٹھارہ انیس برس پہلے میں اور عمران ایک قیمتی مورتی کی تلاش میں جہلم شہر کی طرف گئے تھے۔ یہ بھی جہلم ہی کا رہنے والا تھا۔ لالو نام کے اس بندے نے ایک دو موقعوں پر ہماری کافی مدد کی تھی اور ایک لڑائی کے دوران میں غالباً زخمی بھی ہوا تھا۔ اب کچھ دھندلے دھندلے سے مناظر میری نگاہوں کے سامنے آنے لگے تھے۔

لالو لاکھانی نے آبدیدہ لہجے میں جو پہلا انکشاف کیا، اس نے میرے اور عمران کے کئی اندازوں کو دھڑام سے زمین بوس کر دیا۔ اس نے بتایا کہ وہ کسی کے بھیجنے پر ہی یہاں آتا رہا ہے لیکن یہ بھیجنے والا قاری حمید اللہ نہیں تھا...... وہ خود عزیز اجی تھا۔

اس کے اس پہلے انکشاف کی طرح دیگر انکشافات بھی حیرت ناک تھے۔ یہ انکشافات کرتے ہوئے وہ بار بار کہہ رہا

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

تھا۔ ''تابی صاحب! آپ کے لیے، صرف آپ کے لیے۔ ورنہ کوئی میری ساری کی ساری کھال بھی اتار دیتا تو مجھ سے کچھ نہ جان سکتا۔''

اس نے جو دوسرا انکشاف کیا وہ یہ تھا کہ عزیز اجی بے شک خود کو زلیخا کا بھائی کہتا ہے لیکن اس نے دو ڈھائی برس سے اس پر بُری نگاہ رکھی ہوئی ہے۔ وہ اپنے بچوں کو پالنا چاہتی ہے۔ دوسری شادی کا سوچ بھی نہیں سکتی مگر وہ ہر صورت اسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے ہر ہر ہتھکنڈا استعمال کر رہا ہے اور کرتا رہے گا۔

''اس گھر کو مشکوک بنانا بھی اس کا ہتھکنڈا ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''بالکل ایسا ہی ہے۔ اس سے وہ دو فائدے حاصل کر رہا ہے۔ بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ زلیخا اور اس کے بچوں کی آمدنی کا واحد ذریعہ بھی ختم ہو جائے گا اور وہ پہلے کی طرح عزیز اجی کے محتاج رہیں گے۔ وہ ان کی مالی مدد کرتا رہے گا اور آہستہ آہستہ زلیخا اس کے شکنجے میں آجائے گی۔''

''اور دوسرا فائدہ؟'' میں نے پوچھا۔

''قاری حمید اللہ سے عزیز اجی کی پرانی دعا سلام ہے۔ مکان کے سلسلے میں جو حالات بن گئے ہیں، ان کا نتیجہ یہی ہوگا کہ قاری حمید یہاں رہنا شروع کر دے گا۔ بعد میں عزیز اجی اس مکان کو بھی ہڑپ کرنے میں کامیاب ہو جائے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ قاری حمید اور عزیز اجی آپس میں کسی طرح کی بندر بانٹ کر لیں۔''

ہم نے لالو سے کافی سوال جواب کیے۔ عزیز اجی کا گھناؤنا کردار اس طرح کھل کر سامنے آیا تھا کہ دماغ ابل کر رہ گیا تھا۔ ایک طرف وہ مستقبل قریب میں زلیخا کے مکان کا قبضہ حاصل کرنا چاہتا تھا، دوسری طرف زلیخا کا ''قبضہ'' حاصل کرنے میں بھی لگا ہوا تھا۔

کچھ جرائم پیشہ افراد کے بھی اپنے اصول ہوتے ہیں۔ لالو لاکھانی بھی ان میں سے ایک تھا۔ اس رات اس نے آنسوؤں سے تر بتر چہرے کے ساتھ مجھ سے کہا کہ اب وہ خود کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ لاہور میں رہے اور کسی وقت عزیز اسے اس کا سامنا ہو۔ اس نے کہا کہ وہ کرم ایجنسی کی طرف جا رہا ہے۔ وہ وہاں سے عزیز اکو وہ تیس ہزار روپیا بھی واپس بھیج دے گا جو اس کام کے محنتانے (معاوضے) کے طور پر اس نے لیا تھا۔ (یاد رہے کہ زلیخا کے اس نو تعمیر شدہ گھر میں دو تین دفعہ جو آگ بھڑکی تھی، وہ بھی لالو ہی کی کارروائی تھی) میں چونکہ اس شخص کی اصلاح کرنا چاہ رہا تھا۔ لہٰذا اسے کہا کہ وہ بذریعہ فون مجھ سے رابطے میں رہے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ ایسا کرے گا۔ حقیقتاً میں لالو لاکھانی کی پھرتی اور اس کی سخت جانی سے متاثر ہوا تھا۔ اس نے اچانک پلٹ کر جس طرح خم دار چاقو کا وار مجھ پر کیا تھا، وہ اس کے زبردست فائٹر ہونے کی نشاندہی کرتا تھا۔ رخصت ہوتے وقت لالو نے ایک بار پھر مارشل آرٹس کے رواج کے مطابق مجھے جھک کر سلام کیا اور زبردستی میرے ہاتھ چوم کر چلا گیا۔

اس کہانی کو یہاں ختم ہو جانا چاہیے تھا اور ایک لحاظ سے وہ ختم ہو بھی گئی تھی۔ ہم نے اگلے ہی روز عزیز اجی کو اس آسیب زدہ گھر میں بلایا اور اسے آڑے ہاتھوں لے کر ابر آلود دن میں تارے دکھا دیے۔ وہ پیسے والا ضرور تھا مگر فطری طور پر ڈرپوک بھی تھا۔ گرفتاری، مقدمے اور جیل کے مناظر اس کی نگاہوں کے سامنے آئے تو بھوں بھوں کر کے رونے لگا۔ ایک آدھ گھنٹے میں اس نے سب کچھ تسلیم کر لیا اور یہ بھی مان لیا کہ اس سازش میں قاری حمید نے بھی مقدور بھر اس کا ساتھ دیا ہے۔

قاری حمید کو بھی وہیں بلا لیا گیا۔ لالو لاکھانی کا ریکارڈ شدہ بیان ہمارے پاس موجود تھا اور وہ قاری حمید پر پرچا کٹوانے کے لیے کافی تھا۔ وہ پہلے تو کچھ اکڑتا رہا اور روحانی موشگافیاں کرتا رہا مگر پھر لالو لاکھانی کا اعترافی بیان سن کر اس کی حالت بھی پتلی ہو گئی۔ وہ معافی تلافی پر اتر آیا۔ کچھ دیر بعد اس نے تحریری معافی نامہ لکھا اور حلفاً یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ مکان کے حوالے سے اس سارے اثر کو زائل کرے گا جو اس کی وجہ سے عام لوگوں پر ہوا ہے۔ اس کی بس ایک ہی درخواست تھی کہ اس کی پردہ پوشی کی جائے۔

عزیز اجی بھی آمادہ ہوا کہ اگر یہ معاملہ تھانے کچہری تک نہ پہنچے تو وہ، بیوہ کے ذمّے جو قرض ہے وہ چھوڑ دے گا بلکہ معقول ہرجانہ بھی ادا کرے گا...... مگر یہ ساری بات یہاں ختم نہیں ہوئی۔

☆☆☆

بیس پچیس روز گزر چکے تھے۔ عمران کے محلے میں بیوہ زلیخا بی بی کے حالات کچھ بہتر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ قاری حمید نے مکان کے حوالے سے جو افواہیں پھیلائی تھیں وہ اب خود ہی ان کے تدارک میں لگا ہوا تھا۔ میں نے عمران کے ساتھ زلیخا کے گھر میں جو پانچ چھ روز گزارے تھے، ان سے بھی مقامی لوگوں کے شبہات بڑی حد تک دور ہوئے تھے۔ عزیز اجی نے باقاعدہ ایک اسٹامپ پیپر لکھ کر دیا تھا جس کے مطابق زلیخا، اب اس کی ایک پائی کی مقروض نہیں تھی۔ وہ ہرجانے کا وعدہ بھی کر رہا تھا مگر اس سلسلے میں ہمیں شک تھا کہ وہ آسانی

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

سے یہ تین لاکھ کا ہرجانہ ادا کرے گا یا نہیں۔

ایک یخ بستہ شام میں عمران نے مجھے اپنی عجیب الخلقت موٹر سائیکل پر بٹھایا اور شہر کے گشت کے لیے نکلا۔ وہ لاہور ریلوے اسٹیشن، بادامی باغ اور داتا دربار کے علاقے میں ایسے بہت سے چاچے، بابے اور چاچیاں، ڈھونڈ چکا تھا جن کا تعلق کبھی عمران دانش سے رہا تھا اور جو آج بھی عمران دانش کے احسانات کو یاد کر کے آبدیدہ ہوتے تھے۔ اب وہ مسرور تھے کہ عمران دانش نے ایک نئے روپ میں ان کے سامنے آ کر پھر سے ان کے دکھ بانٹنے شروع کر دیے تھے۔

اسٹیشن کے قریب دو چار مستحق افراد کی مٹھی گرم کرنے کے بعد عمران نے اپنی کھٹارا بی ایم ڈبلیو کا رخ گڑھی شاہو کی طرف کر دیا۔ ہم چار پانچ کلومیٹر آگے نکل گئے۔ گنجان علاقہ اب پیچھے رہ گیا تھا۔ اسی دوران میں عمران کے فون پر کال آ گئی۔ وہ ایک طرف رک کر کال سننے لگا۔ یہ اس کی والدہ تھیں جو جھانسی شہر سے بذریعہ انٹرنیٹ اس سے بات کر رہی تھیں۔ والدہ کے بارے میں تھوڑا بہت تو اس نے مجھے بتایا تھا مگر زیادہ تفصیلات ابھی معلوم نہیں تھیں۔

کال سے فارغ ہونے کے بعد عمران کی نگاہ سڑک کی دوسری جانب اٹھ گئی۔ وہاں ایک اونچی چار دیواری نظر آ رہی تھی۔ وہ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''چاچو جانی، یہی وہ فیکٹری ہے جہاں زلیخا کا مرحوم خاوند کام کرتا تھا۔ یہاں ڈیزل انجنوں اور ٹریکٹرز وغیرہ کے پُرزے بنتے ہیں.....'' اس نے یہ معلومات عام سے انداز میں دی تھیں۔

عمران نے کچھ اور بھی کہا لیکن میں نے سنا نہیں۔ اچانک ہی ساری توجہ بائیں جانب مبذول ہو گئی تھی۔ میں نے فیکٹری کے بہت بڑے گیٹ کے قریب عزیزا جی کو دیکھا تھا۔ وہ ایک بندے کے ساتھ گیٹ کے چھوٹے دروازے سے نکل رہا تھا۔ ان دونوں کا رخ دوسری طرف تھا لہٰذا وہ ہمیں نہیں دیکھ سکے۔ عزیزا جی کے ساتھ والا بندہ کافی ہٹا کٹا تھا۔ گھنی مونچھیں بھی تھیں۔ کیا یہ محض اتفاق تھا کہ عزیزا یہاں اس فیکٹری کے قریب نظر آیا تھا...... یا اس کے پیچھے کوئی خاص وجہ تھی؟ یہ سوال بڑی سرعت اور شدت کے ساتھ میرے ذہن میں ابھرا۔

میں نے عمران کی توجہ عزیزا اور اس کے ساتھی کی طرف مبذول کرائی۔ وہ بھی دلچسپی لینے پر مجبور ہوا۔ عزیزا کے ساتھ جو شخص نظر آیا تھا، وہ فیکٹر کا کوئی ورکر ہی لگ رہا تھا۔ وہ دونوں بیس تیس قدم چلنے کے بعد ایک قریبی چائے خانے میں داخل ہو گئے۔ ہم دونوں نے فیصلہ کیا اور سڑک پار کر کے ہم بھی چائے خانے میں چلے گئے۔ عزیزا چائے میں کیک رس ڈبو ڈبو کر کھا رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ علیک سلیک کے بعد ہم ان دونوں کے قریب ہی بیٹھ گئے۔

انکشاف ہوا کہ عزیزا کے ساتھی کا نام قادر احمد ہے۔ وہ اس فیکٹری میں فورمین تھا اور پارٹ ٹائم کے طور پر وہ بھی عزیزا کی طرح چاولوں کی دکان کرتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی سرخی نظر آتی تھی۔ یہ یقیناً نشے کی سرخی تھی کیونکہ اس کے قریب سے چرس کی ہلکی سی بو بھی آتی تھی۔ ایک بار پھر وہی سوال ذہن میں آیا کہ کیا یہ محض ایک اتفاق ہے کہ عزیزا جی یہاں اس شخص کے ساتھ موجود ہے؟ عزیزا جی کے چہرے پر نظر آنے والی گھبراہٹ بھی ہمیں شک میں مبتلا کر رہی تھی۔

چائے خانے سے نکلنے کے بعد میں نے عمران پر اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ ''میری چھٹی حس کچھ کہہ رہی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ اس قادر نامی بندے سے پوچھ گچھ کی جائے۔ بہتر ہے کہ اسے پکڑ ہی لیا جائے۔''

وہ بولا۔ ''چاچو یار! تم پولیس افسر تو ہو لیکن اعزازی ہو۔ جہاں تک میری عقل کی پرواز ہے تم کسی کو گرفتار شرفتار تو نہیں کر سکتے۔''

میں نے کہا۔ ''گرفتار نہیں کر سکتا، پکڑ تو سکتا ہوں اور بوقتِ ضرورت اغوا بھی کر سکتا ہوں۔''

''اوئے میرا شیر چاچو زندہ باد۔'' عمران نے تعریفی انداز میں نعرہ لگایا۔

میں نے عمران سے پوچھا کہ زلیخا کے شوہر کے ساتھ حادثہ کیا ہوا تھا۔

جواب میں اس نے بتایا۔ ''اس بے چارے کے دونوں بازو کہنیوں سے اوپر تک کٹ گئے تھے، بلکہ کچلے گئے تھے۔ کسی بھاری مشین کی زد میں آ گیا تھا وہ۔ اسپتال پہنچتے پہنچتے خون اتنا زیادہ بہہ چکا تھا کہ اسے بچایا نہ جا سکا۔''

ہم نے کچھ دیر اس بارے میں بات کی۔ میرا شک بڑھ گیا۔

اگلے روز رات کو یہ قادر احمد عرف قادرا، ہمارے ساتھ، میرے گھر واقع گلبرگ میں موجود تھا۔ اسے چاولوں کے تین چار نمونوں کے ساتھ اپنی کوٹھی پر بلانے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ بہرحال کوٹھی پر پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ معاملہ چاولوں کی خریداری کا نہیں بلکہ اس کی شامتِ اعمال کا ہے۔ دس پندرہ منٹ میں ہی مجھے اور عمران کو دال میں بہت سا کالا دکھائی دینے لگا۔

اس میں تھوڑا سا رسک تو تھا مگر میں اور عمران اس شخص کو آڑے ہاتھوں لینے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ ہم نے اسے ننگا کر کے چھت کے پنکھے سے لٹکایا اور سر پر چند جوتے رسید کیے تو اس

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

کی ساری تن فن ختم ہوگئی۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ پولیس اسے اپنے کسی نجی ٹارچر سیل میں لے آئی ہے اور کسی دوسرے کمرے میں اس کا ساتھی عزیزا بھی اسی طرح پنکھے سے لٹکا جوتے کھا رہا ہے۔

میں نے اس کے سر کے بال مٹھی میں جکڑے اور بے رحم لہجے میں کہا۔ ”تیرا یار عزیزا تو یہی کہتا ہے کہ تو بھی اس کے ساتھ ہی ہر جرم میں شریک رہا ہے۔“

”م م...... میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں نے صرف...... میں نے صرف......“ آواز اس کے گلے میں اٹک گئی۔

عمران نے ایک اور جوتا اس کی پیٹھ پر رسید کیا۔ وہ بلبلایا پھر کراہتے ہوئے بولا۔ ”میں نے صرف اس کے کہنے پر یہ ایک غلطی کی لیکن...... میرا ارادہ ایسا نہیں تھا۔ نہ یہ سوچا تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔“

”لیکن ایسا ہو گیا نا...... وہ مر گیا نا......“ میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا۔

وہ کراہا۔ ”پتا نہیں، اوپر والے کو یہی منظور تھا۔“

”اچھا، تم نے یہ سب کیا کیسے؟“ عمران نے پوچھا۔

”وہ...... وہ ان دنوں ہیڈ ریلک (ہائیڈ ریلک پریس) پر ڈیوٹی کر رہا تھا۔ پریس کو کنٹرول میں کر رہا تھا...... میری عقل پر پتھر پڑ گئے۔ جب...... جب وہ پریس میں ڈائی لگا رہا تھا میں نے...... بٹن دبا دیا۔ اس کے دونوں ہاتھ کہنیوں تک پریس میں آ گئے۔ پر...... پر اگر وہ ٹائم پر اسپتال پہنچ جاتا تو بچ جانا تھا اس نے......“

عمران نے ایک اور جوتا اس کی پشت پر رسید کیا۔ ”یعنی اگر وہ مرتا نہ بس دونوں بازوؤں سے محروم ہوتا تو یہ بڑی خیر و سلامتی کی بات ہوتی۔ اس پر یقیناً خوشی کے ترانے بجائے جاتے......“

وہ بلند آواز میں رونے لگا۔ اس کے آنسو اور اس کے منہ سے بہنے والی رال اور اس کی ناک سے نکلنے ولا رقیق مادہ سب ایک دوسرے میں گڈمڈ ہونے لگے۔

ٹھیک ایک گھنٹے بعد ہم اندرونی شہر عزیز اجی کے دو منزلہ گھر کے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ وہ یہی سمجھا کہ ہم اس سے، زلیخا کو دیے جانے والے ہرجانے کا تقاضا کرنے آئے ہیں۔ وہ بے حد خرانٹ اور سفاک شخص ثابت ہوا تھا۔ اس کا جرم ہماری توقع سے کہیں زیادہ سنگین تھا۔ وہ قاتل تھا۔ خوبرو زلیخا پر فریفتہ ہونے کے بعد اس نے اس کے مزدور پیشہ شوہر عابد سے رقابت پالی تھی۔ اس گہری رقابت کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے اپنے رازدار دوست قادر عرف قادرے کے ساتھ مل کر عابد کو معذور و محتاج کرنے کا منصوبہ بنایا...... اسے دونوں ہاتھوں سے محروم کر کے بستر پر ڈالنے کی کوشش کی مگر یہ کوشش اتنی سنگین تھی کہ اس بدنصیب کی موت پر ختم ہوئی۔ وہ اپنی جواں سال بیوی اور تین پھول سے بچوں کو چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گیا۔

عزیزا ایک بہت کائیاں شخص بھی تھا۔ شاید ہماری آمد کے وقت ہی اس کی چھٹی حس نے اسے خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔

جب اس نے ہمارے عقب میں ایک باوردی سب انسپکٹر کو بھی دیکھا تو بالکل غیر متوقع طور پر...... ہاں، قطعی غیر متوقع طور پر اس نے قمیص کے نیچے سے بھرا ہوا پستول نکالا اور سیدھا فائر کر دیا۔

اس نے عمران کو نشانہ بنایا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسرا فائر کرتا، میں اس کی طرف جھپٹا، اس مرتبہ وہ جنونی انداز میں کچھ بولا اور اس نے ہم پر گولی چلانے کے بجائے پستول اپنے پیٹ پر رکھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے خود کو شدید طور پر زخمی کر لینا چاہتا ہے۔ میں نے جست لگاتے ہوئے اس کی کلائی پکڑ کر پستول کا رخ موڑ دیا۔ اس بار گولی ایک کھڑکی میں لگی۔ پولیس اہلکار اندر لپکے اور انہوں نے عزیزا کو جکڑ لیا۔ میں عمران کی طرف پلٹا۔ وہ دل پر ہاتھ رکھے فرش پر سیدھا پڑا تھا۔ بالکل بے سدھ۔

”عمران...... عمران۔“ میں نے اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ہولے سے مسکرایا۔ ”گولی کی آواز سے میرا تو دل ہی بند ہو گیا تھا۔“ اس نے کہا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

میں نے اسے سر کے بالوں سے پکڑ کر ایک بار پھر بری طرح جھنجوڑ دیا۔

گولی اس کے بازو اور سینے کے درمیان، بغل کے ڈیڑھ دو انچ خلا کے اندر سے گزر گئی تھی۔ اسی کو بال بال بچنا کہتے ہیں۔ یہ کوئی بہت انوکھی بات نہیں تھی۔ ایسے اتفاقات ہو جاتے ہیں مگر اس اتفاق نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیے تھے۔ عمران دانش بھی تو ایسی ہی بے مثال خوش قسمتی لے کر اس دنیا میں آیا تھا۔ وہ موت کا کھلاڑی تھا۔ ریوالور کا کھیل، موت کے کنویں میں جان کی بازی اور اس طرح کے بے شمار ”اسٹنٹ“ اس کے لیے دلچسپ مشغلے کی طرح تھے۔ میں کھوئی کھوئی نظروں سے عمران جونیئر کی طرف دیکھتا چلا گیا۔

گلی میں شور بڑھتا جا رہا تھا۔ لوگ اکٹھے ہو رہے تھے۔

ایک آدھ گھنٹے کے اندر اندر ہر شخص کو یہ معلوم ہونے والا تھا کہ ان کے محلے کا چاول فروش، بہت شریف النفس نظر آنے والا عزیز اجی ایک سفاک سازشی اور قاتل ہے۔

❖❖❖

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

میں یونیورسٹی سے واپسی پر حسبِ معمول گھر کے قریبی جنرل اسٹور پر رکا۔ وہاں سے میں نے ایک سگریٹ لے کے سلگایا اور ستون کے ساتھ ٹیک لگا کے سوٹے مارنے لگا۔ معاً میرے کانوں سے ایک جملہ ٹکرایا۔

”یہ جونی کی ماما کی تصویر ہے۔“ اس جملے کے ساتھ ہی ایک دبے دبے سے قہقہے کی آواز سنائی دی۔ میں نے ستون کی آڑ سے دوسری طرف جھانکا۔ یہ ہمارے محلے کے ایک پرائیویٹ اسکول کا سکیورٹی گارڈ تھا۔ جو اس وقت بھی

راہِ نجات

کبیر عباسی

’تم بنجر زمین میں پھول نہیں کِھلا سکتے‘... بالکل اسی طرح انسان کی فطرت میں بسی درندگی کو شگفتگی... مہربانی اور محبت میں نہیں بدل سکتے... انسان ازدواجی زندگی کا آغاز بڑے جوش و خروش اور خوشی کی تیاریوں سے کرتا ہے... مگر آہستہ آہستہ شام کے پھیلے سایوں کے مانند شریکِ سفر کے دل و جسم پر اندوہ کے سائے بڑھتے چلے جاتے ہیں... اداس دل غموں سے معمور ہوتا چلا جاتا ہے... گھر کے مکینوں کے دل سے خوشیاں رخصت ہو جائیں تو پھر مایوسیاں جنم لیتی ہیں... اور انسان راہِ نجات کے لیے نکل پڑتا ہے... ایک ایسی ہی جفا گزیدہ لڑکی کا ماجرا جس کی راہ میں کانٹے ہی کانٹے تھے... کانٹوں کی چبھن نے اس کے جسم کے ساتھ روح کو بھی زخمی کر دیا تھا...

آپ کے پسندیدہ کردار کا ایک اور کارنامہ وفا اور جفا کا شاخسانہ.....

Wafa Azeem pakistanipoint.com

یونیفارم میں ملبوس تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک تصویر دکھائی دے رہی تھی۔ جو وہ ساتھ کھڑے ایک شخص کو دکھا رہا تھا۔ دونوں کے چہرے تمتمائے ہوئے تھے۔ میرے ذہن میں بھی تجسس جاگا کہ آخر اس تصویر میں ایسی کیا خاص بات ہے جو وہ دونوں اتنے اشتیاق سے تصویر کو گھورے جا رہے ہیں۔

میں ان کے عقب میں جا کھڑا ہوا۔ تصویر دیکھ کے میں چونک گیا۔ یہ ہماری پڑوسن خاتون نسیمہ عرف نسیمہ بیچاری کی تصویر تھی۔ وہ پورے محلے میں گھوم کے ہر ایک کو اپنی بیچارگی کی کہانیاں سناتی رہتی تھی اس لیے بیچاری کا نام ہی نسیمہ بیچاری پڑ گیا تھا۔ تصویر میں وہ جھک کے کوئی چیز اٹھا رہی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کے بالائی جسم کے نشیب و فراز عیاں ہو رہے تھے۔ ایسا ہوش رُبا پوز تھا کہ میرا چہرہ بھی تمتمانے لگا۔

گارڈ اور دوسرا شخص تصویر دیکھنے میں اتنے مگن تھے کہ انہوں نے عقب میں میری موجودگی کا نوٹس ہی نہیں لیا۔ میں گھوم کے ان کے سامنے آیا اور تیزی سے تصویر گارڈ کے ہاتھ سے چھین لی۔

گارڈ نے چونک کے مجھے دیکھا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات اُبھرے۔

”باؤ جی، یہ کیا حرکت ہے؟“ اس نے قدرے غصے سے کہا۔ ”تصویر مجھے واپس کرو۔“

میں نے تصویر پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور پوچھا۔ ”یہ کس کی تصویر ہے اور تمہارے پاس کیسے آئی؟“

اس کے چہرے پر دبی دبی سی مسکراہٹ اُبھری۔ ”یہ جونی کی ماما کی تصویر ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب وطلب کو چھوڑو۔ تم تصویر واپس کرو۔“ وہ پھر سے چہرے پر غصیلے تاثرات سجا کے بولا۔

میں نے اس کے غصے کو نظرانداز کرتے ہوئے ہلکے پھلکے سے انداز میں پوچھا۔ ”کر دوں گا تصویر واپس۔ پہلے یہ تو بتاؤ تمہارے پاس یہ تصویر آئی کیسے؟“

اس نے لمحے بھر کے لیے اپنے ساتھی کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے مشورہ طلب کر رہا تھا کہ ساری بات مجھے بتائی جائے یا نہیں۔

”تم نہیں بتاؤ گے تو کوئی اور بتا دے گا۔“ گارڈ کے چہرے پر کشمکش کے تاثرات دیکھ کے میں نے بھی دھکا لگانا فرض سمجھا۔

گارڈ کمینے پن سے مسکرایا اور گویا ہوا۔ ”اس جیسی بہت سے تصویریں آج کوئی اسکول کی باؤنڈری وال سے اندر گراؤنڈ میں پھینک گیا تھا۔ اسکول میں بریک ہوئی تو کسی بچے کی نظر تصویروں پر پڑی۔ وہ تصویر دیکھتے ہی چلّایا۔ ’یہ تو جونی کی ماما کی تصویر ہے۔‘ اس کے بعد تو ہر بچے کی زبان پر یہی جملہ گردش کرنے لگا۔ سب تصویریں اٹھائے واویلا مچانے لگے۔“ گارڈ چسکے لے لے کے بتا رہا تھا۔ ”بچوں کا شور سن کے میں وہاں پہنچا۔ ایک بچے کے ہاتھ سے میں نے تصویر لے کے دیکھی، اتنے میں کچھ ٹیچرز بھی وہاں پہنچ گئیں۔ انہوں نے بچوں سے تصویریں لے لیں مگر اتنی دیر میں پورے اسکول میں یہ بات پھیل چکی تھی کہ یہ جونی کی ماما کی تصویر ہے۔“

”اور جونی کا کیا حال ہوا یہ تصویر دیکھ کے؟“ میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

”شکر ہے آج جونی اسکول آیا ہی نہیں تھا۔ ورنہ......“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”وہ بیچارہ تو اب اسکول جانے کے قابل ہی نہیں رہا۔“ میں تاسف سے بولا۔ گارڈ نظریں چرانے لگا۔ نسیمہ بیچاری پہلے ہی مشکلات سے دوچار تھی۔ اس ناگہانی سے نہ جانے اس کی زندگی میں مزید کیا اتار چڑھاؤ آ جاتے۔ ساری کہانی سن کے مجھے نسیمہ بیچاری پر ترس آ رہا تھا اور گارڈ پر شدید غصہ۔ میں چلّایا۔

”آپ لوگوں کو شرم نہیں آتی یوں کسی خاتون کا تماشا بناتے ہوئے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے تصویر کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہوا میں بکھیر دیے۔ گارڈ کے چہرے پر لمحے بھر کے لیے غصے کے تاثرات نمودار ہوئے لیکن پھر اس نے میرے تاثرات دیکھ کر خود کو کنٹرول کر لیا۔ میں نے انہیں ان کے حال پر چھوڑا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

بائیک پورچ میں کھڑی کر کے میں گھر میں داخل ہوا ہی تھا کہ میرے کانوں میں سسکیوں کی آواز پڑی۔ میں نے چونک کے سامنے دیکھا۔ ایک عورت صوفے پر بیٹھی میری امی کے کندھے سے سر ٹکائے رو رہی تھی۔ دروازے کی آواز سن کے وہ چونک کے سیدھی ہوئی۔ وہ نسیمہ تھی، جس کی تصویر میں ابھی پھاڑ کے آیا تھا۔ بکھرے بال، سوجی ہوئی آنکھیں...... وہ اس حال میں بھی بے پناہ حسین لگ رہی تھی۔

☆☆☆

نسیمہ ہمارے پڑوس میں دو گھر چھوڑ کے رہتی تھی۔ اس کا سب پڑوسیوں کے گھر آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ہمارے گھر میں بھی وہ اکثر پائی جاتی تھی۔ اس کی عمر ستائیس اٹھائیس

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

سال تھی لیکن اسے دیکھ کے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک آٹھ سالہ بچے کی ماں ہے۔ میری اس سے ہلکی پھلکی دعا سلام تھی۔

وہ بے حد باتونی تھی۔ مجھ سے بھی وہ فری ہونے کی کوشش کرتی رہتی تھی لیکن میں امی کی موجودگی میں اسے زیادہ لفٹ نہیں دیتا تھا۔ ویسے بھی مجھے وہ سائیکو سی لگتی تھی۔

امی کے توسط سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ بچپن میں ہی اس کی ماں فوت ہو گئی تھی۔ وہ سوتیلی ماں کے زیرِ سایہ پلی بڑھی تھی۔ سوتیلی ماں بھی بالکل روایتی...... جس نے اپنے سوتیلے پن کو خوب نبھایا تھا۔ اس کے رویے کی وجہ سے نسیمہ بیچاری کی شخصیت مسخ ہو کے رہ گئی تھی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں ہی اس کی ماں نے اسے اپنے رنڈوے بھائی طاہر سے بیاہ دیا تھا۔

طاہر کی عمر چونتیس پینتیس سال تھی، وہ محکمۂ پولیس میں انسپکٹر تھا۔ حد درجہ آوارہ مزاج شخص تھا۔ اس کی آوارگیوں کے قصے زبان زدعام تھے۔ محلے کی کئی عورتوں کے ساتھ بھی اس کے افیئرز چل رہے تھے۔ محلے کا سب سے ہاٹ ٹاپک طاہر کے افیئرز ہی تھے۔

طاہر عورت کو اپنے پاؤں کی جوتی سمجھتا تھا۔ خاص طور پر گھر کی عورت کو تو وہ اپنی باندی سمجھتا تھا۔ اس کی پہلی بیوی بھی اس کے مظالم کی تاب نہ لا کے چل بسی تھی۔ وہ نسیمہ پر بھی تشدد کرتا تھا، جن کے نشانات وہ اکثر میری امی کو بھی دکھاتی تھی۔ امی کو اس سے ہمدردی تھی اور وہ اس کی ڈھارس بندھا رہی ہوتی تھیں۔

اس کا ایک ہی بیٹا جنید عرف جونی تھا۔ وہ اس کے حوالے سے حد درجہ حساس تھی لیکن وہ بھی مزاج میں اپنے باپ پر ہی گیا تھا۔ نسیمہ جتنا اس کا خیال رکھتی، وہ اتنا ہی چڑتا۔ اس کا باپ بھی اسے شہ دیتا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ ماں سے ہمیشہ بدتمیزی سے پیش آتا تھا۔ وہ اتنا بدمعاش تھا کہ پورا محلہ اس سے تنگ تھا لیکن اس کے باپ کے ڈر سے کوئی اسے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔

نسیمہ اکثر و بیشتر اس کی بدتمیزی کا رونا میری امی کے سامنے روتی تھی کہ وہ اس کی کوئی بات نہیں مانتا۔ میرے سامنے بھی ایک دو بار جونی نے اپنی ماں کے ساتھ انتہائی بدتمیزی سے بات کی تھی، اس وقت میرا دل چاہا تھا کہ اس کے کان کے نیچے دو لگا کے اسے سبق سکھاؤں لیکن پھر پرائے معاملے میں ٹانگ اڑانے میں اپنی ٹانگ کے ہی زخمی ہو جانے کے خیال سے باز رہا تھا۔

نسیمہ بیچاری کی زندگی پہلے ہی بھنور میں پھنسی ہوئی تھی اور اب وہ ایک نئی مصیبت کا شکار ہو گئی تھی۔ اس کی غیر معمولی تصاویر پورے محلے میں پھیل چکی تھیں۔ اب جانے اس کا شوہر اس کا کیا حشر کرتا؟

☆☆☆

نسیمہ کا اجڑا ہوا چہرہ دیکھ کے میرے دل میں اس کے لیے بے اختیار ہمدردی جاگی لیکن دماغ نے وارننگ جاری کی کہ ”بیٹا، روتی دھوتی عورت سے ہمدردی جتا کے میرا دہی نہ بنوانا۔“

دل کہاں دماغ کی وارننگ ماننے کا قائل تھا، وہ اپنی مرضی کا مالک تھا، لگا اپنی من مانی کرنے۔

”کیا ہوا۔ نسیمہ باجی، کیوں رو رہی ہیں؟“

وہ میری بات کا جواب دینے کے بجائے ہچکیاں بھرنے لگی۔ میں نے بیچارگی سے امی کی طرف دیکھا۔

”کچھ نہیں ہوا۔“ امی نے کہا۔ ”تم فریش ہو جاؤ۔ میں تمہارے لیے کھانا لگاتی ہوں۔“

میں کندھے اچکاتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ نسیمہ ہنوز ہاتھوں میں چہرہ چھپائے ہچکیاں لے لے کے رو رہی تھی۔ میں اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچا ہی تھا کہ وہ بولی۔ ”حنان، میری بات سنو۔“ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

میں پلٹا اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”ادھر آؤ۔“

امی کچن میں جا چکی تھیں۔ میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کے پاس آ کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ دوپٹے سے بے نیاز چہرہ ہاتھوں میں لیے بیٹھی تھی۔ میں بے اختیار اس سے نظریں چرا کے رہ گیا۔

”تمہیں پتا ہے۔ آج میرے ساتھ کیا ہوا؟“ اس نے اداسی سے کہا۔

”کیا ہوا؟“ مجھے اندازہ تو تھا کہ وہ تصویروں والے معاملے ہی کی بات کر رہی ہے، تاہم میں نے انجان بن کے پوچھا۔

”مم...... میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔“

وہ ایک بار پھر رونے لگی۔ ایک حسین عورت کو روتے دیکھ کے میرا دل بھی بھر آیا جی تو چاہ رہا تھا اسے گلے لگا کے چپ کراؤں لیکن امی کے ڈر سے خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

اس نے خود کو سنبھالا اور اپنی رام کتھا سنانے لگی جو میں گارڈ سے پہلے ہی سن چکا تھا۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

''جونی تو پہلے ہی مجھ سے نفرت کرتا تھا۔ اب تو وہ میرا چہرہ دیکھنے کا بھی روادار نہیں رہا۔ ابھی اس نے دھکے دے کے مجھے گھر سے نکالا ہے۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔ ایک آٹھ سالہ بچے کی اپنی ماں کے ساتھ ایسی حرکت مجھے ششدر کر گئی۔

''لگاتی دو رکھ کے اس چھٹانک بھر کے بچے کو، اس کے ہوش ٹھکانے آجاتے۔'' میں بڑبڑایا۔

''کیا مطلب؟'' شکر ہے اس نے میری بڑبڑاہٹ نہیں سنی تھی ورنہ وہ اپنے بچے کے متعلق جتنی حساس تھی، کوئی پتا نہیں تھا کہ وہ میرے کان کے نیچے ہی دو لگا دیتی۔ میں تیزی سے بات بدلتے ہوئے بولا۔

''اسے کیسے علم ہوا ان تصویروں کا؟''

''آج اس کی طبیعت خراب تھی... اس لیے وہ اسکول نہیں گیا تھا مگر چھٹی کے بعد تو ہمارے گھر بچوں کا تانتا بندھ گیا۔ ہر کوئی اسے تصویروں کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ایک بچے نے اسے تصویر دکھائی تو وہ مجھ پر چلانے لگا۔ میں اسے سنبھالنے لگی تو اس نے مجھے دھکے دے کے گھر سے نکال دیا۔'' وہ سسکیاں لینے لگی۔ میں بمشکل اس کے لرزتے وجود سے نظریں چرا رہا تھا۔

''کوئی بات نہیں۔ بچہ ہے وہ۔ ایک دو دن میں سب بھول جائے گا۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

''وہ بچہ نہیں۔ آفت کی پرکالہ ہے۔ میں جانتی ہوں، وہ کتنا ضدی ہے۔ مجھے تو وہ اب گھر میں گھسنے ہی نہیں دے گا۔''

''کچھ نہیں ہوتا۔ جتنا بھی ضدی ہو۔ ہے تو بچہ ہی۔ آپ فکرمند نہ ہوں۔''

''ابھی تو اس کے باپ کو اس سارے معاملے کا علم نہیں ہوا۔ وہ تو مجھے جیتے جی مار دے گا۔'' وہ ایک بار پھر سسکیاں بھرنے لگی۔ مجھے اس پر ترس تو آرہا تھا لیکن کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اس معاملے میں، میں اس کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ کچھ نہیں کہیں گے وہ آپ کو۔ ویسے بھی اس سب میں آپ کا قصور تو نہیں ہے نا۔'' میں نے اس کی ڈھارس بندھائی۔

''تم اسے جانتے نہیں ہو نا... اس لیے ایسا کہہ رہا ہو۔ وہ تو بلاوجہ مجھے مارتا رہتا ہے۔ یہ دیکھو میری کمر پر اس کے تشدد کے نشان۔'' وہ اٹھ کے قمیص اوپر کرنے لگی۔

میں گڑبڑا گیا۔ ''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ آپ بیٹھیں۔'' میں تیزی اٹھتے ہوئے بولا۔ اسی لمحے امی کچن سے ٹرے اٹھائے نمودار ہوئیں۔ نسیمہ کو قمیص اوپر کرتے دیکھ کے وہ سختی سے بولیں۔ ''یہ کیا کر رہی ہو نسیمہ۔ بیٹھ جاؤ۔''

''آنٹی، آپ کو تو پتا ہے نا اس کی مار کا۔ آپ نے تو میری نیل ونیل کمر دیکھ رکھی ہے نا؟ اور یہ کہہ رہا ہے، وہ کچھ نہیں کہیں گے۔'' وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

امی مجھے خفگی سے گھورتے ہوئے بولیں۔ ''میں کھانا تمہارے کمرے میں ہی رکھ آتی ہوں۔ تم ہاتھ منہ دھولو۔''

''ٹھیک ہے امی۔'' میں نے سعادت مندی سے کہا اور دل ہی دل میں لاحول پڑھتے ہوئے تیزی سے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

کھانا کھا کے میں فارغ ہوا ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور نسیمہ کمرے میں داخل ہوئی۔ میرا دل چاہا کہ اپنا سر پیٹ لوں لیکن مروت دل کی خواہش پر غالب آگئی اور محض اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے پر اکتفا کیا۔

''حنان تم جاسوسی وسوسی کرتے ہو نا۔ مجھے بھی تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔'' وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی تیزی سے بولی۔ اب اس کی حالت قدرے سنبھلی ہوئی لگ رہی تھی۔

''جج..... جی۔ لیکن اس معاملے میں، میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟'' میں نے ہکلاتے ہوئے سوال کیا۔ دل ہی دل میں اپنے جاسوسی کے کیڑے کو کوس رہا تھا۔ یہ منحوس شوق تو آج میرے گلے پڑ رہا تھا۔

''میں جاننا چاہتی ہوں کہ میری وہ تصویریں کس نے اسکول میں بھیجی ہیں؟''

''مم..... میں بھلا یہ کیسے جان سکتا ہوں۔''

اس نے شرمندہ کرنے والی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کہہ رہی ہو۔ ''ہونہہ، تم کیسے جاسوس ہو۔ جو اتنا سا کام نہیں کر سکتے۔''

''اسکول کے گیٹ پر سی سی ٹی وی کیمرے نصب ہیں۔ تم کسی طرح اسکول کی انتظامیہ سے بات کر کے وہ فوٹیج دیکھو۔ ہو سکتا ہے اس سے مدد مل جائے۔'' اس نے تو مفت مشورہ دے دیا۔ لیکن اس پر عمل کرنے کی صورت میں قیمت مجھے چکانی پڑ سکتی تھی۔

''یہ بات تو آپ اپنے میاں سے بھی کہہ سکتی ہیں۔ وہ پولیس والے ہیں، زیادہ آسانی سے یہ کام کر سکتے ہیں۔'' میں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

اس نے مجھے افسوس بھری نظروں سے دیکھا۔ ''تم

www.pakistanipoint.com

انہیں جانتے نہیں ہو نا اس لیے ایسا کہہ رہے ہو۔"

"کچھ بھی ہے، وہ آپ کے شوہر ہیں۔ آپ کی بدنامی ان کی بدنامی ہے۔ کیا وہ آپ کی بدنامی کا باعث بننے والے شخص کو کیفرِ کردار تک پہنچانا نہیں چاہیں گے؟"

"نہیں۔" اس نے اداسی سے کہا۔ "انہیں میری اتنی فکر ہوتی تو رونا ہی کس بات کا تھا۔ وہ تو میرا کوئی قصور نہ ہوتے ہوئے بھی مجھے روئی کی طرح دھنک کے رکھ دیں گے۔" میں نے ہمدردی سے اسے دیکھا۔

"میرے پاس تمہارے لیے ایک اور ٹپ بھی ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے استفسار کیا۔

اس نے کچھ دیر اپنے سیل فون کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی اور سیل میری طرف بڑھایا۔ "یہ دیکھو، مجھے چند دن قبل یہ واٹس ایپ ملا تھا۔"

میں نے سیل کی اسکرین پر نظر دوڑائی۔ سیل کی اسکرین پر وہی تصویر چمک رہی تھی جو میں نے گارڈ کے ہاتھ میں دیکھی تھی۔ نیچے لکھا تھا۔ "تمہیں شرم نہیں آتی ایسے گھٹیا پوز دے کے تصویریں بنواتے ہوئے۔"

نیچے آٹھ دس بار نسیمہ کا جواب لکھا تھا۔ "تمہیں یہ تصویر کہاں سے ملی۔ پلیز، یہ ڈیلیٹ کر دو۔" لیکن تصویر بھیجنے والا جیسے تصویر بھیج کے بھول ہی گیا تھا۔ تصویر جس نمبر سے بھیجی گئی تھی، اس کا نمبر نسیمہ کے موبائل میں سیو نہیں تھا۔

"یہ تصویر آپ کو کس نے بھیجی؟" میں نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔"

"پھر اس نے کوئی اور میسج یا کال نہیں کی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ میں یہ میسج پڑھ کے پریشان ہو گئی تھی۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ وہ میرے کسی میسج کا جواب تک نہیں دے رہا تھا۔ میرا خیال تھا وہ پھر رابطہ کرے گا تو میں اس کی منت کروں گی مگر اس کمینے نے تو آج ہی تصویریں لیک کر دیں۔"

"ہم۔" میں پُرسوچ انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

"تم یہ نمبر نوٹ کر لو اور پتا کرانے کی کوشش کرو یہ کس کا نمبر ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ کام تو ابھی ہو جائے گا۔" میں نے نمبر نوٹ کر لیا۔

میں نے اپنا سیل نکال کے اپنے ایک دوست کو کال کی جو اس موبائل کمپنی کی فرنچائز میں کام کرتا تھا، جس کا یہ نمبر تھا۔ میں نے اسے نمبر بتایا تو وہ چیک کر کے بولا۔ "یہ نمبر کسی ملک ادریس کے نام پر ہے۔"

میں نے نسیمہ کو بتایا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ "ملک ادریس تو میرے والد کا نام ہے۔" وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔

"کیا؟" اس کا جملہ سُن کے میرا منہ بھی کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

میں نسیمہ کے جملے کو جذب کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کال بیل کی آواز سنائی دی۔ میں دروازے کی طرف بڑھا۔ ابھی میں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ میری نظر امی پر پڑی۔ وہ صدر دروازے سے پلٹ رہی تھیں۔

"کون ہے؟" میں نے پوچھا۔ امی ..... جواب دینے کے بجائے چلتی ہوئی میری طرف آنے لگیں۔ میرے پاس پہنچ کے تحکمانہ انداز میں بولیں۔

"تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ باہر مت نکلنا۔" میں نے کچھ کہنے کے لیے لب وا کیے ہی تھے کہ وہ نسیمہ سے بولیں۔

"تمہارا میاں آیا ہے تمہیں لینے۔"

نسیمہ کے چہرے پر ہراس جاگا۔ "پلیز، آنٹی۔ مجھے اس سے بچا لیں۔ وہ مجھے مار دے گا۔" وہ سسکیاں لینے لگی۔

امی نے اسے گلے سے لگایا اور کہا۔ "تم باہر تو آؤ۔ میں اسے سمجھاؤں گی۔ وہ تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔"

"نہیں آنٹی۔ وہ آپ کے سامنے میٹھا بن جائے گا لیکن اس کی کڑواہٹ میں جانتی ہوں یا میرا نیل و نیل بدن۔" اس کی آواز جیسے زہر میں بجھی ہوئی تھی۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہونے لگی۔

"بھئی، جیسا بھی ہے تمہارا شوہر ہے۔ میں تمہیں بھلا کیسے روک سکتی ہوں۔" امی کے چہرے پر بے بسی تھی۔ اسی لمحے دوبارہ کال بیل بجی۔ امی کھینچتے ہوئے نسیمہ کو لے جانے لگیں۔ وہ گھسٹتے قدموں سے ان کے ساتھ چلنے لگی۔ اس کی خوفزدہ سسکیاں در و دیوار کو دہلا رہی تھیں۔

میرا دل بھی پسیجنے لگا۔

"امی، آپ اس کے ابو کو کال کر کے سب بتا دیں۔ ہو سکتا ہے وہ اس کے لیے کچھ کر سکیں۔"

"کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔" نسیمہ نے تلخی سے کہا۔ "میرے باپ کو اس ڈائن نے اپنے شکنجے میں ایسا جکڑا ہوا ہے کہ اس نے جانتے بوجھتے مجھے کھائی میں دھکا دے دیا۔ اسے میری اتنی فکر ہوتی تو مجھے اس درندے سے بیاہتا ہی

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

کیوں۔''

امی اسے اپنے ساتھ لگائے باہر لے گئیں۔ میں بے بسی سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ میرے کانوں میں اس کی سسکیاں ابھی تک گونج رہی تھیں۔

بے اختیار میرے دل میں خواہش جاگی... کہ کاش، انسانوں کے دل میں ایک دوسرے کے لیے نفرت کے بجائے محبت پیدا ہوجائے تو یہ معاشرہ کتنا پُرسکون ہوجائے۔ یہ میرے بس میں تھا نہیں اس لیے دل کو بہلانے کے لیے سیل نکالا اور فیس بک کھول لی، لیکن اماں مجھے وہاں بھی نہ ملی۔ فیس بک پر پہلی نظر ہی جس پوسٹ پر پڑی، اس نے میرے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچ لی۔

☆☆☆

امی نسیمہ کو چھوڑ کے میرے کمرے میں آگئیں۔ میرا لٹکا ہوا منہ دیکھ کے وہ بولیں۔ ''کیا ہوا؟ تم پریشان لگ رہے ہو؟''

''کچھ نہیں ہوا، آپ بتائیں۔ نسیمہ کو کر آئیں اس درندے کے حوالے؟'' میرے لہجے میں تلخی تھی۔

''کیا کرتی۔ میرے پاس اور چارہ ہی کیا تھا؟'' انہوں نے بے بسی سے کہا۔

''بہت غصے میں ہوگا وہ؟''

''نہیں، میرے سامنے تو بہت نرمی سے بات کر رہا تھا۔ کہہ رہا تھا نسیمہ، جونی کو اکیلا چھوڑ کے آگئی ہے۔ ایسا لگ رہا تھا اسے تصویروں کے بارے میں پتا ہی نہیں۔''

''نہ بھی پتا ہو تو پتا چل جائے گا پھر جانے وہ نسیمہ کا کیا حشر کرے گا۔''

''بس، اللہ ہی اسے ہدایت دے۔'' انہوں نے افسردگی سے کہا۔ ''تم اس سے کہیں نہ الجھ پڑنا۔'' انہوں نے یکدم مجھے تنبیہہ کی۔

''نہیں امی، میں بھی اسی معاشرے کا فرد ہوں۔ کیسے کسی بے بس انسان کی مدد کے لیے خود کو مصیبت میں پھنسا سکتا ہوں۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''یہ ان کے گھر کا معاملہ ہے۔ ہمارا بولنا بنتا بھی نہیں۔'' امی کے لہجے میں ناگواری تھی۔

''ہاں، میں جانتا ہوں۔ اس معاملے میں تو ہمارا قانون بھی کچھ نہیں کرسکتا کہ قانون کا رکھوالا خود ہی قانون کی دھجیاں بکھیر رہا ہے۔ ہماری کیا اوقات۔'' میرے لہجے کی تلخی سے گھبرا کے امی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''تم زیادہ ٹینشن نہ لو۔'' انہوں نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''میں تمہارے لیے چائے لاتی ہوں۔''

امی کے باہر جاتے ہی میں نے فیس بک پر وہ پوسٹ کھولی جس نے میرے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچی تھی۔ اس پوسٹ میں بھی نسیمہ کی وہی تصویر تھی، ساتھ لکھا تھا۔ ''جوتی کی ماما نسیمہ کے جلوے تو دیکھیں۔''

پوسٹ شاہینہ ملک نامی آئی ڈی سے کی گئی تھی۔ میں نے اس آئی ڈی کی فرینڈ لسٹ چیک کی۔ اس میں بیشتر لوگ ہمارے محلے ہی کے ایڈ تھے۔ کمنٹس میں کوئی مذاق اڑا رہا تھا تو کوئی پوسٹ کرنے والے کو شرمندہ کرنے کی کوشش لیکن اس نے کسی کا جواب نہیں دیا تھا۔

''آہ، بیچاری نسیمہ۔'' میرے دل سے ہوک اٹھی۔ فیس بک پر تصویر لگنے سے جن لوگوں نے تصویر نہیں دیکھی تھی، انہوں نے بھی یقیناً دیکھ لی ہوگی۔ اس کی بدنامی و بدقسمتی پر مہر ثبت ہوچکی تھی۔

میں نے تصویر سیو کی اور اس کا معائنہ کرنے لگا۔ یہ کسی شادی کے فنکشن کی تصویر تھی۔ تصویر کے زاویے سے لگ رہا تھا کہ یہ خاصی بلندی سے کھینچی گئی ہے۔ پس منظر میں کچھ لڑکیاں بھی نظر آرہی تھیں۔ میں زوم کرکے انہیں دیکھنے لگا۔ اچانک ان میں سے ایک لڑکی کی تصویر دیکھ کے میں چونک گیا۔ یہ میری کلاس فیلو اور دوست سارہ کی تصویر تھی۔ نیوی بلیو شلوار قمیص میں وہ بے پناہ حسین لگ رہی تھی۔ وہ سیل فون میں مگن تھی۔

میں اس کے حسن میں کھویا ہوا تھا کہ امی دروازہ کھول کے اندر داخل ہوئیں۔ ان کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے چائے کا کپ میری طرف بڑھایا۔ میں نے شکریہ کہہ کے کپ تھاما۔

یکا یک میرے ذہن میں ایک خیال آیا تو میں نے ان سے پوچھا۔ ''امی، آپ شاہینہ ملک نام کی کسی خاتون کو جانتی ہیں؟''

ان کے چہرے پر پُرسوچ تاثرات ابھرے۔ ''جانتی تو ہوں پر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''اس نام کی آئی ڈی سے نسیمہ کی وہی تصویر فیس بک پر بھی اپلوڈ ہوئی ہے۔''

''کیا؟'' امی حیرانی سے بولیں۔ ''شاہینہ اس کی سوتیلی ماں ہے۔'' میں چونکا۔ ''مگر وہ یہ حرکت بھلا کیسے کرسکتی ہے۔ اسے نسیمہ کی فکر نہ بھی ہوتی تو کم سے کم اسے اپنے بھائی اور شوہر کی عزت کا خیال تو رکھنا چاہیے تھا۔''

امی اور بھی جانے کیا کہہ رہی تھیں لیکن میرے ذہن

www.paksociety.com

میں کڑی سے کڑی جڑ رہی تھی۔ نسیمہ کے باپ ملک ادریس کا نمبر بھی یقیناً شاہینہ ہی کے استعمال میں تھا جس سے اس نے نسیمہ کو تصویر بھیجی تھی، اب اسی کی آئی ڈی سے فیس بک پر تصویر اپلوڈ ہوئی تھی۔ یہ بات تو روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی تھی کہ اس سارے چکر کے پیچھے شاہینہ ہی کا ہاتھ تھا لیکن وہ ایسا کیوں کر رہی تھی، اس کا جواب میرا ذہن دینے سے قاصر تھا۔

”آپ تو شاہینہ کو جانتی ہیں۔ آپ کے خیال میں اس نے یہ حرکت کیوں کی؟“ میں نے اپنی الجھن سلجھانے کی کوشش کی۔

”نسیمہ بیچاری ٹھیک کہتی ہے کہ وہ ڈائن ہے۔ انتہائی خودغرض عورت ہے وہ۔ نسیمہ کی اپنے شوہر سے زیادہ تر لڑائی اسی بات پر ہوتی ہے کہ طاہر کی آوارگیوں کی وجہ سے نسیمہ کو بھی محلے کی عورتوں کے طنز برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ وہ کئی بار میرے سامنے بھی کہہ چکی ہے کہ وہ اس بدنامی کی پوٹلی کے ساتھ گزارہ نہیں کر سکتی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس نے یہ بات شاہینہ کے سامنے بھی کہی ہو، اور اس نے انتقاماً نسیمہ بیچاری کو بھی بدنام کر دیا ہو۔“ امی نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

یہ بات دل کو کچھ لگ رہی نہیں تھی۔ میں نے امی سے اظہار کیا تو وہ بولیں۔ ”شاہینہ جیسی عورت سے کچھ بھی بعید نہیں۔“

امی کے کمرے سے جانے کے بعد میں نے سارہ کو کال کی۔ اس کے ہیلو کہتے ہی میں رومانوی انداز میں بولا۔

”جانِ جاناں، کیسی ہو؟“

”تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“ اس نے حسبِ معمول میرے رومانوی موڈ کا بیڑا غرق کرتے ہوئے کہا۔

”طبیعت تو ٹھیک ہے مگر مزاج اچھا نہیں۔“ میں نے خفگی سے کہا۔

”کیوں جی، مزاج کو کیا ہو گیا؟“ اس کے انداز میں طنز نمایاں تھا۔

میں چڑ کے بولا۔ ”جو تمہارے جیسی کھڑوس لڑکی کے ساتھ دل لگا لے، اس کا مزاج ٹھیک رہ سکتا ہے بھلا۔“

”اچھا فضول باتیں چھوڑو۔ کام کی بات کرو۔ میں اسائنمنٹ بنا رہی ہوں۔“

”میرے لیے بھی ایک کاپی بنا دینا پلیز......“ میں لہجے میں مسکینیت بھر کے بولا۔

”نہ بھئی، میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں۔“ اس نے صاف انکار کر دیا۔ اپنے ہتھیار کو ناکام جاتے دیکھ کے میں نے دوسرے رخ سے وار کیا۔

”ڈرائنگ کی اسائنمنٹ تو تم نے بنا لی ہوگی؟“ وہ گڑبڑا گئی۔

”کیا مطلب، وہ تو تم نے بنا کے دینے کا وعدہ کیا تھا۔“

”ہاں وعدہ تو کیا تھا مگر ہائے یہ وقت..... فالتو بچتا ہی نہیں۔“ میں نے معصومیت سے کہا۔

”بلیک میلر نہ ہو تو۔“ وہ بڑبڑائی۔

”تم نے مجھ سے کچھ کہا؟“ میں نے انجان بنتے ہوئے استفسار کیا۔

”بنا دوں گی تمہارا اسائنمنٹ بھی۔“ اس نے مرے ہوئے انداز میں کہا تو میرے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ رینگ گئی۔ ”اب پھوٹو بھی فون کیوں کیا ہے؟“

میں یکدم سنجیدہ ہو گیا۔ ”پچھلے دنوں تم نے کوئی شادی اٹینڈ کی؟“

”آج کل تو ہر دوسرے روز ہی کوئی نہ کوئی شادی اٹینڈ کرتی ہوں۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”میں ایک تصویر سینڈ کر رہا ہوں۔ دیکھ کے بتاؤ۔ یہ شادی کب تھی اور کس کی تھی؟“

کال کاٹ کے میں نے اسے تصویر بھیجی۔ چند لمحوں بعد ہی اس کی کال آ گئی۔

”یہ نسیمہ بیچاری کی ایسی تصویر تم تک کیسے پہنچی؟“ اس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

”تو تم جانتی ہو اسے؟“

”اس کے بھائی کی شادی تھی میری کزن سے۔ وہیں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ عجیب سائیکو سی عورت ہے۔“

”ہاں ہے تو سائیکو سی مگر اسی تصویر کی وجہ سے مصیبت میں پھنس گئی ہے۔“ میں اسے ساری کہانی سنانے لگا۔

”تمہارا اس سارے چکر سے کیا لینا دینا ہے؟“ اس نے مشکوک سے انداز میں پوچھا۔

”وہی سراغرسی کا کیڑا تنگ کر رہا ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ تصویر کس نے بنائی اور کیوں لیک کی ہے؟“

”باز آ جاؤ۔ تمہیں یہ کیڑا مروائے گا کسی دن۔“

”صاف صاف بتاؤ تم میری مدد کرو گی یا نہیں۔“ میں سنجیدہ ہو گیا۔

وہ ہنسی۔ ”کیوں نہیں کروں گی۔ تم جانتے ہو سراغرسی میرے بھی خون میں رچی بسی ہے۔“

”تمہارے اسی شوق کی وجہ سے تو میں تم پر مرمٹا

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

ہوں۔ ورنہ......'' میں نے رومانوی ہونے کی کوشش شروع ہی کی تھی کہ وہ میری بات کاٹ کے بولی۔

''فضول باتیں چھوڑو۔ بتاؤ، مجھے کیا کرنا ہے؟''

میں واپس پٹری پر چڑھتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں تصویر دیکھ کے اندازہ تو ہوا ہوگا کہ یہ تصویر کہاں سے لی گئی ہوگی۔ آیا کسی نے چھپ کے لی یا اتفاقاً بن گئی۔''

''تصویر کے زاویئے سے لگ رہا ہے کہ یہ ڈرون کیمرے سے بنائی گئی ویڈیو سے نکالی گئی ہے لیکن کل ہی میں نے اپنی کزن ماریہ کے ساتھ بیٹھ کے ساری ویڈیو دیکھی تھی۔ اس میں تو ایسا کوئی سین نہیں تھا۔'' اس نے ساری بات سنتے ہی کہا۔

''ایڈیٹنگ میں کاٹ دیا ہوگا۔'' میں نے اندازہ لگایا۔

''ہاں مگر یہ تصویر پھر اس کی ماں تک کیسے پہنچی؟ مووی میکر نے ایڈیٹڈ ویڈیو ہی انہیں دی تھی۔''

''یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں۔ تم اپنی کزن سے کنفرم کر کے بتاؤ کہ مووی میکر نے جو تصاویر اور ویڈیوز انہیں دی تھیں، ان میں یہ تصویر تھی یا نہیں؟''

''اوکے۔ میں کنفرم کر کے تمہیں کال کرتی ہوں۔''

''مووی میکر کا پتا اور فون نمبر بھی لے لینا۔''

کال کاٹ دینے کے بعد مجھے اس نمبر کا خیال آیا جس سے نسیمہ بیچاری کو تصویر سینڈ کی گئی تھی۔ میں نے کچھ سوچ کے اپنے ''خفیہ نمبر'' سے وہ نمبر ڈائل کیا۔ تیسری کوشش میں کال ریسیو کی گئی۔ کال ریسیو کرتے ہی کوئی مرد پھاڑ کھانے والے انداز میں ''ہیلو'' بولا۔

میرا تو خیال تھا کہ کال شاہینہ ریسیو کرے گی۔ مرد کی آواز سن کے میں ہڑبڑا گیا۔ ''آپ ادریس صاحب بات کر رہے ہیں؟'' میں نے حتی المکان اپنی آواز تبدیل کر لی تھی۔

''تم کون بول رہے ہو؟'' محتاط سے انداز میں پوچھا گیا۔

''میں جی ٹیلر بات کر رہا ہوں۔ شاہینہ باجی سے بات کرنی تھی۔'' میں نے بہانہ گھڑا۔

''یہ لو بات کرو۔''

''کون ہے؟'' پس منظر سے کسی خاتون کی آواز ابھری۔ ''ٹیلر ہے کوئی۔''

''ٹیلر؟ میرا تو یہ نمبر تمہارے سوا کسی کے پاس ہے ہی نہیں۔'' آواز میں الجھن نمایاں تھی۔

''تو پوچھ لینا اس سے کہ تمہارا نمبر اسے کیسے ملا؟'' بیزاری سے کہا گیا۔

دوسری طرف شاہینہ لائن پر آئی۔ ''ہیلو'' اس نے محتاط سے انداز میں پوچھا۔

''شاہینہ بیگم۔ میں انسپکٹر ندیم بات کر رہا ہوں۔ چند دن قبل تمہارے نمبر سے تمہاری سوتیلی بیٹی کو اس کی ایک تصویر سینڈ کی گئی تھی۔ آج اس کی وہ تصاویر لیک کر دی گئی ہیں۔ میں اس بابت تفتیش کے لیے تمہارے پاس حاضر ہونا چاہتا ہوں۔'' میں نے پاٹ دار آواز میں کہا۔ میرا خیال تھا کہ یہ بات سن کے اس کی گھگی بندھ جائے گی مگر میری توقع کے برخلاف وہ غصے سے پھٹی ہوئی آواز میں بولی۔

''کون ہو تم؟ اور ایسا بیہودہ مذاق کرنے کی تمہاری جرأت کیسے ہوئی؟''

میں جواب دینے ہی لگا تھا کہ باہر سے شور کی آواز سنائی دی۔ میں کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔ ''میں آ رہا ہوں تمہارے پاس، پھر تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ یہ مذاق ہے یا حقیقت۔''

''شوق سے آؤ۔ پتا ہے تمہارے پاس یا بتاؤں؟'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا تو میں نے چونک کے سیل کے طرف دیکھا۔ یہ تو واقعی حد درجہ مکار عورت معلوم ہوتی تھی۔

''پولیس والوں کو سب پتا ہوتا ہے۔'' میں سرد لہجے میں بولا۔

''پھر تو تمہیں یہ بھی پتا ہوگا کہ میرا بھائی بھی پولیس انسپکٹر ہے۔ تمہاری کھال میں بھس بھروا کے واپس نہ بھیجا تو میرا نام بھی شاہینہ نہیں۔''

باہر شور بڑھ چکا تھا۔ امی گیٹ پر کھڑی تھیں۔ ان کے چہرے پر فکرمندی تھی۔ میں نے کال کاٹی اور ان سے شور کی بابت استفسار کیا۔

''خود دیکھ لو۔'' میں نے باہر جھانک کے دیکھا تو گلی لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ نسیمہ بیچاری اپنے گھر کی طرف چیخ چیخ کے اپنے میاں کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔ یکدم وہ پلٹی۔ اس کی نظر امی پر پڑی تو وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھی۔ وہ ان کے سینے سے لگ کے ہچکیاں لے لے کے رونے لگی۔

''کیا ہوا؟'' امی نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

''اس کمینے نے مجھے طلاق دے دی ہے۔'' اس نے یکدم گویا دھماکا کیا۔ اس کا جملہ گلی میں کھڑے ایک شخص نے بھی سن لیا۔ اس نے بلند آواز میں یہ خبر ''بریک'' کی۔ یہ خبر سنتے ہی تمام لوگوں کے چہروں پر سنسنی نظر آنے لگی۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

''امی، آپ ... اندر جائیں۔'' میں امی سے مخاطب ہوا۔

میں نے اچٹتی سی نگاہ لوگوں پر ڈالی جو چہ میگوئیوں میں مصروف تھے۔ اچانک میری نظر ارسلان پر پڑی۔ وہ مجھے دیکھ کے تیر کی طرح میری طرف آیا۔

''تو بھی دوسرے لوگوں کی طرح چسکے لے رہا ہے۔'' میں نے ناگواری سے کہا۔

''نہیں یار۔ میں تو تیری طرف آ رہا تھا۔'' اس نے شرمندہ سے انداز میں کہا۔

میں نے طنزیہ انداز میں اسے دیکھا۔ مجھے اس طرح دیکھتے ہوئے وہ خفگی سے بولا۔ ''تیرا نمبر نہیں مل رہا تھا۔ جم نہیں جانا آج کیا؟'' میں نے چونک کے وقت دیکھا۔ پانچ بج چکے تھے۔ اس وقت ہم جم میں پہنچ چکے ہوتے تھے۔

''اوہ، مجھے تو یاد ہی نہیں رہا۔ میں بائیک نکالتا ہوں۔'' میں کہتے ہوئے اندر کی طرف بڑھ گیا۔

گلی میں لوگوں کی بھیڑ چھٹ چکی تھی۔ ارسلان میرے پیچھے بیٹھ گیا۔ ''یہ نسیمہ بیچاری تمہارے گھر کیوں چلی گئی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''اس کے میاں نے اسے طلاق دے دی ہے۔ امی اس سے ہمدردی سے پیش آتی ہیں۔ سو ان کے پاس چلی گئی۔''

''اوہ، طلاق ہوگئی ہے تو اپنے ماں باپ کے گھر کیوں نہیں گئی؟''

''یار تو نے کیا یہ عورتوں کی طرح تفتیش شروع کر دی ہے۔'' میں نے ناگواری سے کہا۔ اس موضوع سے بچنے کے لیے تو میں جم جانے کے بہانے گھر سے نکل آیا تھا۔ اب وہ بھی یہی موضوع چھیڑ رہا تھا، میں ناگواری کا اظہار نہ کرتا تو کیا کرتا۔

☆☆☆

میں رات کو گھر پہنچا تو نسیمہ کو اپنے ہی گھر میں دیکھ کے حیران رہ گیا۔ امی کچن میں مصروف تھیں اور وہ سکون سے بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ دن کے پُرہول واقعات کا شائبہ تک اس کے چہرے پر نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دھیرے سے مسکرائی۔

''کیسی ہیں نسیمہ باجی؟'' میں نے ہمدردی سے پوچھا۔

''بدن تو دکھ رہا ہے لیکن روح سرشار ہے۔'' اس نے عجیب سے انداز میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' وہ دھیمے سے انداز میں مسکرائی۔

''آج طاہر نے مجھے بہت مارا لیکن میں مطمئن ہوں کہ یہ آخری مار تھی۔ آج کے بعد وہ مجھے نہیں مار سکے گا۔ آزاد کر دیا ہے مجھے اس نے۔'' وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولی۔

''اور جونی؟'' میں نے محتاط... انداز میں پوچھا۔

اس کے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔ ''ہاں، اس نے بھی بہت مارا۔ لفظوں سے بھی اور ہاتھوں سے بھی۔'' اس کی آنکھیں پانی سے بھرنے لگیں۔ اس نے دوپٹے سے آنکھیں صاف کیں۔ ''لیکن آج مجھے اس کے شر سے بھی آزادی مل گئی۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''اب آپ کہاں جائیں گی؟''

''جانا تو باپ کے گھر ہی ہے لیکن جب تک وہ ڈائن ہے اس گھر میں ہے، میری جگہ وہاں نہیں۔ اس نے مجھے طلاق دلوائی۔ میں اسے طلاق دلوا کے رہوں گی۔'' اس نے نفرت سے کہا۔ میں خاموشی سے اسے دیکھنے لگا۔

''اس کام میں تم میری مدد کرو گے نا...؟'' اس نے امید بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''کیسی مدد؟''

''وہ تصویریں اسی بدذات عورت نے لیک کی ہیں۔ مجھے اس بات کے ناقابلِ تردید ثبوت درکار ہیں۔''

''میں نے اس حوالے سے کچھ کام تو کیا ہے۔ میں نے شاہینہ سے فون پر بات بھی کی ہے مگر وہ تو بہت پکی عورت ہے۔ بجائے ڈرنے کے الٹا مجھے دھمکانے لگی۔''

نسیمہ کے چہرے پر فکرمندی جاگی۔

''کیا کہا اس نے؟''

میں نے کال ریکارڈ کر لی تھی۔ میں نے وہ ریکارڈنگ اسے سنائی۔ مرد کی آواز سن کے اس کے چہرے پر الجھن نمودار ہوئی۔ ''یہ کون ہے؟''

''کیا مطلب؟ کیا یہ آپ کے والد صاحب نہیں ہیں؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''نہیں یہ آواز تو میرے لیے یکسر اجنبی ہے۔ یہ مکار عورت اس کے پاس کیا کر رہی ہے؟'' وہ الجھن بھرے انداز میں بولی۔ میں کندھے اچکا کے رہ گیا۔

میرا تو خیال تھا کہ یہ ملک ادریس ہی ہے لیکن یہ تو کہانی میں ایک اور کردار کا اضافہ ہو گیا تھا اور ساتھ ہی ایک نئی الجھن کا بھی۔

☆☆☆

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

ہر الجھن نے کبھی نہ کبھی سلجھنا ہی ہوتا ہے۔ شاہینہ کے ساتھ وہ مرد کون تھا، یہ بات بھی مجھے کچھ دیر بعد ہی پتا چل چکی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرے میں آکے میں نے سارا کو کال کی تھی۔ اس نے اپنی تفتیش مکمل کر لی تھی۔ وہ مجھے اس کے نتائج سے آگاہ کرنے لگی۔ اس کے مطابق موومی میکر نے جو ویڈیو اور تصاویر دی تھیں، ان میں وہ تصویر شامل نہیں تھی۔ اس نے اپنی کزن سے موومی میکر کا نمبر اور پتا بھی حاصل کر لیا تھا۔ اس کا نام کامران تھا اور اس کی فوٹو شاپ بہارہ کہو میں تھی۔

میں نے وہ نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے ہیلو کی آواز سن کے ہی میں چونک گیا۔ میرے لیے یہ آواز جانی پہچانی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میرے چہرے پر ایک گہری مسکراہٹ نمودار ہوگئی تھی۔ کڑی سے کڑی مل رہی تھی اور میرا کام آسان ہوتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

نسیمہ نے صاف کہہ دیا تھا کہ جب تک اس کی ماں کو طلاق نہیں ہوتی، وہ ہمارے گھر میں ہی رہے گی۔ محلے میں رہتے ہوئے ایک بیگانی عورت کو گھر میں رکھنا بھی دشوار تھا۔ لوگ سو طرح کی باتیں بناتے ہیں۔ امی اور ابو دونوں مروت کے مارے تھے، وہ زبردستی اسے گھر سے نکال نہیں سکتے تھے۔ دوسری طرف نسیمہ بیچاری کے باپ نے بھی اسے لے جانے کی کوشش نہیں کی تھی نہ اس کا اور کوئی رشتہ دار اسے ہمارے گھر سے لینے آیا تھا۔ گویا اب شاہینہ کے خلاف ثبوت اکٹھے کر کے اسے طلاق دلوانا میری بھی مجبوری بن چکا تھا۔

ہمارے پاس فی الحال شاہینہ کے خلاف جو ثبوت تھے، ان میں ایک تو وہ واٹس ایپ میسج تھا جو شاہینہ کے سیل نمبر سے نسیمہ کو کیا گیا تھا یا میرے پاس وہ ایک کال ریکارڈنگ تھی جس میں ایک اجنبی شخص شاہینہ کے ساتھ موجود تھا مگر یہ دونوں ثبوت ناکافی تھے۔ مزید ثبوت تلاش کرنے کے لیے میں اور نسیمہ اس وقت اس پرائیویٹ اسکول کے آفس میں موجود تھے جس کے احاطے میں نسیمہ کی تصاویر کھینچی گئی تھیں۔ آفس میں ایک ایل سی ڈی لگی تھی جس پر کیمروں کی لائیو فوٹیج چل رہی تھی۔ گیٹ پر لگے کیمرے کی فوٹیج میں پوری گلی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ منظر دیکھ کے میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

میں بھی پرائمری اسی اسکول سے پڑھا تھا۔ اس کی اونر مس سلطانہ میری بھی ٹیچر رہ چکی تھیں اور مجھ سے اچھی طرح واقف تھیں۔

وہ کسی کلاس میں مصروف تھیں۔ ایک ملازم ہمیں آفس میں بٹھا کے انہیں بلانے چلا گیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ آفس میں داخل ہوئیں۔ میں اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔ انہوں نے میرا پُرتپاک انداز میں استقبال کیا۔ نسیمہ کو میرے ساتھ دیکھ کے ان کے چہرے پر ناپسندیدگی کے تاثرات ابھرے۔ انہوں نے نسیمہ سے رسمی سے انداز میں ہاتھ ملایا اور مجھ سے گویا ہوئیں۔

''کیسے ہو حنان اور کیسی چل رہی ہے تمہاری پڑھائی؟''

''الحمدللہ میم..... بہت اچھی۔ ویسے بھی اس اسکول سے جو پڑھ کے گیا، اسے آگے کبھی اسٹڈیز میں مسئلہ نہیں ہوا'' ان سے میں نے کام بھی نکلوانا تھا چنانچہ مکھن لگانا بھی ضروری تھا۔

وہ فخریہ انداز میں مسکرائیں۔ ''یہ بات تو تم نے ٹھیک کہی۔ ہم اپنے بچوں کے ساتھ بہت محنت کرتے ہیں۔ ان کی بیس اتنی سٹرانگ بناتے ہیں کہ انہیں آگے واقعی اسٹڈیز میں مسئلہ نہیں ہوتا۔''

''جی بالکل۔ میں آج جس مقام پر ہوں، اس کا سارا کریڈیٹ آپ کو ہی دیتا ہوں۔ آپ نے بہت اچھے سے اسکول کو لیڈ کیا ہوا ہے۔'' میں نے مسکرا کے ان سے اتفاق کیا۔

''یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی تم بتاؤ، چائے لو گے یا ٹھنڈا۔''

''اس تکلف کی ضرورت نہیں۔ ایک انتہائی ضروری کام کی وجہ سے آپ کے پاس حاضر ہوا تھا۔ امید ہے آپ تعاون کریں گی۔''

وہ خشمگیں نظروں سے نسیمہ کو دیکھتے ہوئے بولیں۔ ''ہاں بولو، تم تو ہمارے ادارے کا فخر ہو۔ ہم تمہارا کہا بھلا کیسے ٹال سکتے ہیں۔''

میں مسکرایا۔ ''میم، کل آپ کے اسکول کے احاطے میں ان کی تصاویر کھینچی گئی تھیں۔'' میں نے نسیمہ کی طرف اشارہ کیا۔ ''ہم گیٹ پر لگے کیمرے کی سی سی ٹی وی فوٹیج دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ مذموم حرکت کس نے کی؟'' ان کے چہرے پر تجسس کے سے تاثرات اُبھرے۔ مجھے لگا کہ وہ انکار کرنے کے لیے کوئی بہانہ ڈھونڈ رہی ہیں۔ ان کے تاثرات دیکھ کے میں تیزی سے بولا۔

''میم، آپ کو معلوم ہوگا کہ اس نامعلوم شخص کی گھٹیا حرکت کی وجہ سے ان کی زندگی برباد ہوگئی۔ ان کے شوہر نے

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

ان کو طلاق دے دی اور جو بدنامی ہوئی وہ الگ۔ آپ ہماری مدد کر کے ہم پر بہت بڑا احسان کریں گی۔''

''تمہاری اس سب میں کیا دلچسپی ہے؟'' انہوں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''محض ایک شریف خاتون کی مدد کرنا اور ایسی حرکت کرنے والے شخص کو کیفر کردار تک پہنچانا۔''

''اوکے، یہ سامنے ہی کمپیوٹر پڑا ہے۔ تم خود کل کی فوٹیج چیک کر لو گے؟ یا میں کسی کو بلواؤں۔''

''میم، میں خود ہی چیک کر لیتا ہوں۔ ویسے بھی اتنا کمپیوٹر تو آپ نے پرائمری میں ہی سکھا دیا تھا۔'' میں مکھن کی ٹکیا کا فراخدلی سے استعمال کر رہا تھا۔ وہ خوشدلی سے مسکرائیں۔ میں کمپیوٹر پر بیٹھ گیا اور پچھلے دن کی فوٹیج نکال لی۔ میں نے دس بجے کا ٹائم سیٹ کیا اور ویڈیو کو فاسٹ فارورڈ پر لگا دیا۔ کچھ ہی دیر میں میرا مطلوبہ سین آ گیا۔ میں نے اپنے مطلوبہ سین کو پلے کیا۔ برقع میں ملبوس ایک خاتون دیوار سے اندر تصاویر پھینکتی ہوئی واضح نظر آ رہی تھی۔

''یہ..... یہ شاہینہ ہی ہے۔'' نسیمہ چیخی۔ میڈم سلطانہ نے ناگواری سے نسیمہ کی طرف دیکھا تاہم بولیں کچھ نہیں۔

میں نے اپنا مطلوبہ سین ویڈیو سے کٹ کیا اور اپنے موبائل میں ٹرانسفر کرنے کی غرض سے ڈیٹا کیبل کمپیوٹر کے ساتھ منسلک کرنے لگا۔ میڈم سلطانہ بے چینی سے مجھے دیکھ رہی تھیں تاہم انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

کچھ ہی دیر میں ہم شاداں و فرحاں گھر کی جانب گامزن تھے۔ میں نے اپنے حصے کا کام کر لیا تھا اب نسیمہ کو اپنے حصے کا کام کرنا تھا۔

☆☆☆

میں اور سارہ یونیورسٹی کے لان میں بیٹھے تھے۔ آج اس نے اپنے سیدھے بالوں کو گھنگھرالے کر کے کھلا رکھ چھوڑا تھا۔ آنکھوں میں گہرے کاجل کے علاوہ اس کا چہرہ کسی قسم کے میک اپ سے عاری تھا۔ وہ اس سادہ سے روپ میں بھی قیامت ڈھا رہی تھی۔ میں اسے گھورے جا رہا تھا اور وہ بے نیازی سے سیل فون میں مگن تھی۔

''تمہارے اس نئے کیس کا کیا بنا؟'' اچانک اس نے پوچھا۔

''کونسے کیس کا؟'' مجھے اندازہ تو ہو گیا تھا کہ وہ نسیمہ کے متعلق ہی پوچھ رہی ہے۔ تاہم میں نے انجان بن کے پوچھا۔

''ہونہہ..... کونسا کیس تو ایسے پوچھ رہے ہو جیسے تمہارے پاس کیسوں کی ریل پیل لگی ہے۔'' وہ طنزیہ انداز میں گویا ہوئی ہے۔

''کیس تو میرے ہر طرف بکھرے پڑے ہیں لیکن تمہاری یادوں سے فرصت ملے تو اور کچھ کروں۔'' میں نے ٹھنڈی آہ بھری۔ اس کا چہرہ بلش ہوا۔

''بکومت۔ میں تمہارے محلے کی اپسرا، نسیمہ بیچاری کی بات کر رہی ہوں۔ جس کی مدد کے تمہارے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے تھے۔'' اس نے طنز کے وار جاری رکھے۔

''اوہ اچھا..... تم اس کے بارے میں پوچھ رہی ہو۔ اس بیچاری کو تو طلاق ہو گئی۔''

سارہ کے چہرے پر متاسفانہ تاثرات اُبھرے۔

''مطلب تمہارا کیس شروع ہونے سے پہلے ہی بند ہو گیا؟''

''میرا کیس تو اب شروع ہوا ہے۔'' میں پُراسرار انداز میں مسکرایا۔

''کیا مطلب؟ کیا تم نے اب اس کی دوسری شادی کرانے کا بیڑا اٹھا لیا ہے؟'' کم بخت نے ''طنزیات'' میں گویا پی ایچ ڈی کر رکھی تھی۔

''اس کی سوتیلی ماں شاہینہ کو طلاق دلوانی ہے اب۔''

اس کی آنکھیں پھیلیں۔ ''چچ چچ..... تو اب حنان صاحب پھاٹکنی عورتوں کی طرح یہ کام کریں گے؟''

''مجبوری ہے۔ نسیمہ طلاق کے بعد ہمارے گھر آ گئی ہے۔ جب تک شاہینہ اس کے باپ کے گھر میں ہے وہ اپنے گھر نہیں جا سکتی۔ گویا اسے اپنے گھر سے نکلوانے کے لیے شاہینہ کو اس کے گھر سے نکلوانا پڑے گا۔''

''اور یہ کام تم کیسے کرو گے؟ کیسے دلواؤ گے شاہینہ کو طلاق؟'' اس نے طنزیہ انداز میں استفسار کیا۔

میں اسے اب تک کی کارگزاری سنانے لگا۔ ''کام تو ویسے یہ نیکی کا ہے۔'' وہ ساری بات سن کے پُرسوچ انداز میں بولی۔

''کیا مطلب؟''

''میری کزن ماریہ کی زندگی اس نے اجیرن کر رکھی ہے۔ اس کا شوہر تو معقول ہے لیکن شاہینہ نے دو ہفتوں میں ہی اس کا ناک میں دم کر دیا ہے۔ اس کی موجودگی میں مجھے وہ وہاں بسنے والی نہیں لگتی۔''

''گویا اسے طلاق دلوانے میں تمہارا انٹرسٹ بھی ہے۔'' میں نے پُرجوش انداز میں کہا۔

''میرا انٹرسٹ تو اسی وقت شامل ہو گیا تھا جب تمہارا انٹرسٹ شامل ہوا تھا اس میں۔'' وہ دھیرے سے مسکرائی۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

میرے دل نے گھنٹیاں بجائیں۔ ''لیکن اب ماریہ کی وجہ سے انٹرسٹ بڑھ گیا ہے۔''

''دو ہاتھ۔'' میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''پھر تو ہم مل کے ایک ٹیم کی صورت کام کریں گے۔''

''ہاتھ وقت آنے پر میرے والدین سے مانگنا۔'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ میں نے کھسیا کے ہاتھ پیچھے کر لیا۔

''شاہینہ کو طلاق دلوانے میں ماریہ ہمارے لیے کیا کر سکتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

سارہ ہنسی۔ ''وہ تو کچھ بھی کر سکتی ہے۔ کل وہ فون پر تو اتنے غصے میں تھی کہ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ شاہینہ کا گلا گھونٹ کے اسے مار دے۔''

''بس تو پھر اس کے ذمے بھی ایک کام لگا دو۔''

''وہ کیا۔'' سارہ نے پوچھا تو میں اسے اپنے منصوبے کے بارے میں بتانے لگا۔

☆☆☆

شام کو میں جم سے واپسی پر اپنی گلی میں داخل ہوا ہی تھا کہ میں نے اپنے گھر کے گیٹ پر ایک گاڑی رکتے دیکھی۔ اس سے ایک شخص اترا اور تذبذب کے عالم میں گھر کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے بائیک گیٹ پر روکی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

''خالد صاحب کا گھر یہی ہے؟''

''جی ہاں، میں ان کا بیٹا ہوں حنان۔ اور آپ.....؟'' میں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''میں ادریس ہوں۔ نسیمہ کا باپ۔'' اس نے سپاٹ انداز میں کہا۔

''اوہ انکل، آپ۔'' میں نے خوشدلی سے مصافحے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے سرد سے انداز میں میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے کال بیل بجائی اور اس کا جائزہ لینے لگا۔ وہ تقریباً ساٹھ سال کی عمر کا پروقار مرد تھا تاہم اس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی سرد مہری تھی۔

ابو کو گیٹ کھولتے دیکھ کے مجھے خاصی حیرت ہوئی۔ وہ آج بہت جلدی گھر آ گئے تھے۔ میں نے انہیں سلام کیا اور ادریس کا تعارف ان سے کرانے لگا۔ وہ اسے اپنے ساتھ اندر لے گئے۔

میں نے بائیک پورچ میں کھڑی کی اور اندر داخل ہو گیا۔ امی اور نسیمہ لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔ نسیمہ کے چہرے پر خوف پھیلا ہوا تھا۔ امی اسے تسلی دے رہی تھیں۔

''ابو آج جلدی آ گئے۔ خیریت؟'' میں نے امی سے استفسار کیا۔

''ہاں میں نے خود فون کر کے اس کے لیے انہیں جلدی بلایا ہے۔'' انہوں نے نسیمہ کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ اچھا کیا آپ نے۔'' میں نے تعریفی انداز میں کہتے ہوئے نسیمہ کی طرف دیکھا۔

وہ تذبذب کے عالم میں کھڑی تھی۔ ''جاؤ بیٹا، کچھ نہیں ہوتا۔ تمہارے انکل ہیں ناں ادھر۔'' نسیمہ مرے ہوئے قدموں سے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھنے لگی۔

''میں بھی جاؤں ادھر۔'' میں نے امی سے پوچھا۔

''کوئی ضرورت نہیں۔ تم سے اپنی زبان کنٹرول ہو گی نہیں۔ ایسا نہ ہو سارا معاملہ خراب کر دو۔''

''کہاں امی۔ مجھے کیا بولنا ہے۔ آپ کے میاں کے سامنے تو میری بولتی ویسے ہی بند ہو جاتی ہے۔'' میں چہرے پر مسکینی سجا کے بولا۔

''میرے میاں؟ تمہارے تو جیسے کچھ لگتے ہی نہیں۔'' انہوں نے خفگی سے کہا اور کچن کی طرف بڑھ گئیں۔

میرا بدن تھکن سے ٹوٹ رہا تھا۔ میں غسل کرنے کے لیے واش روم میں گھس گیا۔

دن کو میں نے شاہینہ کے خلاف سارے ثبوت نسیمہ کے حوالے کر دیے تھے۔ اس نے اپنے باپ کو کال کر کے ہمارے گھر بلوایا تھا۔ اس نے شام کو آنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ حسب وعدہ آ تو گیا تھا لیکن وہ سارے ثبوت دیکھ کے شاہینہ کو طلاق دے دیتا، یہ ضروری نہیں تھا۔ غسل کرتے ہوئے بھی میں اسی ادھیڑبن میں مصروف رہا۔

میں غسل کر کے باہر نکلا تو امی چائے کا کپ لیے میری منتظر تھیں۔

''آپ نے ڈرائنگ روم میں چائے دے دی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں دے دی۔''

''کیسا ماحول ہے ڈرائنگ روم کا؟ قائل ہوئے ادریس صاحب۔'' میں نے چائے کا کپ اٹھایا کے پُرتجسس انداز میں پوچھا۔

''پتا نہیں۔ نسیمہ اس کے پاس بیٹھی رو رہی تھی۔ میں چائے دے کے ٹھہری نہیں۔''

''تو بیٹھتی ناں ادھر۔ تھوڑا مسالا شسالا ہی لگا آتیں۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''مجھے کیا مسالا لگانا تھا۔ اللہ، اس کے باپ کو عقل

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

دے۔ اپنا گھر بسا کے بیٹی کو بھول ہی گیا۔ بڑے ستم سہے ہیں بیچاری نے اس ناگن کے۔''

میں اور امی گفتگو کر رہے تھے کہ باہر ابو کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ میں باہر نکلا۔ ابو، ادریس کو رخصت کرنے باہر جا رہے تھے۔ نسیمہ لاؤنج میں آ گئی۔ وہ خاصی الجھی ہوئی لگ رہی تھی۔

''کیا رہا؟'' میں نے پوچھا۔

''پتا نہیں کیا ہوگا۔'' اس نے تھکے تھکے سے انداز میں کہا۔ ''سارے ثبوت دیکھنے کے بعد بھی انہیں میرا یقین نہیں آیا۔ کہہ رہے تھے شاہینہ سے بات کروں گا۔'' اس کی آواز بھرّانے لگی۔

''اب مزید کیا بات کریں گے؟'' میں تنک کے بولا۔

امی اسے تسلیاں دینے لگیں۔ میرا دماغ غصے سے کھول رہا تھا۔ مجھے اپنی ساری محنت اکارت جاتی نظر آ رہی تھی۔

☆☆☆

دو دن اسی امید کے سہارے گزر گئے کہ ادریس صاحب نسیمہ کو لینے آئیں گے مگر نہ وہ آئے نہ انہوں نے فون پر نسیمہ سے رابطہ کیا۔ نسیمہ بیچاری بالکل بجھ کے رہ گئی تھی۔ میں نے اسے بارہا کہا کہ وہ خود فون کر کے ان سے پوچھے مگر وہ ہر بار یہی بات دہراتی۔

''انہیں میری پروا ہی نہیں۔ پروا ہوتی تو اسی دن مجھے یہاں سے لے جاتے۔''

دوسری طرف سارہ کو ماریہ سے بھی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ ماریہ کو اتنا اندازہ تو ہو گیا تھا کہ اس کے ساس سسر میں جھگڑا ہوا ہے مگر جھگڑے کی نوعیت کے بارے میں وہ کچھ بتانے سے قاصر تھی۔

قریب تھا کہ میں بھی نسیمہ کی طرح مایوس ہو جاتا کہ شاہینہ، ماریہ کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس گئی۔ اس جال کا آئیڈیا میرا ہی تھا۔ اس دن سارا نے کال کی تو اس کی آواز سنتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کے ہاتھ کوئی زبردست خبر لگی ہے۔

''مل گیا وہ شاہکار جس کا تھا انتظار۔'' اس نے گنگناتی ہوئی آواز میں کہا تھا۔

''کیا مطلب؟''

''واٹس ایپ چیک کر کے کال کرو۔'' اس نے یہ کہتے ہوئے کال کاٹ دی تھی۔ میں نے واٹس ایپ کھولا۔ اس میں سارہ کی طرف سے چند ''وائس میسجز'' موجود تھے۔ میں وہ سننے لگا۔ میسجز سنتے ہوئے میرا رُواں رُواں خوشی سے بھر گیا۔

جنرل نالج

نصرت بھٹو: ذوالفقار بھٹو کی دوسری بیوی تھی جسے وہ بے تحاشا چاہتا تھا۔

پدماوتی: رتن سنگھ کی دوسری بیوی تھی جس پر وہ دل و جان سے نثار تھا۔

جودھا بائی: اکبر کی تیسری بیوی تھی جس سے اس کی محبت کے چرچے زبان زد عام تھے۔

ممتاز: شاہ جہاں کی آٹھویں بیوی تھی جس کی محبت میں اس نے تاج محل بنوایا۔

تاریخ گواہ ہے کہ کسی بھی شوہر نے اپنی پہلی بیوی سے دیوانہ وار محبت نہیں کی۔

یہ صرف جنرل نالج کے لیے ہے۔ گھر میں اس کا تذکرہ کرنے سے گریز کریں۔

کوئٹہ سے نور خان حسنی کا مطالعہ

ان میسجز میں شاہینہ اور مووی میکر کامران کی گفتگو ریکارڈ تھی۔ یہ گفتگو ان کے بیہودہ قسم کے رومانس سے بھری ہوئی تھی۔ ادریس کا بھی دونوں خوب مذاق اڑا رہے تھے۔

ماریہ نے میرے کہنے پر شاہینہ کے موبائل میں ''کال ریکارڈنگ ایپ'' انسٹال کر دی تھی۔ یہ ایپ خاموشی سے شاہینہ کی تمام کالز ریکارڈ کرتی رہی تھی۔ موقع نکال کے ماریہ نے وہ ساری کال ریکارڈنگ حاصل کر کے سارہ کو بھیج دی تھیں۔

میں نے وہ ریکارڈنگز نسیمہ کے نمبر پر سینڈ کیں اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ نسیمہ لاؤنج میں ٹی وی کے آگے بیٹھی تھی۔ اس نے نظریں تو ٹی وی پر جمائی ہوئی تھیں مگر اس کا ذہن دور کہیں خیالوں میں گم تھا۔ مجھے دیکھ کے وہ چونک کے اپنے خیالات سے باہر آئی۔

''بڑے خوش نظر آ رہے ہو؟''

''بات ہی خوشی کی ہے۔ میں نے شاہینہ کے گرد ایک خفیہ جال بُنا تھا، وہ میری توقع کے مطابق وہ اس میں گرفتار ہو گئی ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے اسے اپنی خوشی کی وجہ بتائی۔

اس کا چہرہ الجھن کی آماجگاہ بن گیا۔ ''کیا مطلب؟''

Waqar Azeem www.paksitanipoint.com

''واٹس ایپ چیک کریں۔'' میں کہہ کے گنگنانے لگا۔

اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے موبائل نکال لیا۔ کال ریکارڈنگز سنتے ہوئے اس کے چہرے پر پھیلی الجھن خوشی میں بدلتی چلی گئی۔ میں پل پل اس کے بدلتے تاثرات کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

''یہ تو بڑے کام کی چیز نکالی تم نے۔'' ساری ریکارڈنگز سنتے ہی وہ پُرجوش انداز میں بولی۔ میں فخریہ انداز میں مسکرایا۔

''لیکن تم نے یہ کیا کیسے؟''

''کیسے کو چھوڑیں۔ بس مزے اڑائیں۔'' میں کہتے ہوئے باہر نکل آیا۔ میرے جم جانے کا وقت ہو گیا تھا۔

شام کو واپسی ہوئی تو نسیمہ کو اپنا منتظر پایا۔ خوشی اس کے چہرے سے چھلک رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ پُرجوش انداز میں بولی۔

''ہمارا مشن کامیاب ہو گیا۔ ابو نے اس ڈائن کو طلاق دے دی ہے۔''

''واقعی۔'' میں حیرانی سے بولا۔ ''تم کو کیسے پتا چلا؟''

''ابھی کچھ دیر قبل ابو کی کال آئی تھی۔ انہوں نے بتایا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''ابو مجھے ابھی لینے آرہے ہیں۔ تمہارے دیے ہوئے واٹس ایپ میسجز نے کام کر دیا۔ وہی سن کے ابو اور شاہینہ کا زوردار جھگڑا ہوا اور ابو نے اسے غصے میں طلاق دے دی۔''

''تو اب آپ چلی جائیں گی؟'' تھی تو میرے لیے یہ خوشی کی بات مگر میں چہرے پر اداسی سجا کے بولا۔ آخر مروت بھی تو کسی چڑیا کا نام ہے۔

''ہاں۔'' اس کے چہرے پر بھی اُداسی پھیل گئی۔ ''حنان تم نے مجھ پر جو احسان کیا، میں زندگی بھر نہیں بھول پاؤں گی۔ مجھے تو اپنے بھی ڈستے ہی رہے مگر تم نے غیر ہوتے ہوئے بھی ہر قدم پر میرا ساتھ دیا۔'' اس کی آواز بھرانے لگی۔

''انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ میں نے آپ کے لیے جو بھی کیا انسانیت کے ناتے کیا۔ آپ کو اتنا احسان مند ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''ہاں..... مگر ایسے انسان تو اب معاشرے میں ناپید ہی ہوتے جارہے ہیں۔ آج کا انسان تو انسان کے کام آنے کے بجائے اسے نقصان پہنچانے کے ہی درپے رہتا ہے۔'' اُس نے اداسی سے کہا۔

بات تو وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ واقعی آج کا انسان دوسرے انسان کو مددگار کے بجائے حریف ہی سمجھتا ہے۔ خود آگے نہ بڑھ سکے لیکن دوسرے کو پیچھے کھینچنا اس نے اپنا وتیرہ بنا لیا ہے۔ میں یہ بات کہہ کے اس کی اداسی میں مزید اضافہ نہیں کر سکتا تھا چنانچہ بولا۔ ''انسانوں میں انسانیت کم ضرور ہو گئی ہے مگر ختم نہیں ہوئی۔ آج بھی آپ کو ایسے انسان مل جائیں گے جو بغیر کسی غرض کے آپ کے کام آئیں گے۔''

''جیسے تم۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں..... جیسے میں۔'' میں نے خوشدلی سے ہنستے ہوئے اعتراف کیا۔

ہم باتیں کر رہے تھے کہ کال بیل کی آواز سنائی دی۔ میں گیٹ پر گیا تو توقع کے مطابق ادریس صاحب کو گیٹ پر پایا۔ ان کا چہرہ اس وقت بھی غصے سے سرخ نظر آرہا تھا۔ میں نے مصافحے کے لیے ان کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ان کا ہاتھ لرز رہا تھا۔ میں انہیں اندر لے آیا۔

نسیمہ انہیں دیکھتے ہی ان کی طرف لپکی۔ انہوں نے اسے اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ نسیمہ کا وجود ہچکیوں سے لرز رہا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کے حیرت ہوئی کہ ادریس صاحب کی سرد آنکھوں میں بھی آنسو چمک رہے تھے۔ آخر کار ایک سنگلاخ چٹان سے بھی چشمہ پھوٹ ہی نکلا تھا۔

کچھ دیر بعد میں اور امی انہیں رخصت کر رہے تھے۔ نسیمہ بار بار امی سے لپٹ کے ان کا شکریہ ادا کر رہی تھیں۔ انہیں رخصت کرنے کے بعد میں اپنے کمرے میں آگیا۔ میں خوش تھا کہ ایک اور کامیاب کیس میرے کریڈٹ میں آگیا ہے۔

میں بیڈ پر گرا اور موبائل نکال کے اس کی بھول بھلیوں میں گم ہو گیا۔ اچانک مجھے سارہ کی طرف سے واٹس ایپ میسج موصول ہوا۔ یہ ایک واٹس میسج تھا۔ میں میسج سننے لگا۔ میں جوں جوں میسج سنتا جا رہا تھا میرے چہرے پر الجھن کی لکیریں بڑھتی جا رہی تھیں۔ میں جس بات کو روزِ روشن کی طرح عیاں سمجھ رہا تھا وہ تو تا حال ایک بھید تھا۔

ابھی کچھ دیر قبل میں اس کیس کو کامیابی سے حل کرنے کی خوشی منا رہا تھا مگر اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ یہ میری بھول تھی۔ ابھی تو اس کیس کی کئی پرتیں کھلنا تھیں۔

☆☆☆

اگلے دن میں جنرل اسٹور سے کچھ سامان لے کے گھر جا رہا تھا کہ میں نے طاہر کے گھر کا گیٹ کھلتے دیکھا۔ اس میں سے ایک عورت دندناتی ہوئی برآمد ہوئی۔ وہ خاصے غصے میں

www.pakistanipoint.com
Waqar Azeem

لگ رہی تھی۔

''شاہینہ میری بات تو سنو۔'' میرے کانوں میں طاہر کی آواز پڑی۔

اچھا، تو یہ ہے شاہینہ۔ میں نے اسے بغور دیکھتے ہوئے سوچا۔ اس کی عمر تو پینتالیس سال سے اوپر ہوگی مگر بڑھتی عمر اس پر کچھ خاص اثر انداز نہیں ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ غصے کی شدت سے تمتما رہا تھا۔ وہ اس عالم میں بھی حسین لگ رہی تھی۔ ادریس اگر اس کا ساتھ پا کے اپنی بیٹی سے غافل ہو گیا تھا تو اس میں اس کا اتنا قصور نہیں تھا۔

جسمانی لحاظ سے بھی وہ بالکل فٹ تھی۔ اس کی جسامت بالکل نسیمہ جیسی ہی تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے اچانک میرے ذہن میں جھماکا ہوا۔ میرے ذہن کے کسی نہاں خانے کی کھڑکی کھلی اور ایک خیال نکل کے پھڑ پھڑانے لگا۔ میں پُرسوچ انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

شاہینہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی میرے پاس سے گزر گئی۔ طاہر گیٹ پر کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر بے بسی کے ساتھ ساتھ غصے کے تاثرات تھے۔ اچانک وہ پیچھے مڑتے ہوئے دہاڑا۔ ''تم دفع ہو جاؤ اندر۔'' میری نظر جونی پر پڑی۔ اس پر باپ کے غصے کا کوئی اثر ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ ڈھیٹ بنا اُدھر ہی کھڑا رہا۔ باپ کی شہ نے اسے ضدی اور خود سر بنا دیا تھا۔ آج اس کے مزاج کی یہ کجی طاہر کے گلے پڑ رہی تھی۔

اس نے ایک جھٹکے سے گیٹ بند کیا۔ اس کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ آج جونی کی خیر نہیں۔ میرا دل جونی کی خیریت کی دعا مانگنے لگا۔

☆☆☆

یہ کوئی ڈیڑھ ہفتے بعد کی بات ہے۔ اتوار کا دن تھا۔ میں گیارہ بجے ناشتا کر کے فارغ ہوا ہی تھا کہ نسیمہ ہمارے گھر داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ خوشی سے کھل رہا تھا۔ خوبصورت تو وہ پہلے بھی تھی ہی لیکن اس وقت اس کا چہرہ الوہی سا منظر پیش کر رہا تھا۔

اس کے ساتھ جونی کو دیکھ کے مجھے حیرت ہوئی۔

''کیسے ہو حنان؟ آنٹی کہاں ہیں؟'' اس نے خوشدلی سے پوچھا۔

''امی فوتگی پر گئی ہوئی ہیں۔'' میں نے اسے بتایا۔

''آپ کو خوش دیکھ کے، مجھے بے حد خوشی ہو رہی ہے۔'' میں نے اس کے کھلے کھلے چہرے پر نظر جما کے کہا۔ یہ واقعی حقیقت تھی۔ اس کا چمکتا دمکتا چہرہ دیکھ کے میری صبح خوشگوار ہوگئی تھی۔

''جونی، انکل سے ہاتھ ملاؤ۔'' وہ نرمی سے جونی سے مخاطب ہوئی۔ جونی جب بھی اس کے ساتھ ہوتا تھا وہ ہمیشہ اسے سب سے ملنے کا کہتی تھی مگر وہ جونی ہی کیا جو اس کی بات مان لیتا۔ مگر اس وقت میں حیرت سے گنگ رہ گیا جب جونی نے بنا کچھ کہے خاموشی سے ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ وہ بالکل گم صم لگ رہا تھا۔

میں نے اسے ساتھ لپٹا کے لاڈ کیا۔ وہ خاموشی سے میرے پاس بیٹھ گیا۔

''اس کی طبیعت کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہوتی۔'' میں نے فکر مندی سے کہا۔

نسیمہ ہنسی۔ ''اب جا کے تو اس کی طبیعت ٹھیک ہوئی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''تم اسے کمپیوٹر پر کوئی گیم لگا دو نا۔ پھر بات کرتے ہیں۔'' وہ شاید اس کے سامنے کوئی بات نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔

میں جونی کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ کمپیوٹر پر اسے گیم لگاتے ہوئے کہا۔ ''بس گیم ہی کھیلنا اور چھیڑ چھاڑ نہ کرنا۔'' اس نے فرمانبرداری سے سر ہلا دیا۔ میں اس کی کایا پلٹ پر حیران تھا۔ کہاں تو جونی میاں، جہاں جاتے ہلچل مچا دیتے تھے اور اب اتنی شرافت۔

میں واپس لاؤنج میں آیا تو نسیمہ موبائل کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔

''جونی تو شرافت کا پتلا بن گیا ہے۔'' میں نے حیرت سے کہا۔

''باپ کا زہریلا سایہ جو اس کے سر پر نہیں رہا۔'' وہ مسکرائی۔ میرے چہرے پر اچنبھے کے تاثرات پھیلتے دیکھ کے اس نے وضاحت کی۔ ''اس نے دو ہفتے میں ہی طاہر کا ناک میں ایسا دم کیا کہ وہ اسے میرے پاس چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ شاہینہ بھی جونی سے تنگ آ کے گھر چھوڑ کے چلی گئی تھی۔ اس کے لیے تنہا جونی کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ اب جونی ایک ہفتے سے میرے ساتھ ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ بالکل سدھر گیا ہے۔''

''طاہر اس پر تشدد بھی کرتا رہا ہے۔'' میں نے اسے اطلاع دی۔

''میں جانتی ہوں۔ دوسروں پر ہاتھ اٹھانا تو اس کی گھٹی میں پڑا ہے۔'' اس نے تنفر سے کہا۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

''آپ اتنے دن جونی کے بغیر کیسے رہیں؟ وہ بھی اتنے ظالم باپ کے حوالے کر کے۔''

وہ پُراسرار سے انداز میں مسکرائی۔ ''مجھے یقین تھا کہ جلد یا بدیر وہ اسے میرے پاس چھوڑنے پر مجبور ہوگا اور میرا یقین درست نکلا۔''

''آپ نے طاہر سے طلاق لینے کے لیے خود ہی اپنی تصویریں جونی کے اسکول میں پھینکی تھیں نا؟'' میں نے یکدم دھماکا کیا۔ اس کی رنگت متغیر ہوئی۔

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟'' اس کی آواز لرز رہی تھی۔

میں ہنسا۔ ''جاسوس اپنی معلومات کے ذرائع کبھی افشا نہیں کرتے۔''

''یعنی محض تکّا مارا ہے۔'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''تکّا نہیں، میرے پاس ٹھوس ثبوت ہے۔'' میں نے منہ بنا کے کہا۔

''تو دکھاؤ۔'' اس کا انداز چیلنج کرنے والا تھا۔

''مطلب، آپ میری معلومات کے ذرائع افشا کرائے بغیر یقین نہیں کریں گی۔'' میں نے مصنوعی تاسف سے کہا۔

''بالکل بھی نہیں۔'' وہ مسکرائی۔

میں نے اسے وائس کلپ سنایا۔ یہ شاہینہ کی کال ریکارڈنگ ہی تھی۔ اس میں وہ کامران کو بتا رہی تھی کہ اوریس نے اس پر نسیمہ کی تصاویر اسکول میں پھینکنے کا الزام لگایا ہے۔ ساتھ ہی وہ حیرت کا اظہار کر رہی تھی کہ اس نے تصویر نسیمہ کو بھیجی تو تھی لیکن نہ ہی اسکول میں پھینکی تھی اور نہ ہی شاہینہ ملک کی آئی ڈی اس کی ہے۔''

میرا تو نسیمہ کے اس نظریے پر پختہ یقین تھا کہ تصویریں شاہینہ نے ہی لیک کی ہیں مگر نسیمہ کی گفتگو سن کے میں اُلجھن کا شکار ہو گیا تھا۔ وہ کم سے کم کامران سے تو اس بابت جھوٹ نہیں بول سکتی تھی۔ وہ دونوں تو ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔ میں نے شاہینہ کو کبھی دیکھا نہیں رکھا تھا۔ جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی جسامت نسیمہ کے جیسی ہے۔ سی سی ٹی وی فوٹیج میں تصویریں پھینکنے والی عورت برقع میں ملبوس تھی اور نسیمہ کے بقول یہ برقع شاہینہ کا تھا۔ اس وقت میں نے بھی نسیمہ کی بات کا یقین کر لیا تھا مگر اب مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس سارے چکر میں فائدہ نسیمہ کا ہی ہوا تھا۔ یہ سارا کھٹراگ اسی نے پھیلایا تھا۔

کال پر شاہینہ نے بھی کامران سے اسی خدشے کا اظہار کیا تھا کہ اس سب کے پیچھے نسیمہ کا ہی ہاتھ ہو سکتا ہے۔ اس وقت شاہینہ کا یہ اندازہ میرے دل کو نہیں لگا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ کوئی ماں اپنے ہی بیٹے کے اسکول میں اپنی ایسی تصاویر پھینکتی جو نہ صرف اپنی بدنامی کا باعث بنتیں بلکہ بیٹے کو بھی تماشا بنا دیتیں مگر شاہینہ کو دیکھ کے مجھے یقین آ گیا تھا کہ یہ کام نسیمہ ہی کا ہو سکتا ہے، اور کوئی ایسا کرتا تو اب تک سامنے آ چکا ہوتا۔

یہی سوچ کہ میں نے نسیمہ کے سامنے تکّا مارا تھا۔ اس کے تاثرات دیکھ کے مجھے یقین آ گیا تھا کہ میرا تکّا محض تکّا نہیں بلکہ تیر تھا جو ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔

نسیمہ ریکارڈنگ سن رہی تھی اور میں بغور اس کے بدلتے تاثرات دیکھ رہا تھا۔

''میرے پاس اور کوئی چارہ ہی نہیں رہا تھا۔ میں جونی کی بہتری کے لیے یہ قدم اٹھانے پر مجبور ہو گئی تھی۔'' اس نے ریکارڈنگ سن کے تلخی سے کہا۔

''کیسی بہتری؟ آپ نے تو اس بیچارے کا تماشا بنا دیا۔'' میں نے حیرت سے کہا۔

''وہ روز بروز بگڑ رہا تھا۔ میرے اور طاہر کے روز روز کے جھگڑوں سے اس کی شخصیت مسخ ہو کے رہ گئی تھی۔ باپ کی طرح تشدد اس کے بھی مزاج کا حصہ بنتا جا رہا تھا۔ آئے روز جونی کے اسکول اور محلے میں جھگڑے ہوتے۔ اس کا باپ اسے بجائے منع کرنے کے اسے اور شہ دیتا تھا۔ اس کے کارناموں پر فخر کرتا تھا۔ میں نے خود ایب نارمل زندگی گزاری ہے۔ اب میں اپنے بیٹے کو بھی ایب نارمل ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ابھی تو وہ بچہ ہے لیکن اس کے شر سے کوئی بھی محفوظ نہیں تھا۔ بڑا ہو کے تو وہ عفریت بن جاتا۔ تب میں اپنی آنکھوں سے اپنے بیٹے کے ہاتھوں لوگوں کو برباد ہوتے کیسے دیکھ سکتی تھی۔ میں نے ہر حربہ آزما کے دیکھ لیا تھا۔ مجھے اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ جونی جب تک اپنے باپ کی صحبت میں رہے گا، اس کی شخصیت میں بجائے بہتری آنے کے بگاڑ ہی آئے گا۔ طاہر کسی بھی صورت مجھے چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ ایسے میں مجھے شاہینہ نے وہ تصویر بھیجی۔ اس کا نمبر تو میرے پاس نہیں تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ یہ تصویر اسی نے مجھے بھیجی ہے۔ جو بعد ازاں تم نے درست ثابت کر دیا۔ اس کا مقصد مجھے محض نیچا دکھانا تھا۔ لیکن میں نے اس کی چال اسی پر الٹنے کا فیصلہ کیا۔ میں جانتی تھی کہ طاہر ایسے تو مجھے چھوڑے گا نہیں لیکن جونی میرے ساتھ

www.pakistanipoint.com

رہنے سے انکار کر [illegible]
جاتا۔ میں بھی بولی [illegible] وہ
ایک بار ضد پر آجاتا تھا تو [illegible] طاقت اسے ضد سے
ہٹا نہیں سکتی تھی۔ اب [illegible] کے دل میں اپنے لیے نفرت
پیدا کرنا تھا۔"

میں حیرت سے منہ کھولے اس کی طلسم ہوشربا سن رہا تھا۔ یہ کیسی ماں تھی جو اپنے بیٹے کے دل میں اپنے لیے ہی نفرت پیدا کررہی تھی اور بقول اس کے وہ یہ سب اپنے بیٹے کی بہتری کے لیے ہی کررہی تھی۔

"شاہینہ نے جب مجھے تصویر بھیجی تو میرے ذہن میں طاہر سے چھٹکارے کا ایک منصوبہ پلنے لگا۔ میں نے بہت سوچ بچار کے بعد ایک پلان تیار کیا۔ جس پر کامیابی سے عمل کرکے میں ایک تیر سے چار چار شکار کرسکتی تھی۔ طاہر اور شاہینہ سے چھٹکارا، اپنے بیٹے اور باپ کے دل میں اپنی جگہ بنانا میرا مقصد تھا۔" وہ فخریہ انداز میں مسکرائی۔ آج میں ایک بالکل نئی نسیمہ سے روشناس ہورہا تھا۔ اس کا کردار تو ایک پہیلی کی طرح تھا۔ پرت در پرت چھپا۔ وہ میرے سامنے بیٹھی اپنے کردار کی پرتیں ہٹارہی تھی اور میں دم بخود سنتا جارہا تھا۔

"میں نے تصاویر صاف کروائیں۔ یہ مشکل کام کرنے کے بعد میں نے احتیاطاً شاہینہ ملک کے نام سے فیس بک پر آئی ڈی بنائی اور اس میں محلے کے لوگوں کو ایڈ کیا۔ سی سی ٹی وی فوٹیج کے ذریعے شاہینہ پر شک ڈلوانے کے منصوبے میں رسک تھا اس لیے آئی ڈی بنانا بھی ضروری تھی۔ اگلے مرحلے میں، میں اپنے میکے گئی اور موقع دیکھ کے شاہینہ کا برقع لے آئی۔ وہ یہ برقع کبھی کبھی استعمال کرتی تھی۔ مجھے پتا تھا کہ اسکول کے گیٹ پر کیمرے لگے ہیں۔ میں نے کیمرے کے سامنے آکے تصاویر اندر پھینک دیں۔ ایسا کرتے ہوئے میرا دل جس کرب سے گزرا، وہ میں ہی جانتی تھی۔ میں نے اپنے بچے کی بہتری کے لیے خود کو اور اپنے بیٹے کو پوری دنیا کے سامنے تماشا بنادیا۔ میں نے ایک بہت بڑا جوا کھیلا تھا۔ اپنی اور اپنے بیٹے کی زندگی میں نے داؤ پر لگادی تھی۔ میں ہار جاتی تو میرے پاس کچھ بھی...... کچھ بھی نہ بچتا۔" اس کے لہجے میں یکدم جیسے صدیوں کی تھکن اُتر آئی تھی۔

اس نے میز پر رکھے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا اور ایک ہی سانس میں پی گئی۔

"میں جانتی تھی کہ اب مجھ پر اور میرے بیٹے پر ہر طرف سے پتھر برسیں گے۔ لوگوں کی زبانوں سے لگنے والے زخم ہمیں لہولہان کردیں گے لیکن یہ چند دن کی تکلیف تھی۔ اس کے بعد راحت ہی راحت تھی۔ مجھے اپنے باپ کا سایہ مل جاتا تھا اور میرے بیٹے کو اپنے باپ کے سائے سے نجات۔ اس کے بعد میں اس کی پرورش اپنے ڈھنگ سے کرسکتی تھی۔" ماما کی اس انوکھی کہانی نے مجھے گنگ کردیا تھا۔

"میرا کردار بھی کیا آپ کے منصوبے کا حصہ تھا؟" میں نے شکوہ کناں انداز میں پوچھا۔

"ہاں۔" وہ ہلکا سا مسکرائی۔ "میں جانتی تھی کہ تمہیں جاسوسی اور خلقِ خدا کی مدد کا شوق ہے۔ مجھے یقین تھا کہ تم میری مدد ضرور کرو گے اور دیکھو میرا یقین غلط نہیں تھا۔"

میں حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ میں اسے سائیکو سمجھتا تھا مگر وہ تو کمال کی نفسیات داں تھی۔ اس نے اپنی کہانی کے تمام کرداروں کی نفسیات کا بالکل درست اندازہ لگایا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں اس کہانی میں اپنا کردار ادا کررہا ہوں مگر مجھ سمیت اس کہانی کے سب کردار اس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلیوں کی طرح حرکت پذیر تھے۔ ہمیں خبر تک نہیں ہوئی تھی کہ ہماری ڈوریاں کسی اور کے ہاتھ میں تھیں۔

میں ہونق بنا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھے تسلی دینے کے لیے بولی۔ "تم نے میری توقع سے بھی بڑھ کے اپنی صلاحیتوں کا استعمال کیا۔ تم اگر کامران اور شاہینہ کا چکر بے نقاب نہ کرتے تو شاید میں کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو پاتی۔ تم واقعی بہت ذہین ہو۔"

میں نے ٹھنڈی آہ بھری۔ "ذہین تو آپ ہیں۔ میں تو خود کو "چول" محسوس کررہا ہوں۔ کیا خوب "ماموں" بنایا ہے آپ نے مجھے۔" میں نے شکایتی انداز میں کہا۔

اس کے چہرے پر اُداسی پھیل گئی۔ "میں ذہین نہیں، میں تو محض ماں تھی۔ میری ماما نے ہی مجھے یہ سب کرنے پر مجبور کیا۔ ورنہ کون عورت یوں اپنا تماشا بنوانا پسند کرے گی۔"

میں نے سنا تھا کہ ماں اپنے بچوں کے لیے کچھ بھی کرسکتی ہے، کسی بھی حد سے گزر سکتی ہے۔ ماں کی ماما کے متعلق میں نے بہت سی کہانیاں پڑھ رکھی تھیں۔ آج اس انوکھی ماں نے مجھے ماما کی ایک اور انوکھی کہانی سے روشناس کرادیا تھا۔

❖❖❖

چہرہ در چہرہ

احمد بلال امجد

مسلسل کامیابیوں کے بعد مجرم بے خطر ہو جاتا ہے... دل سے خوف اور کامیابی کا نشہ دلیر بنا دیتا ہے... کچھ ایسے ہی مجرموں کی کارروائیاں... ایک واردات کے بعد اگلی واردات نے ان کے قدموں کو وسعت دی... ان پتھر دل مجرموں کے دل میں محبت اور ہمدردی کا جذبہ عنقا تھا... اغوا برائے تاوان کی ایک ایسی ہی واردات سے شروع ہونے والی سنسنی خیز کہانی... واردات کرنے والے قانون کی دہلیز پر تھے... مگر اس کے باوجود راہ میں وہ رکاوٹیں تھیں جو مجرموں اور قانون کے درمیان فاصلے کو ختم نہیں ہونے دے رہی تھیں...

قانون اور مجرموں کے درمیان جاری آنکھ مچولی کا سنسنی خیز اختتام......

فائر کی آواز سے جنگل گونج اٹھا تھا۔ رات کے سناٹے میں یوں لگا جیسے کہیں نزدیک ہی فائر ہوا ہے۔ آواز کا ارتعاش کچھ دیر تک رہا اور پھر ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ میں، رضا اور اکمل اس آواز سے چونک گئے تھے۔ پچھلے چند ہفتوں سے ہمارا یہ معمول تھا کہ ہم جنگل کنارے بیٹھا کرتے تھے۔

شہر سے باہر فلنگ اسٹیشن پر اکمل کی رات نو بجے سے صبح چھ بجے تک ڈیوٹی چلتی تھی۔ وہ ہمارا پرانا دوست تھا۔ میں اور رضا دس بجے معمول کے گشت پر نکلتے، گیارہ بجے کے قریب اس کے پاس پہنچ جاتے۔ وہ فلنگ اسٹیشن کے ایک سرے پر کرسیاں بچھائے ہمارا منتظر ہوتا تھا۔ ہم وہاں تھوڑی تک گپ شپ لگاتے، چائے پیتے اور تقریباً دو گھنٹے گزار کر، واپس شہر کی جانب چلے جاتے تھے۔ وہاں ماحول بڑا اچھا ہوتا تھا۔ اس وقت سڑک پر اِکّا دُکّا گاڑیاں ہوتی تھیں۔ یوں سمجھیں بہت ہی کم ٹریفک ہوتا تھا۔ سڑک کنارے فلنگ اسٹیشن، اس کے بعد کافی ساری خالی جگہ تھی اور اس کے بعد جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ یہ کوئی قدرتی جنگل نہیں تھا۔ بلکہ محکمۂ جنگلات نے اپنی کاوش سے لگایا تھا۔ یوں تھوڑی دیر سکون لے کر ہم نکل آتے تھے مگر اس دن فائر کی آواز نے ہمیں چونکا کر رکھ دیا۔

''جنید، یہ آواز سنی تم نے، فائر کی آواز تھی نا؟'' رضا نے دھیمے سے کہا۔

''ہے تو فائر ہی کی آواز، کون فائر کر سکتا ہے؟'' میں نے اُلجھتے ہوئے کہا تو اکمل نے اُکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تمہیں لگ رہا ہوگا، نہ اس جنگل میں کوئی شکار ہے جو شکاری اس وقت شکار کر رہا ہوگا، اور نہ کسی کی ہمت کہ ادھر جائے۔''

''کوئی شکار نہیں ہے کا کیا مطلب، ابے گھامڑ، ضروری نہیں کہ شکار کوئی جانور ہی ہو۔ کہیں کوئی وارد■

ہی نہ ہوگئی ہو۔'' میں نے تشویش سے کہا تو اکمل جل کر بولا۔

''تم پولیس والے بھی نا، جاؤ دیکھو، یہاں کیوں بیٹھے ہو؟''

''تیری چائے نہیں آئی ابھی تک۔'' رضا نے بات بدلنے کی خاطر کہا۔ لیکن میرا دھیان اسی جنگل کی طرف لگا ہوا تھا جہاں اندھیرا تھا۔ فلنگ اسٹیشن کی روشنی میں بس یہ احساس ہوتا تھا کہ وہاں درخت ہیں۔ میں لاشعوری طور پر اُدھر ہی دیکھ رہا تھا۔ ایسے میں ہمارے سامنے چائے آگئی۔ میں چائے پیتے ہوئے اسی طرف دیکھ رہا تھا کہ مجھے یوں لگا جیسے جنگل میں کہیں روشنی ہوئی ہے۔ ایک لہر اُبھری ہے اور پھر وہ روشنی کی لہر غائب ہوگئی ہو۔ میں چونک گیا لیکن میں نے بات نہیں کی۔

باتوں کے دوران ہم چائے پی چکے تھے۔ ابھی ہمیں تھوڑی دیر مزید بیٹھنا تھا۔ ایسے میں ایک سیاہ رنگ کی فوروہیل فلنگ پمپ کے پاس آ کر رُک گئی۔ وہ فوروہیل مجھ سے تقریباً سو فٹ کے فاصلے پر ہوگی مگر وہاں تیز روشنی تھی۔ نجانے مجھے کیوں لگا کہ وہ کوئی سیدھے سڑک سے چلتی ہوئی نہیں آئی بلکہ اس کے ٹائروں پر کافی مٹی اور گارا لگا ہوا تھا۔ اس کی دونوں سائڈوں پر یوں لکیریں سی پڑی ہوئی تھیں جیسے یہ فوروہیل کہیں جھاڑیوں میں سے نکل کر آئی ہو۔ میں اسے نگاہوں میں رکھے سوچے جا رہا تھا۔ فلنگ کے بعد ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص نے کارڈ نکالا اور ادائیگی کر دی۔ میں نے کرسی سے ٹیک لگا لی۔ اگرچہ میں رضا اور اکمل کی باتیں سن رہا تھا لیکن میری توجہ اسی گاڑی کی طرف تھی جو اب رینگتی ہوئی تھوڑا سا ٹرن لے کر سڑک کی جانب چل دی تھی۔ میں نے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کی ایک جھلک دیکھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک مرد تھا اور اس کے ساتھ والی پسنجر سیٹ پر کسی عورت کی واضح جھلک نظر آئی۔ وہ گاڑی سڑک پر جانے کے بعد تیز رفتاری سے

lpoint.com

آگے بڑھ گئی۔ ہم بھی مزید دس منٹ وہاں رہے پھر اٹھ کر واپس شہر کی جانب چل دیے۔

☆☆☆

مجھے پولیس کی نوکری کرتے ہوئے بیس سال ہو گئے تھے۔ اتنے عرصے میں میرے مختلف ڈپارٹمنٹ میں تبادلے ہوئے، نوکری کا دورانیہ اگر اتنا شاندار نہیں تو اتنا بُرا بھی نہیں تھا۔ بس یونہی نوکری کرتا ہوا ایس ایچ او بن گیا تھا۔ چند ماہ پہلے میں تفتیشی ڈپارٹمنٹ میں تھا۔ وہاں ہم سب سے کچھ غلطیاں ہوئیں اور کچھ بے پروائی ہوئی جس کی پاداش میں مجھے گشت پر لگا دیا گیا تھا۔ اس ٹیم میں رضا بھی شامل تھا۔ یہ اچھا ہوا کہ ہم دونوں کو بہ گشت پر لگا دیا گیا تھا، ورنہ نئے آنے والے سے بنتے بنتی بنتی۔

میں صبح معمول کے مطابق اٹھا، تیار ہو کر ناشتے کی میز پر آیا تو میرے دونوں بچے اسکول جا چکے تھے۔ میں نے اخبار اٹھایا اور پڑھنے لگا۔ ناشتے کے دوران میں نگاہ ایک دو کالمی خبر پر پڑی۔ شہر کے ایک بزنس مین اجمل ملک اپنی فوروہیل گاڑی سمیت غائب ہوئے ہیں، وہ اغوا ہو چکے ہیں یا کہاں گئے؟ وہ نزد کی قصبہ اکبر آباد گئے ہوئے تھے۔ وہاں سے رات کے وقت لوٹ رہے تھے لیکن رات گئے تک وہ واپس گھر نہیں پہنچے۔ اس خبر کے ساتھ اجمل ملک کی تصویر کے ساتھ فوروہیل کی تصویر بھی تھی۔ یہ خبر پڑھتے ہی میرے دماغ میں فوراً ہی رات جنگل میں ہونے والا فائر گونج گیا۔ ضرور وہاں کچھ نہ کچھ ہوا ہے۔ میں نے اطمینان سے ناشتا کیا اور سکون سے تھانے پہنچا۔

انسپکٹر ناصر شاہ کے کمرے میں کافی ہلچل تھی۔ ہونی بھی چاہیے تھی۔ ایک بزنس مین کا اغوا ہوا تھا۔ جبکہ میرے مطابق ان کا قتل ہو چکا تھا۔ اب یہ بات میں سیدھے سبھاؤ اسے بتا نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا مجھے گھما پھرا کر ہی اسے کچھ بتانا تھا۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ انسپکٹر ناصر شاہ اپنے کمرے سے باہر نکلا، اس کے ساتھ ایک نوجوان بھی تھا جس نے بہترین جدید تراش کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ نگاہ پڑتے ہی انسپکٹر نے مجھے گھور کر دیکھا پھر مجھے قریب بلا کر پوچھا۔

''تمہاری ڈیوٹی ہے نا، اکبر آباد جانے والی سڑک پر؟''

''بالکل، اُدھر ہی ہے۔'' میں نے تحمل سے کہا۔

''رات یہی کوئی دس بجے کے قریب تم نے کوئی فوروہیل دیکھی، یہیں کہیں شہر کی طرف آتے ہوئے؟''

ناصر شاہ نے پوچھا۔

''ہاں دیکھی تھی لیکن فلنگ اسٹیشن پر۔'' میں نے فوراً جواب دیا۔

''فلنگ اسٹیشن پر.....''

''ہاں، انہوں نے وہاں سے پیٹرول لیا تھا۔'' میں نے بتایا۔

''تم بتا سکتے ہو، اس وقت گاڑی میں کون کون تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''ایک مرد اور ایک عورت تھی۔'' میں نے جھٹ سے بتا دیا۔

''مرد اور عورت..... پاپا تو اکیلے گئے تھے؟'' اس نوجوان نے تیزی سے کہا تو ناصر شاہ نے اس کی طرف کوفت سے دیکھا، پھر مجھ سے بولا۔

''کچھ مزید بتا سکتے ہو؟''

''ایک بات..... جس وقت میں نے یہ فوروہیل دیکھی تھی، اس سے تھوڑی دیر قبل میں نے جنگل میں ایک فائر کی آواز سنی تھی، رضا میرے ساتھ تھا۔ اس نے بھی آواز سنی تھی۔''

میرے یوں کہنے پر اُس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اسے بہر حال کوئی سرا مل گیا تھا۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''میرے ساتھ چلو۔''

''ٹھیک ہے لیکن صاحب سے.....'' میں کہتے کہتے رک گیا تو اس نے میری طرف دیکھ کر اُکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

''وہ میرا ماتحت ہے۔ ابھی واپس آ جاتے ہیں۔''

ہم پولیس اسٹیشن سے باہر نکل گئے۔

تقریباً آدھے گھنٹے میں ہم تین گاڑیوں میں اس فلنگ اسٹیشن تک آ پہنچے۔ ایک گاڑی میں ناصر شاہ اور اس کی ٹیم کے لوگ تھے، دوسری میری اور تیسری گاڑی میں اجمل ملک کا بیٹا زاہد اور اس کے دوست تھے۔ ہم سب گاڑیوں سے نیچے اترے۔ میں ناصر شاہ کو اس جگہ لے گیا جہاں پر میں رات بیٹھا ہوا تھا اور اس جانب اشارہ کیا جہاں سے فائر کی آواز آئی تھی۔ اسی لوکیشن سے میں نے اسے بتایا کہ فوروہیل نے کہاں سے پیٹرول ڈلوایا تھا اور وہ کیسے مڑ کر شہر کی جانب چلی گئی تھی۔

''نمبر دیکھا تھا تم نے؟'' ناصر شاہ نے پوچھا تو میں نے حافظے میں محفوظ وہ نمبر بتا دیا۔ اس پر زاہد ملک

WaqarAzeem.com www.pakistanipoint.com

نے چونکتے ہوئے کہا۔

''یہ تو پاپا کی فوروہیل کا نمبر ہے۔''

''مزید تصدیق کے لیے آپ سی سی ٹی وی کیمرے میں سے دیکھ لیں۔'' میں نے انہیں صلاح دی۔

اگلے بیس پچیس منٹ میں سی سی ٹی وی کیمرے پر وہی فوروہیل نمودار ہوئی۔ اس نے پیٹرول ڈلوایا۔ جیسے ہی ڈرائیور نے کارڈ دیا تو زاہد ملک بے ساختہ بول اٹھا۔

''یہ کوئی اجنبی آدمی ہے۔ اس نے پاپا کا کارڈ کیسے استعمال کرلیا؟''

''مطلب تم اس بندے کو نہیں جانتے ہو؟'' ناصر شاہ نے پوچھا۔

''میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔'' اس نے تشویش سے کہا۔

''اوہ..... غور کرو، اس کے ساتھ بیٹھی خاتون.....'' ناصر شاہ کہتے کہتے خاموش ہوگیا۔ سب دیکھ رہے تھے کہ اس میں وہ خاتون اتنی واضح دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

''اس اجنبی مرد نے اجمل ملک کا کارڈ استعمال کیا؟ یہ کیسے ہوگیا؟'' ناصر شاہ نے فلنگ اسٹیشن کے منیجر سے پوچھا۔

''مجھے تو پتا نہیں، خیر میں اس لڑکے کو بلاتا ہوں، جس نے پیٹرول ڈالا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے منیجر کمرے سے باہر گیا، پھر کچھ دیر بعد اس کے ساتھ ایک لڑکا تھا۔ لڑکا شاید سویا ہوا تھا۔ ناصر شاہ نے اسکرین پر فوروہیل دکھاتے ہوئے اس لڑکے سے پوچھا۔

''اس فوروہیل میں پیٹرول تم نے ڈالا تھا؟''

''جی سر۔'' اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''اس نے کارڈ دیا تھا اور تم نے رسید.....'' ناصر شاہ کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس نے کہا۔

''سر یہ فوروہیل اکثر یہاں سے پیٹرول بھرواتی ہے اور کارڈ ہی سے ادائیگی کرتے ہیں۔ انہوں نے مجھے پن کوڈ تک بتا دیا۔ ادائیگی ہوگئی تو میں نے مزید پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔'' اس لڑکے نے بتایا۔

''مطلب انہیں کارڈ کا پن کوڈ بھی معلوم تھا۔'' ناصر شاہ نے حیرت سے کہا اور تھوڑا پریشان ہوگیا۔

''جی بالکل۔'' لڑکے نے کہا تو ناصر شاہ چند لمحے خاموش رہا پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔

''جنید کچھ گڑبڑ لگتی ہے۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔ کیونکہ فلنگ اسٹیشن پر فوروہیل میں اجمل ملک نہیں ہے، کوئی اور ہے۔ اس کے ساتھ خاتون بھی ہے۔ کارڈ کے بارے میں بھی وہ جانتے ہیں۔ جبکہ اکبر آباد سے اجمل ملک اکیلا ہی نکلا تھا۔'' میں نے اپنا خیال ظاہر کیا تو وہ حتمی لہجے میں بولا۔

''ہمیں اس جنگل میں جانا ہوگا۔''

''جی ہاں ایک بار چیک تو کرنا پڑے گا۔'' میں نے کہا تو اس نے پاس کھڑے منیجر سے پوچھا۔

اس جنگل میں جانے کا راستہ کس طرف سے ہے؟''

''آپ اسی سڑک پر تھوڑا سا آگے جائیں گے تو نیچے کی طرف ایک کچا راستہ جاتا ہے۔ یہ جنگل کے درمیان سے ہے۔''

''اوکے۔'' اس نے کہا اور کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا۔

ناصر شاہ مجھے لیتے ہوئے پھر اسی جگہ آگیا جہاں ہم رات بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے سمت کی نشاندہی کے لیے پوچھا۔

''غور کرو، خوب سوچ کر بتاؤ، فائر کس سمت سے ہوا تھا؟'' میں نے فوراً ہی اس سمت اشارہ کر دیا تو وہ بولا۔ ''کیا خیال ہے گاڑیاں ادھر ہی کھڑی کر کے پیدل جنگل میں جائیں یا پھر گاڑی میں؟''

''میرا خیال ہے گاڑی میں چلتے ہیں۔'' میں نے کسی بھی غیر متوقع صورت حال کے پیش نظر کہا تو ناصر شاہ نے اگلے لمحے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

''اوکے، آؤ چلیں۔''

اگلے دس منٹ بعد ہم جنگل کی طرف جانے والے کچے راستے پر تھے۔ دونوں طرف جنگل تھا۔ چونکہ یہ ایک مصنوعی جنگل تھا اس لیے ترتیب سے لگایا ہوا تھا۔ تھوڑا سا فاصلہ طے کیا تو ایک پکی سڑک کا کراس آگیا۔ ہم بائیں جانب مڑ گئے۔ مزید تھوڑا سا فاصلہ طے کر کے ایک کھلی سی جگہ پر گاڑیاں روک دی گئیں۔ ہم نیچے اتر آئے۔ ناصر شاہ ٹائروں کے ان نشانات کو دیکھ رہا تھا جو بڑے واضح تھے۔ تھوڑے سے فاصلے پر وہ نشان ختم ہوگئے۔

''جنید، کیا خیال ہے، وہ فوروہیل یہیں تک آئی ہو گی اور پھر واپس بھی گئی ہے، دیکھو ذرا یہ نشان۔'' ناصر نے زمین پر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ تھوڑا غور کرنے پر یہ تصدیق ہوگئی کہ کوئی گاڑی یہاں آکر رکی ہے پھر یہیں سے واپس بھی پلٹ گئی ہے۔

www.pakistanipoint.com

''قدموں کے یہ نشان ہمیں اس سمت کا اشارہ دے سکتے ہیں جہاں.....'' میں کہتے ہوئے جان بوجھ کر خاموش ہوگیا۔ میں نے لاشعوری طور پر زاہد ملک کی طرف دیکھا، اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ زیادہ بات نہ کرتے ہوئے ہم نے پیروں کے نشان دیکھنا شروع کر دیے۔ وہاں جوتوں کے نشان دکھائی دے رہے تھے۔ میرے ذہن میں تھا کہ ان میں کسی خاتون کے جوتوں کے نشان بھی ہوں گے لیکن تین مختلف نشانات کے علاوہ چوتھا نشان ہمیں دکھائی نہیں دیا۔ ہم ان نشانات پر چل پڑے۔ ہمارا رخ شمال کی طرف تھا۔ دائیں جانب سورج تھا جس کی روشنی چھن کر آ رہی تھی۔ تقریباً دو سو قدم چلنے کے بعد ہم ٹھٹک کر رک گئے۔

سامنے ایک شخص ٹیڑے میڑے انداز میں زمین پر پڑا ہوا تھا۔ ہم جونہی اس کے قریب گئے تو پہلی نگاہ میں اندازہ ہوگیا کہ وہ شخص مر چکا ہے۔ فائر شاید اس کے پیٹ میں لگا تھا۔ میرے خیال میں زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوگئی تھی۔

''یہ کون ہے؟'' ناصر شاہ نے جان بوجھ کر زاہد سے پوچھا۔

''میں نہیں جانتا۔'' اس نے کہا تو میں نے چونک کر ناصر شاہ کی طرف دیکھا۔ ہمارے دماغ جو خیال آیا تھا کہ جنگل میں کہیں اجمل ملک کی لاش ہوسکتی ہے۔ ویسا بالکل نہیں ہوا۔ یہ کسی اجنبی کی لاش تھی۔

''تم نے اسے کبھی اپنے پاپا کے ساتھ دیکھا ہو؟'' ناصر شاہ نے تسلی کرنے کے لیے پوچھا۔

''نہیں، میں اسے پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔'' زاہد نے کہا تو ناصر شاہ نے اپنے ماتحتوں سے کہا۔

''اردگرد پھیل جاؤ سب..... دیکھو کہیں کوئی.....''

وہ حکم دیتے ہوئے پھر خاموش ہوگیا۔ سب سمجھ رہے تھے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ میں اور زاہد وہیں کھڑے رہے۔ ناصر ایمبولینس اور دیگر عملے کو کال کرنے لگا۔

جیسے ہی ایمبولینس اور دیگر عملہ وہاں پر پہنچا، ماتحت بھی جنگل چھان کر واپس آنے لگے۔ اس لاش کی تصاویر بنانے اور کارروائی کے بعد ایمبولینس والے آگے بڑھے۔ وہ منظر میری نگاہوں میں جم کر رہ گیا جب میں نے ناصر کو دیکھا۔ اس کے سر پر پی کیپ جھکی ہوئی تھی۔ آنکھیں ادھ کھلی ہوئی اور چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔ جیسے وہ جو کچھ سوچ رہا ہے، اس کے لیے انتہائی تکلیف دہ رہا ہو۔ میں سمجھ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہے۔ اُس کے کاندھے پر لگے ہوئے بیج فقط بیج نہیں تھے بلکہ ذمے داری کا بوجھ تھا جسے وہ اُٹھائے ہوئے تھا۔ اس کے عقب میں لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس کا دائیں بازو جسم کے ساتھ لگا ہوا تھا، جبکہ بائیں بازو پھیلا ہوا تھا، یہاں تک کہ ہاتھ اس کے سر سے بھی اونچا چلا گیا تھا۔ اس شخص نے سفید شرٹ پہنی ہوئی تھی اور گلے میں بڑی نفیس ٹائی باندھی ہوئی تھی۔ اتنے میں ایمبولینس کے عملے کا ایک آدمی آگے بڑھا اس نے سفید چادر اس لاش پر ڈال دی۔ درختوں سے چھن کر آنے والی سورج کی پیلی روشنی مجھے نارنجی دکھائی دے رہی تھی۔

تمام کارروائی سے نمٹنے کے بعد ہم شہر کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا کہ اجمل ملک اگر جنگل میں نہیں مل سکا تو پھر وہ کہاں گیا؟ کیا اسے کہیں راستے میں مار دیا گیا؟ وہ اغوا ہوا، اس کے ساتھ کیا ہوا، فی الحال ... یہ ایک معما تھا۔

☆☆☆

اگلے دن جب میں پولیس اسٹیشن پہنچا تو رضا نے مجھے بتایا۔

''یار وہ ناصر شاہ صبح سے کئی بار تمہارا پوچھ چکا ہے۔''

''اتنی ایمرجنسی تھی تو مجھے کال کر لیتا۔'' میں نے تنک کر کہا۔

''اب یہی سوال تم خود ہی اس سے کر لو۔'' اس نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا تو میں بے پروائی سے بیٹھتے ہوئے بولا

''اچھا کر لیتا ہوں، میں جانتا ہوں، وہ مجھے کیوں بلا رہا ہے۔''

''تم جانو اور ناصر شاہ، ہاں ویسے تم رات کہاں تھے، اسی ناصر شاہ کے ساتھ؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، سہ پہر کے وقت تک اس کے ساتھ تھا پھر میں گھر چلا گیا بہت تھک گیا تھا۔'' میں نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

''کیا بنا پھر اس اجمل ملک کا؟'' رضا نے سوال کیا۔

''کچھ بھی نہیں، سہ پہر تک تو اس کا کہیں سراغ نہیں ملا، صرف اتنا پتا ہے کہ اکبر آباد گیا تھا ایک بزنس مین سے ملنے۔ وہاں اس کی کوئی بزنس میٹنگ تھی۔ شام سے ذرا پہلے وہاں سے اکیلا ہی نکلا ہے۔ پھر اس کے بعد نہیں پتا کہ

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

اس کے ساتھ کیا ہوا؟'' میں نے بتایا۔

''اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، وہ جنگل سے پہلے ہوا، جنگل سے ملنے والی لاش جس کی بھی ہوگی، اسے معلوم ہوگا، یا پھر جو فوروھیل لے بھاگے ہیں، انہیں پتا ہوگا۔''

رضا نے اپنی طرف سے یہ کیس حل کر کے رکھ دیا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس وقت میرے دماغ میں ایک خیال رینگ گیا۔ میں نے سوچا اسے بعد میں ناصر شاہ سے ڈسکس کروں گا۔ مجھے ابھی وہاں بیٹھے پانچ منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ ناصر شاہ نے بندہ بھیج دیا۔ میں اٹھا اور اس کے کمرے میں چلا گیا۔

''بیٹھو۔'' اس نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا تو میں سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر سنجیدہ لہجے میں بولا۔

''جس بندے کی لاش جنگل سے ملی ہے، وہ نہ تو ہمارے شہر کا ہے اور نہ ہی اکبر آباد کا۔ وہ طارق نگر کا ہے، فیضان نام ہے اُس کا۔''

''یہ لاش نے تمہیں خود بتایا ہے؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا تو اس نے بھنّا کر میری طرف دیکھا، پھر ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

''ابے گھامڑ، اس کی جیب سے جو والٹ ملا ہے، اس کی مدد سے شناخت ہوئی ہے، اس میں کچھ ایسی دستاویز ملی ہیں جن سے شناخت ممکن ہوسکی ہے۔''

''اچھا۔'' میں نے سر ہلاتے ہوئے ہونقوں کے مانند کہا تو اس نے میری طرف دیکھا، پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

''میں جانتا ہوں تم میرے ساتھ ایسا رویّہ کیوں رکھے ہوئے ہو۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ محکمے نے تمہارے ساتھ بے انصافی کی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم اپنی صلاحیتوں کو......''

''مجھے بھاشن مت دو اور نہ ہی مجھے جذباتی کرنے کی ناکام کوشش کرو۔ محکمے میں کارکردگی دکھاؤ تو وہ آفیسرز کی جھولی میں جا پڑتی ہے اور کوئی ناکامی ہو جائے تو نچلے ملازمین کے کھاتے میں پڑ جاتی ہے۔ اب جو بھی ہو، تنخواہ تو اتنی ہی ملنی ہے۔ سو کر رہا ہوں نوکری۔ اب میں.... باؤں؟'' میں نے پُرسکون انداز میں اپنی بات کہہ کر اٹھنا چاہا تو وہ بولا۔

''ایسا نہ کرو یار، ہم مل کر اس کیس کو حل کرتے ہیں، کامیابی تیری، اگر ناکامی ہوئی تو وہ میری، بولو ڈن؟'' اس نے مجھے مناتے ہوئے کہا۔

''دیکھو میں اگر تمہارے ساتھ کام... کرنا چاہوں تو اس کی اجازت مجھے محکمہ نہیں دیتا۔ میں اپنی کسی اور بیٹ پر ہوں اور......'' میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری کاٹتے ہوئے کہا۔

''میں نے اجازت لے لی ہے، یہ دیکھو۔''

یہ کہہ کر اس نے دراز کھولی، اس میں سے ایک پرچہ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ وہ حکم نامہ تھا کہ میں ناصر شاہ کے ساتھ کام کروں۔ حکم حاکم، مرگ مفاجات، اب تو کام کرنا تھا۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور دھیمے سے لہجے میں بولا۔

''بولو، کیا کرنا ہے مجھے۔''

''یہ ہوئی نا بات......'' یہ کہہ کر وہ میز پر پڑی اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے بولا۔ ''چلو باہر نکلتے ہیں، کہیں اچھی سی جگہ پر جا کر چائے پیتے ہیں، پھر بات کریں گے۔''

''چلو۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد ہم 'کیفے ڈی۔ ڈم' میں بیٹھے ہوئے تھے۔

''یہ تو تم جانتے ہو کہ اجمل ملک کا شمار ہمارے شہر کے بڑے بزنس مین ہوتا ہے۔'' ناصر شاہ نے کہا تو میں خاموش رہا۔ وہ کہتا چلا گیا۔ ''اس کا کافی بزنس ہے اور چند ماہ سے وہ پلان کر رہا تھا کہ اکبر آباد کے علاقے میں ایک نئی فیکٹری لگائے۔ وہاں پر اس نے مقامی عملہ بھرتی کیا ہوا تھا، زمین خرید لی، فیکٹری کا سامان آ رہا تھا، مکمل ہونے میں ابھی دو تین ماہ کا عرصہ تھا۔ میں رات ان کے پاس ہی تھا۔ وہاں ان سے جو معلومات ملی ہیں وہ یہ ہیں کہ سب خوش تھے، ان کا روزگار جڑ گیا تھا۔''

''وہاں پر اس کے بزنس یا فیکٹری کا کوئی مخالف؟'' میں نے پوچھا۔

''انہوں نے یہی بتایا تھا کہ شہر میں کوئی ایسا نہیں تھا جس نے مخالفت کی ہو بلکہ وہاں کی بزنس کمیونٹی خوش تھی کہ قصبے میں مزید کاروبار بڑھے گا۔'' ناصر شاہ نے بتایا۔

''اس کے گھر کو ٹٹولا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، ابھی تو اتنا ہی معلوم ہوسکا ہے کہ اس کی ایک بیوی ہے جو اپنے ایک بیٹے عابد ملک کے پاس لندن میں ہے۔ اس کے ساتھ اس کی بیٹی صوفیہ ملک بھی گئی ہوئی ہے۔ یہاں صرف ایک ہی بیٹا ہے زاہد ملک ہے۔ یا پھر ان کے بنگلے میں ملازمین ہیں۔ سبھی نے یہ بتایا کہ اس کا

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

رویہ بہت اچھا تھا۔ کوئی پریشانی نہیں تھی۔ سب معمول کے مطابق چل رہا تھا۔'' اس نے بتایا تو میں نے کہا۔

''اچھا جو بھی ہوا ہے، اکبر آباد سے لے کر فلنگ اسٹیشن تک کے درمیان ہوا ہے۔''

''بالکل، تمہاری بات بالکل درست ہے لیکن یہ جو کچھ ہوا، اس کی وجہ کیا ہے؟ ایسا کیوں ہوا؟ اور سب سے پہلی بات اس وقت اجمل ملک کہاں ہے؟ وہ زندہ بھی ہے یا قتل ہو گیا؟ اگر زندہ ہے تو کہاں ہے؟ کون سی مجبوری ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے گھر نہیں جا پا رہا ہے یا سامنے نہیں آ رہا ہے؟ اگر قتل ہو گیا ہے تو اس کی لاش کہاں ہے؟ پھر اس کے بعد یہ پتا کرنا ہوگا کہ اس کے قاتل کون ہیں یا.....'' ناصر ایک دم سے کہتا چلا گیا۔

''دیکھو ناصر..... بات یہ ہے ہمیں کہیں نہ کہیں سے تو اپنی تفتیش کا آغاز کرنا ہے۔'' میں نے تحمل سے کہا۔

''بالکل ایسے ہی ہے۔'' اس نے میری بات سے اتفاق کیا۔

''اب ہمارے سامنے تین سمتیں ہیں۔ ایک اکبر آباد کے لوگ، دوسرا اس کے گھر والے، اور تیسرا یہ کہ فور وہیل لے جانے والے کون تھے۔ اسی سے ہمیں پتا چلے گا کہ اجمل ملک کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ دوسرا جنگل میں ملنے والی لاش کے قاتل کون ہیں؟'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو اس نے پوچھا۔

''تو چلو بتاؤ، کہاں سے ابتدا کریں۔''

''میرے خیال میں ہم دونوں ایک ہی رخ پر تفتیش کرنے کے بجائے، الگ الگ دو رُخ پکڑ لیں۔ یہ زیادہ.....'' میں صلاح دے رہا تھا کہ وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''ڈن ہو گیا۔ تم اپنے ساتھ جسے چاہو لے لو۔ جہاں سے چاہو شروع ہو جاؤ۔ ہمیں جلد از جلد اس کیس کو حل کرنا ہے۔''

''ٹھیک ہو گیا۔ میں اکبر آباد سے دیکھتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اور میں فور وہیل کا پتا کرتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''میرا خیال ہے اس میں دو باتیں ہیں دیکھنے والی، پہلی یہ کہ ایک اجنبی نے پیٹرول کی ادائیگی کے لیے اجمل ملک کا کارڈ کیسے استعمال کر لیا۔ اور دوسرا گاڑی میں ٹریکنگ تو ہو گی، اس کے بارے میں پتا کرو۔'' میرے کہنے پر اس نے ایک لمحے کو سوچا پھر مسکرا دیا۔ پھر ہمارے درمیان کئی باتیں طے ہو گئیں۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد ہم وہاں سے اٹھ گئے۔ میں سیدھا پولیس اسٹیشن آیا۔ وہاں رضا موجود تھا۔ میں نے اپنے ہیڈ کو مطلع کیا اور رضا سے کہا۔

''گھر جاؤ، کوئی صاف ستھرا سوٹ پہن کر تیار ہو جاؤ، میں کچھ دیر میں تمہیں وہاں سے پک کر لوں گا۔''

''ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لیں ڈوبیں گے؟'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ میں اس کی سنی اُن سنی کرتے ہوئے پولیس اسٹیشن سے نکل گیا۔

☆☆☆

اکبر آباد پہنچنے تک رضا نہ صرف اَپ ڈیٹ ہو چکا تھا بلکہ اس سے کافی پہلوؤں پر بات ہو گئی تھی۔ اکبر آباد ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ جس میں داخل ہوتے ہی ایک بڑی سی نہر تھی جسے پار کرتے ہی قصبے کی دکانیں شروع ہو جاتی تھیں۔ پھر زرعی زمین پر فصلیں تھیں، اس کے بعد چند فرلانگ کے بعد قصبے کی باقاعدہ آبادی شروع ہو جاتی تھی۔ ہمیں وہاں جلال خان سے ملنا تھا جو اجمل ملک کی فیکٹری لگانے کا ذمے دار تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ اکبر آباد میں اجمل ملک کا منیجر تھا۔

''یہاں چوکی میں اپنے آنے کی اطلاع دے دو۔'' رضا نے مجھے یاد دلایا تو میں نے جیب سے فون نکالا۔ ان لوگوں کو بھی کچھ پتا نہیں تھا۔ میں جب گھر میں تھا تو چوکی انچارج سے بات ہوئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ مجھے آنا ہے۔ پھر بھی میں نے اس کا نمبر ملایا اور اسے اپنے آنے کی اطلاع دے دی۔ یہ بھی ایک فارمیلٹی تھی جو پوری کر دی تھی۔ ایک صاف ستھرے علاقے میں ایک شاندار گھر کے سامنے ہم جا رکے۔ بیل دینے کے ساتھ ہی ایک چوکیدار نما شخص باہر نکلا۔ وہ ہمارے ہی منتظر تھے۔ وہ ہمیں لاؤنج میں لے گیا۔

ایک فربہ مائل ادھیڑ عمر گورے شخص نے ہمارا استقبال کیا۔ یہی جلال خان تھا۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے جونہی مناسب سمجھا پہلا سوال داغ دیا۔

''جب اجمل ملک آپ کے پاس سے گئے تو کیا اکیلے تھے؟''

''جی بالکل، اُن کے ساتھ ڈرائیور بھی نہیں تھا۔ وہ اکثر آ جاتے تھے، یہ کوئی ایسا انوکھا واقعہ نہیں تھا۔'' اس نے عام سے انداز میں بتایا۔

www.Pakistanipoint.com

انتباہ

ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی جانب سے تنبیہہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر ''آفیشل پیج'' کی اصطلاح استعمال کر رہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اور کہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر اپ لوڈ کر کے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کر رہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کر دیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

PREVENTION OF ELECTRONIC CRIMES ACT 2016

اور

COPYRIGHT ORDINANCE 1962/2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35804200-35804300

''کتنے بجے گئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی کوئی چھ بجے کے قریب۔'' اس نے سوچتے ہوئے بتایا۔

''کیا اُن کے پاس کوئی کیش بھی تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، اُن کی جیب میں کوئی تھوڑا بہت ہوتو ہو لیکن وہ کیش یوں نہیں رکھتے تھے۔'' اس نے اعتماد سے بتایا۔

''یہاں شہر میں اُن کا کوئی مخالف، یا کوئی.....'' رضا نے پوچھنا چاہا تو وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''ارے نہیں، یہاں سب خوش تھے۔ خاص طور پر بزنس کمیونٹی تو بہت خوش تھی۔ ان کا بزنس چلنے والا تھا۔''

''آپ کے خیال میں ان کے ساتھ کیا حادثہ پیش آسکتا ہے؟'' رضا نے سوچا ہوا سوال کر دیا۔ اس پر وہ چند لمحے سوچتا رہا، پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''میرا خیال نہیں، کم از کم یہاں تو کوئی ایسا واقعہ یا بات سامنے نہیں آئی جس کی وجہ سے کہا جا سکے..... میں اس بارے کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''اچھا چلیں ہمیں فیکٹری کا ایک وزٹ کروا دیں۔'' میں نے جلال خان سے مایوس ہوتے ہوئے کہا تو اس نے صوفے کی پشت چھوڑتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے میں اپنا بندہ بھیج دیتا ہوں، وہ لے جائے گا۔''

یہ سنتے ہی ہم اٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد وہاں سے نکلے تو پچھلی نشست پر ان کا ایک بندہ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ہمیں فیکٹری لے گیا جو قصبے کے جنوب میں تھی۔ چار دیواری کے ساتھ اندر کی عمارت مکمل ہوئی تھی۔ لیکن مشینیں ابھی لگنے والی تھیں۔ وہاں پر موجود لوگوں سے بات چیت کی لیکن کوئی ایسی بات معلوم نہ ہو سکی جس سے ہماری تفتیش آگے بڑھتی۔

سہ پہر کا وقت ہو رہا تھا جب ہم واپس قصبے سے نکلے۔ یہاں آکر ہمیں کچھ بھی پتا نہیں چل سکا تھا۔ مایوسی اور ناکامی نے دماغ چڑچڑا کر دیا تھا۔ سارے دن کی خجالت کے بعد ہاتھ کچھ بھی نہیں آیا تھا۔ واپسی پر ہم خاموش تھے۔ رضا ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ قصبے سے نکلتے ہوئے جب نہر آئی تو میں نے کہا۔

''رضا، یہاں رک کر چائے پی لیں۔ اچھا ماحول ہے۔ تھوڑی ٹینشن دور ہوگی۔''

''ہاں میں یہی سمجھ لوں گا کہ ہم چائے پینے یہاں تک آئے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے کار ایک سائڈ پر لگا دی۔

ہم کار سے نکل کر ایک چائے خانے کی طرف بڑھ گئے۔ اس کا رخ اگرچہ سڑک کی طرف تھا لیکن نہر کی طرف چار پائیاں، بینچ اور کرسیاں رکھی تھیں۔ وہاں لوگ بیٹھے کھا پی رہے تھے۔ رضا جاتے ہی ایک چارپائی پر ڈھیر ہو گیا۔ میں اس کے سامنے والی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں میں ایک نوجوان سالڑکا ہم سے آرڈر لے کر چلا گیا۔

ہمارے ساتھ ہی مختلف لوگ چارپائیوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ وہ آپس میں یونہی باتیں کر رہے تھے۔ میری اُن کی طرف پشت تھی۔ میرا دھیان اُن کی طرف چلا گیا جب ایک بندے نے پوچھا۔

''یار سنا ہے، وہ اجمل ملک قتل ہو گیا ہے جو یہاں فیکٹری لگا رہا تھا؟''

''نہیں نہیں یار..... وہ تو پرسوں شام یہاں دیکھا گیا تھا یہاں سڑک پر'' دوسرے کسی شخص نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھا ہوگا، لیکن قتل کرنے میں آج کل کتنا وقت لگتا ہے، فائر کیا اور اگلا بندہ مر گیا۔ تم پرسوں کی بات کر رہے ہو۔ مگر ایک بات بتاؤ تم کس طرح کہہ رہے ہو کہ وہ قتل ہو گیا؟'' کسی تیسرے نے پوچھا۔

''یہ جو راستے میں پمپ آتا ہے، اس کے پیچھے جو جنگل ہے، کل وہاں سے لاش ملی ہے۔'' اس نے اپنے لہجے کو خوفناک بناتے ہوئے بتایا۔

''وہ کسی دوسرے بندے کی لاش تھی۔ اجمل ملک کی نہیں ہے۔ اخبار پڑھو، اس میں خبر آئی ہے۔'' کسی اور نے اپنی معلومات جھاڑی۔

''دیکھ میری بات سن..... میرے گاؤں کے ایک لڑکے نے بتایا، وہ کل شام اپنی موٹر سائیکل پر گاؤں سے آیا، جیسے ہی پکی سڑک پر چڑھا، اس نے دیکھا، سڑک کے کنارے دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ وہاں پر اجمل ملک اپنی گاڑی سے باہر نکل کر کھڑا تھا۔ اس کے پاس تین افراد کھڑے تھے اور ایک جوان لمبی عورت کھڑی تھی۔ وہ باتیں کر رہے تھے۔''

میں ہی نہیں رضا بھی یہ گفتگو سن کر چونک گیا۔

''تمہارا کیا خیال ہے ان لوگوں نے اجمل ملک کو اغوا کر لیا ہوگا؟'' کسی نے پوچھا۔

''میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ان لوگوں نے اغوا کر لیا

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

ہے، میں تو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مجھے کہاں سے پتا چلا۔'' جواباً کہا گیا۔

''اچھا تو پھر جنگل میں قتل ہونے والا بندہ کون ہے؟''

''او بھائی میں کون سا اُن کے ساتھ پھرتا ہوں جو مجھے پتا ہوگا۔''

''او یار جتنے منہ اتنی باتیں۔ کہتے ہیں مہر اللہ داد اس کے خلاف تھا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہاں اکبر آباد میں فیکٹری لگے۔'' کسی نے کہا۔

''نہ اُسے کیا تکلیف ہے بھلا؟ فیکٹری لگے گی تو لوگوں کو نوکریاں ملیں گی، روزگار بڑھے گا۔ مزدوری ملے گی، دکانداری بڑھے گی۔''

''یہ تم سوچ رہے ہو نا، وہ جگہ مہر اللہ داد کے بھائی مہر فضل داد کی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کا بھائی زمین اسے بیچ دے جبکہ فضل داد نے زمین اجمل ملک کو بیچ دی۔ اب مہر اللہ داد تو چاہتا ہے کہ.....'' اس نے کہنا چاہا تو کسی نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

''یار زمین بک گئی، فضل داد نے بیچ دی، اب کیا۔ یا تو پہلے ہوتی نا بات، اب اگر فرض کرو اجمل ملک قتل بھی ہو جاتا ہے تو کیا زمین واپس اللہ داد کو مل جائے گی۔ یہ بات نہیں ہے یار۔''

چل یار، بھاڑ میں جائے سب، ہمیں کیا لینا دینا، تو سنا، اس بار گیا تھا پنڈی؟''

''ہاں گیا تو تھا لیکن اس بار مال اتنا زیادہ فرخت نہیں ہوا۔'' اس نے کہا تو وہ اپنے مال اور بیوپار کی باتیں کرنے لگے۔ میں نے اگلے چند لمحوں میں فیصلہ کر لیا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔

میں نے اپنی جیب سے فون نکالا اور چوکی انچارج کو فون کر دیا۔ جیسے ہی اس نے کال ریسیو کی، میں چارپائی سے اٹھ گیا۔

''جی سر فرمائیں۔''

''اچھا بات سن یار، یہ جو شہر والی نہر ہے، تم سے کتنے فاصلے پر ہے؟''

''یہی کوئی دس منٹ کا راستہ ہے۔''

''بس پھر جلدی سے نکل کر یہاں پہنچ، چائے خانے پر، جتنی جلدی ہو سکے۔'' میں بات کرتے ہوئے کچھ فاصلے پر چلا آیا تھا۔ اتنا فاصلہ کہ وہ میری بات نہیں سن سکتے تھے۔

''خیر تو ہے نا سر؟''

''بس ایک بندے کو تھوڑی دیر چوکی لا کر بات... کرنی ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں آ رہا ہوں۔''

''ہاں بس جلدی۔'' میں نے کہا اور فون بند کر کے واپس آ گیا۔ اس وقت تک چائے آ گئی تھی۔ میں نے پیالی تھامی اور اس شخص کی طرف رخ کر کے بیٹھ گیا جس نے لڑکے والی بات بتائی تھی۔ اس کی نشان دہی رضانے کی تھی۔ میں اسے غور سے دیکھنے لگا۔ وہ شکل صورت سے کافی خرانٹ بندہ لگ رہا تھا، یوں جیسے چرب زبان قسم کے ٹھگ ہوتے ہیں۔ اس سے بات کرنا ایک رسک ہی تھا۔ ورنہ تو ویسے بھی ہم اندھیرے میں ہی تھے۔ جیسے ہی ہم نے چائے ختم کی، مجھے سڑک پر پولیس جیپ دکھائی دی۔ اس میں چوکی انچارج بیٹھا ہوا تھا۔ ساتھ میں دو بندے اور تھے۔

میں نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا، تو وہ ہماری طرف آ گیا۔ تبھی میں نے اس شخص کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''بھائی جی آپ کا نام کیا ہے؟''

''بات کیا ہے، پہلے تم اپنا تعارف کراؤ۔'' اس نے اکھڑ لہجے میں جواب دیا۔

''میرا نام مجید ہے اور میرا تعلق پولیس سے ہے، اگر تم اِدھر میرے پاس آ جاؤ تو اچھا ہے تم سے دو چار باتیں کرنی ہیں۔'' میں نے پُرسکون لہجے میں سکون سے کہا تو اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا پھر بولا۔

''جو بات کرنی ہے یہیں کر لو۔''

''اچھا جس لڑکے نے اجمل ملک کو دیکھا تھا۔ سڑک پر اُسے یہاں بلوا سکتے ہو؟'' میں نے بھی زیادہ وقت نہیں دیا۔

''کیوں، کیا چاہتے ہو تم؟'' اس نے کہا تو اتنی دیر میں چوکی انچارج ہمارے پاس پہنچ گیا۔ وہ وردی میں تھا۔ ایک دم سے وہاں سناٹا چھا گیا۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔

''کون ہے وہ بندہ؟''

''یہ ہے۔'' میں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو چوکی انچارج نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''او چل آ ذرا چوکی تک.....''

www.pakistanipoint.com
Waqar Azeem

''میں نے کیا کیا ہے جی۔''

''اچھا تم میں سے مہراللہ داد والی بات کس نے کی تھی؟'' اچانک رضا نے پوچھا تو ایک شخص نے ایک ادھیڑ عمر سے بندے کی طرف اشارہ کر دیا۔ تبھی میں نے کہا۔

''اسے بھی لے چلو، ہم اُدھر ہی آتے ہیں۔''

چوکی انچارج انہیں لے جانے لگا، میں اٹھا تو میرے ساتھ رضا بھی اٹھ گیا۔ ہم دونوں کار تک گئے۔ اتنے میں وہ دونوں کو لے کر چل پڑا۔ ہم ان کے پیچھے پیچھے چوکی تک جا پہنچے۔

وہ لڑکا تقریباً آدھے گھنٹے میں پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ گاؤں کے کچھ لوگ بھی تھے۔ وہ تھوڑا گھبرائے ہوئے تھے۔ میں نے سب کے سامنے اس سے پوچھا۔

''یار صرف اتنا پوچھنا تھا کہ تم نے اجمل ملک کو کہاں دیکھا، اور وہ کتنے لوگ تھے؟''

''میں اپنی موٹر سائیکل پر تھا جی۔ پکی سڑک پر چڑھا تو دیکھا دائیں طرف اجمل ملک کھڑا ہے۔ اس کے پاس دو آدمی کھڑے تھے۔ ان کے پاس ایک عورت بھی تھی۔ قریب ہی ایک سیاہ رنگ کی فوروہیل کھڑی تھی۔ وہ سب آپس میں باتیں کر رہے تھے۔'' اس لڑکے نے کہا اور خاموش ہو کر ہمیں دیکھنے لگا۔

''لڑکے، پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمہیں کیسے پتا کہ وہ بندہ اجمل ملک ہی ہے؟'' رضا نے سوال کیا۔

''سر میں وہاں فیکٹری میں کام کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں انہیں۔ مجھے تھوڑی حیرت بھی ہوئی تھی کہ وہ یوں یہاں کیوں کھڑے ہیں۔''

''حیرت کیوں ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔

''ایسے ہی بس، مجھے یوں لگا جیسے انہیں کوئی سرِراہ مل گیا ہے اور وہ یہیں کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔''

''ایسا کیوں لگا؟'' رضا نے باقاعدہ جرح کر ڈالی۔

''کیونکہ سڑک کے دوسرے کنارے پر ایک کار کھڑی تھی گہرے نیلے رنگ کی۔''

''وہ کار اور اس کا رنگ تمہیں کیسے یاد ہے، تم نے تو ایک نگاہ دیکھا تھا اس کار کو؟'' رضا نے سکون سے پوچھا۔

''میں اکبرآباد کی طرف جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہی کار میرے قریب سے گزری، اس میں اجمل ملک اکیلے ہی تھے، کار خود ڈرائیو کر رہے تھے۔ مجھے یہاں پھر حیرت ہوئی کہ ان کی تو فوروہیل گاڑی ہے، یہ کار میں واپس کیوں جا رہے ہیں؟'' اس نے عام سے لہجے میں کہا تو میں چونک گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ اجمل ملک واپس ہی نہیں گیا بلکہ اکبرآباد پلٹ گیا تھا۔ تبھی میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

''تمہیں پورا یقین ہے کہ وہ واپس اجمل ملک ہی جا رہا تھا؟''

''جی بالکل، مجھے اچھی طرح یاد ہے، یہ کون سی پرانی بات ہے، پرسوں ہی تو دیکھا تھا۔''

''اچھا بیٹا اب تم جاؤ۔ بہت شکریہ۔'' میں نے اُسے کہا تو وہ سب اٹھ گئے۔ جب سبھی چلے گئے تو میں نے رضا سے کہا۔

''معاملہ یہیں کہیں گڑبڑ لگتا ہے۔''

''اگر وہ واپس اکبرآباد کی طرف گیا تھا تو پھر کہاں جا سکتا ہے؟'' میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

''اور کیوں گیا؟'' رضا نے لقمہ دیا تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ تو اب وہی بتا سکتا ہے۔ اگر ہمیں کہیں زندہ مل گیا تو۔ ضرور پوچھنا تم۔''

کیا خیال ہے اب چلیں واپس؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں چلتے ہیں۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا اور چوکی انچارج سے ہاتھ ملا کر وہاں سے نکل پڑے۔

راستے میں من چاہا کہ تھوڑی دیر ہی سہی فلنگ اسٹیشن پر رکیں لیکن ابھی اگلے کے آنے کا وقت نہیں ہوا تھا اور مجھے شدت سے بھوک لگی ہوئی تھی۔ میں نہیں رکا اور چلتا چلا گیا۔

☆☆☆

گھر جا کر میں فریش ہوا اور کھانا کھا کر پولیس اسٹیشن چلا گیا۔ ناصر شاہ میرا منتظر تھا۔ میں نے اپنی رُوداد سنائی تو اس نے حیرت سے کہا۔

''یار، یہ تو معاملہ ہی عجیب سا ہو رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے وہ اکبرآباد کی طرف اپنی مرضی سے گیا ہے۔ اگر گیا ہے تو کیوں گیا؟ کیا اسے علم تھا کہ راستے میں ایک قتل ہونا ہے؟ کیا اس قتل میں وہ بھی شریک ہے؟''

''سب سے اہم بات، وہ خاتون کون ہے؟ باقی ... لوگ کون ہیں؟'' میں نے کہا تو وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھایا اور بولا۔

''میں نے اجمل ملک کا کال ریکارڈ نکلوایا ہے۔ اس کے فون بند ہو جانے سے تین گھنٹے پہلے تک کی کالز میں نے دیکھی ہیں۔ تم جو وقت بتا رہے ہو، تقریباً اسی وقت

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

ایک فون سے کافی کالز ہوئی ہیں۔ میں نے اس فون کو چیک کیا تو وہ بند ہے۔''

''لیکن یہ دیکھا کہ وہ کس نام سے ہے؟'' میں نے تیزی سے پوچھا

''یہ معلوم نہیں کیا۔'' اس نے سوچتے ہوئے کہا پھر اپنی دراز کھول کر کال ریکارڈ نکالا، پھر فون پر رابطہ کر کے کسی کے ذمے لگایا کہ اس نمبر کے بارے میں معلومات دے۔

''مجھے نہیں لگتا اجمل ملک کہیں اغوا ہوا ہے یا اسے قتل کر دیا گیا ہے۔ میرے خیال میں وہ کہیں چھپ کر بیٹھا ہے، ممکن ہے وہ اب تک ملک چھوڑ کر چلا گیا ہو۔'' میں نے اپنی سوچ کے بارے میں بتایا۔

''تم ایسا کیوں سوچ رہے ہو؟''

''دیکھو اگر وہ اغوا ہوا ہوتا تو اب تک اغوا کرنے والوں کی طرف سے کوئی نہ کوئی مطالبہ آچکا ہوتا۔'' میں نے دلیل دی۔

''چلیں اگر مان لیں کہ اغوا نہیں ہوا تو قتل کیوں نہیں ہوا؟'' اس نے پوچھا۔

''کیونکہ وہ اپنی مرضی سے اکیلا اکبر آباد گیا۔ اس کی گاڑی میں موجود لوگوں نے ایک قتل کیا۔ وہ کسی نہ کسی حوالے سے اس خطرے سے آگاہ تھا۔'' میں نے دلیل دی۔

''اب میری بات سنو، میں نے پوری کوشش کی ہے کہ کسی طرح اس فوروھیل کا پتا چل جائے لیکن نہ تو وہ شہر سے باہر گئی ہے اور نہ ہی سامنے کہیں دکھائی دی۔ مطلب اس فوروھیل کو کہیں چھپایا ہوا ہے۔ وہ لوگ جانتے ہیں کہ اس گاڑی سے وہ پکڑے جا سکتے ہیں۔''

''ٹریکنگ کیا کہتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی کہ فوروھیل شہر تک آئی ہے۔ اس کے بعد اس کے سگنل ملنا بند ہو گئے۔ انہوں نے معمول کے مطابق فون پر رابطہ کیا لیکن وہاں سے کوئی جواب نہیں ملا، فون بند جا رہا تھا۔''

''مطلب کہ ٹریکنگ کو جام کر دیا گیا۔ چلیں یہ بات تو مان لیتے ہیں مارکیٹ میں ایسے آلات موجود ہیں جو ٹریکنگ سسٹم کو جام کر دیتے ہیں لیکن اجمل ملک نے فون کیوں بند کیا ہوا ہے؟'' میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''اچھا ہم ایسا کرتے ہیں، ابھی فوروھیل کو ایک طرف رکھ دیتے ہیں۔ کیونکہ ابھی وہ گم ہے۔ ہم ایسا کرتے ہیں کہ.....'' لفظ ابھی اس کے منہ ہی میں تھے کہ اس کے سیل فون کی میسج ٹون بجی۔ اس نے جلدی سے اِن بکس کھولا اور غور سے پڑھتے ہوئے بولا۔

''فیضان..... یار یہ تو وہی بندہ ہے جو قتل ہو گیا ہے۔''

''مطلب بات یہاں پر آ کر پھنس گئی ہے کہ اب ہم پھر اندھیرے میں ہیں۔'' میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا تو رضا نے کہا۔

''اچھا بات سنو، ہم ایک بار پھر سوچیں، یہیں سے کوئی اشارہ ملے گا کہ ہمیں آگے کیا کرنا ہے۔''

''لیکن میں یہ کہتا ہوں، اگر ہمیں کچھ بھی ملا تو وہ اکبر آباد ہی سے ملے گا۔ کیونکہ اجمل ملک واپس گیا ہے تو کہاں گیا؟'' میں نے شک کی بنا پر کہا تو ناصر شاہ نے پوچھا۔

''تم ایسا کیوں سوچ رہے ہو؟''

''میں تمہیں بتاتا ہوں لیکن پہلے دیکھو کہ اس وقت کے بعد جلال خان کو کوئی کال گئی ہے، مطلب اجمل ملک نے کال کی ہے جلال خان کو؟'' میں نے تیزی سے کہا تو ناصر شاہ نے سوچتے ہوئے وہ کاغذ پھر اپنے سامنے کیے۔ ان پر دیکھتا رہا پھر تیزی سے بولا۔

''ہاں یار..... دو کالز ہیں۔''

''تو پھر جلال خان کو سب پتا ہے، اسی سے بات پتا چلے گی۔'' میں نے حتمی انداز میں کہا تو ناصر شاہ بولا۔

''اگر ایسا نہ ہوا تو..... مطلب وہ سیدھے سبھاؤ تو کچھ نہیں بتائے گا، اس پر تھوڑا زور ڈالنا پڑے گا۔ وہ اثر رسوخ والا بندہ ہے، کہیں معاملہ خراب ہی نہ کر دے۔''

''یہ رسک تو لینا پڑے گا۔'' میں نے کہا۔

''تو چلو پھر، اکبر آباد تک پہنچنے میں پینتس چالیس منٹ لگیں گے۔'' ناصر شاہ نے ایک دم سے کہا تو ہم تینوں اٹھ گئے۔

اکبر آباد پہنچے تو رات کا پہلا پہر گزر چکا تھا۔ قصبے میں ہُو کا عالم تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہاں رات کا آخری پہر چل رہا ہو۔ کچھ ہی دیر میں ہم جلال خان کے گھر کے قریب پہنچ گئے۔ ہم نے کار گلی کے نکڑ پر کھڑی کی، اور تینوں اس سڑک پر پیدل چل پڑے۔ ناصر اور رضا پیچھے ٹھہر گئے، میں نے گیٹ بجا دیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک چوکیدار نے چھوٹا دروازہ کھولا اور اندر ہی سے کھڑے کھڑے پوچھا۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

''کون ہے؟''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور سیدھا اندر چلا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ شور مچاتا، میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، اس نے تڑپ کر گن میرے مارنا چاہی لیکن پیچھے سے رضا نے اس کی نال پکڑ کر کھینچ لی۔ تبھی میں نے دھیمے سے کہا۔

''دیکھ ہماری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ سکون کر جاؤ تو کچھ نہیں کہیں گے۔ ورنہ......'' میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ ایک دم سے ڈھیلا پڑ گیا۔

''کیا چاہتے ہو؟'' اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

''جلال خان سے ملنا ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ تو گھر پر نہیں ہے۔'' اس نے پھنسی ہوئی آواز میں کہا۔

''تو کدھر ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ تو سرِشام ہی باہر چلا گیا تھا۔'' اس نے ہولے سے کہا۔

''چل ہم اُس کا انتظار کر لیتے ہیں۔'' میں نے کہا تو چوکیدار نے کہا۔

''ایسے کیسے آپ......'' اس نے کہنا چاہا تو رضا کو نجانے کیا سوجھی، اس نے ایک زوردار جھانپڑ اس کے دے مارا۔ میں نے لاشعوری طور پر اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا، اچانک میری نگاہ اوپر کے روشن کمرے پر پڑی۔ کوئی ہمیں دیکھ رہا تھا جو ایک دم سے پیچھے ہٹا تھا۔ پردہ اب تک ہل رہا تھا۔ اچانک اس کی روشنی بند ہو گئی۔ میں فوراً اندر جانا چاہتا تھا۔ جبکہ رضا اس چوکیدار سے اُلجھا ہوا تھا۔

''تجھے ہماری بات سمجھ میں نہیں آتی۔'' رضا نے دہاڑتے ہوئے کہا۔

میں نے انہیں اُلجھے رہنے دیا اور داخلی دروازے کی جانب بڑھا۔ وہ اندر سے بند تھا۔ میں نے اپنا مخصوص تار نکالا اور چند لمحوں میں دروازہ کھول لیا۔ داخلی دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی میں نے اپنا پسٹل نکال لیا تھا۔ میں نے چند قدم آگے بڑھائے تھے کہ رضا بھی میرے پیچھے آ گیا۔ اس کے ساتھ چوکیدار بھی تھا۔ اس نے بھی پسٹل نکالا ہوا تھا اور چوکیدار کو کور کیا ہوا تھا۔ میں نے دھیمی آواز میں اس سے پوچھا۔

''نیچے کون ہے؟''

''صاحب کی بیگم اور بچے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''اور اوپر کون ہے؟'' میں نے مزید دھیمی آواز میں پوچھا تو وہ بولا۔

''کوئی بھی نہیں ہے۔''

اس کا جھوٹ پکڑا گیا تھا۔ میری اگر اس کمرے پر نگاہ نہ پڑی ہوتی تو شاید میں اس کی بات مان لیتا۔

''رضا، اس کی تلاشی لو۔'' میں نے کہا تو رضا اس کی تلاشی لینے لگا۔ اس کی جیب سے چند روپے، کچھ کاغذات اور ایک فون برآمد ہوا۔ رضا نے فون اپنی جیب میں رکھ لیا اور باقی چیزیں واپس اس کی جیب میں ڈال دیں۔ اب کم از کم یہ خطرہ نہیں تھا کہ وہ کسی کو کال کر کے بلا سکتا ہے۔

''چل اوپر چل۔'' میں نے اس سے کہا تو اس نے لاشعوری طور پر سیڑھیوں کی طرف دیکھا، میں نے اسے ٹہوکا دیا تو وہ چل پڑا۔

سیڑھیاں چڑھ کر ہم ...... اوپر آئے۔ ہمارے سامنے تین کمرے تھے۔ تینوں میں روشنی نہیں تھی۔

میں نے ایک کمرے پر تار آزمایا۔ دروازہ تو کھل گیا لیکن اندر کوئی نہیں تھا۔ میں نے دوسرے دروازے پر تار آزمایا تو وہ بھی کھل گیا۔ میں محتاط انداز میں اندر داخل ہوا اور ٹٹول کر لائٹ جلائی۔ میری توقع کے مطابق بیڈ پر اجمل ملک بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ پُرسکون تھا۔ وہ مجھے یوں دیکھ رہا تھا جیسے میں نے اس تک پہنچ کر غلطی کی ہے۔

''تو آپ یہاں بیٹھے ہیں۔'' میں نے تحمل سے کہا۔

''آؤ بیٹھو۔'' اس نے یوں مجھے بیٹھنے کے لیے کہا جیسے میں کوئی بزنس ڈیل کے لیے وہاں آیا ہوں۔ میں نے کمرے سے باہر دیکھا، رضا باہر تھا، میں نے اسے اشارہ کیا کہ وہ چوکیدار سمیت اندر آ جائے۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئے، اجمل ملک نے چوکیدار سے کہا۔

''تم جاؤ نیچے۔''

''ٹھیک ہے سر۔'' اس نے ہولے سے کہا اور پلٹ گیا۔ میں ایک صوفے پر بیٹھا تو رضا بھی میرے ساتھ آ کر بیٹھ گیا۔

''ہم آپ کو تلاش کر رہے ہیں اور آپ یہاں بیٹھے ہیں۔ بتا سکتے ہیں ایسا کیوں کیا آپ نے؟'' میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

''خود کو بچانے کے لیے۔ کچھ لوگ مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں۔'' اس نے کمالِ تحمل سے کہا۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

''لیکن آپ کی جگہ کوئی دوسرا قتل ہو گیا اور.....'' میں نے کہنا چاہا تو وہ اسی تحمل سے بولا۔

''آپ کو چونکہ پتا نہیں اس لیے آپ کو یہ سب عجیب سا لگ رہا ہے۔ میں آپ کو تفصیل سے بتاتا ہوں، اصل بات کیا ہے۔''

''بتائیں۔'' میں نے کہا پھر فوراً ہی ایک خیال کے تحت بول پڑا۔ ''ٹھہریں پہلے میں اطلاع کر دوں کہ آپ مل گئے ہیں۔''

میرے کہنے کی دیر تھی کہ اس نے تڑپ کر کہا۔ ''نہیں، ابھی نہیں، میری بات سن لیں، پھر جو آپ کی مرضی ہو۔''

''چوکیدار نیچے چلا گیا ہے، وہ کال کر کے کسی کو بھی بلا سکتا ہے اور آپ ہمیں باتوں میں الجھا کر.....'' میں نے کہنا چاہا تو وہ بولا۔

''نہیں ایسا نہیں ہے میں اب خود کو محفوظ سمجھتا ہوں، آپ میری بات سنیں۔''

''ویسے تو میرے ہیڈ کو معلوم ہے کہ میں کہاں جا رہا ہوں، لیکن پھر بھی اطلاع دینا میرا فرض ہے۔ پھر جو وہ کہیں گے۔'' میں نے ڈھٹائی سے کہا تو اس نے کندھے ڈھیلے چھوڑ دیے۔ میں نے ناصر شاہ کے نمبر ملائے اور رابطے کا انتظار کرنے لگا۔ چند لمحوں بعد رابطہ ہو گیا تو میں نے کہا۔

''میں نے اجمل ملک کو تلاش کر لیا ہے۔''

''کہاں سے، تم کہاں ہو؟'' اس نے تیزی سے پوچھا۔

''میں جلال خان کے گھر میں ہوں، اجمل ملک وہیں ہے۔'' میں نے بتایا۔

''تو لے آؤ پھر یار میں کوئی.....'' اس نے کہنا چاہا تو میں بولا۔

''وہ کوئی بات کرنا چاہتا ہے، میں وہ بات سن لوں، پھر تم جہاں کہو لے آتا ہوں۔ اور.....'' میں کہہ رہا تھا کہ اجمل ملک اونچی آواز میں بولا۔

''اسے کہنا خدا کے لیے ابھی کسی کو کچھ مت کہے۔ یہ اطلاع صرف اپنے تک رکھے۔ میں سب کچھ بتا دیتا ہوں۔''

''سن لیا تم نے ناصر؟'' میں نے پوچھا۔

''ٹھیک ہے، پھر جو بہتر ہے وہ کرنا۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔'' اس نے کہا تو میں نے فون بند کر دیا۔ پھر اجمل ملک کی طرف یوں دیکھا جیسے اب میں اس کی بات سننے کے لیے تیار ہوں۔ تبھی اس نے کہنا شروع کیا۔

''تقریباً تین ماہ ہو گئے ہیں، کچھ لوگ میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ وہ نہ صرف مجھے جان سے مارنے کی دھمکی دے رہے ہیں بلکہ میرے بچوں کے لیے بھی خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ اسی لیے میں نے اپنی بیوی اور دو بچوں کو لندن بھجوا دیا ہے۔''

''وہ کیوں جان سے مارنا چاہتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی تک سوائے بھتا لینے کے مزید کوئی مطالبہ سامنے نہیں آیا۔ وہ ہر ماہ بچاس لاکھ مانگتے ہیں، دو ماہ ہو گئے میں انہیں رقم دے رہا ہوں، اس بار مجھ سے فوری طور پر اتنے پیسے نہیں ہو سکے۔ میں نے چند دن کی مہلت مانگی تھی۔ انہیں تقریباً اڑتیس لاکھ دے چکا ہوں..... انہوں نے وہ رقم لے لی ہے مگر اپنی ناراضگی کا اظہار میرے ایک ملازم کو قتل کر کے دیا۔''

''اور آپ پولیس کی مدد لینے کے بجائے یہاں آ کر چھپ گئے؟'' میں نے پوچھا تو وہ بولا۔

''اور میں کیا کرتا۔ میرے بیٹے زاہد ملک کو مسلسل دھمکیاں مل رہی ہیں کہ باقی کی رقم بھجوا دو۔ ورنہ تیرے باپ کو مار دیں گے۔ اگر پولیس کو بتایا تو اس کی جان بھی خطرے میں ہے۔ میں حالات سازگار ہونے تک یہاں ہوں۔ جیسے ہی ان کی رقم مکمل ہو جاتی ہے تو میں سامنے آ جاؤں گا۔''

''اور پھر اگلے ماہ وہ بھتا مانگیں گے اور آپ سے رقم پوری نہیں ہو گی۔ کب تک ایسے چھپتے رہیں گے؟'' رضا نے سوال کیا۔

''سچی بات یہ ہے کہ میں یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ کسی دوسرے ملک، پھر وہاں سے کوئی نہ کوئی حل تلاش کرنے کی کوشش کرتا۔'' اس نے بے بسی سے کہا تو میں بولا۔

''میرا خیال ہے کہ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ آپ وہاں زیادہ محفوظ رہیں گے۔''

''لیکن میرے بیٹے کی زندگی بھی تو خطرے میں پڑ جائے گی۔'' اس نے مضطرب انداز میں کہا۔

''کسی کو کیا پتا کہ آپ کہاں ہیں۔ آئیں چلیں۔'' میں نے کہا تو وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر اٹھ گیا۔

جب ہم سیڑھیاں اتر کر نیچے آئے تو وہاں بالکل

www.pakistanidigest.com

خاموشی تھی۔ مجھے تھوڑی سی حیرت ہوئی کہ چاہے جلال خان گھر پر نہیں ہے لیکن اس کی بیگم اور بچے تو ہیں، کیا وہ نشہ کر کے سوئے ہوئے ہیں کہ اب تک ان میں سے کسی کو پتا ہی نہیں چلا۔ میں نے اجمل ملک سے سرسری انداز میں پوچھا۔

''یہ جلال خان اپنے بچوں کو لے کر کدھر گیا ہے؟''

''انہیں چند دن کے لیے شہر والی کوٹھی میں چھوڑ آیا ہے، جب تک میں یہاں ہوں تو وہ اُدھر رہیں گے۔'' اس نے عام سے انداز میں کہا تو ایک دم سے رضا نے میری طرف دیکھا، میں بھی وہی سوچ رہا تھا۔ ہمیں چوکیدار مشکوک لگا۔ میں نے اسے بھی ساتھ لے جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے گیٹ پر آ کر چوکیدار سے کہا۔

''چلو ہمارے ساتھ گاڑی تک۔''

''میں..... یہاں ہوں نا۔'' اس نے کہنا چاہا تو رضا نے اسے بازو سے پکڑا اور آگے لگا لیا۔

☆☆☆

صبح ہونے میں ابھی تھوڑا وقت تھا جب ہم شہر میں بننے والے ایک نئے علاقے میں پہنچے۔ وہاں کئی کوٹھیاں اور بنگلے بن چکے تھے اور کئی بن رہے تھے۔ ہم ایسے ہی ایک زیرِ تعمیر بنگلے کے پورچ میں جا رکے۔ ناصر شاہ کے ساتھ دو اہلکار تھے۔ وہ ہمیں لے کر ایک ایسے کمرے میں چلے گئے، جہاں چارپائیاں اور بینچ وغیرہ بچھی تھیں۔ ایک دو کرسیاں بھی تھیں۔ میں نے رضا کو اشارہ کیا کہ چوکیدار کو کسی دوسرے کمرے میں لے جائے۔ وہ اسے لے کر دوسری جانب بڑھ گیا۔ کمرے میں اجمل ملک کو ایک چارپائی پر بٹھایا، میں اور ناصر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

''فیضان قتل ہوا، اس کے قتل ہو جانے کی بابت آپ پہلے سے جانتے تھے؟'' ناصر شاہ نے پوچھا۔

''نہیں، میں نے تو انہیں رقم دے کر بھیجا تھا۔ وہ تینوں میرے ملازم تھے۔ میرا تو یہی خیال تھا کہ اگر رقم کم بھی ہے تو انہیں کچھ نہیں کہیں گے۔'' اجمل ملک نے بتایا۔

''وہ لڑکی بھی ملازمہ تھی؟'' ناصر شاہ نے پوچھا۔

''جی بالکل۔'' اس نے کہا۔

''یہاں آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ وہ لڑکی آپ کی ملازمہ نہیں آپ کی رکھیل تھی۔ کیا میں درست کہہ رہا ہوں؟'' ناصر شاہ نے غصے میں کہا تو وہ چند لمحے خاموش رہا پھر سر اٹھا کر بولا۔

''آپ یونہی سمجھ لیں۔ میں.....'' اس نے کہنا چاہا تو ناصر شاہ بولا۔

''ہم تمہاری ہر بات مان سکتے ہیں لیکن جب جھوٹ بول کر ہمیں گمراہ کرنے کی کوشش کرو گے تو پھر ہم سے بھلائی کی توقع مت رکھنا۔''

''میں سچ کہوں گا۔'' اس نے دھیمے سے کہا۔

''میں نے آج سارا دن فیضان اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں چھان بین کی ہے۔ وہ لڑکی تمہارے اتنے نزدیک تھی کہ تمہارے کارڈ کا پن نمبر بھی اسے معلوم تھا۔ وہ جو فورو وہیل لے کر گیا، وہ تمہارے کسی دفتر میں کام نہیں کرتا تھا۔ بولو وہ دونوں کہاں ہیں؟'' ناصر شاہ نے کچھ اس طرح غراتے ہوئے کہا کہ ایک لمحے کے لیے اجمل ملک کی آنکھوں میں خوف تیرنے لگا۔

''بس یہی میری کمزوری ہے جس کے سامنے آ جانے کے خوف سے میں غلطی پر غلطی کرتا چلا گیا۔ اب جبکہ آپ کو معلوم ہی ہو گیا ہے، تو سنیں۔'' اس نے کہا تو ہم خاموش رہے۔ ''تقریباً تین ماہ پہلے عنبرین عرف عینی مجھے ایک ہوٹل میں ملی تھی۔ وہ ایک ماڈل گرل ہے۔ وہاں کوئی فیشن شو تھا جس میں مجھے بھی بلایا گیا تھا۔ مجھے وہ پسند آ گئی اور کچھ اس کا التفات بھی تھا۔ ایسی لڑکیاں کسی نہ کسی پیسے والے کے ساتھ جڑتی ہیں تاکہ ان کے اخراجات چلتے رہیں۔ شہر میں ایک کوٹھی ہے۔ میں جب چاہتا اُسے وہاں بلا لیتا تھا۔''

''اس دن جب تم اکبر آباد سے نکلے ہو، اس وقت اکیلے تھے، یہ تمہیں راستے میں ملی، اس کے ساتھ فیضان اور دوسرا مرد تھا۔ یہ ساری کہانی کیا ہے؟'' ناصر شاہ نے سختی سے پوچھا۔

''وہ دوسرا مرد جو عینی کے ساتھ تھا، وہ ایک طرح کا سیکیورٹی گارڈ ہے عنبرین کا۔ وہ شوبز کا کام بھی کرتی ہے نا۔ مجھے خوف تھا کہ دشمن مجھے نقصان نہ پہنچا دیں۔ میں نے انہیں بلایا۔ تاکہ وہ رقم ان تک پہنچا دیں۔ وہ جس کار میں آئے تھے، میں اسی میں واپس چلا گیا۔ وہ تینوں رقم لے کر چلے گئے۔'' اس نے بتایا۔

''اس کے بعد نہ وہ عینی مل رہی ہے، نہ تمہاری گاڑی۔ ہو سکتا ہے انہوں نے فیضان کو مار کر پھینک دیا ہو اور رقم لے کر فرار ہو گئے ہوں۔'' میں نے تیزی سے کہا تو وہ سوچتے ہوئے بولا۔

''ممکن ہے، ان کے دل میں کوئی لالچ آ گیا ہو۔

لیکن مجھے بلیک میل کرنے والوں کی طرف سے اب تک کوئی ردِعمل نہیں آیا؟'' اس نے پھر سوچتے ہوئے کہا۔

''مطلب تم نہیں جانتے ہو کہ قتل کس نے کیا، تمہارے دشمنوں نے کیا یا پھر تمہارے ملازموں نے؟'' ناصر شاہ نے حتمی لہجے میں کہا تو اچانک رضا نے پوچھا۔

''تمہارا کارڈ تو عینی نے استعمال کیا۔ چلو مان لیا، کیا گاڑی کا ٹریکنگ سسٹم بھی اسی نے بند کیا؟''

''وہ میرا فون اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ تاکہ اگر کوئی بات چیت کرنا پڑے تو اسی فون سے ہو۔ اسی سے عینی نے ٹریکنگ بند کی ہوگی۔''

''اور اب وہ فون تمہارے پاس نہیں ہے؟'' ناصر شاہ نے غصے میں کہا۔

''عینی کے پاس ہی ہے۔'' وہ سرسراتے ہوئے بولا۔

''اب بولو عینی کو کہاں تلاش کیا جائے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ اپنے گھر ہو سکتی ہے یا پھر شہر والی کوٹھی پر۔'' اس نے منمناتے ہوئے بتایا تو مجھے یوں لگا ہم پھر اندھیرے میں آ گئے ہیں۔

''اچھا تم ابھی یہاں آرام کرو۔ سوچو کہ وہ عینی کہاں مل سکتی ہے۔'' میں نے کہا اور وہاں سے اٹھ گیا۔ میں کمرے سے باہر آیا تو ناصر شاہ بھی میرے پیچھے ہی آ گیا۔

''اب کیا کرنا ہے، وہ تو کوئی پکڑائی نہیں دے رہا.....'' ناصر شاہ نے پوچھا تو میں نے کہا۔

''یہ بتائے گا۔ ابھی ذرا اس سے اچھا سلوک رکھا ہے، کچھ دیر بعد بتائے گا، تم اسے تھوڑا ڈراؤ دھمکاؤ شاید بات بن جائے۔'' میں نے غصے میں کہا تو اس نے لمحہ بھر سوچتے ہوئے کہا۔

''اوکے، میں دیکھتا ہوں۔''

میں اُس کمرے میں جا پہنچا جہاں چوکیدار تھا۔ وہ چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے جاتے ہی غصے میں کہا۔

''چل اٹھ کھڑا ہو جا۔ میری باتوں کا جواب دے۔ ابھی سچ بولنا، ورنہ تیرے ساتھ کیا ہوگا، تو سوچ بھی نہیں سکتا۔''

وہ تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کے چہرے پر زیادہ پریشانی نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ایسے کسی بھی ماحول سے واقف تھا۔

''صاحب پوچھیں جو پوچھنا ہے؟''

''تو نے یہ جھوٹ کیوں بولا کہ جلال خان کے بچے اِدھر ہی ہیں جبکہ وہ نہیں تھے۔'' میں نے پوچھا۔

''مجھے یہی کہا تھا جلال خان نے کہ کوئی بھی اجنبی پوچھے تو یہی کہا جائے۔ مجھے تو وہی کرنا تھا جو انہوں نے کہا۔'' اس نے اعتماد سے کہا۔

''چل میں تیری بات مان لیتا ہوں۔ ایک بات بتا، لیکن بہت سوچ سمجھ کر بتانا، بعد میں تجھے کوئی مشکل نہ ہو۔'' میں نے مصالحانہ انداز میں پوچھا تو وہ پُرسکون انداز میں بولا۔

''جی پوچھیں۔''

''تو عینی کے بارے میں کیا جانتا ہے؟''

''جی مجھے بالکل بھی نہیں پتا، کون عینی ہے۔ میں تو شام کے وقت چوکیداری کے لیے آتا ہوں اور صبح واپس چلا جاتا ہوں۔'' اس نے سکون سے کہا تو میں نے چند لمحے سوچا اور پھر وہاں سے اٹھ گیا۔

ناصر شاہ باہر راہداری میں کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ ''اس عینی کا پتا کرنا ہوگا۔ ان سے تو کچھ نہیں ملا سوائے ان کے متوقع ایڈریس کے؟''

''تو چلو پھر نکلو۔'' میں نے کہا تو وہ باقی لوگوں کو ہدایات دینے لگا۔ رضا وہیں رہ گیا اور ہم دونوں نکل پڑے۔

☆☆☆

اس وقت سورج نکل رہا تھا جب ہم عینی کے گھر تک پہنچے۔ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ شہر کا گنجان آباد علاقہ نہیں تھا لیکن اسے پوش علاقہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ کوئی وقت تھا کہ یہ علاقہ پوش رہا ہوگا۔ مگر پھر بھی سکون تھا۔ صبح ہونے کی وجہ سے ٹریفک بھی بہت کم تھا۔ چھوٹے سے گیٹ کے سامنے کار روک کر ناصر شاہ باہر نکلا تو میں بھی پسنجر سیٹ سے اُتر آیا۔ دستک کے جواب میں ایک نوعمر لڑکا دروازے پر نمودار ہوا۔ اس نے ہمیں دیکھا، پھر اس کی نگاہ کار پر پڑی تو وہ فوراً بول اٹھا۔

''آپ ابھی سے آ گئے، ابھی تو جانے میں آدھا گھنٹا پڑا ہے۔''

''میں نے سوچا کہیں ناشتا کرتے ہوئے دیر نہ ہو جائے، میں اس لیے جلدی آ گیا۔'' ناصر شاہ نے مؤدب سے لہجے میں کہا۔

''تو پھر.....'' یہ کہتے ہوئے وہ خاموش ہو گیا جیسے

Maqar Azeem www.pakistanipoint.com

سوچنا چاہتا ہو، پھر بولا۔ ''اچھا ایک منٹ میں پوچھ کے بتاتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' ناصر شاہ نے اسی لہجے میں کہا۔

یہ کہتے ہی وہ مڑ گیا۔ دو تین منٹ بعد وہ واپس آ کر بولا۔

''آپ ایسا کریں اندر آ جائیں، یہیں ناشتا کر لیں۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا اور اندر چلا گیا۔ میں کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے اس کے پیچھے چل دیا۔ ہمیں کسی نہ کسی طرح اندر تو جانا ہی تھا، یہ قدرت نے موقع فراہم کر دیا تھا۔ اس نے ہمیں ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ ہم صوفے پر بیٹھ گئے۔ لڑکا ابھی واپس نہیں آیا تھا۔ ایسے میں ایک لڑکی کا چہرہ سامنے آیا۔ وہ لڑکی پوری طرح تیار تھی۔ سفید چہرے پر میک اَپ تھا، کاجل بھری بھوری آنکھوں میں اِک غرور تھا، جن پر تیکھی چتون بنائی ہوئی تھی۔ بالکل دائیں آنکھ کے کنارے پر ننھا سا تارا سا چمک رہا تھا۔ پیچھے کی طرف بنائے ہوئے سیاہ گیسو سے ماتھا مزید چوڑا دکھائی دے رہا تھا، ستواں ناک اور ہلکی سی مسکان والے پتلے لبوں پر گہرے گلابی رنگ کی لپ اسٹک، اس کا ایک ہی دائیں کان دکھائی دیا تھا، جس میں ایک چھوٹا سا زبرجد نما بندہ تھا، جس کے آخر میں موتی لگا ہوا تھا۔ اس نے نیلے رنگ کی قمیص پہنی ہوئی تھی۔ بس ایک لمحہ اس نے ہمیں دیکھا اور واپس پلٹ گئی۔ لیکن میں پہچان گیا تھا۔ یہ وہی لڑکی تھی جسے میں فوروھیل میں دیکھ چکا تھا۔ بھی میں نے بے ساختہ کہا۔

''یہی عینی ہے۔''

میرے کہنے کی دیر تھی کہ جیسے اُسے کرنٹ لگ گیا۔ وہ تیزی سے باہر نکلا، اس کے پیچھے میں بھی انتہائی سرعت کے ساتھ باہر آیا۔ ہم جیسے ہی کمرے سے باہر آئے، عینی ہمیں گیٹ پار کرتے ہوئے دکھائی دی۔ اب ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ ہمارے سامنے ہوتی اور ہم اسے جانے دیتے۔ میں نے پوری قوت سے چھلانگ لگائی اور گیٹ تک جا پہنچا۔ وہ گیٹ سے پار ہو چکی تھی۔ میں جب گیٹ سے نکلا تو وہ سڑک تک جا پہنچی تھی۔ انہی لمحات میں ایک کار اس کے نزدیک آن پہنچی تھی۔ کار رکی اور عینی نے کار کے دروازے پر ہاتھ ڈال دیا۔ مجھے لگا کہ ابھی وہ اس میں بیٹھ جائے گی، میں نے پسٹل نکالا اور انتہائی سرعت سے کار کے ٹائر پر فائر کر دیا۔ جب تک میں نے فائر کیا، کار چل پڑی تھی۔

ناصر شاہ صورتِ حال کو بھانپ گیا تھا۔ وہ انتہائی تیزی سے کار میں بیٹھا اور کار اسٹارٹ کی، یوٹرن لینے تک سامنے جاتی ہوئی کار دائیں جانب مڑ چکی تھی۔

''ہاتھ آئی اور نکل گئی۔'' ناصر شاہ نے خجالت سے کہا اور دانت پر دانت جما کر رفتار ایک دم سے بڑھا دی۔ موڑ مڑتے ہی ٹائروں کی آواز نے ماحول دہلا دیا۔ کار سامنے جا رہی تھی۔ اس کی جو بھی رفتار تھی، ہم لمحہ بہ لمحہ اس کے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ تقریباً دو کلو میٹر تک پیچھا کرتے رہنے کے بعد ہم بالکل اس کے سر پر پہنچ گئے۔ میں نے پسٹل نکالا اور دو تین فائر کر دیے۔ وہ سی ٹائر میں نہیں لگے لیکن ایک فائر پچھلے شیشے میں لگا۔ شیشہ ٹوٹ چکا تھا۔ اچانک موڑ آنے پر سامنے جاتی کار کی رفتار ذرا سی آہستہ ہوئی، تب تک ناصر شاہ والی کار اس سے جا ٹکرائی۔ سامنے والی کار بے قابو ہو گئی، اچانک بریک لگے تو پھر.. ہماری کار بھی لہرائی۔ کار رکتے ہی ڈرائیور اور عینی ایک دوسرے کی مخالف سمت میں بھاگنے لگے۔ ناصر شاہ اس کی سمت بھاگا اور وہ عینی تک جا پہنچا۔ اس نے عینی کو جکڑا اور کار کی پچھلی نشست پر لا پھینکا۔ جبکہ میں ڈرائیور کے پیچھے تھا۔ وہ نہیں رک رہا تھا، میں نے دو فائر اس طرح کیے کہ اسے نہ لگیں۔ وہ خوف زدہ ہو گیا۔ اس نے دوڑ ترک کر دی اور نیچے بیٹھ گیا۔ میں نے اسے کالر سے جا پکڑا۔

ہم نے بیچ بازار میں انہیں پکڑا تھا۔ ممکن ہے کئی تصویریں اور ویڈیو بھی بن چکی ہوں، مگر ہمیں کوئی پروا نہیں تھی۔ میں نے عینی کو اگلی نشست پر اور ڈرائیور کو پچھلی نشست پر بٹھایا، ناصر شاہ کا پسٹل لے کر دونوں کو کور کیا۔ تب تک ناصر شاہ نے کار بڑھا دی تھی۔

آدھے گھنٹے میں ہم واپس اسی زیرِ تعمیر کوٹھی میں آ گئے جہاں پر اجمل ملک کو رکھا ہوا تھا۔ جیسے ہی وہ اجمل ملک کے سامنے آئے، اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ میں نے ان دونوں کو فرش پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''چل بھئی عینی شروع ہو جا، کیوں قتل کیا تو نے فیضان کا؟''

''میں نے اُسے بالکل نہیں مارا، وہ تو جن لوگوں نے ہم سے بیگ لیا تھا، وہی اسے مار کر پھینک گئے تھے۔'' اس نے روہانسا ہوتے ہوئے کہا۔

''تم لوگوں نے پولیس کو اطلاع کیوں نہیں دی؟''

www.pakistanipoint.com

میں نے پوچھا۔

''سر نے منع کیا تھا۔'' اس نے اجمل ملک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اور وہی تم لوگوں کی گاڑی بھی چھین کر لے گئے؟'' میں نے جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

''جی سر، میں اور عدنان وہاں سے پیدل سڑک پر آئے اور لفٹ لے کر شہر پہنچے۔'' اس نے معصومیت سے کہا تو میں نے پوری قوت سے ایک تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ وہ دیوار سے جا لگی۔

''پیٹرول تیرے باپ نے ڈالو یا تھا، کارڈ کا پن کوڈ تیرے ابا نے دیا تھا۔ فور وہیل میں کون بیٹھی تھی تیری روح۔'' میں نے دہاڑتے ہوئے کہا۔ وہ میری طرف آنکھیں پھاڑے حیرت سے دیکھنے لگی۔ مجھے واقعتاً اس پر غصہ آگیا تھا۔ پاگل بنا رہی تھی ہمیں۔ تبھی ناصر شاہ نے پوچھا۔

''چل یہ بتا تو ہمیں دیکھ کر بھاگی کیوں؟''

''میں تو اس کا انتظار کر رہی تھی لیکن اندر یہ لوگ آکر بیٹھ گئے۔'' اس نے ڈرائیور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ کار ڈرائیور ہے، میں اس کے ساتھ اکثر سفر پر جاتی ہوں۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تیار ہو کر صبح صبح کدھر جا رہی تھی؟''

''میں اکبر آباد جا رہی تھی۔'' اس نے کہا۔

''نہیں سر جی، یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اس کو ائرپورٹ جانا تھا۔ یہ سچ ہے کہ میں اکثر اپنی کار پر اسے لے جاتا ہوں۔ آج یہ ائرپورٹ جا رہی تھی۔ یہ تو جب میں وہاں پہنچا تو یہ بھاگی آرہی تھی۔ اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا ڈاکو۔ میں اسے لے کر بھاگ نکلا۔ میرا اتنا ہی قصور ہے جی۔''

''تمہاری کوئی شہر میں ضمانت دے دے گا؟'' ناصر شاہ نے پوچھا۔

''جی جی جتنی کہیں۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''اوئے رضا...... اس کی ضمانت لے لے اور اسے جانے دے۔'' ناصر نے اونچی آواز میں کہا تو وہ چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی ناصر شاہ نے عینی کی طرف دیکھا اور بولا۔

''جھوٹ پر جھوٹ بولے جا رہی ہے۔ کوئی ایک

ستمبر 2020ء کے شمارے کی ایک جھلک

فیصلے دل کے

محبت اور چالبازی کے درمیان عبرت اثر معرکہ آرائی کا احوال آخری صفحات پر نشور ھادی کے قلم سے

بے منزل مسافر

گمشدہ تاریخی گوشوں پر ایک گہری نظر...... ابتدائی صفحات پر زویا اعجاز کے قلم کا جادو

شه زوز

عشق و محبت کے سحر انگیز جذبوں کی جنوں خیزی، لطیف رشتوں اور کثیف سازشوں کے جال اسما قادری کے قلم کا کمال

ساشا

کبھی پرخطر جزیروں، کبھی بغاوتوں کے جنگل میں بھٹکتے مسافر کی داستان...... عمر عبداللہ کے قلم کا شاہکار

اس کے علاوہ

ناہید سلطانہ اختر، تنویر ریاض، غلام قادر، طاہر جاوید مغل، ڈاکٹر شیر شاہ سید، آصفہ ضیا احمد اور فہمی فردوس کی خوب صورت تحریریں

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

بات بھی سچ کہی ہے تو نے؟ میں ابھی لیڈی کانسٹیبل بلواتا ہوں، وہ تیرا دماغ ٹھیک کر دے گی۔ سب کچھ باہر آجائے گا۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے نمبر پش کیے اور کسی لیڈی کانسٹیبل کو فوراً پہنچنے کا کہا تو عینی روہانسا ہوتے ہوئے بولی۔

''سر جی مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے، مار دیں گے وہ مجھے۔''

''یہاں تو قتل کرنے کے جرم میں پھانسی چڑھ جائے گی۔ حساب برابر۔'' ناصر شاہ نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''سچ بتائے گی تو شاید کچھ بچت ہو جائے، ورنہ.....'' میں نے سرد سے لہجے میں کہا۔

''اب تو بتانا پڑے گا عینی.....'' اجمل ملک نے کہا تو اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، پھر سر جھکا لیا۔

''بتانا ہے یا دوسرے طریقے سے بتاؤ گی۔'' میں نے اسے بازو سے پکڑ کر جھنجوڑا۔ وہ ہاں میں سر ہلانے لگی۔ میں نے عینی کو کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ ''چل شروع ہو جا، لیکن یہ دیکھ لے اگر تو نے کہیں بھی غلط بیانی کی تو پکڑی جائے گی، پھر معافی کی گنجائش نہیں ہوگی۔''

''میں سب سچ بتا دوں گی۔'' اس نے کہا اور تھوک نگل کر سانس لی۔

☆☆☆

''میں ان دنوں نئی نئی ماڈلنگ کی دنیا میں آئی تھی۔ ماڈلنگ تو صرف ایک بہانہ ہوتا ہے۔ اصل میں ہم جیسی لڑکیوں کا کام ... کچھ دوسرا ہی ہوتا ہے۔ ہم کسی نہ کسی دولت مند کو پھنسا لیتی ہیں۔ جب تک ان سے مال ملتا ہے ٹکی رہتی ہیں، پھر ہماری نگاہ کسی دوسرے دولت مند بندے پر جم جاتی ہے اور ہم اُن کے ساتھ منسلک ہو جاتی ہیں۔ میں بھی ان دنوں ایسے ہی کسی دولت مند کی تلاش میں تھی۔ میں مختلف پارٹیوں میں جاتی رہی۔ انہی دنوں مجھے ایک بندہ ملا جس نے مجھے اجمل ملک کے بارے میں بتایا۔ اس نے باقاعدہ مجھ سے چند ملاقاتیں کیں، کبھی ڈنر کبھی لنچ۔ اسی نے مجھے ایک پلان دیا۔

''دیکھو میں تمہیں ایک امیر بندہ دیتا ہوں۔ اسے قریب کرو، اس کے لیے میں بھی تمہیں رقم دوں گا۔''

''تمہیں اس سے کیا دلچسپی ہے۔ تم پیسہ لگا کر.....''

''وقت آنے پر سب بتاؤں گا۔ ابھی تم آم کھاؤ پیڑ مت گنو۔'' اس نے کہا اور پھر نہیں ملا۔ ہاں مگر اس نے کافی معقول رقم مجھے دے دی تھی۔''

''پھر تمہارا اس سے رابطہ کیسے ہوتا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس سے فون پر رابطہ تھا۔ وہی بتاتا تھا کہ اجمل ملک کہاں اور کب پایا جائے گا۔ میں وہاں پہنچ جاتی۔ تیسرے ہفتے مجھے کامیابی مل گئی۔ اجمل ملک خود مجھ پر فدا ہو گیا تھا۔ اس نے شہر میں رہنے کے لیے ایک کوٹھی دے دی۔ کافی زیادہ رقم دینی شروع کر دی۔ تقریباً ایک ماہ بعد اس بندے نے فون پر رابطہ کر کے مجھے کہا کہ تمہیں ماہانہ ملتا رہے گا۔ جو اندر کی خبر ہو، اس پر نگاہ رکھنا۔ وہ سب مجھے بتاتی رہنا۔''

''اور پھر تم سب باتیں اُسے بتاتی رہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے کیا چاہیے تھا۔ مجھے رقم مل رہی تھی اور میں سب بتاتی رہتی تھی اسے۔ دوسرے ماہ اسی فون والے بندے نے کہا کہ مجھے اپنے ساتھ سیکیورٹی کے لوگ بھی رکھنے چاہئیں۔ اس نے مجھے قائل کیا اور ایک بندہ بھیج دیا۔ اس طرح عدنان میرے ساتھ آ جڑا۔ دن گزرتے رہے اور سب کچھ معمول پر رہا۔''

''اس دن، جب فیضان کا قتل ہوا۔ کیا ہوا۔''

''اس دن مجھے اجمل ملک کا فون آیا کہ میں اپنے سیکیورٹی گارڈ کو لے کر فوراً اکبر آباد پہنچوں۔ پوچھ لیں اِن سے۔'' عینی نے اجمل ملک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''انہوں نے یہ بھی کہا کہ میں دفتر سے فیضان کو بھی ساتھ لے کر آؤں۔ میں نے کار لی، راستے میں دفتر سے فیضان کو لیا اور اکبر آباد چل دی۔ میری کار کی ڈرائیونگ عدنان کر رہا تھا۔ اکبر آباد سے کچھ پہلے ہی اجمل ملک کا فون آ گیا۔ انہوں نے ہمیں رکنے کے لیے کہا۔ ہم وہاں ان سے ملے۔ تب مجھے وہاں جا کر معلوم ہوا کہ کسی کو ایک بڑی رقم پہنچانی ہے۔ انہوں نے ہماری کار لی اور اپنی فوروھیل مجھے دے دی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنا فون فیضان کو دے دیا کہ اس پر رابطہ ہوگا۔''

''اچھا تم لوگ واپس مڑ گئے، پھر کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم عدنان کے دل میں کب یہ خیال

www.pakistanipoint.com

آیا کہ رقم ہتھیا لی جائے۔ اس نے جب فور وہیل جنگل کی طرف موڑی تو فیضان نے تشویش سے پوچھا۔

''گاڑی اِدھر کیوں لے جا رہے ہو عدنان؟''

''خاموش رہو، بتاتا ہوں۔'' اس نے تلخی سے کہا اور فور وہیل بھگا دی۔ فیضان بار بار پوچھتا رہا، میں نے بھی اسے کہا کہ یہ کر کیا رہے ہو، تب تک اس نے فور وہیل ایک جگہ لے جا کر روک دی۔ پھر ہمیں گاڑی سے باہر آنے کو کہا۔ ہم نیچے اتر آئے۔ اس نے...... ہیڈ لائٹس آن ہی رہنے دیں۔ نیچے اتر کر اس نے ہمارے سامنے ایک تجویز رکھی۔''

''کیسی تجویز؟'' میں نے تیزی سے پوچھا۔

''اس نے کہا، دیکھو، یہ بہت بڑی رقم ہے۔ اگر ہم اسے حصوں میں بانٹ لیں تو ہمارے دن پھر جائیں گے لیکن فیضان نے کہا کہ یہ باس کی امانت ہے اور اسے پہنچانا ہے۔''

''اس پر ان کی تکرار ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔

''اچھی خاصی تکرار ہوئی۔ عدنان نے آفر کی کہ تم اپنا حصہ لے لینا، اور بعد میں کہہ دینا کہ میں لے کر بھاگ گیا ہوں۔ پھر تو ٹھیک ہے؟ مگر فیضان اَڑ گیا۔ وہ یہی کہتا رہا کہ یہ باس کی امانت ہے۔''

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''تب عدنان...... ایک دم سے خاموش ہوا اس نے کوئی دوسری بات نہیں کی۔ اچانک اس نے اپنی شرٹ کے اندر رکھا ہوا پسٹل نکالا اور فائر کر دیا۔ وہ بے چارہ گولی کھا کر نیچے گر کر تڑپنے لگا۔ پھر اس نے پسٹل میری طرف کر دیا۔''

''مطلب وہ تمہیں بھی مارنا چاہ رہا تھا؟''

''نہیں اس نے مجھ سے پوچھا کیا چاہتی ہو، میں نے اس سے کہا تم رقم لے لو، مجھ کچھ مت کہنا۔ اس نے اپنا پسٹل ہاتھ ہی میں رکھا، بیگ ویسے ہی گاڑی میں پڑے رہنا دیا۔ مجھے اپنے ساتھ پسنجر سیٹ پر بٹھایا اور چل پڑا۔''

''پھر آگے......'' میں نے پوچھا۔

''سڑک پر آتے ہی اس کی نگاہ فیول پر پڑی۔ وہ بہت کم تھا۔ ذرا سا آگے آئے تو ایک فلنگ اسٹیشن نظر آیا۔ وہاں کوئی گاڑی نہیں تھی۔ اس نے فور وہیل موڑ دی۔ اسے معلوم تھا کہ میرے پاس جو کارڈ ہے، وہ اجمل ملک کے نام پر ہے۔ اس نے پیٹرول بھروایا اور شہر کی طرف چل پڑا۔''

''اور تم خاموشی سے اُس کے ساتھ جاتی رہیں۔'' میں نے کہا۔

''ظاہر ہے میں کیا کر سکتی تھی۔ اس نے شہر میں ایک جگہ مجھے اتار دیا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ زندگی بچ گئی۔ اس وقت اس نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے کسی کو بتایا تو کسی وقت بھی قتل ہو سکتی ہوں۔ میں نے بس جان چھڑائی اور اتر گئی اور وہ خود نجانے کس طرف غائب ہو گیا۔''

''اچھا تو یہ ہے تمام رام کہانی۔'' ناصر نے پوچھا۔

''اس کے مطابق تو قتل کیا عدنان نے اور ساری رقم بھی وہ لے کر بھاگ گیا۔ اور اب تم بھاگ رہی تھیں بیرونِ ملک......؟'' میں نے اندھیرے میں تیر پھینکا۔

''میں کیا کرتی، جو بندہ مجھے فون کرتا تھا، جس نے اجمل ملک کے ساتھ جوڑا تھا۔ اس نے مجھے ملک سے نکل جانے کا مشورہ دیا تھا۔ اسی نے سارا بندوبست کیا ہے۔ اس کا بندہ ائرپورٹ پر میرا انتظار کر رہا ہوگا۔'' عینی نے تیزی سے کہا۔

''فلائٹ کا ابھی وقت تو نہیں ہوا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''اگرچہ وہ بندہ اب ملنے والا نہیں، نہ ہی وہاں ہوگا لیکن کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' ناصر شاہ نے کہا اور پھر فون پر کسی سے رابطہ کرنے لگا۔ وہ کسی کے ذمّے یہ کام لگا کر تھوڑی دیر بعد واپس آ گیا۔ اس نے آتے ہی کہا۔

''قاتل ابھی تک پکڑا نہیں گیا۔ لیکن عینی اس قتل کی چشم دید گواہ ہے لہٰذا، ملک صاحب آپ کو اور عینی کو تھانے جانا ہوگا۔ وہاں قانونی کارروائی تو ہوگی۔ چوکیدار کو جانے دیتے ہیں۔''

''او کے باس، اب میں گھر جا کر بھوک مٹا لوں؟'' میں نے کہا اور باہر کار میں آ بیٹھا۔ اس وقت تک پولیس کی گاڑیاں آ گئیں۔ وہ ان سب کو لے کر تھانے چل دیں۔

میں گھر آ کر خوب سویا۔ میری آنکھ دوپہر کے بعد کھلی۔ میں اٹھا اور فریش ہو کر کمرے سے باہر آیا تو بیگم نے کہا۔

''وہ ناصر شاہ کا دو تین بار فون آ چکا ہے۔''

''آنے دو۔ اس نے بھی کہیں مصیبت ہی کے منہ میں دینا ہے۔'' میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کھانا لاؤں آپ کے لیے؟'' بیگم نے پوچھا۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

''ہاں، لاؤ۔ سکون سے کھاؤں گا۔ پھر بات سنوں گا ناصر کی۔'' میں نے سختی سے کہا تو بیگم ہنستے ہوئے اٹھ گئی۔ مجھے لگا جیسے وہ میرا مذاق اُڑا رہی ہے۔ وہ کھانا لگا چکی تو یہی بات میں نے اس سے کی۔

''نہیں آپ یونہی سمجھ رہے ہیں۔ میرے ذہن میں کچھ نہیں۔ ویسے آپ کیا محسوس کر رہے ہیں، سچ بتائیں۔''

''سچ بتاؤں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں بالکل سچ۔'' اس نے پانی کا گلاس بھر کر رکھتے ہوئے کہا۔

''یہی کہ کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا بھی نہیں۔'' میں نے کہا تو ہمارا مشترکہ قہقہہ فضا میں بلند ہوگیا۔

''لیکن جنید، قاتل تو ابھی پکڑنا ہوگا نا۔'' بیگم نے سنجیدگی سے کہا۔

''ہاں وہ تو ہے۔'' میں بھی ایک دم سے سنجیدہ ہو گیا۔

☆☆☆

شام کافی حد تک خوشگوار تھی جب میں تھانے پہنچا۔ ناصر شاہ کے کمرے میں رضا بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دونوں باتیں کر رہے تھے۔ میرے جاتے ہی رضا نے کہا۔

''سارے حالات کا تجزیہ ہم کر چکے۔ اگر اجمل ملک اور عینی درست کہہ رہے ہیں تو عدنان کو تلاش کرنا بے حد ضروری ہے۔ اصل قاتل بھی وہی بنتا ہے۔ اُسے پکڑنا.....''

''لیکن تم لوگ اس بندے کو کیوں بھول رہے ہو جس نے عینی کو اجمل ملک کے پیچھے لگایا۔ دوسرا اب اگر عدنان باہر نکل گیا ہوگا تو اسے کیسے تلاش کر پائیں گے؟'' میں نے کہا۔

''عینی نے... فون نمبر دے دیا ہے لیکن وہ بند ہے۔ اس کے بارے میں معلومات کا کہا ہے۔ کچھ دیر بعد مل جائے گی۔ وہ بندہ اگر ہاتھ لگ گیا تو ہم عدنان تک پہنچ جائیں گے۔'' ناصر شاہ نے بتایا۔

''عینی سے عدنان کے بارے مزید معلومات لینے کی کوشش کی کہ وہ کہاں رہتا تھا، کہاں کا رہنے والا ہے، وغیرہ وغیرہ۔'' رضا نے پوچھا۔

''تم ایسا کرو، اس سے باتیں کرو، اگر کچھ پتا چلے تو کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔'' ناصر شاہ نے کہا۔

''اور وہ فون نمبر بھی جس گروہ کو اجمل ملک پیسے بھجواتا تھا۔ اسے بھی ٹریس کریں۔'' میں نے کہا۔

ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ناصر شاہ کا فون بج اٹھا۔ اس نے اسکرین پر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اجمل ملک کا فون۔''

یہ کہتے ہی اس نے کال ریسیو کی اور اسپیکر آن کر کے فون ہمارے قریب کر دیا۔ دوسری طرف سے علیک سلیک کے بعد اجمل ملک نے کہا۔

''شاہ صاحب اگر آپ میرے گھر آسکتے ہیں تو فوراً آجائیں، آپ کے لیے کچھ معلومات ہیں۔''

''جی ٹھیک ہے، میں ابھی آتا ہوں۔'' ناصر شاہ نے کہا۔

''آپ آجائیں، باقی باتیں یہیں پر ہوں گی۔'' اس نے زور دیتے ہوئے کہا اور فون بند کر دیا۔

''یہ اپنے گھر میں ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''کچھ لوگوں کی شخصی ضمانت تھی کہ ابھی اس کی گرفتاری نہ ڈالی جائے، اس کے ساتھ عینی کو بھی۔ ایک دو دن دیکھتے ہیں۔'' ناصر شاہ نے بے چارگی سے کہا۔

''انہی باتوں سے میں.....'' میں نے مایوسی سے کہا تو ناصر شاہ بے بسی سے بولا۔

''کیا کریں یار نوکری بھی تو کرنی ہے۔ چل اٹھ چلتے ہیں۔'' اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا تو بادلِ ناخواستہ میں اٹھ گیا۔ اس نے رضا کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''تم جاؤ، ایک چکر عینی کی طرف لگا آؤ۔''

ہم تھانے سے نکلے اور اجمل ملک کے گھر تک پہنچنے میں ہمیں کوئی آدھا گھنٹا لگا۔ کیا شاندار بنگلا بنایا تھا اُس نے۔ گیٹ سے اس کے کمرے تک پہنچنے میں ہمیں کوئی پانچ سات منٹ تو لگ ہی گئے ہوں گے..... کمرے میں اس کے ساتھ ایک اور ادھیڑ عمر کا شخص بیٹھا ہوا تھا۔

''آئیں پلیز بیٹھیں۔'' اجمل ملک نے کہا تو ہم اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئے۔ تبھی وہ ادھیڑ عمر شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ ہمارے انتہائی قریبی دوست الیاس صاحب ہیں۔ ہمارے شہر کے ٹاپ بزنس مین ہیں۔ میری گم شدگی سے پریشان تھے۔ آج مجھے ملنے آئے تو انہوں نے ایک انکشاف کیا ہے، آپ بھی سنیں۔''

ہم اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اس نے پہلے کھنکھار کر اپنا گلا صاف کیا پھر قدرے شرمندہ، خوف زدہ سے انداز میں بولا۔

www.paksitanipoint.com

''جس طرح اجمل بھائی نے بتایا کہ کچھ لوگ بھتے کی صورت میں ان سے رقم لیتے رہے ہیں، گزشتہ تین ماہ سے میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہو رہا ہے۔ میں اب تک کوئی ڈھائی کروڑ روپے انہیں دے چکا ہوں۔ تین چار دن ہو گئے ہیں، ان کا مطالبہ پھر سے شروع ہو گیا ہے، اس بار انہوں نے پچاس لاکھ مانگے ہیں۔''

''اور آپ نے دھمکی کی وجہ سے پولیس کے ساتھ رابطہ نہیں کیا۔'' ناصر شاہ نے افسوس بھرے انداز میں کہا۔

''معاف کیجیے گا، آپ ناراض نہ ہوں، پولیس کا کوئی اتنا اچھا کردار نہیں ہے۔ ہم ان پر کیسے بھروسا کر سکتے ہیں۔ پولیس کا کردار اگر اچھا ہوتو ایسے جرائم پیشہ لوگ سامنے ہی نہ آئیں۔ ان کی جرأت ہی نہ ہو ہم کس سے فریاد کریں جا کر؟'' اس نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

''اب بھی تو آپ بتا رہے ہیں نا۔ خیر..... مزید رقم کب تک دینی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کل، یہی کوئی دس بجے کے قریب۔''

''کیسے لیتے ہیں وہ رقم؟'' میں نے انتہائی تحمل سے پوچھا۔

''وہ ایک خاص مقام کے بارے میں بتاتے ہیں۔ ہم اپنا بندہ بھیج دیتے ہیں، وہ مختلف چکر دینے کے بعد کسی جگہ سے وہ رقم وصول کر لیتے ہیں یا کہیں رکھ دینے کی بابت کہتے ہیں۔ ایسا ہی بس۔'' اس نے بتایا۔

''آپ ایسا کریں، ایک چھوٹی سی تحریری درخواست دے دیں، یہ خفیہ رہے گی۔ کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔ آپ معمول کے مطابق ان کی بات مان لیں یعنی کچھ پس و پیش کے ساتھ..... ہمیں آپ ڈیٹ رکھیں۔ کل آپ کی رقم میں لے کر جاؤں گا۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

''مجھے آپ پر یقین ہے۔ کم از کم یہ لوگ بے نقاب تو ہونے چاہئیں۔'' اس نے دردمندی سے کہا۔

''ہو جائیں گے، آپ بس ہمیں آپ ڈیٹ رکھیں۔ ان کے فون وغیرہ ہمیں دیں۔ ہم کچھ نہ کچھ تو کریں گے ہی۔'' ناصر شاہ نے کہا۔ پھر کچھ دیر تک یونہی باتوں کے بعد ہم وہاں سے اٹھ کر تھانے آ گئے۔ راستے میں ہم نے طے کر لیا تھا کہ ہمیں اپنے آفیسر کو اعتماد میں لینا ہوگا۔ بہ ظاہر بلیک میلر یا بھتا خور دکھائی دینے والے اصل میں کیا ہیں، یہ تو وقت آنے پر پتا چلنا تھا۔ ہم کسی اَن دیکھے جزیرے پر آن پہنچے ہیں یا پھر کسی جنگل میں بھٹک گئے ہیں۔

رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ہم اپنے آفیسر سے ملنے ان کے گھر جا پہنچے۔ انہیں ساری رُوداد سنانے کے بعد پوری طرح آگاہ کیا۔ پھر موجودہ صورتِ حال کے بارے میں بتایا۔ ساری بات سن کر انہوں نے تشویش سے کہا۔

''یار یہ سب شہر میں ہماری ناک کے نیچے کیسے ہوتا رہا؟''

''اس کا جواب تو ہم سب کو معلوم ہے۔'' میں نے قدرے ترش لہجے میں کہا تو آفیسر نے میری طرف غور سے دیکھا پھر بولا۔

''آپ کو جو مدد بھی درکار ہو، وہ لے لیں۔ آپ کو فری ہینڈ چاہیے، وہ بھی دیا۔ لیکن مجھے یہ لوگ چاہئیں۔ یہ صرف قتل کیس نہیں ہوگا، اس میں بہت کچھ نکلے گا۔''

''جی میرا بھی یہی خیال ہے۔'' ناصر شاہ نے کہا۔

''تو ٹھیک ہے، آپ اپنی ٹیم بنائیں، جو بھی کرنا چاہیں کریں۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔'' آفیسر نے کہا تو مجھے تھوڑا حوصلہ ہوا۔

ہم واپس تھانے آ گئے۔ ناصر شاہ نے اپنے سامنے نمبر رکھ لیے۔ تبھی میں نے اس سے کہا۔

''ناصر، تم کیا سمجھتے ہو کہ اس وقت ہمارے پاس کوئی ایسا بندہ ہے، جو ان فون نمبرز سے ہمیں مجرموں تک پہنچا سکے یا پھر اتنا ماہر ہو کہ کہیں ان کی نشاندہی کر سکے یا پھر اتنی دھونس لے.....؟''

''ایسا تو نہیں ہے، وہی جو اب تک ہمیں سہولت میسر ہے۔'' اس نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ تین نمبر ہیں نا، عدنان کا، اجمل ملک کو بلیک میل کرنے والے کا، اور الیاس کا دیا ہوا۔ یہ.....'' میں نے کہنا چاہا تو وہ بولا۔

''نہیں ایک چوتھا نمبر بھی ہے، وہ بندہ جس نے عینی کو اجمل ملک کا راستہ دکھایا تھا۔''

''اوکے یہ چاروں نمبر لکھ کر مجھے دو۔ پھر میں جانوں اور میرا کام۔ تم انہیں اپنی روٹین میں محکمے والوں کو دو۔'' میں نے کہا۔

''کیا کرو گے تم؟'' اس نے تجسس سے پوچھا۔

''یار ہمارا بھی کچھ پردہ ہے، وہ رہنے دو۔'' میں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا تو وہ خاموشی سے ایک کاغذ پر وہ نمبر لکھنے لگا۔ اس نے دوبارہ احتیاط سے ان نمبروں کو

www.pakistanipoint.com
Waqar Azeem

دیکھا، پھر وہ کاغذ میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے اسے جیب میں رکھ لیا اور پوچھا۔

''اب میرا تھانے میں کوئی کام نہیں ہے۔ اب میں جاؤں؟''

''رضا کا انتظار نہیں کرنا؟'' اس نے کہا۔

''تم کرو، میں گھر کے لیے نکلتا ہوں۔ ہاں کوئی ایمرجنسی ہو تو مجھے بتا دینا۔'' میں نے کہا اور اٹھ گیا۔

میں تھانے سے نکلا تو سیدھا اس علاقے کی طرف جا نکلا، جہاں میرا ایک دوست ظہیر رہتا تھا۔ اصل میں وہ میرا دوست بن گیا تھا، وہ عمر میں مجھ سے بہت چھوٹا تھا۔ ایک بار وہ ایک چھوٹے سے جرم میں پھنس گیا تھا۔ اس کا کوئی اتنا بڑا جرم بھی نہیں تھا..... جب لڑکے اکٹھے ہو جائیں تو ساتھ میں کئی ہوشیار ہو جاتے ہیں، وہ بھی ویسا ہی تھا۔ مجھے اس پر ترس آ گیا اور میں نے اسے جانے دیا۔ کچھ عرصے بعد وہ مجھے ایک ڈھابے پر ملا، وہ اکیلا ہی تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے انتہائی خوشی کا اظہار کیا۔ اس نے بتایا کہ اس نے تب سے ان لڑکوں کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ وہ سب کے سب ..... کسی نہ کسی جرم میں پھنس کر جیل جا چکے ہیں۔ میں نے توبہ کر لی تھی تو بچ گیا۔ ہماری بہت ساری باتیں ہوئیں، فون نمبر کا بھی تبادلہ ہو گیا۔ اس دن اس نے جاتے ہوئے مجھے کہا تھا کہ اگر کمپیوٹر کے بارے کوئی مشکل ہو تو مجھے بتایئے گا۔ چونکہ اس کے دماغ میں کہیں نہ کہیں جرم پھنسا ہوا تھا، سو وہ کمپیوٹر ہیکر بن گیا۔ اس کے بعد میں نے اس سے کئی بار مدد لی تھی اور اس کے عوض میں نے اسے کچھ رقم بھی دی تھی۔ وہ کہتے ہیں نا درخت کو کاٹنے کے لیے کلہاڑی میں لکڑی ہی کا دستہ لگایا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح مجرم کو پکڑنے کے لیے مجرمانہ سرگرمیوں والے لوگوں ... ہی سے مدد لینا پڑتی ہے۔ میں جانتا تھا کہ وہ ان فون نمبرز کو لے کر میری مدد کر سکے گا۔ وہ بڑے تپاک سے ملا۔

''ارے تم اب بھی اسی چھوٹے سے گھر میں ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''صاحب اب آپ سے کیا چھپانا، میرے دونوں بھائی اب بزنس کر رہے ہیں، وہ بھی حلال والا!! ایک دم قانونی، ایک بڑی کوٹھی میں رہتے ہیں ہم۔ یہ دھندا کرنے والی جگہ ہے۔ یہاں کسی کی نظر نہیں پڑتی۔ آپ کام بولیں، چھوڑیں باقی قصے۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا تو میں نے وہ نمبر اسے لکھوا دیے۔

''صاحب اگر آپ کہیں کہ میں فوراً سب کچھ بتا دوں تو ایسا ممکن نہیں ہے۔ مجھے ایک، دو دن دیں۔ میں پھر کچھ بتا سکوں گا۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ لیکن ایک بات، ابھی میں تمہیں کچھ بھی نہیں دے پاؤں گا، ہاں اگر یہ بندے پکڑے گئے تو نہال کر دوں گا۔'' میں نے اسے وضاحت کے ساتھ بتایا وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''ڈونٹ وری سر...... چلتا ہے۔ میں بتا دوں گا آپ کو۔''

میں کچھ دیر اُس کے پاس بیٹھ کر اٹھ گیا۔

☆☆☆

اس صبح میں ابھی تیار بھی نہیں ہوا تھا جب ظہیر کا فون آ گیا۔ میں نے اس کی کال ریسیو کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں ظہیر بولو۔''

''صاحب ایک نمبر کا اتا پتا معلوم ہوا ہے۔ وہ رات دو بجے تک اِدھر اُدھر پھرتا رہا ہے، دو بجے کے بعد سے وہ ایک ہی جگہ پر ہے۔ ممکن ہے سویا ہوا ہو۔''

''نمبر بولو۔'' میں نے تیزی سے کہا تو اس نے نمبر دہرا دیا۔ اسی لمحے میں نے چٹ نکال کر دیکھی تو وہ نمبر اس بندے کا تھا، جس نے عینی کو اجمل ملک سے ملوایا تھا۔

''اس کی لوکیشن بھیج رہا ہوں صاحب۔ باقی کا دیکھتا ہوں۔''

''ہاں، فوراً بھیج دو۔'' میں نے کہا اور کال بند کر دی۔ اگلے ہی لمحے میں نے ناصر خان کو فون کیا اور اسے تیار ہو کر پہنچنے کا کہا، پھر میں نے رضا کو فون کیا کہ وہ عینی کو لے کر وہاں پہنچے جہاں میں بتاؤں۔ فون کرنے میں مجھے یہی کوئی تین منٹ لگے ہوں گے۔ اگلے دو منٹ میں تیار ہو کے نکلا۔ میں نے اپنی کار میں بیٹھ کر لوکیشن دیکھی، وہ مجھ سے کوئی بیس پچیس منٹ کے فاصلے پر تھی۔ اگر ٹریفک بالکل درست ملتا تب، ممکن ہے اس سے بھی زیادہ وقت لگ جاتا۔ میں نے لوکیشن کے بارے میں ناصر شاہ کو سمجھایا اور تیزی سے چل پڑا۔ ابھی میں تھوڑا سا آگے بڑھا تھا کہ رضا کا فون آ گیا۔

''ابے مجھے بتا تو سہی، جانا کدھر ہے۔''

اسے میں نے مطلوبہ پتا سمجھا دیا۔ اور پوری توجہ ڈرائیونگ پر لگا دی۔ صبح کے وقت اتنا زیادہ ٹریفک نہیں تھا۔ میں اندازاً وقت پر پہنچ گیا۔ اس دوران رضا بھی عینی تک پہنچ گیا اور اس نے عینی کو ساتھ لے لیا تھا۔ وہ ایک گلی میں دو منزلہ مکان تھا۔ میں نے ظہیر کو فون کیا تو وہ میرا منتظر

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

تھا۔

''صاحب آپ بالکل درست لوکیشن پر کھڑے ہو۔''

''تو بجادوں بیل؟'' میں نے کہا۔

''دیکھ لیں آپ کی مرضی ہے، ورنہ میں ہلچل مچا دیتا ہوں اگر آپ کہیں تو۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اچھا تھوڑی دیر ٹھہرو، میں تمہیں بتاتا ہوں۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں کار ہی میں بیٹھا ہوا تھا۔ گلی میں اِکا دُکا راہ گیر گزر رہے تھے۔ انہی لمحات میں ناصر شاہ بھی گلی کے نکڑ پر پہنچ گیا۔ میں نے وہیں سے اپنی لوکیشن رضا کو بھیج دی۔ وہ مجھ سے تھوڑے فاصلے پر تھا۔ اس مکان کے باہر کوئی نام نہیں لکھا ہوا تھا۔ ہم اس بندے کے نام ہی سے واقف نہیں تھے۔ ناصر شاہ میرے پاس آکر بولا۔

''اب بتا کیا کرنا ہے؟''

''کچھ بندے ہیں تیرے ساتھ؟''

''ہاں ہیں، وہ تھوڑا دور ہیں، اگر کوئی معاملہ بنا تو وہ آجائیں گے۔ سبھی سول کپڑوں میں ہیں۔''

''اوکے، دو منٹ ٹھہرو۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے ظہیر کو فون کیا۔ وہ منتظر تھا۔

''صاحب، میں ہلچل یوں مچاؤں گا کہ اس کے فون پر کال کر کے کہوں گا کہ باہر پولیس پہنچ رہی ہے، نکل جلدی سے۔''

''اوکے۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں کار سے اُترا اور گیٹ پر جا پہنچا۔ ناصر شاہ دوسری جانب کھڑا تھا۔ تقریباً دو منٹ گزرے ہوں گے کہ ہمیں تیزی سے گیٹ کھلنے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک نوعمر لڑکے نے باہر جھانکا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ جیسے ہی اس نے سر نکالا، میں نے اس کی منڈی پکڑی اور اندر کی جانب بڑھا۔ ناصر شاہ میرے کور پر تھا۔ مجھے اندر ڈیوڑھی کے سامنے صحن دکھائی دیا، پھر ایک برآمدہ تھا۔ اسی برآمدے میں ایک نوجوان کھڑا تھا۔ اس نے ہمیں یوں اندر آتے دیکھا تو وہ فوراً اندر جانے کے بجائے، دائیں جانب سیڑھوں کی طرف بھاگا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔ میں نے نوعمر لڑکے کو چھوڑا اور اس کے پیچھے بھاگا۔ وہ چند سیڑھیاں عبور کر چکا تھا۔ میں نے اس کی ٹانگ پکڑی تو اس نے دوسری پر وزن ڈالا اور گھوم کر مجھے مارنے کی کوشش کی۔ میں بچ گیا لیکن اسے قابو میں کر لیا۔ اس کی کمر میرے دونوں ہاتھوں میں تھی، میں نے اسے گھمایا اور نیچے کی طرف پھینک دیا۔ وہ سیڑھیوں کے سرے پر گرا تو اٹھ نہیں سکا۔

اتنی دیر میں چند جوان اندر صحن میں آگئے۔ گھر میں موجود دو خواتین بھی شور کرنے لگیں۔ تبھی ناصر شاہ نے دہاڑتے ہوئے کہا۔

''خاموش بی بی۔ اس لڑکے نے قتل کیا ہے۔''

''قتل......'' ایک خاتون نے لرزتے ہوئے کہا، یہ سنتے ہی اس نے شور نہیں مچایا بلکہ دبے دبے لہجے میں آہ بکا کرنے لگی۔

''میں نے کوئی قتل نہیں کیا؟'' اس نوجوان نے بہ مشکل سر اٹھا کر کہا۔ ایسے میں رضا کے ساتھ عینی گھر میں داخل ہوئی۔ جیسے ہی اس کی نگاہ عینی پر پڑی، نوجوان کا چہرہ پیلا پڑ گیا، وہ انتہائی خوف زدہ ہو گیا۔

''یہی ہے وہ بندہ؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں یہی ہے۔'' عینی نے تصدیق کر دی۔

''تت......تم......'' اس نے کہا اور بے دم سا ہو کر وہیں فرش پر گر گیا۔

''چلو اٹھاؤ اسے اور لے چلو۔'' ناصر شاہ نے کہا تو دو جوان آگے بڑھے اور اسے اٹھا کر لے جانے لگے۔

''خدا کے لیے میرے بچے کو مت لے جاؤ، میرا بچہ بے قصور ہے۔'' وہی ادھیڑ عمر خاتون روتے ہوئے ناصر شاہ سے کہنے لگی۔

''ٹھیک ہے اماں اگر بے قصور ہوا تو اسے کچھ نہیں ہوگا۔'' اس نے کہا اور باہر کی طرف چل دیا۔

گلی میں کافی لوگ اکٹھے ہو چکے تھے۔ وہاں پر کسی بھی ہنگامے کا خطرہ ہو سکتا تھا۔ ہمیں وہاں سے بچ کر نکلنا تھا۔ اگلے چند منٹوں میں ہم وہاں سے نکل گئے۔ میں نے اس بندے کا فون قابو میں کر کے اپنے ڈیش بورڈ میں رکھ لیا تھا۔ ہماری منزل وہی پوش علاقے کی زیرِ تعمیر کوٹھی تھی جہاں ملزمان سے تفتیش کرنا ہوتی تھی۔

ہم ابھی راستے ہی میں تھے کہ ظہیر کا فون آ گیا۔ میں نے اس کی کال ریسیو کی تو وہ بولا۔

''صاحب ایک اور فون جاگ گیا ہے۔ اس کی لوکیشن بھیجوں۔''

''کون سا ہے؟'' میں نے پوچھا تو اس نے نمبر بتا دیے۔ میں نے چٹ پر وہ نمبر دیکھا تو میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میری توقع کے مطابق وہ ان لوگوں کا

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

فون نمبر تھا، جو ہمیں الیاس نے دیا تھا۔ اسی پر رابطہ کر کے انہوں نے رقم لینی تھی۔

''ابھی اس کی لوکیشن مت دو۔ جب میں کہوں تو دینا، ابھی صرف اس نمبر کو نگاہ میں رکھو۔''

''ٹھیک ہے، اس کا مطلب ہے آپ سے جڑے رہنا ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا تو میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''کہتے ہیں صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ اسے سمجھو۔''

''اوکے صاحب..... آج آپ کے ساتھ مزدوری کر لیتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

ایک منٹ نہیں گزرا تھا کہ الیاس کا فون آ گیا۔ اس نے بھی مجھے یہی اطلاع دی کہ رقم مانگ لی گئی ہے۔ وہ کہہ رہا ہے رقم دے کر بندہ بھیجو۔ تب میں نے اسے کہہ دیا، میں اس تک پہنچ رہا ہوں۔ میں نے ساری صورتِ حال ناصر شاہ کو بتائی۔ ہم اس کے لیے پلان پہلے ہی کر چکے تھے۔ ناصر نے اس نوجوان کے ساتھ دو بندے بھیج دیے خود وہ سارے انتظامات کرنے لگا۔ میں تقریباً بیس منٹ میں الیاس کے آفس پہنچ گیا۔ اس کی میز پر ایک سیاہ بیگ رکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک فون رکھا ہوا تھا۔

''یہ بیگ ہے، اس میں تقریباً اٹھائیس لاکھ روپے ہیں۔ اور یہ فون ہے جس سے ان کے ساتھ رابطہ رہے گا۔'' اس نے بتایا

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا اور فون اور بیگ اٹھا کر چل دیا۔

میں جب الیاس کے دفتر سے نکلا تو میرے اردگرد لوگ پھیل چکے تھے۔ میں نے کار میں بیٹھتے ہی ظہیر کو کال ملائی اور لوکیشن کا پوچھا۔ اس نے جھٹ سے میرے فون پر لوکیشن بھیج دی۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر ہی تھا۔ میں منتظر تھا کہ وہ مجھے فون کرے۔ میں نے کار اسٹارٹ کی اور چل دیا۔ میں ابھی بیس گز بھی نہیں گیا تھا کہ الیاس والا فون منمنایا۔ میں نے کال لیتے ہوئے پوچھا۔

''جی بولیں۔''

''اسی طرح سیدھے چلتے رہو، اگلے کراس سے دائیں مڑ جانا۔ میں پھر بتاتا ہوں۔''

یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے ظہیر کو کال ملا کر کہا۔

''اب فون بند نہیں کرنا، مجھے اس کی لوکیشن بتاتے رہنا۔''

''جی صاحب، وہ آپ سے تھوڑے ہی سے فاصلے پر پیچھے ہے۔''

''اب جب تک ہم بالکل قریب نہ ہو جائیں مجھے بتاتے رہنا۔'' میں نے اسے سمجھایا تو وہ مجھے بتانے لگا، میں اگلے کراس سے دائیں جانب مڑ گیا۔ تقریباً آدھا گھنٹا ہم اسی چوہے بلی کے کھیل میں لگے رہے۔ وہ مجھے کچھ دیر بعد نئی ہدایت دے دیتا۔ میں اس کی ہدایت کے مطابق چلتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے شہر سے باہر جانے والی سڑک پر مجھے پہنچا دیا۔ وہاں جا کر اس نے مجھے کچی سڑک پر اترنے کا کہا اور میں اُتر گیا۔

''یہاں بیگ رکھو اور واپس پلٹ جاؤ۔'' اس نے مجھے ہدایت دی۔

''اس کے لیے مجھے باہر نکلنا پڑے گا۔'' میں نے کہا۔

''نہیں کار میں بیٹھے بیٹھے پھینک دو۔'' اس نے غراتے ہوئے کہا تو میں نے بیگ پھینک دیا۔ اس کے ساتھ ہی ظہیر سے پوچھا۔

''کہاں ہے وہ۔''

''آپ سے تقریباً سو گز دور ہو گا۔ جہاں سے آپ مڑے ہیں، مطلب آپ کے پیچھے پیچھے ہی آیا ہے۔''

میں نے ناصر شاہ کو فون کیا اور کار موڑنے لگا۔

''کہاں ہو آپ سب؟''

''جہاں سے تم مڑے ہو، اس سے تھوڑے فاصلے پر۔''

''کوئی کار کھڑی دکھائی دے رہی ہے؟'' میں پوچھا۔

''ہاں ایک ہے تو سہی۔''

''بس وہی ہمارا ٹارگٹ ہے۔'' میں نے کہا اور کار موڑنے لگا۔ میں کار موڑنے کے بجائے سیدھا آگے چلا گیا۔ تھوڑے سے فاصلے پر جا کر میں نے یوٹرن لیا اور انتہائی رفتار سے واپس آیا۔ وہ رکی ہوئی گاڑی کچی سڑک پر اتر چکی تھی۔ وہ جیسے ہی بیگ تک پہنچے، ایک بندہ تیزی سے اترا اور بیگ تک پہنچا، اسی وقت فائرنگ ہونا شروع ہو گئی۔ سامنے سے بھی فائر ہونے لگے۔ میں ان کی گاڑی تک پہنچ گیا تھا۔ میں نے اپنا پسٹل نکالا اور اس کار کے ٹائروں پر فائر کرنے لگا۔ ناصر شاہ اور جوان بھی اِدھر اُدھر پھیل کر فائر کر رہے تھے۔ سامنے سے فائرنگ رک گئی تھی۔ ہم تھوڑا آگے بڑھے۔ تبھی ایک نوجوان نے سن

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

روف کھولا اور فائر کر دیا۔ وہ میری کار کے بونٹ پر لگا۔ تب تک کئی فائر اس کی طرف ہو گئے۔ چونکہ ہم انہیں مارنا نہیں، زندہ پکڑنا چاہتے تھے، صرف ڈرایا دھمکایا جا رہا تھا۔ تھوڑی سی محنت کے بعد ہم نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ فائرنگ رک جانے سے خاموشی ہو گئی تھی۔

''باہر آ کر گرفتاری دے دو، تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ تمہارے پاس صرف دو منٹ ہیں۔ اس کے بعد کوئی معافی نہیں ملے گی۔'' ناصر شاہ نے بلند آواز میں کہا۔

اس وارننگ کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ کار میں سے دو نوجوان نکلے۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سر پر رکھے ہوئے تھے۔ فوراً ہی دو تین جوان کار کی جانب بڑھے۔ اس میں کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے ان دونوں کو قابو میں کیا اور سیاہ بیگ پھر سے میری گاڑی میں آ گیا۔

''ان کی تلاشی لو، ان کے سیل فون چیک کرو۔''

دونوں کی جیبوں سے سیل فون برآمد ہوئے۔ وہ میں نے اپنے قبضے میں کیے۔ ان کی گاڑی ایک نوجوان لے کر چل پڑا۔ انہیں باندھ کر ایک گاڑی میں ڈالا اور چل دیے۔ شہر میں داخل ہو کر میں نے ناصر کو فون کیا۔

''ناصر تم چلو میں تھوڑی دیر میں پہنچتا ہوں۔''

''اوکے۔'' اس نے کہا اور میں سیدھا الیاس کے آفس میں گیا۔ انہیں بیگ واپس کرتے ہوئے کہا۔

''اپنی رقم گن لیں۔''

''ہمیں اعتماد ہے۔'' اس نے کہا۔

''ممکن ہے، کم ہوں۔'' میں نے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔'' اس نے کہا تو میں واپس مڑا اور سیدھا ظہیر کی طرف چل دیا۔ میں نے بیگ میں سے اس کا حصہ تقریباً دو لاکھ نکال لیا تھا۔

میں نے اسے ایک اہم سٹاپ پر بلا لیا تھا۔ گلیوں میں جاتا تو مجھے بہت دیر ہو جاتی۔ تھوڑی دیر بعد میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے اسے پک کیا اور چل پڑا۔

''ڈیش بورڈ کھولو اور اس میں سے رقم نکال لو۔''

اس نے ڈیش بورڈ کھولا اور نوٹ اٹھا کر کہا۔

''صاحب یہ تو دو لاکھ سے اوپر لگتے ہیں۔''

''ہاں تو تمہارے لیے ہیں نا۔ اسے رکھو، ابھی مزید ملنے والے ہیں۔'' میں نے اسے باور کرایا کہ وہ کام کرے۔

''باقی دو نمبر تو ٹریس کرنے ہیں۔ لیکن ابھی یہ تینوں فون جو ڈیش بورڈ میں پڑے ہیں انہیں اٹھاؤ اور ان کا پورا پورا پوسٹ مارٹم کر کے دو۔ رہی زندگی تو شام کو ملتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے صاحب۔''

''چل اب اتر، مجھے مزدوری پر جانے دے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور ایک جگہ اسے اتار دیا۔ وہ اترا تو میں نے کار بھگا دی۔

☆☆☆

میں زیرِ تعمیر کوٹھی پہنچا تو وہ تینوں ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے پاس ناصر شاہ تھا۔ کمرے سے باہر چند افراد پہرا دے رہے تھے۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ ہمارے خفیہ ڈیپارٹمنٹ کا آصف مغل بھی وہاں موجود تھا۔

''ارے تم یہاں کیسے؟'' میں نے بے ساختہ پوچھا۔

''تمہارا کیا مطلب ہے ہم سوئے ہوئے ہیں۔ میں تو ان دونوں کے پیچھے کئی دن سے ہوں۔ میں اس انتظار میں تھا کہ یہ کوئی وارادات کریں تو میں انہیں پکڑوں۔'' اس نے سکون سے بتایا۔

''اب یہ ان سے پوچھ لیں، یہ سیدھے سیدھے سچ بتائیں گے یا پھر تھوڑا گرم کرنا پڑے گا انہیں۔'' میں نے ان کی طرف دیکھ کر سخت لہجے میں جان بوجھ کر کہا۔

کسی بھی مجرم پر نفسیاتی دباؤ زیادہ کارگر ثابت ہوتا ہے۔ انہیں یہ باور کرانا پڑتا ہے کہ ہمیں سب کچھ پتا ہے لیکن وہ ان کے منہ سے سننا چاہتے ہیں۔ اگر تعاون کریں گے تو شاید وہ بچ جائیں ورنہ دوسری صورت میں تو بس ان کی موت ہی ہے۔ ان پر موت کا خوف طاری کرنا پڑتا ہے۔

''لگتا ہے یہ لوگ تربیت یافتہ ہیں۔'' ناصر شاہ نے کہا۔

''مگر کسی چوہے کی طرح پکڑے گئے۔ یہ کیا تربیت ہوئی بھلا۔'' آصف مغل نے اہانت آمیز لہجے میں کہا۔

''تم لوگ جانتے نہیں ہو ہم کون ہیں، اگر ہمارا پتا لگ گیا نا تو تمہاری سانسیں رک جائیں گی۔'' ان میں سے ایک نے کہا تو ناصر شاہ نے آگے بڑھ کر ایک ٹھوکر اس کی پسلیوں پر ماری اور دہاڑتے ہوئے کہا۔

''بول بے، کون ہے تو، بول میں بھی ڈر جاؤں۔''

''میں کہتا ہوں، ہمیں جانے دو، ورنہ بہت بُرا

www.pakistanipoint.com

ہوگا۔'' اس نے پھر ناصر شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو مجھے بھی غصہ آنے لگا۔

''پہلے تم اپنے بارے میں بتاؤ... بلکہ یہ بتاؤ کہ تم کس کے کُتے ہو۔ پھر اگلی بات کرتے ہیں۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا اور اس کو بالوں سے پکڑ لیا، پھر اسے گھسیٹتا ہوا کمرے کے درمیان لے آیا۔ پھر اس کے ٹھوکر مارتے ہوئے بولا ''ابھی بولے گا یا......''

''جنید میں ان دونوں کو دیکھتا ہوں، تم اسے لے جاؤ، وہ عینی والا بندہ اسے۔'' ناصر شاہ نے کہا تو میں نے اس لڑکے کی طرف دیکھا، اسے اٹھنے کا اشارہ کیا وہ بادلِ ناخواستہ اٹھ گیا۔ میں نے اسے کالر سے پکڑا اور دوسرے کمرے میں لے گیا۔ میں نے راہداری میں کھڑے دو افراد کو بھی بلا لیا۔ میں نے اسے کمرے کے فرش پر بٹھا دیا اور خود کرسی گھسیٹ کر اس سے دو فٹ کے فاصلے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں بھئی جوان کیا نام ہے تیرا؟''

''فرخ ہے جی۔'' اس نے دھیمے سے بتایا۔

''کس کے لیے کام کرتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میں جو کچھ بھی کہوں گا، آپ سے بالکل سچ کہوں گا ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔ آپ چاہیں اس کی جتنی مرضی تحقیق کر لیں۔'' اس نے روہانسا ہوتے ہوئے کہا۔

''جو میں نے پوچھا ہے، وہ بتاؤ، سچ جھوٹ کا پتا چل جائے گا۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا تو وہ ہولے سے بولا۔

''کوئی چھ ماہ ہو گئے ہیں، ایک خاتون فون پر میری دوست بن گئی تھی۔ ہماری باتیں یونہی بے تکلفی سے آگے بڑھیں اور پھر بڑھتی چلی گئیں۔ میں چونکہ بے روزگار تھا۔ اس نے مجھے دھیرے دھیرے اس بات پر قائل کر لیا کہ میں کچھ لڑکیوں سے راہ و رسم بڑھاؤں۔ اور انہیں کچھ لوگوں کے قریب کر دوں تو ایک لمبی رقم وہ دیتی رہے گی۔ میں نے پھر ایسا ہی کیا۔''

''کیا وہ خاتون تمہیں کبھی ملی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں وہ مجھے کبھی نہیں ملی، بس ہماری بات فون پر ہی ہوتی تھی۔ وہ مجھے رقم میرے اکاؤنٹ میں بھیج دیتی تھی۔ میں وہاں سے لے لیتا تھا۔'' اس نے بتایا تو میں نے پوچھا۔

''تم کیا کرتے تھے؟''

''میرے پاس رقم آنی شروع ہوئی تو میں بھی پارٹیوں میں جانے لگا۔ وہاں کئی لڑکیاں ملتیں۔ اُن سے بات چیت چلتی، دوستی ہو جاتی۔ پھر وہ خاتون مجھے بتاتی کہ کس بندے کے ساتھ مجھے کس لڑکی کو جوڑنا ہے۔ میں پھر اس پر کام کرتا۔ اس سے پھر جو معلومات ملتیں، وہ میں اس خاتون کو بتا دیتا تھا۔ مجھے رقم مل رہی تھی۔'' اس نے بتایا۔

''وہ کس طرح کی معلومات لیتی تھی، چلو عینی کے بارے ہی میں بتاؤ؟'' میں نے پوچھا تو بولا۔

''یہی کہ اجمل ملک کیا کر رہا ہے؟ کس وقت، کہاں ہوتا ہے۔ جب اس نے فیکٹری لگائی تو وہاں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ ایسی ہی باتیں۔''

''کیا اجمل ملک کوئی جرائم پیشہ بندہ ہے کیا پتا چلا؟'' میں نے ایک خیال کے تحت پوچھا تو وہ تیزی سے بولا۔

''نہیں، بس اسے لڑکیوں سے دلچسپی تھی۔ ان پر وہ بہت زیادہ رقم خرچ کرتا تھا۔ بس اس کے سوا نہیں۔''

''کیا تمہیں یہ پتا ہے کہ اسے بلیک میل کیا جا رہا تھا۔ عینی جب عدنان کے ساتھ......'' میں نے پوچھنا چاہا تو وہ تیزی سے بولا

''جی مجھے پتا ہے لیکن اس حد تک جتنا مجھے عینی بتاتی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ اجمل ملک بہت پریشان ہے۔ کوئی اسے بلیک میل کر رہا ہے۔ جس دن عینی اکبر آباد گئی تھی، اس نے مجھے بتایا تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ عینی کو یوں سامنے بلاتا تھا۔ یہ تعلق خفیہ رکھا ہوا تھا۔ میں پریشان ہو گیا۔ مجھے کوئی گڑبڑ لگی تھی۔ اس کے بعد میں نے بھی عینی کے ساتھ رابطہ نہیں کیا پھر پتا چلا کہ کوئی قتل ہو گیا ہے۔''

''اس خاتون سے بات کر سکتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا فون میرے پاس نہیں۔ اب پتا نہیں وہ کال ریسیو بھی کرتی ہے کہ نہیں۔'' اس نے دھواں ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ کہا۔

''نمبر تو تمہیں یاد ہوگا۔'' میں نے پوچھا۔

''ہاں یاد ہے۔'' اس نے کہا۔

''بتاؤ۔'' میں نے کہا تو اس نے مجھے نمبر بتا دیا۔ میں نے کال کی تو میری توقع کے مطابق وہ فون بند تھا۔ میں نے وہ ظہیر کو بھیج دیا۔ اس کے ساتھ میسج بھی کر دیا کہ اسے بھی دیکھے، جیسے ہی یہ فون 'جاگے' مجھے بتا دے۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

''اب دیکھ لے، تو نے جو کہا، میں نے سچ مان لیا۔ اب اگر کوئی بات نکلی تو سمجھو، تیری خیر نہیں، یہ قتل تجھ پر بھی پڑ سکتا ہے۔ یہ ذہن میں رکھنا۔'' میں نے کہا تو وہ تڑپ کر بولا۔

''مجھ سے جیسی قسم لے لیں، یہ سچ ہے۔ خدا کے لیے مجھ پر قتل مت ڈالیں، مجھے اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے۔''

''اچھا دیکھتے ہیں۔'' میں نے کہا اور اس کے پاس ایک بندہ چھوڑ کر وہاں سے اٹھ آیا۔

دوسرے کمرے میں ان دونوں کی درگت بن چکی تھی۔ وہ فرش پر پڑے لمبی لمبی سانسیں لے رہے تھے۔ تبھی میں نے پوچھا۔

''کچھ بتایا انہوں نے؟''

''نہیں ابھی تک خاطر داری کروا رہے ہیں۔''

''تو پھر اچھی طرح کرو نا، کوئی ہڈی ٹوٹے، کوئی زخم آئے، کوئی فائر ہی مار دو، آخر ہمارا فائرنگ کا تبادلہ تو ہوا ہے۔ ان میں ایک آدھ کو مار دو۔'' میں بڑے سکون سے بولا۔

''ہاں تمہاری یہ بات تو بالکل ٹھیک ہے۔ ایک مر بھی گیا تو ہمیں کیا، اور دوسرا بھی فائر لگنے سے اوپر پہنچ گیا تو ہمیں کیا۔ خبر تو یہی بنے گی نا کہ دو ڈکیت مزاحمت کے دوران پولیس مقابلے میں ہلاک۔'' ناصر شاہ نے کہا اور ساتھ ہی پٹل نکالتے ہوئے اس کا سیفٹی کیچ ہٹا دیا۔

''بالکل، ایسا ہی کرو۔'' آصف مغل نے کہا۔

''ہاں بھئی کس کو مرنا ہے۔''

کمرے میں آواز گونجی تو ایک دم سے سناٹا چھا گیا۔ ان دونوں نے سر اٹھایا اور ناصر شاہ کی طرف دیکھا پھر ان میں سے ناٹے قد والے نے تھرتھراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں بتاتا ہوں۔''

''چل دوسرے کو اٹھا کر لے جا باہر اور فائر مار دے۔'' ناصر شاہ نے دہاڑتے ہوئے کہا۔

''نن..... نہیں..... میں بھی بتاتا ہوں۔''

''چلو پھر ہو جاؤ شروع۔'' ناصر شاہ نے غصے میں کہا تو ان میں سے ناٹے قد والے نے کہا۔

''ہم اسی شہر کے رہنے والے ہیں۔ بس چھوٹی موٹی بدمعاشی چلتی ہے ہماری۔ اسی بل بوتے پر کچھ جوئے کے اڈے چلتے ہیں، کسی کی زمین کا قبضہ چھڑوانا ہو یا قبضہ کرنا، بس یہی ہمارا کام ہے۔ تین چار ماہ پہلے ہم سے ایک بندے نے رابطہ کیا کہ موٹی رقم کمانی ہے تو بتاؤ۔ اس نے تفصیل یہ بتائی کہ رقم والا بیگ لینا ہے اور بحفاظت پہنچانا ہے۔ جتنی رقم بھی ہوگی، اس کا تیسرا حصہ ہمیں ملے گا۔ یہ کام تھوڑا رسک والا تو تھا لیکن بہت آسان تھا۔ پھر یہ کام کرتے چلے گئے۔''

''اب تک کتنی بار کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ ہمارا آٹھواں چکر تھا۔'' اس نے بتایا۔

''آٹھواں؟'' میں نے بے ساختہ کہا، پھر ناصر شاہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ شہر میں کوئی تیسرا بندہ بھی بلیک میل ہو رہا ہے۔''

''کتنے دنوں بعد ایک چکر ہوتا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہر ہفتے میں ایک بار تو ضرور۔'' اس نے کہا۔

''اچھا یہ بتاؤ، بیگ پہنچاتے کہاں تھے؟'' آصف

چٹکلا

ایک نیا شادی شدہ جوڑا کسی تفریحی مقام پر ہنی مون منانے گیا۔ منیجر نے جب پوچھے بغیر ان کا نام رجسٹر میں لکھ لیا تو بیوی بہت حیران ہوئی، اس نے منیجر سے پوچھا۔ ''آپ کو میرے شوہر کا نام کیسے معلوم؟''

منیجر نے جواب دیا۔ ''یہ ہمارے پرانے کرم فرما ہیں۔ ہر سال ہنی مون منانے کے لیے ہمارے ہوٹل میں ہی تشریف لاتے ہیں۔''

☆☆

ایک لڑکا رشتے کے سلسلے میں لڑکی دیکھنے گیا۔ لڑکے کو لڑکی پسند آ گئی تو اس نے لڑکی سے پوچھا۔ ''کیا آپ کے والد کی حیثیت اتنی ہے کہ وہ مجھے سلامی میں کار دے سکیں؟''

لڑکی نے جواب دیا۔ ''میرے ابا کی حیثیت تو ہوائی جہاز دینے کی ہے لیکن کیا آپ کے ابا کی حیثیت ائر پورٹ بنانے کی ہے؟''

مردان سے عجب خان کا جواب

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

نے پوچھا۔

''جس طرح لیتے تھے، اسی طرح دے دیتے تھے۔'' اس نے بتایا۔

''سمجھا نہیں؟'' آصف مغل نے کہا۔

''ہوتا یوں تھا کہ ہم بیگ لے لیتے اور اپنے پاس رکھ لیتے۔ اس میں رقم گنتے کہ کتنی ہے۔ اس میں سے اپنا حصہ نکال کر رکھ لیتے۔ پھر ہمیں فون ملتا کہ بیگ دے جائیں۔ کوئی ہمیں کسی بھی سڑک پر ملتا۔ ہمارا اس سے رابطہ ہو جاتا اور ہم بیگ اس کے حوالے کر دیتے۔ ہمیں نہیں پتا کہ وہ بیگ کدھر لے جاتے تھے۔'' اس نے بتایا۔

ہم تینوں نے ان سے گھما پھرا کر کئی سوال کیے تھے لیکن اس سے زیادہ ہمیں کچھ نہیں ملا تھا۔ تھک ہار کر میں، ناصر شاہ اور آصف مغل تینوں کمرے سے باہر آ گئے۔

''سر کھانا آیا ہے، وہیں تو لگا دوں۔'' ایک جوان نے ہمیں باہر نکلتا دیکھ کر کہا تو ناصر شاہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جوان نے اوپر ایک کمرے میں جانے کا کہا۔ جس کی ابھی کھڑکیاں تک نہیں بنی تھیں۔ وہاں سے ہوا آ رہی تھی۔ فرش بھی نہیں بنا تھا۔ وہیں اس نے ایک چادر ڈال دی اور کھانا لگا دیا۔ ہم کھانے کے دوران اپنے اپنے طور پر سوچتے رہے۔ یہاں تک کہ کھانا کھا چکے اور وہیں بیٹھے باتیں کرنے لگے۔

''تم اس کیس میں کب انوالو ہوئے؟'' ناصر شاہ نے آصف سے پوچھا تو وہ بولا۔

''میرے لوگوں کی نظر ایسے لوگوں پر تو ہوتی ہی ہے۔ پچھلے ماہ سے ان کی سرگرمیوں کی مشکوک اطلاع تھی مجھے۔ ہم ان پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ پچھلی بار ان کا لین دین ہونا تھا جو نہیں ہوا۔ یہ انتظار کرتے رہے اور کوئی ان کے پاس نہیں آیا۔ میں ایسے ہی کسی اگلی ورادات کا منتظر تھا کہ انہیں رنگے ہاتھوں پکڑوں۔ مجھے ابھی اتنا علم نہیں تھا کہ یہ اصل میں واردات کیا کر رہے ہیں۔ میں انہیں صرف مشکوک سمجھ کر ان کی نگرانی کروا رہا تھا۔''

''یہ کوئی لمبی چوڑی واردات لگتی ہے۔ اس میں پلان کس قدر خفیہ رکھا جا رہا ہے۔ جسے بھی ہم پکڑتے ہیں۔ اسی تک محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ آگے بالکل اندھیر چھا جاتا ہے۔'' ناصر شاہ نے سوچتے ہوئے کہا پھر چونک کر میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''جنید تمہیں اس فرخ کے بارے میں کیسے پتا چلا، تم بالکل ٹھیک اس کے گھر تک جا پہنچے؟''

''تم آم کھاؤ، پیڑ مت گنو۔'' میں نے گول مول بات کر دی۔

''یہ کیا بات ہوئی بھلا؟'' اس نے اُکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

''میرے کچھ اپنے ذرائع ہیں، انہوں نے پہنچا دیا۔ اب یہ سوچو کہ آگے کرنا کیا ہے؟'' میں نے بات بدلنے کی خاطر کہا۔

''ان سب پر تو کچھ نہ کچھ ڈال کر کرتے ہیں نا اندر..... لیکن ابھی تک وہ قاتل نہیں پکڑا گیا اور یہ بلیک میلر کا گروہ.....'' ناصر شاہ نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ اس کے چہرے پر مایوسی پھیل چکی تھی۔

''ایک منٹ ٹھہرو..... سوال یہ ہے کہ اتنا بڑا منظم گروہ، جو صرف اپنے مہروں سے کام چلا رہا ہے۔ ظاہر ہے کسی نہ کسی پلان کے تحت چل رہا ہوگا، مطلب کوئی تو اس پلان کا کرنے والا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کس مقصد کے لیے یہ پلان کر رہا ہے؟ کیا اسے دولت ہی چاہیے؟'' آصف مغل اپنی رو میں کہتا ہی چلا گیا۔

''یہ بات تو اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ اگر کوئی گروہ ہے تو وہ بہت منظم ہے، ان کی پلاننگ بھی بہت مضبوط ہے۔ اب ان کا مقصد کیا ہے، یہ ہم اس وقت تک نہیں جان سکتے جب تک وہ پکڑے نہ جائیں۔'' میں نے پُرسکون انداز میں کہا۔

''تو پھر کیا کیا جائے؟'' ناصر شاہ نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔

''ایسے ہو سکتا ہے کہ شہر میں ہونے والی مشکوک سرگرمیوں کو ایک بار پھر سے دیکھا جائے۔ مطلب میں اپنے لوگوں سے کہتا ہوں۔ دوسرے دوستوں سے بھی ملتا ہوں۔ ان سے ملتی جلتی اگر کوئی سرگرمی دکھائی دی تو اسے دیکھ لیتے ہیں۔ اب تو یہی ہو سکتا ہے۔'' آصف مغل نے ایک راستہ دکھایا تو میں نے کہا۔

''ہاں یہ ایک راستہ تو ہے۔ اس پر کوشش ضرور کرنی چاہیے۔ ویسے ان لوگوں کے پکڑے جانے سے وہ اپنی سرگرمیاں بالکل بند کر کے کچھوے کے مانند اپنا سر چھپا لیں گے۔ آپ دیکھ لینا جو بھی نمبر ہمیں ملے گا، وہ بند ہوگا۔ ہمیں ان سے کوئی مدد نہیں ملے گی۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن ہمیں ایک کوشش ضرور کرنی چاہیے۔'' آصف نے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

''چلو ٹھیک ہے۔ ملتے ہیں پھر شام کے وقت۔''
میں نے کہا اور اٹھ گیا۔ میں وہاں سے اٹھنا چاہتا تھا۔ کیونکہ مجھے ظہیر کا میسج آ گیا تھا کہ میں اس کے پاس پہنچوں۔ بلاشبہ وہ کچھ نہ کچھ معلوم کر چکا تھا۔ میں وہاں سے اٹھا اور اپنی کار تک جا پہنچا۔ مجھے اب ظہیر کے پاس جانا تھا۔

☆☆☆

میں نے اپنی کار ایک مارکیٹ کے سامنے پارک کی اور تنگ گلیوں میں ہوتا ہوا ظہیر کے پاس جا پہنچا۔ وہ میرے ہی انتظار میں تھا۔ اس نے مجھے ایک کرسی پر بٹھایا اور بولا۔

''صاحب، یہ کھیل ہے تو بہت اُلجھا ہوا اور بہت صبر آزما ہے لیکن ہے بڑا دلچسپ۔''

''ابے کیا ہو گیا؟'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''دیکھیں آپ نے مجھے تین فون نمبرز دیے تھے۔ میں نے انہیں ٹریس کیا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔ ان کے اپنے ہی چند مخصوص نمبرز ہیں جن پر انہوں نے بہت زیادہ کالز کی ہیں۔ دوسرا ایک الگ فون تھا، اس کی ایک نمبر پر بہت زیادہ کالز تھیں۔ وہ تھوڑا مجھے لگا۔ لیکن جیسے ہی آپ نے مجھے نمبر بھیجا تو بہت کچھ کھل گیا۔'' اس نے کہا اور طویل سانس لی۔

''وہ ایک عورت کا نمبر ہے۔ اس عورت کا نمبر میں نے ٹریس کیا تو ایک مخصوص نمبر پر اس کی بہت زیادہ کالز تھیں۔ شاید میں اسے نظر انداز کر دیتا لیکن یہ جو دو فون الگ مجھے آپ نے دیے، یہ بھی اسی نمبر پر کالز کرتے رہے ہیں، جس پر وہ عورت کال کرتی ہے۔ یعنی دونوں کا ایک مشترکہ نمبر مل گیا ہے۔'' اس نے دلچسپی سے کہا تو میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''وہ کون سا نمبر ہے؟''

اس نے اسکرین کی طرف اشارہ کیا، کی بورڈ سے کچھ ٹائپ کیا اور سامنے اسکرین پر وہی نمبر جگمگانے لگا۔

''یہ ہے جی مشترکہ نمبر۔''

''اس کی لوکیشن دیکھی، کس کے نام ہے یہ؟'' میں نے پوچھا

اس نے پھر سے ٹائپ کیا.... تو اسکرین پر ایک لوکیشن نمودار ہو گئی۔ جس طرح نیٹ پر نقشہ سامنے آ جاتا ہے، بالکل اسی طرح وہ شہر کا منظر تھا، پہلی نگاہ میں لگا کہ وہ کسی گاؤں کا نقشہ ہے، چاروں طرف ہرے بھرے درخت ہیں۔ لیکن پھر غور کیا تو وہ ایک مخصوص چار دیواری کے اندر گھر تھا جو کئی ایکٹر پر پھیلا ہوا تھا۔ وہ کوئی فارم ہاؤس تھا۔

''یہ نمبر کسی عبدالجبار ولد محمد دین کے نام پر ہے۔''
ظہیر کی آواز سنائی دی تو میں نے نقشے سے اپنی نگاہیں ہٹائیں۔

''اس نقشے کی درست لوکیشن کیسے ہو گی؟'' میں نے پوچھا تو مجھے لگا میں نے احمقانہ سوال کر دیا ہے پھر تیزی سے کہا۔ ''مطلب اس کی حتمی نشان دہی کرو۔''

''وہ میں بتا دیتا ہوں، ویسے میں نقشہ بھی آپ کو بھجوا دیتا ہوں تاکہ آپ کے پاس محفوظ ہو جائے۔''

وہ جگہ شہر کے شمال میں تھی۔ اسے جو مین روڈ لگتا تھا وہ یہی شہر اور اکبر آباد کے درمیان والا تھا۔ وہی روڈ جس پر فلنگ اسٹیشن تھا اور اس کے پاس جنگل تھا۔ لیکن یہ فارم ہاؤس کافی آگے، شہر کے پاس، سڑک کے بائیں جانب تھا۔ میں نے اس کی لوکیشن اچھی طرح سمجھ لی۔

''کیا یہ نمبر ابھی بھی 'جاگ' رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں، میں کافی دیر سے دیکھ رہا ہوں، یہ یہیں پر ہے اور اس سے کئی کالز بھی ہوئی ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''یہ کالز کس نمبر پر ہوئیں؟''

''صاحب نمبر بھی بتا دیتا ہوں اور لوکیشن بھی۔'' اس نے کہا اور کی بورڈ پر مصروف ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اسکرین پر ایک اور نقشہ نمودار ہوا۔ وہ شہر کے ایک رہائشی علاقے کا تھا۔ ایک مخصوص گھر پر اس نے انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

''یہاں ہے وہ فون نمبر۔''

''کیسے کر لیتے ہو یار تم؟'' میں نے خوشگوار حیرت سے پوچھا۔

''ویری سمپل، جس طرح جال ہوتا ہے، ایک دوسرے سے جڑا ہوا، یہ بھی ایسا ہی ہے۔ جس سے جتنی زیادہ کالز ہوں گی وہ اتنا ہی قریب ہو گا، مطلب اس سے زیادہ قریب ہو گا، یہ جس حوالے سے بھی ہو۔'' اس نے پُرسکون انداز میں کہا۔

''اچھا اب صورتِ حال یہ بنی ہے کہ جس نمبر پر عورت کال کرتی ہے۔ اسی پر یہ دونوں کرتے ہیں۔ وہ مشترکہ نمبر کسی اور کو کال کرتا ہے۔''

''دونوں جگہوں کے نقشے بھی آپ تک پہنچ گئے ہیں۔'' اس نے کہا۔

www.pakistanipoint.com

''تمہارا مال بھی بہت جلد تم تک پہنچ جائے گا، اگر مجھے ملا تو۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اس کی مجھے پروا نہیں۔ میں جانتا ہوں یہ بے ایمانی کا دھندا ہمیشہ ایمان داری سے چلتا ہے، ورنہ نہیں چلتا۔'' اس نے کہا تو ہم دونوں ہی ہنس دیے۔ تبھی میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''چل بابو، میں اب نکلتا ہوں۔ کوئی انفارمیشن ملے تو مجھے بتانا۔''

''جی ٹھیک صاحب۔'' اس نے کہا تو میں نکلتا چلا گیا۔

میں واپس مارکیٹ تک آیا تو سہ پہر ہو چکی تھی۔ وہاں آتے ہی میں نے ناصر شاہ کو فون کر دیا۔

''جلدی تھانے پہنچو میرے پاس کچھ انفارمیشن ہیں۔''

''چل پہنچتا ہوں۔''

''اور آصف مغل کو بھی بلا لینا۔'' میں نے کہا۔

''او کے۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ جب تک میں کار مارکیٹ سے نکال کر روڈ پہ آیا تب تک میں نے رضا کو بھی فون کر دیا۔ کچھ دیر بعد ہم چاروں ناصر کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں ساری صورتِ حال سمجھانے میں مجھے دس بیس منٹ لگ گئے۔

''اوہ اس فارم ہاؤس میں ضرور کچھ ہے۔ ایک انفارمیشن میں بھی شیئر کرنا چاہتا ہوں۔'' آصف نے مضطرب ہوتے ہوئے کہا۔

''بولو۔'' ناصر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرے ایک سورس نے مجھے اطلاع دی ہے کہ کچھ دنوں سے ایک شخص ایک مخصوص قسم کا پیکٹ لے کر شہر سے نکلتا ہے۔ اور وہ اس فارم ہاؤس میں جاتا ہے۔ یہ کام روزانہ نہیں ہفتے میں ایک آدھ بار کرتا ہے۔ اس کا مطلب ہے یہ فارم ہاؤس مشکوک ہے۔''

''ممکن ہے وہ کوئی ڈاک وغیرہ.....''

''میرا سورس ایک دکان دار ہے۔ وہ پیکٹ ایک دکان پر آتا ہے۔ کوئی ٹرک یا ویگن باہر سے آتی ہے تو وہ پیکٹ اس ٹرک یا ویگن سے بھیجا جاتا ہے۔ وہاں سے ایک آدمی بائیک پر آتا ہے اور لے جاتا ہے۔ جب مجھے یہ بتایا گیا تو میں نے اپنا ایک آدمی اس کے پیچھے لگا دیا کہ یہ جاتا کہاں ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ فارم ہاؤس تک جاتا ہے۔ مطلب پیکٹ کی ڈلیوری وہیں ہوتی ہے۔'' آصف نے پوری تفصیل سے بتایا۔

''تو اس کا مطلب یہ ہوا میری جان کہ وہاں پر کچھ لمبا ہی چل رہا ہے۔ اگر وہاں پر کوئی کارروائی کرنی پڑی تو بہت سوچ سمجھ کر ناہوگی۔'' ناصر نے سوچتے ہوئے کہا تو رضا بولا۔

''صاحب سے ملو اور انہیں بتاؤ، ہمیں فورس چاہیے ہوگی۔''

''بالکل، اس فارم ہاؤس کو دیکھنا پڑے گا۔'' میں نے حتمی انداز میں کہا تو سبھی اس پر متفق ہو گئے۔

☆☆☆

اس وقت سورج غروب ہونے کو تھا جب میں اور ناصر اس فارم ہاؤس تک جا پہنچے۔ ہماری بیک پر کمانڈوز تھے۔ جنہوں نے ہمارے ساتھ مخصوص مائیک لگا دیے تھے۔ ہمیں بس منہ سے چند لفظ نکالنے تھے اور وہ کمک پہنچ جاتی۔ ان کا اپنا ایک طریقہ کار تھا۔ اس وقت ہم ان کے ماتحت تھے اور ان کی ہدایات کو فالو کر رہے تھے۔ میں اور رضا نے سفید سفاری سوٹ پہنے ہوئے تھے اور کسی محکمہ کے آفیسر لگ رہے تھے۔ فارم ہاؤس کے گیٹ پر ہمیں روک لیا گیا۔

''کس سے ملنا ہے؟'' ایک سیکیورٹی گارڈ نے پوچھا۔

''اس فارم ہاؤس کے مالک سے یا جو کوئی بھی اس کا نمائندہ ادھر ہے۔'' میں نے رعب دار لہجے میں کہا۔

''کیوں ملنا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''دیکھو ہم انکم ٹیکس سے آئے ہیں۔ ہم سے زیادہ سوال جواب مت کرو۔ ہمیں ان سے ملواؤ یا پھر ہم انہیں اپنے دفتر میں بلوا لیں گے۔'' میں نے ذرا سختی سے کہا تو وہ لمحہ بھر سوچ کر بولا۔

''ٹھیک ہے میں اندر بات کرتا ہوں۔'' اس نے کہا اور گیٹ کے ساتھ بنے کمرے تک پہنچ گیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہاں پر کیمرا لگا ہوا ہے۔ اندر ہمیں کوئی دیکھ رہا ہوگا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا اور اس نے ہمیں آگے جانے کی اجازت دے دی۔

ہم پورچ میں پہنچے تو ایک سوٹ پہنے شخص کھڑا دکھائی دیا۔ میں نے کار روکی اور باہر نکل کر اس کے پاس جا پہنچا۔

''جی فرمائیں کیسے آنا ہوا؟''

''آپ مالک ہیں یہاں کے؟'' میں نے پوچھا۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

"نہیں میں منیجر ہوں۔" اس نے کہا۔
"اور مالک؟" میں نے پوچھا۔
"وہ ہیں، آپ مجھے بتائیں۔" اس نے بے رخی سے کہا۔
"کیا ہمیں اُن سے نہیں ملوائیں گے۔ بیٹھنے کو بھی نہیں کہیں گے؟" میں نے اُکتائے ہوئے انداز میں پوچھا۔
"ضرورت ہوئی تو انہیں ملوا دیں گے۔ آپ بتائیں۔" اس نے بیٹھنے کی بات گول کرتے ہوئے کہا۔
"آپ نے اس فارم ہاؤس کا ابھی تک ٹیکس نہیں بھرا، یہاں تک کہ اسے رجسٹرڈ بھی نہیں کروایا۔" میں نے یونہی کہہ دیا۔
"ٹھیک ہے۔ میں صبح سارے کاغذات لے کر آپ کے دفتر پہنچ جاتا ہوں۔ پھر جو ہوگا۔" اس نے کہا۔
مجھے اس کے انداز پر بے تحاشا غصہ آ رہا تھا۔ اس کا رویّہ بہت جارحانہ تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی اسے پکڑ لوں۔ مگر میں نے تحمل سے کام لیتے ہوئے کہا۔
"آپ ابھی دکھا دیں۔"
"میں سمجھ رہا ہوں کہ آپ کو رشوت لینی ہے، وہ میں صبح آپ تک پہنچا دوں گا۔ کیوں خواہ مخواہ وقت ضائع کر رہے ہو۔ جاؤ اب۔" اس نے درشت لہجے میں کہا تو میرا خون کھول اٹھا۔
"میں ایسے تو نہیں جانے والا، اب آیا ہوں تو فارم ہاؤس دیکھوں گا، کتنا رقبہ ہے اور......" میں نے کہنا چاہا تو اندر سے دو افراد تیزی سے باہر آئے، ان کے ہاتھ میں پسٹل تھے۔ انہوں نے ہم پر تانتے ہوئے کہا۔
"چلو اندر۔"
"کیا ہوگیا؟" سوٹ پہنے شخص نے حیرت سے کہا۔
"یہ ٹیکس والے نہیں پولیس والے ہیں۔" اندر سے آئے ایک شخص نے کہا تو میرے کان میں آواز گونجی۔
"جاؤ اندر، ہم بھی اندر آ گئے ہیں۔"
بلاشبہ یہ بات رضا نے بھی سن لی تھی۔ وہ ہمیں کور کرتے ہوئے اندر کی جانب لے کر چل پڑے۔ جیسے ہی ہم لاؤنج میں گئے، انہوں نے ہماری تلاشی لی اور پسٹل نکال لیے۔ ہم نہتے ہو چکے تھے۔ ایسے میں ایک لمبے قد والی خاتون اندر سے برآمد ہوئی۔ اس کے کھچڑی بال تھے، چہرے سے کوئی غیر ملکی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ چند لمحے ہمیں دیکھتی رہی پھر بولی۔
"کیسے پہنچ گئے یہاں تک؟"
"دیکھ لو پھر پہنچ گئے؟" رضا نے یوں کہا جیسے کسی محبوبہ کو کہتے ہیں۔
"اوشٹ اُپ، جو پوچھا ہے، وہ بتاؤ۔" اس نے تلخی سے کہا۔
"پہلے تم بتاؤ، تمہیں کیسے پتا چلا کہ ہم پولیس والے ہیں۔" رضا نے پھر مضحکہ خیز سوال کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ وقت لے رہا ہے اور مجھے پیغام دے رہا ہے کہ میں اپنے حواس قابو میں رکھوں۔ ان کی باتوں کے دوران میں نے دیکھا کہ میرے دائیں بائیں کھڑے ہوئے لوگ مجھ سے دو فٹ کے فاصلے پر تھے۔ اچانک میرے کان میں گونجا۔
"ہم باہر ہیں۔ اٹیک۔"
اس کے ساتھ ہی داخلی دروازے سے لوگ اندر داخل ہوئے۔ میں نے ایک پر چھلانگ لگائی تو رضا نے دوسرے پر۔ اتنی دیر میں کئی فائر ہو گئے۔ میں نے اس سے نہ صرف پسٹل چھین لیا بلکہ اسے نیچے گرا دیا۔ لمحوں میں پانسا پلٹ گیا۔ انہوں نے اس عورت کو قابو میں کر کے باندھ دیا۔ وہ منیجر کو باندھنے لگے تو میں نے کہا۔
"اسے تھوڑی دیر میرے حوالے کریں۔"
"بعد میں وقت دیں گے۔" ایک کمانڈو نے کہا اور اندر کی جانب گھس گئے۔ پولیس فورس بھی اندر آ گئی تھی۔
اگلے دو گھنٹے میں باہر فائرنگ بھی ہوئی اور تلاشی بھی ہوتی رہی۔ فارم ہاؤس سے کوئی اٹھارہ کے قریب لوگ برآمد ہوئے۔ اس کے ساتھ جو خوفناک صورت حال سامنے آئی، وہ بم بنانے کی تھی۔ اس فارم ہاؤس میں ایک جگہ بم بنائے جا رہے تھے۔ جو پیسہ اکٹھا کیا جا رہا تھا، اسی مقصد کے لیے تھا۔ اتنی دیر میں آصف اور ناصر بھی پہنچ گئے۔ وہ وہاں پر موجود لوگوں کو باندھنے لگے۔ پتا نہیں کتنے خوفناک لوگ تھے وہ۔
"ہم نے اندر سے تمام لوگ نکال لیے ہیں، اب آپ مزید تلاشی لینا چاہتے ہیں تو لے لیں۔" کمانڈو کے لیڈر نے کہا۔
"اس عورت اور منیجر کو میرے حوالے کر دیں۔" میں نے کہا۔
میں اور رضا انہیں لے کر ایک کمرے میں آ گئے۔ پہلے تو میں نے جی بھر کے اس منیجر کی ٹھکائی کی۔ جب مطمئن ہوگیا تو اس عورت سے پوچھا۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

''اب تم سیدھی طرح بتادو کہ مال کہاں پڑا ہے اور یہ سب کچھ کس کے لیے کر رہی تھیں؟''

''تم بچ نہیں پاؤ گے؟'' اس عورت نے دھمکی دی۔

''وہ تو بعد کی بات ہے، ابھی بتاؤ یا ہم خود تلاشی لے لیں۔'' رضا نے اسے آنکھ مارتے ہوئے کہا پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''یہ ایسے نہیں مانے گی۔''

''چل بیڈ روم میں چلتے ہیں۔'' میں نے اس عورت کا بازو پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا اور ساتھ میں دو تین جڑ دیے۔ رضا نے منیجر کو آگے لگا لیا۔ اس عورت کے بیڈ روم میں آ گئے، کیا شاہانہ بیڈ روم تھا۔ اس میں کئی اسکرینز لگی ہوئی تھیں۔ وہ خود سارے فارم ہاؤس کو یہیں سے دیکھتی تھی۔ رضا مختلف دیواروں کو دیکھنے لگا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد اسے دیوار میں ایک تجوری مل گئی۔ تھوڑا سا مزید تشدد کرنا پڑا، عورت نے وہ تجوری کھول دی۔ اس میں نوٹوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ ساتھ میں سونے کے بسکٹ اور کئی کاغذات تھے۔

جب ہم رات گئے وہاں سے نکلے تو میں نے نوٹوں کا ایک بھرا ہوا بیگ الگ کر لیا۔ ہم انجانے میں ایک خوف ناک منصوبے تک پہنچ گئے تھے۔ ہم بنانے والے جو معاملات تھے وہ دوسرے شعبے کے سپرد ہو گئے۔ ہمارا اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ جو کیس ہمارے پاس تھا، ہم اسی سے متعلق تھے۔ ایسے میں ناصر شاہ نے کہا۔

''یار، مجھے افسوس یہ ہے کہ ہم ابھی تک قاتل نہیں پکڑ پائے۔''

''... وہ ان میں سے تھا ہی نہیں۔'' میں نے کہا تو اچانک رضا بولا

''نہیں تم کچھ بھول رہے ہو۔ اس فرخ نے ہی عدنان کو عینی کے ساتھ جوڑا تھا۔ اس سے پوچھ تاچھ کی جائے۔''

''ہاں تم نے ٹھیک کہا۔''

''وہ تھانے ہی میں ہے۔ وہیں چلتے ہیں۔'' ناصر شاہ نے کہا تو ہم سیدھے اُدھر ہی چلے گئے۔

فرخ حوالات میں دیوار کے ساتھ لگا... بیٹھا تھا۔ میں نے اسے بلایا تو وہ سلاخوں کے اس پار آ کر کھڑا ہو گیا۔

''اوئے تو نے عینی کے ساتھ ایک گارڈ عدنان کو جوڑا تھا، وہ کون تھا، کہاں سے تھا اور اب کہاں ہے؟''

''ہاں میں جانتا ہوں، وہی عینی کے ساتھ تھا جب فیضان قتل ہوا، اگر آپ مجھے نکال لیں تو میں اس کے بارے میں بتا دیتا ہوں۔'' اس نے ہمارے ساتھ سودے بازی کی۔

''چل ہو گیا، بتا کہاں ہے وہ۔'' رضا نے تیزی سے کہا۔

''میں اس کا نمبر بتا دیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے نمبر بتا دیا۔ میں نے وہ نمبر تیزی سے نوٹ کیا اور ظہیر کو بھیج دیا۔ اس کے ساتھ یہ میسج بھی لکھ دیا کہ فوراً جگہ ٹریس کرو۔

اگلے دو منٹ بعد اس کا فون آ گیا۔

''صاحب..... یہ وہی نمبر ہے جس کی لوکیشن میں نے بعد میں آپ کو دی تھی۔ لیکن.....''

''لیکن کیا؟'' میں نے مضطرب ہوتے ہوئے پوچھا۔

''لیکن ابھی وہ آپ کے آس پاس ہی ہے کہیں۔ یہی کوئی بیس پچیس فٹ کے فاصلے پر۔'' اس نے پُرسکون انداز میں کہا۔

''اوہ!'' میں نے حیرت سے کہا اور ارد گرد دیکھا۔ فارم ہاؤس سے آئے لوگ تھانے کے ایک کمرے میں بند تھے۔ ان کی کارروائی چل رہی تھی، کچھ دیر بعد ہی انہیں جیل لے کر جانا تھا۔ میں نے اپنے فون سے نمبر ملائے، بیل گئی۔ میری نگاہ اُن سب پر تھی۔ اچانک ایک بندے نے فون جیب سے نکالا اور اسکرین پر نمبر دیکھے۔ کال جا رہی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ میں مسکرا دیا۔ وہ منیجر تھا۔ میں نے کمرے میں جا کر منیجر کو کالر سے پکڑ کر اٹھایا اور باہر لے آیا۔ اسے فرخ کے سامنے کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہی ہے عدنان؟''

''ہاں یہی ہے۔'' اس نے تصدیق کر دی تو رضا نے ایک جھانپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔

''فوروھیل کہاں ہے؟''

''شہر میں ایک گھر کے گیراج میں۔'' اس نے فوراً مان لیا۔

''رضا، اسے لے جا ناصر شاہ کے پاس، اور فوروھیل برآمد کرو۔ مجھے کام ہے، میں آتا ہوں۔'' میں نے کہا اور پُرسکون انداز میں تھانے سے نکل گیا۔ میری گاڑی میں ایک نوٹوں بھرا بیگ پڑا ہوا تھا۔ وہ مجھے ظہیر تک پہنچانا تھا۔

❖❖❖

www.pakistanipoint.com

سازِ مرگ

ماہ رخ ارباب

فلسفۂ طب کے مطابق انسانی جسم میں موجود تمام بیماریوں کا سبب انسان کے اندر موجود قوتِ حیات کی کمزوری ہے... قوتِ حیات میں بگاڑ کی وجہ سے بیماریوں کی علامات سامنے آتی چلی جاتی ہیں... انہی علامات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے تحقیق و جستجو کے شوقین اوک سفر پر نکل پڑتے ہیں... انسانی جسم میں رونما ہوتی تبدیلیوں کے راز جاننے اور ان کی توڑ پھوڑ کی روک تھام کے لیے وہ ایسی نادر جڑی بوٹیوں تک پہنچ جاتے ہیں... جو حیاتِ انسانی کے لیے کارگر ثابت ہوں... ایسے ہی محبت کرنے والے دم ساز کرداروں کی جدوجہد... وہ ایسے کیمیاگر تھے... جو راکھ کو سونے میں اور سونے کو آرزو کی تکمیل میں بدل سکتے تھے...

یارانِ جہاں کو پیش آنے والے طلسماتی و تحیر انگیز واقعات..... سرورق کی تیکھی کہانی

کمرے میں مکمل خاموشی طاری تھی۔ محض غذاؤں کی کھڑکھڑاہٹ تھی جو ماحول میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔

وہ ناک پر عینک ٹکائے ہاتھ میں تھامے کاغذات کا مطالعہ کر رہا تھا۔ پیشانی پر سلوٹ اور بھینچے ہوئے دانت گہرے غور و فکر کی نشاندہی کر رہے تھے۔ وہ زندگی کی ستّر بہاریں دیکھ چکا تھا۔ زندگی کو ہر حوالے سے جنت کی طرح گزارنے کے بعد اب وہ بڑھاپا بقیہ مصروفیات سے دور

www.pakistanipoint.com

حقیقی جنت میں گزارنا چاہتا تھا۔ ایک ساحلی شہر کے خوبصورت وِلا میں اس کے بُڑھاپے کو شاندار بنانے کے تمام لوازمات تیار تھے۔ کاروبار کی کنجیاں بھائی اور بیٹے کے حوالے کرنے کے بعد اس نے ہاتھ جھاڑ لیے تھے مگر زندگی ابھی اسے یہ رخصت دینے کو تیار نہیں تھی۔

اس نے کاغذ ایک جانب رکھ کر قلم اٹھایا اور رف پیڈ کھسکایا۔ یاددہانی کے لیے ہر چیز لکھ لینے کی عادت اس کی منظم طبیعت کا خاصہ تھی۔ فون کی بے ڈھنگی ٹرن ٹرن نے سکون میں خلل ڈالا تو اس نے ناگواری سے بھویں اُچکائیں۔ سی ایل آئی پر نمبر جانا پہچانا تھا۔ اس نے ریسیور اٹھالیا۔

''ہیلو۔'' اس کی گونجتی ہوئی بھاری آواز ابھری۔ انگریزی اس کے لہجے سے اجنبی محسوس ہوتی تھی۔

دوسری جانب سے جو اطلاع ملی، اس نے اس کے سرخ وسپید، متورم چہرے پر عنابی رنگ بکھیر دیا۔ انتہائی مختصر تراشیدہ، غبار کے مانند سفید بالوں کو ایک ہاتھ میں دبوچ کر اس نے زور سے جھٹکا۔ یہ شدید ذہنی دباؤ کا نتیجہ تھا۔

''تم ایسا نہیں کرسکتے۔'' وہ دہاڑا۔

''ہم برسوں سے اس کے پیچھے ہیں۔ ہمارے لوگ وہاں تک پہنچ چکے ہیں۔ بس اب ایک آنچ کی کسر رہ گئی ہے۔ تم ہماری مدد کے بنا تنہا اسے مکمل نہیں کرسکتے۔ ہمیں نکال کر اس پروجیکٹ کو یوں نہیں ہتھیا سکتے۔''

اس کا تھوڑی دیر پہلے کا پُرسکون انداز عنقا ہوچکا تھا۔ اب وہ باقاعدہ چیخ رہا تھا۔

''ہاں ٹھیک ہے! مجھے کچھ وقت دو۔ ہاں ہاں آخری بار۔ میں اس بار خود اس میں دلچسپی لے رہا ہوں ۔ میں اس کام میں اپنے بھائی کو کھو چکا ہوں۔ اب اسے اس آسانی سے لپیٹ نہیں سکتا۔ اب تو میں پاتال تک اس کا پیچھا کروں گا ٹھیک ہے۔''

''بھاڑ میں جاؤ۔'' اس نے آخری جملہ کریڈل پر فون پٹخنے کے بعد ادا کیا تھا۔ وہ عمر کے اس حصے میں تھا جہاں حد سے زیادہ بڑھی ہوئی خوشی یا غم دونوں ہی جان لیوا ثابت ہو سکتے ہیں۔ دولت کے ساتھ ورثے میں ملی بے اعتدالیوں نے اسے اندر سے کھوکھلا کردیا تھا۔ غصے سے ہانپتے ہوئے اس نے دراز میں اِدھر اُدھر ہاتھ مارا۔ اچانک اندھیرے گوشے سے ایک ہاتھ نمودار ہوا۔

''یہ لیں۔ میں ایک اضافی شیشی ہمیشہ اپنی جیب میں رکھتا ہوں۔'' ہاتھ میں گولیوں کی ایک ڈبیا تھی۔

وہ شخص نہ جانے کب سے کمرے کے ایک کونے میں خاموش بیٹھا تھا۔

بوڑھے نے پھرتی سے ڈبیا تھامی اور گولی پانی کی مدد سے حلق سے اتار لی۔

''جیمز کی کال تھی؟'' اسی کونے سے آواز ابھری۔ اندھیرے میں بیٹھے شخص کے نقوش پوری طرح واضح نہیں تھے مگر تھوڑے بہت نظر آتے عکس میں بوڑھے کی شبیہہ نمایاں تھی۔

''ہاں وہی تھا۔'' گولی نے بوڑھے کے مرتعش اعصاب کو سہارا دیا۔ اب اس کی آواز پُرسکون تھی۔

''میرے بھائی کا غیاب ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ مجھے نئے سرے سے اس عمر میں محنت کرنی پڑ رہی ہے۔ اور یہ پروگرام کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔'' اس نے کاغذ کا کپ توڑ مروڑ کر دور پھینکا۔

''میں ان کی گردن مروڑ دوں گا۔ تم فوراً وہاں کے لوگوں سے رابطہ کرو۔ وہ کام میں تیزی لائیں۔ اگر میرا پیسہ ضائع ہوا تو میں ان کے حلق سے نکلواؤں گا۔ اور میں ایسا کرسکتا ہوں، وہ جانتے ہیں۔'' بوڑھا آدمی پال شمٹ تھا۔ ایک بہت بڑے دواساز ادارے کا مالک جس نے تمام زندگی بہت کامیابی سے گزاری تھی۔ وہ آگے بڑھنے کے لیے ہر رکاوٹ کو دور کرنے کا قائل تھا۔ چاہے اس کے لیے طاقت ہی کیوں نہ استعمال کرنی پڑے۔ مگر اب اس کی زندگی کے سب سے بڑے معاہدے میں کچھ عجیب ہی رکاوٹیں درآئی تھیں۔

''بہتر ہے فادر۔ میں فوراً وہاں لوگوں سے رابطہ کرتا ہوں۔ ویسے آپ عمر کے بارے میں یونہی پریشان ہیں۔ میں تو ماریہ کو اپنی نئی ماں کے روپ میں دیکھ رہا تھا۔'' اس نے کلب کی ایک رقاصہ کا نام لیا۔ بوڑھا بنا دیکھے اندھیرے میں بیٹھے شخص کی شرارتی مسکراہٹ کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ اس نے غصے سے تاریکی میں پوشیدہ وجود کو گھورا تو وہ مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

''چلتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ بھسم کردیا جاؤں۔''

سوٹ کی کریز درست کرتا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ چہرے پر مسکراہٹ تھی... جو محض اس کے قریبی لوگوں کے سامنے نمودار ہوتی تھی۔ اسے گھورنے کی کوشش کرتے بوڑھے کی آنکھوں میں غصے کی جگہ تحسین آمیز چمک نے لے لی تھی۔ اس کا بیٹا اب اس قابل تھا کہ اس کے معاملات سنبھال

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

سکے۔

☆☆☆

ادھ بُنا سویٹر اور اون کی ٹوکری آرام کرسی پر رکھ کر شمشاد نے ایک ہاتھ کا چھجا سا بنا کر آنکھوں پر رکھ لیا۔ وہ پچھتر سال کی عمر میں بھی بنا سہارے چلتی تھی۔ سفید جھریوں بھرے چہرے پر ہر وقت ایک خوشگوار تاثر رہتا تھا۔ جو حالات کے مطابق کبھی کم، کبھی زیادہ ہوتا رہتا تھا۔ بینائی اس عمر میں بھی قابلِ رشک تھی۔ اسی کو آزماتے ہوئے سویٹر کی سلائیاں اس وقت بھی ہاتھ میں تھیں۔ باہر وہ کافی دیر بیٹھنے کے ارادے سے نکلی تھی مگر بادل کسی سرمئی چادر کی طرح پچھلے تین دن سے سایہ کیے ہوئے تھے اور برسات کے کوئی آثار موجود نہیں تھے۔

”لگتا ہے، تم آج بھی ناراض محبوبہ کی طرح اینٹھے ہی رہو گے۔ اتنا بوجھ سنبھالے تھکتے بھی نہیں۔“

اس نے ہنس کر بادلوں کو مخاطب کیا۔ مخاطب کرنے کو اور کوئی وہاں تھا بھی نہیں۔ اس سخت، بارانی علاقے میں پتھروں کا بنا یہ مکان دور دور تک تنہا تھا۔ تنہائی کے اس جنگل میں بُنائی کا مشغلہ ہی اس کا واحد ساتھی تھا۔

”مگر اب کون یہ سویٹر پہنے گا۔“ اس نے افسردگی سے سیاہ و سرخ دھاریوں والے اپنے ادھ بُنے سویٹر کو دیکھا جو وہ کئی ماہ سے اپنے شوہر کے لیے بُن رہی تھی۔ تاکہ اس کی سالگرہ پر تحفتاً پیش کر سکے مگر ناصر حسین کی ناگہانی موت نے اسے ذہنی طور پر مفلوج سا کر دیا تھا۔

اس نے اداسی سے ہاتھوں میں تھاما دھاگا سلائی کے گرد لپیٹا اور کانپتے ہاتھوں سے سلائی کو کھینچا۔ یادوں کی لہریں ذہن کے ساحل سے سر پٹخنے لگیں تو اس نے سر کرسی کے پشتے پر رکھ لیا۔

شمشاد بیگم کے شوہر کی سرکاری نوکری کی مدت تمام ہوتی، اس سے پہلے ہی وسطی پنجاب سے آئے دونوں میاں بیوی اس علاقے کے قدیم حسن کے اسیر ہو چکے تھے۔ سیاہ چٹانوں پر اُگے سخت خودرو پودے، جو سارا سال موسم کے آگے ڈٹے رہتے۔ اور جب بارش ہوتی تو اپنی جڑیں سخت چٹانوں کے سینے میں کچھ اور پیوست کر لیتے۔

دنیا کی نایاب ترین جنگلی حیات شمشاد نے اسی علاقے میں آ کر دیکھی تھی۔ دورانِ ملازمت تو شہر میں سرکاری رہائش دستیاب تھی۔ لیکن ملازمت کے آخری سال میں انہوں نے یہیں گھر کی تعمیر شروع کر دی تھی۔ وراثتی زمینوں کو بھائیوں کے حوالے چھوڑ کر یہاں رہائش کا فیصلہ منوانا ایک الگ ہی قصہ تھا۔

وہ یونہی آنکھیں موندے مسکرانے لگی۔

اس سے پہلے کہ ماضی کی بھول بھلیوں میں پھر سے کھو جاتی۔ اچانک شور سا اٹھا۔

صحن کا کونا، جہاں دو دیواریں مل رہی تھیں۔ اس نے کچھ خالی گھی کے ڈبے اوپر تلے رکھ چھوڑے تھے۔ تاکہ موسم آنے پر انہیں نئے پودوں کی پنیری کے لیے استعمال کیا جا سکے۔

مگر جس دن سے وہ وہاں رکھے گئے تھے۔ ہر روز ایک پُرشور آواز کے ساتھ گر جانا ان کا معمول تھا۔ ٹین کے ڈبوں کی آواز سن کر وہ شروع میں بے تحاشا چونک جایا کرتی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو خوفزدہ ہو جاتا مگر وہ اس معمول کی عادی ہو چکی تھی۔

بُنائی کا سامان کرسی پر رکھتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ کرسی کے پیچھے لگے سنگی ستون کا سہارا لے کر آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتری اور بکھرے ہوئے ڈبوں کو سمیٹ کر دوبارہ کرسی پر آ بیٹھی۔

فرصت کے دنوں میں یہاں موجود جنگلی حیات کا مطالعہ کرنا اور صدیوں پرانے غاروں کے اندھیروں میں بھٹکنا دونوں میاں بیوی کا دل پسند مشغلہ تھا۔ وہ ساٹھ کی دہائی تھی جب وہ یہاں پہنچے تھے۔

ان دنوں ان علاقوں میں جیپ کے علاوہ کسی سواری کا چلنا ناممکن تھا۔ جیپ میں ضروری سامان کے ساتھ وہ وہاں بھٹکتے رہتے۔

اس دن بھی وہ راہ میں ملتے اِکا دُکا چرواہوں کی حیرت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے، جو ایک عورت کو کھلی جیپ میں دیکھ کر حیران تھے، ایک ایسے علاقے کی جانب عازمِ سفر تھے۔ جس کے متعلق مشہور تھا کہ وہاں کچھ نایاب حیات پائی جاتی ہیں۔

”مجھے لگتا ہے، آپ غلط راستے پر جا رہے ہیں۔ ہم پچھلے تین گھنٹے سے چل رہے ہیں، ابھی تک تو تالاب بھی نظر نہیں آیا۔ بہتر ہوتا ہم خادم حسین کو ساتھ لے لیتے۔“ ہچکولے کھاتی جیپ کی اوپر لگی گرل مضبوطی سے تھامے، خود کو جھٹکوں سے بچاتے شمشاد بیگم نے کچھ تشویش سے آس پاس دیکھا۔

اس نے شلوار قمیص کے ساتھ چمڑے کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ سر پر سختی سے کسا ہوا دوپٹا تھا جس کے دونوں سرے جیکٹ کے اندر تھے۔ اس اہتمام کا مقصد پردے

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

کے علاوہ راستے میں اڑتی دھول مٹی سے بچنا بھی تھا۔

''ہم بالکل صحیح جا رہے ہیں۔ وہ علاقہ ان غاروں کے سلسلے سے زیادہ دور نہیں جہاں ہم پچھلی بار پہنچے تھے۔ مجھے وہاں کا راستہ ہاتھوں کی لکیروں کے مانند ازبر ہے۔ تم بے فکر رہو۔'' وہ اسٹیئرنگ کو سختی سے دبوچتے ہوئے بولا۔

راستہ بہت خراب تھا۔ دراصل یہ گاڑیوں کی راہگزر تھی ہی نہیں۔ وہ تیل سے چلنے والی گاڑی سے یہاں آنے والے شاید پہلے انسان تھے۔

''آپ کو اپنی ہاتھوں کی لکیریں ازبر ہیں،، یہ میرے لیے ایک اطلاع ہے۔ اور اب اس تسلی کے بعد میری تشویش کچھ اور بڑھ گئی ہے۔ کیونکہ ایسی ہی تسلی دے کر آپ اکثر اپنی جرابیں الٹی پہن لیتے ہیں۔'' شمشاد نے شگفتہ انداز میں ایک حقیقت بیان کی۔ تو راستے پر توجہ مرکوز کیے ہوئے ناصر حسین کو اس کی بات سمجھنے میں کچھ وقت لگا۔ مگر سمجھ کر اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

''جس کا کام اسی کو ساجھے۔ جس طرح میں ایک بٹن نہیں ٹانک سکتا اسی طرح تم گاڑی نہیں چلا سکتیں۔''

''اچھا! یہ چیلنج ہے کیا؟ تو اترے ڈرائیونگ سیٹ سے ابھی دیکھ لیتے ہیں۔'' شمشاد بیگم نے مسکراتے ہوئے سنجیدہ پیشکش کی۔

''بخشو بی بلّی! چوہا لنڈورا ہی بھلا۔ میں ابھی زندہ رہنا چاہتا ہوں۔'' وہ مزید کچھ کہتا، اس سے پہلے ہی گاڑی نے زبردست ہچکولا کھایا۔ اس نے تیزی سے اسٹیئرنگ گھمایا۔ گاڑی ایک بڑے سے پتھر پر چڑھ کر نیچے اتری تھی۔ وہ دو چٹانوں کے درمیان ایک تنگ سا راستہ تھا اور وہ بخیر وہاں سے گزر آئے تھے عین اختتام پر یہ ابھرا ہوا پتھر کم و بیش دو فٹ اونچا تھا۔ گاڑی اس پر چڑھ کر الٹی نہیں بڑی بات تھی۔

وہ بمشکل سنبھلے تھے اور اس صدمے سے ابھر کر کھلی جگہ میں پہنچے ہی تھے جب ایک اور واقعہ رونما ہوا۔ وہ مارخور ایک چٹان کے عقب سے اچھل کر اچانک ہی گاڑی کے سامنے آیا تھا۔

گاڑی کے دونوں اطراف بڑے بڑے پتھر تھے اور وہ کسی پتھر کے پیچھے سے ابھرا تھا۔ گاڑی کی رفتار ہلکی تھی اصولاً جانور کو تیزی سے نکل جانا چاہیے تھا۔ مگر وہ گاڑی سے ٹکرا گیا، گاڑی کو لگنے والے جھٹکے سے اندازہ ہوا کہ چوٹ ہلکی تھی۔ باوجود اس کے، وہ گرتے ہی بے حس و حرکت ہو گیا تھا۔ ناصر حسین نے تیزی سے اتر کر بڑے بڑے سینگوں والے اس جسیم پہاڑی بکرے کا جائزہ لیا۔

''یہ زندہ ہے؟'' شمشاد نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے پوچھا۔ وہ ابھی تک پے در پے لگنے والے واقعاتی جھٹکوں سے سنبھلی نہیں تھی۔

''بہتر ہو گا تم خود آ کر دیکھ لو۔'' ناصر حسین کمر پر ہاتھ رکھے پُرسوچ انداز میں جانور کو دیکھ رہا تھا۔ وہ چالیس سال کا صحت مند انسان تھا۔ اور زندگی کو اپنی شرائط پر گزارنے کا عادی۔ زمیندارانہ پس منظر سے ہونے کے باوجود اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے سول سروس میں آنے کا فیصلہ بھی اس کی ضدی طبیعت کا مظہر تھا۔ شمشاد اس کی چچازاد اور بچپن کی منگیتر تھی۔ ان کے خاندان میں لڑکیوں کی تعلیم کا رواج نہیں تھا۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ ناصر حسین سے منسوب لڑکی اَن پڑھ رہ جائے۔ شدید قسم کے ہنگاموں اور پنچایتوں کے بعد بھی فیصلہ وہی ہوا جو ناصر حسین چاہتا تھا۔ بزرگوں کی جہاندیدہ نگاہوں نے یہ سچائی بھانپ لی تھی کہ لڑکا اتھرا ہے۔ کہیں رسّی ہی نہ تڑا جائے۔ زہر کھانے سے بہتر ہے نیم چبا لیا جائے۔ سو میٹرک کے بعد گھرداری کے اسباق لیتی شمشاد کو ہونے والے شوہر کے اصرار پر کتابوں میں دنیا بسانی پڑی۔ یہ جوہر تو اس پر بعد میں کھلے کہ قدرت نے دونوں چچازادوں کو ایک ہی مٹی سے بنایا تھا۔

آزاد پنچھیوں کی فطرت رکھنے والے۔

جو ایک بار خاندانی جکڑبندیوں سے آزاد ہوئے تو محض عید تہواروں پر ہی اُن سے ملنے پہنچ پاتے تھے۔ خاندان نے بھی ان کی اس فطرت سے سمجھوتا کر لیا تھا۔

ناصر حسین کی بروقت فیصلہ لینے کی صلاحیت اور مضبوط اعصاب ہر ہنگامی صورتِ حال میں ابھر کر سامنے آتے تھے۔

اس وقت بھی اس ویران مقام پر جہاں دور دور تک انسانی آبادی کا نام و نشان نہیں تھا۔ ایک پُراسرار انداز میں گھائل جانور کے پاس وہ اطمینان سے غور و فکر کر رہا تھا۔ دم بہ دم تیز ہوتی دھوپ سے بے نیاز۔

اس کی بات سن کر شمشاد طوعاً و کرہاً نیچے اتر آئی۔ اسے جانور پسند تھے مگر زندہ حالت میں، مردہ جانور دیکھنا کوئی خوشگوار تجربہ نہیں تھا۔

گاڑی کے بونٹ سے ہونے والی ٹکر اتنی شدید نہیں تھی کہ ایک جسیم مارخور مر ہی جاتا۔ مگر زمین پر پڑا وہ جانور بے حس و حرکت تھا۔

پتھروں پر سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتی وہ گاڑی کے

www.pakistanipoint.com

اگلے حصے کی جانب پہنچی اور اس پر نگاہ پڑتے ہی ایک زور کی ابکائی لیتی ہوئی دور ہٹ گئی۔ خوبصورت جانور کے بھورے بال اس کی لانبی گردن سے بہتے خون سے تر تھے۔ وہ نکر سے نہیں مرا تھا۔ بلکہ شہ رگ سے بہتا خون تھا جو موت کی وجہ بنا تھا۔ ذبح کرتے ہاتھوں سے نکل کر بھاگا ہوا جانور تھا شاید۔ مگر عجیب بات یہ تھی کہ گردن پر خون کی دھار کی موجودگی کے باوجود وہاں کاٹنے کا کوئی نشان نہیں تھا۔ بس عین شہ رگ پر ایک گول سا سوراخ تھا جیسے کسی گولی سے بنا ہو۔

''لگتا ہے کسی شکاری کی گولی کا نشانہ بنا ہے۔ بے چارہ جانور۔'' اس نے افسوس سے دیکھا۔

مگر ناصر حسین کا دھیان کہیں اور تھا۔ وہ اس کے ماتھے کی جانب کھڑا تھا۔ اور اس کی پُرسوچ نگاہ کسی چیز پر جمی تھی۔

''مجھے یہ کوئی عام جانور محسوس نہیں ہوتا۔ یہ پالتو ہو سکتا ہے، یہ دیکھو!'' اس نے پنجوں کے بل بیٹھتے ہوئے اس کے ماتھے کی جانب اشارہ کیا۔

وہاں کی جلد جھلسی ہوئی تھی۔ جانور کو داغا گیا تھا۔ یہ عجیب تھا، وہ جنگلی جانور تھا پالتو نہیں۔ لوگ اپنے پالتو جانوروں کو پشت کی جانب سے داغتے ہیں جہاں تکلیف کا احساس کم ہوتا ہے۔ زخم بھی جلدی مندمل ہو جاتا ہے مگر ماتھے پر داغنے سے اس کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔

اس نے دائیں بائیں دیکھ کر گولی چلانے والے کو تلاشا، جس کی چاند ماری کا شکار اس وقت ان کے سامنے پڑا تھا۔ مگر دوپہر کی تیز دھوپ میں تپتی ہوئی چٹانوں پر کسی ذی روح کی موجودگی کے آثار نہیں تھے۔ ہمیشہ چٹانوں پر چپکی رہنے والی چھپکلیاں بھی درزوں میں گھس چکی تھیں۔

''اب کیا کرنا ہے ناصر! ہم یہاں کب تک کھڑے رہیں گے۔ اسے ہٹانا تو مشکل ہے۔ اور اطراف سے گاڑی نہیں نکلے گی۔'' شمشاد نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہمیں پیدل چلنا پڑے گا۔ جتنا چل سکے۔ ورنہ واپسی۔'' ناصر حسین نے آگے بڑھ کر گاڑی سے سامان اتارا تو ایک بیگ شمشاد نے اپنی پیٹھ پر لاد لیا۔ وہ شہر میں بیگم صاحبہ تھی۔ سامان اٹھانے کے لیے ہر وقت ملازم حاضر تھے۔ مگر یہاں ایسی کوئی سہولت دستیاب نہیں تھی۔

چند قدم چل کر ہی جیسے یک دم ان کو جنت مل گئی تھی۔

ایک بڑی سی پہاڑی کے پیچھے ایک اُن چھوئی دنیا کسی وسیع تصویر کے مانند پھیلی ہوئی تھی۔ دور تک پھیلے درختوں کے درمیان صاف پانی سے بھرا تالاب۔ چٹانوں پر اگے نایاب پودے اور اُن پر کھلے پھولوں کے رنگ۔

مگر ان سب سے الگ ایک اور ہی چیز نے انہیں متوجہ کر لیا۔ وہ ایک خستہ حال عمارت تھی۔ جو شاید کسی اُجڑے معبد کی باقیات تھیں۔

عمارت کے کھنڈروں سے اس کی اصل کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ نہ انہوں نے زیادہ کھوج کرنے کی کوشش کی تھی۔

قبل از اسلام یہ جگہ بدھ مت کے ماننے والوں کا مرکز تھی۔ اس سے پہلے اور بعد میں بھی مختلف چھوٹے بڑے مذاہب کے پیروکار یہاں رہتے رہے تھے۔

ایک بڑے سے ہال اور تین چھوٹے کمروں پر مشتمل عمارت کی ساخت انگریزی زبان کے حرف 'ٹی' سے مشابہ تھی۔

مرکزی ہال سے آگے درمیانی کمرے میں منبر نما چبوترا اسے کسی قسم کی عبادت گاہ کی صورت دیتا تھا۔ عابد اور ان کے معبود دونوں ہی صدیوں کے چکر میں کھو چکے تھے۔ بس معبد باقی رہ گیا تھا۔

وہ اس جگہ کو دیکھ کر سحر زدہ سے رہ گئے تھے۔ سخت موسموں کا سامنا کرتی اس زمین میں اس قدر ہریالی کا ذمے دار وہ تالاب ہی تھا جو کسی چشمے سے وجود میں آیا تھا۔ اور ان کے دل نے صدا دی کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں ان کا مسکن بننا ہے۔

بچوں کی عدم موجودگی میں اُن کے لیے یہاں رہنا اور بھی آسان ہو گیا تھا۔

شمشاد کے سویٹر پر چلتے ہاتھ اور دماغ میں چلتی سوچوں کی روانی کو ایک ساتھ رکنا پڑا۔ اس نے غور سے دیکھا۔ پھندا غلط لیا تھا یا ماہر کھٹکا ہوا تھا۔

بوڑھے کان غلط بھی سن سکتے تھے۔ اس نے کان لگائے۔ دبے قدموں کی آواز تھی۔ جیسے کوئی اگلے پنجوں پر قدم رکھتا ہوا زمین سے جڑا چل رہا ہو۔ سکون کی سانس لیتے ہوئے اس نے پھر سے پھندا اٹھایا۔ یہ یقیناً خوراک کی تلاش میں اس کے گھر کے آس پاس منڈلاتی کتیا تھی... جو جب بھی دروازہ کھلا دیکھتی تو اندر گھس آتی تھی۔

تنہا یہاں رہنا بھی کبھار اسے خوفزدہ کر دیتا تھا۔ یہ خوف جانوروں کا نہیں تھا۔ خاص طور پر پچھلے سال ناصر حسین کی موت کے بعد وہ زیادہ محتاط ہو گئی تھی مگر اس کے انتقال کے بعد بھی اس نے یہاں سے جانے کی کوئی کوشش

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

نہیں کی تھی۔ اسے اس عمر میں اب موت کا خوف نہیں ستاتا تھا۔ ہر انسان کی طرح ایک پُرسکون موت اس کی خواہش تھی۔

بس ایک جز وقتی ملازم رکھ لیا تھا۔ جو تمام باہر کے کام نمٹا دیا کرتا تھا۔ وقتاً فوقتاً اس کے بھائی بہنوں کے بچے اس کے ساتھ رہنے آجایا کرتے۔

اس نے گہری سانس لی۔ ایک شخص کے نہ ہونے سے دنیا میں جیسے تمام مصروفیات ختم ہو چکی تھیں۔ تمام دنیا غیر محفوظ ہو گئی تھی۔

گھر کے باہر پھر ایک کھٹکا ہوا۔

اب کے آواز بہت واضح تھی۔ اس نے اون سمیٹا اور سویٹر سمیت کروشیے کی ٹوکری میں بھر لیا۔

''اندر چل کر بیٹھنا بہتر رہے گا۔'' وہ بڑبڑائی۔

حالانکہ اندر سنائی دیتی 'موسیقی' ذہنی کام کرتے وقت یکسوئی میں خلل ڈالتی تھی۔

اس کے اٹھنے سے قبل ہی دستک کی تیز آواز ابھری۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دروازے تک پہنچی۔

اس وقت تک دو بار مزید دروازہ بجایا جا چکا تھا۔ اس خراب موسم میں آنے والے کے لیے وہ دل ہی دل میں کچھ القابات سوچ رہی تھی۔

کچا صحن، رات ہوئی ہلکی بوندا باندی کے بعد کیچڑ زدہ ہو چکا تھا۔ وہ سنبھل سنبھل کر پیر رکھتی آگے بڑھتی گئی۔ ساتھ ہی بڑبڑا رہی تھی۔

''اس موسم میں بھی تم لوگوں کو گھر میں سکون نہیں ہے۔ اب کون سا مجھ سے دوڑ دوڑ کر کام ہوتا ہے۔ یہ شفاعت بھی جانے کہاں رہ گیا۔'' اس نے لکڑی کے دروازے کا ایک پٹ تھوڑا سا کھولا اور سامنے موجود منظر دیکھ کر چہرے کے تاثرات بدلتے چلے گئے۔

☆☆☆

ہچکولے کھاتی لینڈ روور کے اسٹیئرنگ کو سنبھالتے سنبھالتے اب اس کے ہاتھ دکھنے لگے تھے۔

گاڑی پھر ایک پتھر پر چڑھی اور اس نے تیزی سے بریک لگایا۔ ماتھے پر خوشگوار موسم میں بھی پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے۔

''لگتا ہے، ڈیڈ ٹھیک کہتے ہیں۔ مجھے ڈرائیونگ میں مزید پریکٹس کی ضرورت ہے۔'' بڑبڑاتے ہوئے اس نے گاڑی ریورس کی اور نسبتاً بہتر راستے پر چڑھا دی۔

شمشاد بیگم کا ملازم چند گز کے فاصلے پر اس کے استقبال کو پہلے سے موجود تھا۔

''بی بی جی! صاحب کو معلوم ہوا آپ اِدھر دو ہی دن بعد دوبارہ اکیلے آئے ہو۔ تو وہ ناراض ہوں گے۔'' وہ سرخ گندمی رنگت کا حامل دبلا پتلا مگر چست و تندرست نظر آتا شخص تھا۔ توانائی اور پھرتی جیسے اس کی رگ رگ سے پھوٹتی تھی۔

وہ مخصوص پوٹھوہاری لہجے میں مسکراتے ہوئے بولا تو انداز میں شرارت تھی۔

''ڈیڈ کو کون بتائے گا شفاعت حسین! وہ تو یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ میں اس وقت یہاں سے بہت دور دارالحکومت کے ہاسٹل میں ہوں۔'' وہ سنبھل کر گاڑی سے اتری اور پتھروں پر پیر جماتی ہوئی شفاعت کے نزدیک آ کھڑی ہوئی۔

سفید شرٹ اور جینز کے نیچے آرام دہ جوتے پہنے اپنا بیک پیک کندھے پر لٹکائے وہ کوئی سیلانی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک ملازم کے ساتھ کھڑے ہو کر گفتگو کرتے ہوئے اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا، وہ ایک بڑے سرکاری افسر کی بیٹی ہے۔

''ارتضیٰ بی بی! سامان صرف ایک ہی بیگ لائے ہو آپ؟ کتنے دن رکنے کا ارادہ ہے جی۔ میں ضرورت کا چیزیں اور جمع کر لوں۔ بی بی جی کی موت کے بعد سے میں راشن لے کر نہیں آیا۔'' وہ گاڑی سے سامان اتار کر نیچے رکھتے ہوئے بولا۔ لہجے میں شمشاد کی موت کے ذکر سے اداسی پھیل گئی۔

ارتضیٰ نے ماتھے پر ٹکا چشمہ اتار کر آنکھوں پر رکھ لیا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں نمی کی جھلک تھی۔ وہ اس وقت ہاسٹل میں تھی جب اسے اپنی چہیتی پھپھی کی اچانک موت کی اطلاع ملی تھی۔ وہ بہت محتاط خاتون تھیں۔ نہ جانے کس طرح گھر کی دہلیز پر کسی زہریلے سانپ کا نشانہ بن گئیں۔ بارش رکنے کے بعد شفاعت گاؤں سے واپس آیا تو اسے شمشاد بی بی کا نیلا جسم دروازے پر پڑا نظر آیا تھا۔

وہ وفادار ملازم تھا۔ تدفین کے تمام معاملات اس کے سپرد کر کے شمشاد اور ناصر حسین کے بھائی بے فکر ہو گئے اور شمشاد کو اس کی وصیت کے مطابق ناصر حسین کے پہلو میں دفن کر دیا گیا تھا۔

اس طرح اس مٹی کے دیوانے ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو کر رہ گئے۔

اس نے خیالات کی رو کو سر جھٹک کر توڑا اور شفاعت

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

کو [illegible] وہ ابھی [illegible] اداس
سے [illegible] تھا

''شفاعت [illegible] من! یہاں ابھی دو مہمان اور آنے والے ہیں۔ تم تمام سامانِ ضرورت یہاں جمع کرلو۔ تاکہ تمہاری غیر موجودگی میں ہمیں پریشانی نہ ہو اور ہاں ہتھیار چلا لیتے ہو؟'' اس نے مکان کی جانب چلتے ہوئے اچانک پوچھا۔

شفاعت چلتے چلتے ایک پل کو رکا۔

''بی بی جی! ہتھیار تو ہمارا زیور ہے۔ ہم نسلوں سے سپاہی ہیں۔ میری ٹانگ میں گولی نہیں لگتی، تو میں بھی سپاہی ہوتا۔ آپ حکم کرو۔ کیا کرنا ہے۔'' اس نے سینہ یوں تان لیا جیسے ارتضیٰ کے حکم پر کشتوں کے پشتے لگا دے گا۔

''ہاہاہا......'' ارتضیٰ نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ''تم دلچسپ آدمی ہو شفاعت۔'' بھئی پوچھنے کا مقصد تھا کہ کبھی شکار وکار کرنا ہو۔ تو تم مدد کرسکتے ہو یا نہیں۔ ہم ابھی اس معاملے میں اناڑی ہیں'' اس نے مکان کے ڈھلوانی راستے پر چڑھتے ہوئے کہا۔

''آپ یہ معاملہ ہم پر چھوڑ دو۔ ہم سب بندوبست کرتا ہے۔'' پھر کچھ توقف کے بعد بولا تو لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

''آپ بُرا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں بی بی جی؟''

ارتضیٰ نے سوالیہ انداز میں اس کی جانب دیکھا۔

''پوچھو؟''

''ابھی آپ دو دن پہلے اپنے گھر والوں کے ساتھ اِدھر آیا فوتگی میں...... پھر واپس چلا گیا۔ اب دو دن میں دوبارہ اتنا سفر کرکے واپس آیا۔ ہمیں سمجھ نہیں آتا آپ پہلے ہی اِدھر رک جاتا؟''

''تم کیا جانو شفاعت حسین ایک اکلوتی بیٹی کی مجبوریاں۔'' اس نے آہ بھری۔

''ڈیڈ مجھے کبھی اکیلے یہاں رکنے نہیں دیتے اور میں یہاں رہ کر وہ زندگی جینا چاہتی ہوں جو شمشاد آنٹی نے جی...... وہ اپنے آخری وقتوں میں عجیب باتیں کرتی تھیں۔ مجھے ان کی موت پر ابھی تک یقین نہیں آیا۔'' وہ بولتے بولتے دروازے تک پہنچ گئے۔

لکڑی کا دروازہ کسی قدیم قلعے کے دروازے کی یاد دلاتا تھا۔ تاریخ کے رومان میں مبتلا ناصر حسین نے مضبوط ساگوان کا یہ دروازہ آرڈر پر بنوایا تھا۔

شفاعت نے تالا کھولا تو ارتضیٰ کی نظر پتھریلی نیم پختہ روش پر جم گئی۔ یہی جگہ تھی جہاں شمشاد کی لاش کئی گھنٹے کیچڑ اور بعد میں ہونے والی بارش میں بھیگتی رہی تھی۔

اس نے قدم اندر رکھا۔ بڑا سا صحن اطالوی طرز پر سجایا گیا تھا۔ ایک جانب سنگی دیوار تو دوسری جانب گھنے پودوں کے پیچھے سے جھلکتا سفید مکان۔ دروازے کے ساتھ ہی چھت کی جانب جاتا زینہ تھا۔ برآمدے میں آرام کرسی آج بھی جوں کی توں موجود تھی۔ جیسے ابھی گھر کے اندر سے کوئی برآمد ہوگا اور اس پر آبیٹھے گا۔

اس نے اندر جاکر اپنا سامان ایک چھوٹے کمرے میں رکھ دیا۔ اس کے لباس بدل کر باہر آنے تک شفاعت اس کے لیے ٹیبل پر ایک ٹرے میں کچھ اشیائے خورونوش سجا چکا تھا۔

اب باورچی خانے میں کھٹ پٹ کر رہا تھا۔ اس نے ٹرے میں رکھا کولڈ ڈرنک کا کین اٹھا لیا۔ آتشدان پر رکھی تصویروں کا جائزہ لیتے ہوئے وہ ان کے نزدیک جا پہنچی۔

زیادہ تر ناصر حسین اور شمشاد بیگم کی تصاویر تھیں۔ بقیہ ان کے بھائی بہنوں کے گروپ فوٹوز۔ مگر ایک تصویر دیکھ کر وہ چونک اٹھی۔ وہ کچھ پیچھے کر کے رکھی گئی تھی۔ جیسے رکھنے والا اسے لوگوں کی نگاہوں سے چھپانا چاہتا ہو۔ مگر اپنی نظر سے اوجھل بھی نہ کرنا چاہتا ہو۔ اسے یاد تھا جب وہ پہلے آئی تب یہ تصویر یہاں نہیں تھی۔ اس نے فریم ہاتھ میں اٹھا لیا۔

وہ کسی خاکستری بال دار جلد پر بنا نقش تھا۔ وہ جھلسنے سے بنا تھا۔ داغنے کا نشان۔

فریم کو اس نے دروازے کی سمت گھمایا تاکہ روشنی میں تصویر کو ٹھیک سے دیکھ سکے اور ٹھٹک کر رہ گئی۔ برآمدے میں رکھی راکنگ چیئر اپنے دونوں کروی پایوں پر جھول رہی تھی۔ جیسے کوئی کرسی پر بیٹھا اسے دھیرے دھیرے جھلا رہا ہو۔ جبکہ کرسی کے دور و نزدیک کوئی نہیں تھا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔

تصویر کو اس کی جگہ پر رکھ کر وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی باہر نکل آئی۔ ٹھنڈے برآمدے میں کوئی موجود نہیں تھا۔ ہر طرف پُرسکون چمکیلی دھوپ بکھری ہوئی تھی۔ جھولتی ہوئی کرسی اب ساکت تھی۔ اس نے کرسی کو ہاتھ سے چھوا۔ وہ دوبارہ ہلنے لگی۔ ارتضیٰ کے ماتھے پر پُرسوچ انداز میں بل سے پڑ گئے۔ اس کے ذہن میں شمشاد کی باتیں گونجنے لگی تھیں۔ وہ اکثر گھر میں ہونے والی عجیب و غریب حرکات کا ذکر کیا کرتی تھیں۔ جسے ارتضیٰ جھٹلا دیا کرتی تھی۔

''بی بی جی! آپ کے مہمان آج آئیں گے یا کل؟

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

کھانا کتنے لوگوں کا بنانا ہے جی؟'' شفاعت کی آواز نے سوچ میں خلل ڈالا۔ تو اس نے سر جھٹکا اور اندر کی جانب مڑ گئی۔

وہ کونے میں بنے کچن میں کھڑا سالم مرغ کو الٹ پلٹ کرتا اس پر مصالحہ لگا رہا تھا۔ ارتضیٰ کو دیکھا تو اپنی کارکردگی کی تعریف کروانے کی خواہش جاگی۔ ''بی بی جی! آپ کو معلوم ہے۔ جب بی بی حیات تھے، وہ کھانا خود پکاتے تھے۔ مگر اکثر چھٹی میں یہ تندوری مرغ ہم سے ضرور بنواتے تھے۔ صاحب کو پسند تھا نا۔ بس پھر نا صاحب رہا، نہ بی بی کا شوق۔ اچھا ہوتا آپ ان کو ساتھ لے جاتے۔ ویسے بھی جیسے صاحب کا انتقال ہوا.....'' وہ بولتے بولتے اچانک چپ ہو گیا۔ ارتضیٰ نے اس کا اچانک چپ ہونا محسوس کیا۔ وہ کچھ بتاتے بتاتے رہ گیا تھا۔

وہ اچھل کر کاؤنٹر پر بیٹھ گئی۔ کچن بڑے سے لاؤنج میں ہی پارٹیشن کر کے بنایا گیا تھا اور باہر کی تیز روشنیوں کے برعکس اندر خنک سی نیم تاریکی تھی۔

''ہم چاہتے تھے وہ ہمارے ساتھ رہیں مگر وہ یہیں رہنا چاہتی تھیں اور تم کیا بتا رہے تھے۔ ناصر انکل کے متعلق؟''

اس نے کُریدا تو شفاعت نے یوں اِدھر اُدھر دیکھا جیسے کسی اَن دیکھی مخلوق کے سن لینے کا ڈر ہو۔

''بی بی! میں آپ کو ڈرانا نہیں چاہتا مگر اِدھر سب کچھ جیسا نظر آتا ہے۔ ویسا ہے نہیں۔ یہ گھر۔ اِدھر رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ بی بی کو اکثر اِدھر آوازیں سنائی دیتا تھا۔ گانے کا آواز..... یہ ٹھیک ہے کہ.....'' وہ خاموش ہوا۔ بولا تو آواز مزید ہلکی تھی۔

''صاحب کا موت گولی سے ہوا تھا۔ مگر بی بی نے ایک بات آپ سب لوگوں سے چھپائی تھی۔'' وہ یکدم خاموش ہو گیا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد چپ چاپ مرغی پر مصالحہ صحیح کرنے لگا۔ جیسے مدتوں سے یونہی خاموش رہا ہو۔

''کون سی بات چھپائی تھی شفاعت؟'' جب وہ خود سے بولنے پر آمادہ نہ ہوا تو ارتضیٰ کو ٹوکنا پڑا۔ اس نے سنجیدہ نگاہوں سے ارتضیٰ کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر خوف کا تاثر تھا۔

''بی بی! سچ بات ہے۔ میں بہت دور سے اِدھر آتا ہوں۔ کوئی بلا ہوتو اسے گولی مار دوں مگر جو نظر نہیں آتا اس سے کیسے نمٹوں؟ صاحب کو ہم نے اوپر پتھر پر سے اٹھایا تھا۔ وہ ایک دن پہلے غائب ہو گیا تھا۔ اور جب ان کا لاش ملا تو ان کی گردن پر ایک نشان تھا۔ اِدھر پیچھے۔'' شفاعت نے اپنی گدی پر ہاتھ رکھ کر بتایا۔

''جیسا کسی نے نکیلی شے سے بنایا ہو۔ زخم کا نشان۔ بی بی نے یہ بات سب سے چھپائی تھی۔ تاکہ کوئی ان کو اِدھر سے جانے کو نہ بولے۔ اچھا ہوتا وہ چلے جاتے۔'' اس نے افسردگی سے سر ہلایا۔

''صاحب کو غسل میں نے دیا بی بی کے حکم سے۔ اِدھر ہم اپنے مُردوں کو خود غسل دیتے ہیں۔ یہ باپ کا حق ہے بیٹے پر۔ صاحب میرے لیے والد صاحب کی طرح تھا۔ مگر اب لگتا ہے۔ بی بی اس بات کو..... داغ والی بات کو..... سب سے چھپانا چاہتا تھا اس لیے مجھ سے غسل دلوایا۔'' اس نے ارتضیٰ کی نظر بچا کر آنسو پونچھے۔

وہ دم سادھے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ ناخواندہ تھا۔ حالات کا تجزیہ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ نہ ہی مختلف واقعات کی کڑیاں جوڑنے کی صلاحیت رکھتا تھا مگر جو کچھ بتا رہا تھا، وہی اس کا دماغ ماؤف کرنے کے لیے کافی تھا۔ اسے آتشدان پر رکھی تصویر یاد آئی جو دوسری تصویروں کے عقب میں کچھ چھپا کر رکھی گئی تھی۔ مگر وہ کوئی انسانی جلد نہیں تھی۔ وہ بھوری بال دار کھال تھی۔ جیسے کوئی ہرن۔

اس کی پھپھی کا ذہنی توازن خراب نہیں تھا۔ یہ وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ جس طرح یہاں ہوئے عجیب واقعات سے اسے آگاہ کرتی تھیں۔ شفاعت اس کی توثیق کر رہا تھا۔ دو افراد ایک ساتھ وہم میں مبتلا نہیں ہو سکتے۔ اور پھر اسے ہلتی ہوئی راکنگ چیئر یاد آئی۔ ایک پل کو اس کے جسم میں جھرجھری سی آ گئی۔

''کاش ربیعہ اور محسن آج آ جاتے۔'' وہ دل ہی دل میں تنہا آنے پر پچھتائی۔ ربیعہ اور محسن اس کے خالہ زاد تھے اور انہیں کل یہاں پہنچنا تھا۔ اسے ایک پل کو اپنے ایڈونچر پر لعنت بھیج کر واپس جانے کا خیال آیا۔ زندگی رہتی تو مشغلے بہت۔

''سنو شفاعت!'' اس نے لہجے کو رعب دار بنانے کی ناکام کوشش کی۔

''تم آج یہیں کیوں نہیں ٹھہر جاتے؟''

''یہاں؟'' شفاعت اچھل پڑا۔ ''ن..... نہیں..... میرا مطلب ہے۔ مجھے ابھی خریداری کرنے بھی تو جانا ہے نا بی بی جی! پھر شام میں اِدھر آنا، مشکل ہوگا۔ میں اب صبح ہی آ سکوں گا۔'' وہ نظر چراتے ہوئے جلدی جلدی بولا۔ صاف ظاہر تھا وہ یہاں رکنا نہیں چاہتا تھا۔

www.pakistanipoint.com

"[illegible] ل آنٹی کے ساتھ کام کرتے کتنا عرصہ ہوا؟ آج ان کی بھتیجی کو تمہاری مدد کی ضرورت ہے تو پیٹھ دکھا رہے ہو۔ میں نے تو سنا تھا، یہاں کے لوگ بہت بہادر ہوتے ہیں۔" وہ سخت لہجے میں بولنا شروع ہوئی جو بتدریج رقت آمیز انداز میں بدل گیا۔ شفاعت نے بے بسی سے اس کی جانب دیکھا۔ وہ دیہاتی آدمی تھا۔ اس کی بی بی یونیورسٹی کی ڈراما سوسائٹی کی ممبر ہے، وہ یہ بات نہیں جانتا تھا۔

"ٹھیک ہے بی بی جی۔ آپ بولتے ہو تو میں اِدھر ٹھہر جاتا ہوں مگر مجھے کچھ ہو تو میرے بال بچوں کا خیال رکھنا پھر آپ کی ذمے داری ہے۔ سنا ہے غیبی چیز کو گولی بھی نہیں لگتی۔" وہ واضح طور پر خوفزدہ تھا۔

ارتضیٰ نے بمشکل ہنسی روکی۔

"تم فکر نہ کرو شفاعت! خدا نے چاہا تو ہم دونوں کل کی صبح ضرور دیکھیں گے۔" وہ کاؤنٹر سے اترتے ہوئے بولی۔ تو وہ اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرتا ہوا اثبات میں سر ہلانے لگا۔

کھانے سے فارغ ہو کر اس نے موبائل فون اٹھایا۔ سگنل بہت کمزور تھے۔ موبائل استعمال کرنے کے لیے باہر جانا پڑتا تھا۔ اس نے فون رکھا اور شمشاد کے کمرے کی راہ لی۔ اس کی کہی باتوں کی تصدیق کے لیے وہ سب سے مناسب جگہ تھی۔

حد سے زیادہ سہما ہوا شفاعت اندھیرا پھیلتے ہی ہال میں جا کے لیٹ گیا اور لیٹتے ہی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکا تھا۔ اب چاہے کوئی بھوت ہوتا یا چڑیل، اس کی جانے بلا۔

شمشاد کا کمرا بھی ترتیب میں کم و بیش اسی کے کمرے کے مانند تھا۔ چھوٹا مگر آرام دہ۔ درمیان میں ایک گیسٹ روم جو عموماً خالی رہتا تھا۔ یہاں کبھی ایک سے زائد مہمان رکتے ہی نہیں تھے، شاذ ہی ایسا ہوا تھا کہ مکان کے تمام کمرے زیرِ استعمال آئے ہوں۔ آخری بار یہ ناصر حسین کی فوتگی پر ہوا تھا۔ جب سب رشتے دار اکٹھے ہوئے تھے، شمشاد کی موت پر زیادہ تر لوگ تدفین کے فوراً بعد واپس چلے گئے تھے۔

کئی صدیوں پہلے تعمیر کردہ یہ عمارت آج بھی اپنی بنیادوں میں اسی طرح مضبوط تھی۔ سخت پتھریلی دیواروں کے درمیان دن میں بھی اندھیرا چھایا رہتا تھا۔ تعمیر میں ہوا و روشنی کی ضرورت کا خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ حالانکہ بعد میں ناصر حسین نے اس میں بہت سی تبدیلیاں کروائی تھیں مگر اب بھی وہ کسی تہ خانے کا سا تاثر رکھتی تھی۔

ارتضیٰ نے بیڈ کے برابر رکھی بڑی سی الماری کا لاک ہلایا۔ وہ بند تھی۔ پھر اسے کچھ یاد آیا۔ شمشاد چابیاں سنگار میز پر رکھے گلدان میں رکھتی تھی۔

اسے شمشاد کی ڈائریوں کی تلاش تھی۔ جو وہ اپنے کام کی یادداشتوں کے سلسلے میں باقاعدگی سے لکھتی تھیں۔ تاکہ انہیں تحریری صورت میں چھپوا سکے۔ وہ اپنے آپ میں کسی نایاب جریدے کی سی حیثیت رکھتی تھیں۔

اس سے پہلے کہ وہ کمر کس کر تلاش شروع کرتی، باہر سے آنے والی زوردار آواز نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ وہ ٹین کے ڈبے گرنے کی آواز تھی۔

آواز بہت پُرشور تھی۔ اس نے باہر نکل کر کونے میں رکھے ڈبوں کو دیکھا۔

"نہ جانے آنٹی نے یہ کباڑ کیوں جمع کر رکھا ہے؟"

وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی ان کے نزدیک پہنچی۔ اوپر تلے رکھے ڈبے بظاہر عام سے تھے۔ شاید کونے میں ہوا کا زور گردباد بناتا تھا۔ جس کے دباؤ سے ڈبے بار بار لڑھک جاتے تھے۔ آخر اس اونچائی پر ہوا چلتی بھی تو بہت تیز تھی۔ اس نے شفاعت کو انہیں وہاں سے ہٹانے کی ہدایت کر دی۔ باوجود اس کے ٹال مٹول کے۔

ڈائریاں تلاش کرنے کا کام بعد کے لیے چھوڑ کر وہ کمرے میں آگئی۔ بستر پر لیٹ کر بھی اس کا ذہن مسلسل اسی کے گرد گھوم رہا تھا۔ شمشاد اور ناصر حسین کی موت کو وہ سب لوگ فطری سمجھتے رہے۔ دو ایسے لوگ جو عمر کی نقدی خرچ کر چکے تھے، اب انہیں واپس لوٹنا ہی تھا۔ وہ بھی ایسا ہی سوچتی رہتی اگر عمر کے آخری حصے میں شمشاد کے ٹیلی فونک رابطوں میں تسلسل نہ آجاتا۔ اور اب اپنی کام کی یادداشتوں سے جڑی دستاویزات کو اس طرح پوشیدہ رکھنا۔ سب اتنا سادہ نہیں تھا جتنا نظر آ رہا تھا۔ سوچتے سوچتے اس کا سر دکھنے لگا۔

اس نے آنکھیں موند لیں اور تھوڑی ہی دیر میں غافل ہوگئی۔

رات کا کوئی تیسرا پہر تھا جب اس کی آنکھ کسی آواز سے کھلی تھی۔

وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر چھت کو دیکھنے لگی، ذہن اس طرح اچانک بیدار ہونے کی وجہ سوچ رہا تھا۔ اس نے گھڑی کی چمکتی سوئیوں پر نظر ڈالی جو تین کا وقت دکھا رہی تھیں۔ تب ہی ایک عجیب سے جلترنگ نے اسے اپنی

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

جانب متوجہ کیا۔ وہ ایسی آواز تھی، جیسے کئی بانسریاں ایک ساتھ بج رہی ہوں۔ عجیب سی پُراسراریت اور خوبصورتی تھی اس لے میں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

موسیقی کی خوبی سے قطع نظر سوچنے کی بات یہ تھی کہ اس وقت کس کا بانسری بجانے کا شوق جاگا ہوگا۔

اس نے ہاتھ مار کر سائڈ لیمپ روشن کیا اور بستر سے اٹھ کر باہر کی جانب کھلتی کھڑکی کا پردہ ذرا سا سرکایا۔ موٹی سنگی دیوار میں، محراب نما کھڑکی پر مضبوط سلاخیں نصب تھیں۔

باہر کا منظر دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ دور و نزدیک بارش نے چادر تان رکھی تھی۔ اگر بارش نہ ہوتی تب بھی اس گہرے اندھیرے میں کچھ دیکھنا ناممکن تھا۔

بارش کی جانب دھیان گیا تو اسے جنریٹر کی مدھم آواز بھی آنے لگی۔

یہاں بجلی کا پول موجود تھا مگر برقی رو عموماً معطل رہتی تھی۔ جنریٹر ہی یہاں بجلی کا بڑا ذریعہ تھا۔

وہ پلٹ کر بستر پر آ بیٹھی۔ مکان اپنے اسرار آہستہ آہستہ عیاں کر رہا تھا۔ بانسری کی آواز اب بہت واضح سنائی دے رہی تھی۔ وہ بستر پر لیٹ کر اس کے رکنے کا انتظار کرتے کرتے اس وقت نیند کی وادیوں میں کھو گئی... جب باقی خلقِ خدا جاگنے کی تیاریوں میں تھی۔

☆☆☆

صبح کے سناٹے اور بے سکون نیند کو شفاعت کی شور مچاتی آواز نے توڑا تھا۔ وہ سحر خیز تھا اور منہ اندھیرے ہی اٹھ کر معمولاتِ زندگی شروع کرنے کا عادی تھا۔

ارنصی بمشکل آنکھیں کھولتی دروازے تک پہنچی مگر وہ کہیں باہر سے چلّا رہا تھا۔

''بی بی جی! جلدی آیئے۔ آپ دیکھ کر حیران ہو جائیں گے۔'' وہ بیرونی دروازے سے ہی چلّایا۔

ارنصی نے جلدی جلدی منہ پر پانی کے چھپاکے مارے اور باہر نکلی۔ نہ جانے کون سی قیامت آئی تھی۔

باہر نکل کر جیسے وہ سحر زدہ ہی رہ گئی تھی۔ اس نے دنیا کے اَن گنت سبزہ زار دیکھے تھے مگر ایسی کاملیت، اتنے رنگ۔ ڈھلے ہوئے سیاہی مائل پتھروں کے درمیان جمع شدہ شفاف برساتی پانی۔ اردگرد کھلے پھول بوٹوں کے رنگ بھی دُھل کر نکھر آئے تھے۔

برساتی تالاب کے کنارے، پیاس بجھاتے چند خرگوش اس کے قدموں کی آہٹ سے بدک کر جھاڑیوں میں گھس گئے تو وہ مسکرانے لگی۔

یہ سب یقیناً ایسا تھا جس کے لیے اسے نیند سے جگایا جاتا۔

''یہ اچانک کہاں سے آیا شفاعت۔'' وہ واقعی حیران تھی۔

''ادھر ایسا ہی ہوتا ہے بی بی جی! بارش نہیں ہوتا تب دھول مٹی سب رنگ چھپا دیتا ہے۔ ابھی بارش کا موسم ہے تو سب پیڑ پودا پانی جمع کر لے گا۔'' اس وقت اس کا انداز ایک فخر سے بھرے گائڈ کا سا تھا۔ جو سیاحوں کو اپنے ماحول کے حسن سے روشناس کرا رہا ہو۔ وہ اسے باہر چھوڑ کر خود اندر چلا گیا۔ اسے معلوم تھا اب بی بی جلدی اندر نہیں آئے گی۔ وہ کافی دیر وہاں کھڑی قدرت کی اس صناعی کی داد دیتی رہی۔

اسے پہلی مرتبہ فطرت کا جادو سمجھ آیا تھا۔ حُسن کس طرح نظر کو جکڑ لیتا ہے۔ اسے اپنے انکل آنٹی کی یہاں گھر بنانے کی خواہش سمجھ میں آنے لگی تھی۔

شفاعت ناشتا بنا کر فوراً بازار کے لیے نکل گیا تھا۔ وہ اس سے اس نہ وقت گونجنے والی موسیقی کے متعلق کچھ نہیں پوچھ پائی۔ ویسے بھی اس سے کچھ پوچھنا اسے مزید خوفزدہ کرنے والی بات ہوتی۔ حالانکہ رات وہ جس طرح اصطبل پہنچ کر سویا تھا۔ یقین کرنا مشکل تھا کہ وہ خوفزدہ بھی ہوتا ہے۔

دوپہر کا کھانا گول کر کے وہ چھت پر پہنچ گئی اوپر چڑھ کر دیکھنے پر دور و نزدیک کے مناظر کھل کر واضح ہوئے۔ البتہ اس کی توجہ دور پہاڑوں کے دامن میں واقع بستی نے اپنی جانب مبذول کروالی۔ سرخ رنگ کی چھتیں بھورے پہاڑوں میں دور سے جھلک دکھا رہی تھیں۔ وہ بستی کافی دشوار گزار علاقے میں واقع تھی۔

''اس جگہ کا چکر تو لگانا پڑے گا۔'' اس نے ارادہ باندھا اور نیچے اتر گئی۔ ابھی اسے شمشاد کے کمرے کی مفصل تلاشی لے کر اس کی ڈائریاں بھی پڑھنی تھیں۔ اس نے تمام الماریاں اور درازیں چھان ماریں اور تھک ہار کر ایک جانب بیٹھ گئی۔ تب ہی جیسے غیب سے خیال آیا۔ وہ پھرتی سے اٹھی اور بستر کا گدا اوپر اٹھا دیا۔ اسے اپنی کم عقلی پر افسوس ہوا۔

وہ تین ڈائریاں پلنگ پر بچھے گدے اور تختوں کے درمیان پوشیدہ تھیں۔ سیاہ چمڑے کی مضبوط جلدوں سے مزین۔ اس نے فاتحانہ انداز میں مسکرا کر دیکھا اور انہیں بغل میں دبا لیا۔ دوپہر کا سورج بادلوں سے جھانکنے لگا تھا۔

www.pakistanidigest.com

ماحول میں چھت کے نالے سے ٹپکتی بوندوں کے علاوہ ہر طرح سے خاموشی تھی۔

شفاعت باہر تھا۔ کسی قسم کی مداخلت کا امکان نہیں تھا۔ یہ انہیں کھنگالنے کا بہترین وقت تھا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور ڈائریاں لے کر بستر پر پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ پہلی ڈائری اس وقت سے شروع ہوئی جب انہوں نے یہاں باقاعدہ رہائش اختیار کی تھی۔ اور وہی کافی طویل تھی۔ انہوں نے بہت منظم انداز میں ہر جاندار و بے جان شے کا ریکارڈ رکھا تھا۔

وہ خاموشی سے ان کا مطالعہ کرتی رہی۔ گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں اداسی بھی چکراتی رہی۔

وہ ڈائریاں شمشاد اور ناصر حسین کی زندگی کے شب و روز کی تحریری دستاویز تھیں۔ ان کے کام کی تمام تفصیلات۔ نایاب پودے، اور جاندار۔

اور ایک چیز جسے دیکھ کر وہ چونک اٹھی۔

آتش دان پر رکھے نشان کی ہاتھ سے بنی ڈرائنگ تھی۔ یہ چار سال پہلے کسی زخمی ہرن کے جسم سے لی گئی تھی۔ اسی کی تصویر انہوں نے فریم کروا رکھی تھی۔ وہ محویت سے انہیں پڑھتے ہوئے بالکل بھول چکی تھی کہ وہ ڈائریاں کس مقصد کے لیے اٹھا کر لائی تھی۔ وہ مقصد اسے تیسری جلد کھولتے ہوئے یاد آیا۔ شمشاد نے وہاں ناصر حسین کے کام کی تفصیلات پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک بستی کا ذکر کر رکھا تھا۔

اس نے تاریخ پر نظر دوڑائی۔ یہ صفحہ کوئی چار سال قبل لکھا گیا تھا۔ جس کے دو سال بعد وہ خود ایک اندوہناک موت کا شکار ہو گیا۔

وہ بغور پڑھنے لگی۔ شمشاد نے لکھا تھا۔

''آج ناصر گھر آئے تو بہت خوش تھے۔ عجیب بات ہے۔ ہم سمجھتے تھے چالیس سال اس علاقے میں رہتے ہوئے ہم یہاں کے چپے چپے سے واقف ہو چکے ہیں۔ مگر ثابت ہوا کہ قدرت جب تک نہ چاہے انسان آنکھ کے سامنے موجود شے بھی نہیں دیکھ پاتا۔ اس قدیم سرزمین کے اسرار سالوں سے ہمارے سامنے ہوتے ہوئے بھی نگاہوں سے اوجھل تھے۔ جب وقت آیا تو سامنے آ گئے۔ بنا کوشش کے، محض اتفاق سے۔ آج وہ پہاڑی بستی گئے تھے۔ ان کے دوستوں نے ان کے شبہے کی تصدیق کر دی — ان کی دریافت واقعی نایاب ہے۔ ہمیں امید ہے یہ علاقہ ہم پر مزید کچھ راز کھولے گا۔''

اس صفحے پر تحریر بس یہیں تک تھی۔ اس نے جلدی جلدی صفحات آگے پلٹے۔ مگر اس سے پہلے کہ... وہ اس دریافت کا راز جان سکتی، ہارن کی تیز آواز سے اس کے کان جھنجھنا اٹھے۔

''یہ کون جاہل ہے۔ اس نے ڈائری پٹخی اور پھر ذہن جیسے یکدم حاضر ہوا۔ یہ یقیناً ربیعہ اور محسن ہیں۔ اس نے جلدی سے نیچے چھلانگ لگائی اور ڈائریوں کو سمیٹ کر گدے کے نیچے چھپایا۔ وہ ایک اہم راز کی امین تھیں، شمشاد اور ناصر کے سالوں کی محنت کا ثمر۔ انہیں بے پروائی سے پھینکنا ان کے کام کی توہین کے مترادف تھا۔

وہ خیر مقدمی مسکراہٹ چہرے پر سجائے تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی باہر نکلی۔ مگر باہر کا منظر دیکھ کر مسکراہٹ ایک دم سمٹ کر ماتھے کی ناگوار تیوری میں بدل گئی۔ وہ سینے پر ہاتھ باندھے، وہیں دہلیز پر کھڑی انہیں گاڑی سے اترتے دیکھتی رہی۔

وہ دو نوجوان تھے۔ ایک دبلی پتلی مختصر جسامت کی لڑکی اور درمیانے قد و قامت کا پکی کیپ اور سادہ پینٹ شرٹ میں ملبوس نوجوان۔ لڑکی نے فوراً ہی اپنا بڑا سا پرس سنبھالا اور اوپر آتی ڈھلان پر قدم رکھ دیے۔ سیاہ جینز اور ٹی شرٹ میں بھورے بالوں کی پونی جھلاتی وہ تیزی سے اوپر آ رہی تھی۔

اس نے یقیناً ارتضیٰ کو دیکھ لیا تھا۔

''کیسی ہو؟'' نوجوان لڑکی نے جو بلاشبہ ربیعہ تھی، لپک کر اس کے گلے سے جھولتے ہوئے پوچھا۔ وہ دانستہ اس کے ماتھے پر بنی لکیروں سے صرف نظر کر رہی تھی۔ جیسے اس کی ناراضگی کی وجہ سے واقف ہو۔

''اس کٹ کھنے کو تم لے کر آئی ہو؟ یا خود ہی ساتھ چپک کر آیا ہے؟'' اس نے گاڑی کی ڈکی سے سامان نکالتے نوجوان کی جانب اشارہ کیا۔ وہ کافی دور تھا۔ ان کی آوازوں کا اس تک پہنچنا مشکل تھا۔

''ششش آہستہ بولو۔'' ربیعہ نے گھبرا کر نوجوان کو دیکھا۔

''تمہیں معلوم ہے انہیں بُرا جلدی لگتا ہے۔ یہ بھی ناراض ہو گئے تو پھنس جائیں گے۔ محسن کا اپنا کچھ پروگرام تھا۔ وہ دوستوں کے ساتھ کہیں نکل گیا۔ ازیک بھائی کو پتا چل گیا تھا کہ ہم کیا سوچے بیٹھے ہیں۔ پہلے تو بابا کو مطلع کر کے پورے پروگرام پر پانی پھیرنے والے تھے۔ میری

www.pakistanipoint.com

منتیں کرنے پر بمشکل اس شرط پر راضی ہوئے کہ وہ بھی ساتھ آئیں گے۔'' وہ جلدی جلدی بول رہی تھی۔ تاکہ اوپر آتے نوجوان کی سماعتوں کی رسائی سے پہلے بات مکمل کر لے۔ اسے خدشہ اپنی بات سے نہیں، ازبک کے تلخ تبصروں سے تھا۔ جو ارتضٰی کو جلتے توے پر بٹھا دیتے۔

اس کے ان دونوں کزنز میں چھتیس کا آنکڑا تھا۔

ازبک کی حاکمانہ اور روک ٹوک والی عادات کو باقی کزنز تو جیسے تیسے سہہ جاتی تھیں مگر ارتضٰی کے سامنے اس کی مثال ایک میان میں دو تلوار والی ہو جاتی تھی۔

''یعنی یہ تمہیں دھمکا کر یہاں آیا اور اب رنگ میں بھنگ ڈالے گا۔'' اس نے دانت نکوستے ہوئے ربیعہ کے کان میں سرگوشی کی۔ تو ربیعہ نے بے بسی سے کندھے اچکا دیے۔ اس کی ان دونوں کے سامنے ایک نہیں چلتی تھی۔

''ہائے کزن کیسی ہو؟ تمہیں اس پر بھڑکنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود آیا ہوں۔ تاکہ تمہاری حرکتوں پر نظر رکھ سکوں۔ بے فکر رہو انکل کو نہیں بتاؤں گا۔ وہ یہی سمجھ رہے ہیں کہ ان کی لاڈلی پڑھائیاں کر رہی ہے۔ چلو اب ہمیں ہمارے کمرے دکھاؤ شاباش!'' وہ دونوں ہاتھوں میں سفری بیگ اٹھائے اس کے قریب سے گزرتا ہوا بولا۔

اس نے یقیناً اس کی گفتگو سن لی تھی۔

ربیعہ نے ازبک کی بات سن کر منہ دوسری جانب گھما لیا۔ اس میں ارتضٰی کے تاثرات دیکھنے کی تاب نہیں تھی۔

''شفاعت سے کہو گاڑیاں ڈھانپ دے۔ تمہیں خود تو کسی بات کا خیال نہیں۔ مٹی سے بھر چکی ہے تمہاری گاڑی۔'' گھر کے اندر سے اس کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔

ارتضٰی نے خون کے گھونٹ پیتے ہوئے گردن سے پکڑ کر ربیعہ کو دھکیلا اور خود بھی اس کے پیچھے اندر داخل ہو گئی۔

اب اسے ازبک کو واپس بھگانے کی ترکیب بھی سوچنی تھی۔

وہ ماں اور باپ دونوں جانب سے ان کا کزن تھا اور بڑوں نے دانستہ چھوٹوں کی شتر بے مہار حرکتوں پر اسے نگران چھوڑ رکھا تھا۔ اس لیے ان سے اس کی شکایت کرنا فضول تھا۔

☆☆☆

''ویسے سوچنے کی بات ہے یہ آخری ڈائری آنٹی نے انگلش میں کیوں لکھی ہے جبکہ باقی دونوں اردو میں ہیں؟'' وہ دونوں فریش ہو کر اب ارتضٰی کے پاس موجود تھے اور ازبک نے ارتضٰی کے کہے بنا ڈائری کا معما حل کرنے کا ذمہ اٹھا لیا تھا، حالانکہ اسے ارتضٰی کی کہانیوں پر ایک پل کو بھی یقین نہیں آیا تھا۔ وہ کسی صورت ماننے کو تیار نہیں تھا کہ مکان کچھ غیر معمولی واقعات کا مرکز ہے۔

اب وہ ایک ہاتھ میں شفاعت کی تیار کردہ کافی کا کپ تھامے دوسرے ہاتھ سے ڈائری کے ورق الٹ رہا تھا، ربیعہ کو اس تمام بکھیڑے میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ وہ موبائل کو الٹ پلٹ کر سگنل چیک کر رہی تھی مگر آخر تنگ آ کر اس نے ہاتھ کھڑکی سے باہر نکال لیا، اس کے چہرے پر خوشی کے تاثرات ابھرے۔ سگنل نے جھلک دکھائی تھی مگر فوراً ہی ہاتھ کو ایک جھٹکا سا لگا۔

''اِدھر دو موبائل۔'' ارتضٰی نے اس سے موبائل چھپٹا اور اپنی جیب میں ڈال لیا۔

ربیعہ گہری سانس لیتی ایک جانب جا بیٹھی۔

اس نے اپنا سامان ارتضٰی کے کمرے میں رکھا تھا اور اب مجبور تھی کہ اس کی ہر بات سنے۔

ربیعہ کی جانب سے بے فکر ہو کر وہ ازبک کی جانب متوجہ ہوئی۔

''بھئی ہو سکتا ہے کوئی تحقیقی موضوع ہو۔ اردو میں لکھنا مشکل ہو!'' ارتضٰی نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔

ازبک نے ایک ملامتی نگاہ اس پر ڈالی۔ ''مجھے یہ تو معلوم تھا کہ تمہارے پاس عقل کا ذخیرہ محدود ہے مگر یہ اندازہ نہیں تھا صورتِ حال اتنی خراب ہے۔ اور اس ننھے دماغ کے ساتھ تم لوگ یہاں گتھیاں سلجھانے آئے ہو؟'' اس نے باری باری دونوں پر نگاہ ڈالی۔

ربیعہ نے شرمندہ ہو کر گردن جھکالی، یہ حکمتِ عملی اسے اکثر ازبک کے زہریلے طعنوں سے بچا لیا کرتی تھی مگر ارتضٰی کو سانپ کے بل میں ہاتھ ڈالنے کا شوق تھا، اس بار بھی خاموش نہ رہ سکی۔

''ہاں ہم بیوقوف ہیں، کیونکہ جس وقت ہم اخلاق اور خوش خلقی کی لائن میں لگے تھے، اس وقت تم ذہانت سے اپنا خالی برتن بھر رہے تھے، یہ دیکھے بنا کہ کٹورا ٹوٹا ہوا ہے۔'' وہ تلملا کر بولی۔ اور آخر میں ازبک کا سر دو انگلیوں سے بجا ڈالا۔

وہ خاموشی سے اسے بولتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

''میں بطور خاص تم سے مخاطب نہیں تھا، ویسے تمہیں شوق ہے... مجھ سے بات کرنے کا۔'' اس نے پھر تیلی لگائی۔

اب کی بار ارتضٰی بھڑک کر چھت سے جا لگی، اس سے پہلے کہ وہ ازبک کا منہ نوچنا شروع کر دیتی، ربیعہ نے جلدی سے

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

درمیان میں آکر رکاوٹ ڈالی۔

"رکو تم دونوں! ہم کیا یہاں لڑنے کے لیے جمع ہوئے ہیں؟"

اس نے دونوں بازو پھیلا کر سنجیدگی سے کہا تو ارتضی ازبک کو کھا جانے والی نگاہوں سے گھورتی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل کے کونے پر ٹک گئی۔

ازبک نے ماحول کی سنگینی کو محسوس کیا تو بقیہ تیر وتفنگ سمیٹ کر رکھتے ہوئے اصل موضوع کی جانب واپس پلٹا۔

"یہ دیکھو۔" اس نے ایک صفحے پر ہاتھ رکھا۔

"کوئی ایسا انسان جو تمام عمر اردو کو ذریعہ تحریر بنائے رکھے، آخر عمر میں آکر اچانک دوسری زبان میں لکھنا شروع کردے تو یہ بات واضح ہے کہ وہ اپنی تحریر کسی سے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے۔"

"ایسا کون ہوسکتا ہے؟" دونوں کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"کسی ایسے سے، جس کی رسائی اس کی ڈائری تک ہے۔ جو اردو پڑھنا جانتا ہو یا اس گھر میں آمدورفت رکھتا ہو اور ڈائری چوری کرکے اسے باہر لے جاسکتا ہو۔"

اس نے سادہ انداز میں بولتے ہوئے انکشاف کیا، دونوں خاموش ہوگئیں۔ ازبک کی بات نے اسے عجیب احساس دلایا تھا۔ غیر محفوظ ہونے کا احساس۔ یعنی آنٹی شمشاد کو کسی اپنے سے ہی خطرہ تھا۔ کوئی ایسا فرد جو گھر کے چپے چپے سے واقف تھا۔

وہ کچھ بولتی اس سے پہلے ہی دروازے پر ہوئے کھٹکے نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

"بی بی جی! اگر لڑائی ختم ہوگئی ہو تو میں جاؤں؟" شفاعت کا مسکراتا چہرہ دروازے کے پیچھے سے نمودار ہوا۔

"تم یہاں کھڑے ہماری باتیں سن رہے تھے؟" وہ ہکا بکا رہ گئی۔

"نہیں ساری تو نہیں.. مگر آپ چیخے تو میں جلدی سے کھانا چھوڑ کر اِدھر آگیا۔ میری زنانی ہر وقت لڑتی ہے جی۔ مگر مجھے شہر والوں کی لڑائی دیکھنے کا شوق تھا۔ اُدھر کیسے لڑتے ہیں۔ آج پتا چلا۔ بڑی بی بی تو کبھی تیز آواز میں بولتے ہی نہیں تھے۔" اس نے باچھیں کانوں تک پھیلاتے ہوئے اپنی کارکردگی کی رپورٹ دی تو ربیعہ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ اس کے گھر کے ملازمین حد درجہ فرمانبردار اور مؤدب تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کوئی ملازم چھپ کر مالکوں کی گفتگو سنے۔ اس نے ناسمجھی سے ارتضی کو دیکھا جو شفاعت کو گھورنے میں مصروف تھی۔ اس کے تیور دیکھ کر شفاعت خاموشی سے کچن کی جانب کھسک گیا۔

"شفاعت کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" ازبک جو اتنی دیر سے سر صفحے پر جھکائے تحریر کو گھور رہا تھا۔ اچانک بولا تو وہ چونک اٹھی۔

"نہیں نہیں، یہ بیوقوف ہے اور سیدھا سادا سا انسان ہے۔" اس نے فوراً جھٹلایا۔

"کسی کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہوتا ہے۔" ربیعہ نے موبائل ارتضی کی جیب سے نکالتے ہوئے رائے دی...تو تینوں اپنی اپنی سوچ میں کھو گئے۔ کمرے میں محض پنکھے سے ہلتے صفحات کی آواز تھی۔

اچانک ازبک کی نگاہ ڈائری پر بنی ایک ڈرائنگ پر پڑی۔ وہ چونک اٹھا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے انگلی سے صفحہ بجایا تو ارتضی نے تھوڑا سا جھک کر دیکھا۔ اسے آتشدان پر رکھی تصویر یاد آگئی۔

"رکو میں تمہیں کچھ دکھاتی ہوں۔" وہ باہر دوڑ گئی۔

ربیعہ نے حیرت سے دیکھا۔ تھوڑی دیر پہلے تک یہ ازبک کی جان لینے پر تلی ہوئی تھی۔ اس نے سر جھٹکا اور موبائل سے سر پٹخنے لگی۔

وہ جس تیزی سے گئی تھی اُسی تیزی سے واپس آئی۔ ہاتھ میں آتشدان پر رکھی تصویر تھی۔

"یہ دیکھو!" اس نے فریم دونوں کے سامنے لہرایا۔

"یہ بالکل ویسی ہی ہے۔ جیسی اس کاغذ پر بنی ہے۔ پیچھے بھی ایک صفحے پر موجود تھی۔ نہ جانے کیا ہے۔" اس کی آواز میں جوش تھا۔

ازبک نے تصویر اس کے ہاتھ سے لے کر کاغذ پر بنے نمونے کے برابر لا رکھی۔ وہ سادہ سے فریم میں جڑی عجیب تصویر تھی۔ پہلی نظر میں وہ محض ایک نقش محسوس ہوتی تھی مگر نزدیک سے دیکھنے پر جھلسی ہوئی جِلد طبیعت پر عجیب اثر کرتی تھی۔ تصویر بہت واضح تھی۔ اور بہت قریب سے بنائی گئی تھی۔ جو یقیناً ناصر حسین کے طاقتور کیمرے کا کارنامہ تھا۔ اس کے تصویری البم وہ پہلے ہی یہاں سے لے جاچکے تھے۔

"ناں! یہ دو الگ خاکے ہیں۔ دونوں کا ڈیزائن بالکل مختلف ہے۔" اس نے پہلی ہی نظر میں اس کا خیال مسترد کردیا۔

"ہوسکتا ہے آنٹی نے اندازے سے بنائی ہو اس

Waqar Azeem
www.pakistanpoint.com

لیے کچھ مختلف ہو۔'' ربیعہ نے خیال ظاہر کیا۔

''جتنی باریکی سے وہ اپنی یادداشتیں محفوظ کر رہی تھیں۔ تمہیں لگتا ہے انہوں نے اتنا اہم پیٹرن اندازے سے بنایا ہو؟'' ارتضیٰ نے اس کی بات پر نفی میں سر ہلایا۔

''تمہیں کیسے معلوم یہ اہم ہے؟''

''اگر اہم نہ ہوتا تو ڈائری میں کیوں ہوتا؟ اور اس کی تصویر علیٰحدہ سے رکھی ہے۔ یہ یقیناً کچھ خاص ہے۔'' وہ بند مٹھی ہونٹوں پر رکھے اب بالکل سنجیدہ تھا۔ ارتضیٰ اسے بغور دیکھتے ہوئے مسلسل کچھ سوچ رہی تھی۔ کوئی بات اس کے ذہن میں آتے آتے اچانک دور چلی جاتی تھی۔

اور پھر جیسے جھماکا سا ہوا۔ اسے یاد آگیا، یہ نشان کیا ہوسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

''یہ..... یہ نشان .....'' اس نے تھوک نگل کر حلق تر کیا۔

''رکو مجھے شفاعت سے کنفرم کرنا ہوگا۔'' وہ اچانک باہر نکل گئی اور ازبک اسے روکتا ہی رہ گیا۔

کچھ ہی دیر میں وہ شفاعت کے ساتھ واپس آئی۔ اس کا چہرہ اپنے ہی خیال کے تکدّر سے سفید پڑ رہا تھا۔

''اس تصویر میں دیکھو شفاعت! کیا یہ وہی نشان ہے جو انکل کی گردن پر بنا تھا۔'' اس نے استفہامیہ نظروں سے اپنی جانب دیکھتے شفاعت کو مخاطب کیا۔ باقی دونوں نفوس خاموشی سے اس کی حرکات دیکھ رہے تھے۔ البتہ اس کی آخری بات پر دونوں چونک اٹھے تھے۔

ازبک کو ڈائری شفاعت کو دکھانے میں جو تردّد تھا، وہ اس کے چہرے سے ظاہر تھا۔ مگر اس نے کچھ کہے بنا اسے شفاعت کی جانب کھسکا دیا۔

اس نے جھک کر صفحے پر نگاہ ڈالی اور بس ایک نظر دیکھ کر سیدھا کھڑا ہوگیا۔

اس کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات سے وہ کہے بنا ہی اس کا جواب سمجھ گئے۔

''ہاں جی! یہ وہی نشان ہے۔ بی بی نے اِدھر لکھ رکھا ہے اسے۔'' اس نے جیسے خود کلامی کی۔

''مگر وہ ایسا جلا ہوا نہیں تھا جی۔ اس فریم والے فوٹو جیسا۔ ہاتھ سے بنا تھا۔ جلے ہوئے سے خون نہیں بہتا۔ صاحب کی گردن پر.....''

''اچھا، اچھا بس کرو۔ تفصیل مت بتاؤ۔'' ربیعہ نے اسے ٹوکا۔ اس کے چہرے پر ناگواری اور تکلیف کے تاثرات تھے۔ شفاعت جھجک کر چپ ہوگیا۔

''ٹھیک ہے، تم جاسکتے ہو۔'' ارتضیٰ نے اسے جانے کا اشارہ کیا مگر پھر اچانک کچھ یاد آیا۔ ''سنو یہ پہاڑی بستی کس طرف ہے؟ اس کے متعلق کچھ معلوم ہے؟''

شفاعت جاتے جاتے پلٹا۔ اس کے چہرے کے تاثرات اچانک بدلے تھے۔

''ہاں جی معلوم تو ہے۔ صاحب بہت جاتے تھے وہاں۔ ان کے دوست ہیں اُدھر کچھ۔'' اس نے رک رک کر بات مکمل کی۔

''اوہ واؤ۔ تم ہمیں وہاں لے جاسکتے ہو؟'' وہ اچانک پُرجوش ہوگئی۔

''ٹھیک ہے جی کب چلنا ہے؟''

''کل ہی۔'' وہ چہکی۔ شفاعت نے سر جھکایا اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔ ازبک نے بغور اس کا پژمردہ انداز ملاحظہ کیا تھا۔

☆☆☆

''یار شفاعت! یہ بانسری بجانے کا شوقین کون ہے اس علاقے میں؟'' وہ چاروں صبح ہی صبح پہاڑی بستی کی جانب روانہ ہوگئے تھے۔

ازبک کی بات پر ارتضیٰ اور شفاعت دونوں نے چونک کر دیکھا۔

''بڑا ہی بے وقت اس کا یہ شوق جاگتا ہے۔ اس سے التجا کرنی ہے کہ بھائی چاہے آرکسٹرا بجاؤ مگر دن میں۔ آدھی رات غریبوں کے آرام کے لیے ہوتی ہے۔'' اس نے مزاحیہ پیرائے میں شکایت کی۔ تو ارتضیٰ نے گہری سانس لی۔ وہ رات بھر سکون سے سوئی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا وہ بدروحوں کا سنگیت پھر سنائی دیا تھا۔

''صاحب! یہ آواز گھر کا حصہ ہے، قریب چار پانچ سال سے۔ کبھی دن میں آتا ہے کبھی رات میں، بی بی کہتا تھا یہ موت کا ساز ہے۔ ہمیں نہیں معلوم اس کا مطلب مگر ہم کھوج نہیں کرتا۔'' اس نے چٹانوں پر پیر مضبوطی سے جماتے ہوئے بات مکمل کی۔ وہ بتدریج اونچائی پر جارہے تھے۔ بستی کی جانب جاتی پگڈنڈیاں تنگ تھیں۔

ارتضیٰ نے معنی خیز انداز میں ازبک کو دیکھا۔ وہ اس کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ مگر اس وہم کو حقیقت سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

''یہ پہاڑی بستی کے لوگ کرتے کیا ہیں؟'' ارتضیٰ نے اب کے ربیعہ کو غصے سے گھورتے ہوئے سوال کیا۔ جو

نظر فون پر گاڑھے بمشکل چل پا رہی تھی۔

''کچھ خاص نہیں، شکاری ہیں زیادہ تر۔ کچھ ادھر شہر میں ان کے مرد کام کرتے ہیں۔ یا کچھ لوگ فوج میں۔''

اچانک ازبک لڑکھڑایا شاید جوتے کا تسمہ کھل کر پیر میں الجھا تھا۔ اس کے ساتھ چلتے شفاعت نے ہاتھ آگے بڑھایا تاکہ سہارا دے سکے۔ تب ہی ازبک کے دائیں طرف کچھ چٹانوں سے چنگاریاں پھوٹیں۔ اس نے حیرت سے پلٹ کر چٹان کو دیکھا۔ سیاہ چٹان پر سفید گول نشان نمایاں تھا۔ فائر کی آواز بعد میں گونجی تھی اور صورتِ حال سمجھ کر اس کا رنگ ایک پل کو فق پڑ گیا۔ ان پر گولی چلائی گئی تھی۔

''سب نیچے بیٹھ جاؤ۔'' شفاعت چلّایا۔ سب گھبرا کر وہیں بیٹھ گئے جہاں موجود تھے۔ مگر دس پندرہ منٹ کے انتظار کے بعد بھی دوسرا فائر نہیں ہوا۔ وہ کھلی جگہ میں تھے آسانی سے نشانہ بن سکتے تھے خاص طور پر اونچائی سے۔ موسم میں حدت تھی یا حالات کی نزاکت، ارتضیٰ کو اپنے ماتھے سے پسینہ بہتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ دیکھ سکتی تھی باقیوں کی حالت بھی اس سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ شکار کرنے اور شکار بننے کے لیے دو بالکل مختلف نوع کی ہمت چاہیے ہوتی ہے۔ اسے آج علم ہوا۔

ربیعہ نے حالات کا جائزہ لینے کے لیے گھٹنوں سے سر باہر نکالا۔ وہ کسی کچھوے کے مانند گول مول ہو چکی تھی۔ تب ہی اس کی اچٹتی سی نظر ایک شخص پر پڑی۔ گہرے رنگ کے شلوار قمیص اور ہُڈ والی جیکٹ میں ملبوس ایک ہاتھ میں رائفل تھامے، وہ ایک بلند چٹان پر ایستادہ تھا۔ دور سے صورت نظر آنا مشکل تھا۔ ربیعہ نے اشارے سے ارتضیٰ کو اس کی جانب متوجہ کیا۔ تو باقیوں کی توجہ بھی وہیں مبذول ہو گئی مگر تب تک وہ وہاں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ شفاعت نے غصے سے دانت پیسے۔

''ابھی میرے پاس رائفل ہوتی تو اسے مزہ چکھا دیتا۔ اندھوں کی طرح گولی چلاتا ہے۔'' اس نے ہاتھ جھاڑے۔

''گھر واپس چلتے ہیں؟'' ربیعہ منمنائی۔

''نہیں وہ جا چکا ہے۔ ہم آگے جائیں گے۔'' ازبک نے حتمی انداز میں کہا۔

''میں نہیں جاؤں گی۔ اگر وہ دوبارہ آ گیا تو؟'' ربیعہ اینٹھ گئی۔ وہ بہت خوف زدہ ہو چکی تھی۔

''اگر دوبارہ آیا تو تمہیں کیا؟'' ارتضیٰ نے اسے حیرت سے دیکھا۔ تو جواباً ربیعہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''اس شخص نے ہم پر گولی چلائی اور تم پوچھ رہی ہو مجھے کیا؟'' وہ باقاعدہ کانپ رہی تھی۔

''ضروری تو نہیں اس نے ہمیں نشانہ بنایا ہو۔ ہوسکتا ہے غلطی سے گولی یہاں آ گئی ہو۔''

''جو بھی ہو، میں نہیں جاؤں گی۔'' وہ مزید سکڑ گئی۔

''اگر وہ مارنا چاہے گا تو ابھی گھر واپسی کے سفر میں گولی مار دے گا اور میں تمہیں آگے کر کے، اس بات کو یقینی بناؤں گا کہ وہ کامیاب رہے۔'' ازبک نے دانت پیسے۔

اس نے بے یقینی سے ازبک کو دیکھا۔

''مجھے گھر چھوڑ دو پھر کہیں بھی چلے جانا۔'' وہ روہانسی ہو کر بولی۔

''تمہارا مطلب ہے تم گھر میں تنہا زیادہ محفوظ رہو گی بجائے ہمارے ساتھ جانے کے؟'' ارتضیٰ نے دانستہ سنجیدہ انداز اپنایا۔ وہ معاملے کی سنگینی سے ربیعہ کی توجہ ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''ہاں، مگر اکیلی کیوں۔ شفاعت بھی تو ہوگا۔'' وہ بدکی۔

''بیوقوف! اگر اتنا خوف ہے تو واپس چلی جاؤ۔ ہم ہرگز معاملے کی کھوج تک پہنچے بنا واپس نہیں جائیں گے۔ یہاں کسی کو چاند ماری کا شوق ہے تو ہمارے پاس بھی ایک سپاہیوں کا رشتے دار موجود ہے۔ کیوں شفاعت؟'' ارتضیٰ نے کھڑے ہو کر ہاتھ جھاڑتے ہوئے شفاعت کو مخاطب کیا۔ تو وہ نہ سمجھنے والے انداز میں منہ کھولے اثبات میں سر ہلانے لگا۔ ازبک پہلے ہی کھڑا ہو چکا تھا مگر ازراہِ احتیاط اس نے جگہ بدل لی تھی۔

''میرا خیال ہے، بی بی جی ٹھیک کہتے ہیں۔ ابھی گھر چلنا بہتر ہوگا۔''

شفاعت نے ربیعہ کو اٹھنے کے موڈ میں نہ پا کر ہمدردانہ انداز میں ازبک کو مخاطب کیا۔ تو اس نے ایک ہاتھ سے ربیعہ کا بازو تھاما اور اسے جھٹکے سے کھڑا کر دیا۔ وہ چٹانوں پر ایک پل کو لڑکھڑائی اور پھر تیزی سے دوڑتی ہوئی ارتضیٰ کے پاس لپک گئی۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ طے ہو چکا تھا کہ سفر جاری رکھا جائے۔ اور یہ فرض کر لیا جائے کہ گولی غلطی سے صراطِ مستقیم سے بھٹک کر اجنبی راستوں پر نکل آئی تھی۔

سورج کا سفر ان سے زیادہ تیزی سے جاری تھا اور جس وقت پہاڑی بستی کے آثار نظر آئے، وہ ان کے سروں پر پہنچ چکا تھا۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

عمودی بے ترتیب پگڈنڈی ختم ہوتے ہی ان کی نگاہ ایک وسیع قطعۂ زمین پر پڑی۔ سیاہ چٹانوں کے درمیان چھوٹے چھوٹے لکڑی اور پتھروں سے تعمیر شدہ مکانات اور ان کے درمیان اپنی اپنی سرگرمیوں میں مصروف بستی کے مکین۔

آگے بڑھنے کے بجائے وہ وہیں رک گئے۔ وہ تمام مکین ایک ہی خاندان، ایک ہی برادری سے تھے۔ اجنبیوں کا یوں گھس آنا انہیں ناگوار بھی گزر سکتا تھا۔ شفاعت نے آگے بڑھنے کا ارادہ کیا تھا شاید مگر اس سے قبل ہی ایک اونچے پتھر پر بیٹھے دو نوجوان ان کی جانب متوجہ ہو گئے۔ وہ گود میں رائفلیں رکھے سر سے سر جوڑے راز و نیاز میں مشغول تھے۔ ایک دراز زلف نوجوان چھلانگ لگا کر نیچے اترا اور شفاعت کا ہاتھ تھام کر مقامی زبان میں وہاں موجودگی کا احوال دریافت کرنے لگا۔

اگر شفاعت پہلے ہی انہیں اس قبیلے کے ذریعۂ روزگار کے متعلق آگاہ نہ کر چکا ہوتا... تو وہاں ہتھیاروں کی بہتات ضرور انہیں پریشان کرتی۔ یہ شکاریوں کی آبادی تھی اور ہتھیار ان کے روزگار کا ذریعہ۔

دوسرا نسبتاً کم عمر نوجوان وہیں پتھر پر بیٹھا شہری مہمانوں کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی دلچسپی کا محور واضح طور پر منہ کھولے اجنبی زبان سمجھنے کی کوشش کرتی لڑکیاں تھیں۔

شفاعت کی بات سن کر دراز زلف لڑکا اثبات میں سر ہلانے لگا۔

☆☆☆

شفاعت نے نہ جانے کیا وضاحت کی تھی... جو نوجوان نے تینوں کو گاؤں بھر سے گزار کر سیدھا اس نیم پختہ مکان میں لا پٹخا تھا۔ اور اب وہ ایک قوی الجثہ دیو ہیکل شخص کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ امداد حسین نامی وہ شخص گاؤں کے غیر اعلانیہ سردار کی سی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کی مالی حیثیت بھی باقی گاؤں والوں سے کافی حد تک بہتر نظر آتی تھی۔

ابتدائی تعارف سے یہ تو واضح ہو چکا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جس سے ملنے کے لیے ناصر حسین ایک طویل سفر طے کر کے یہاں آیا کرتا تھا۔

ایک ادھیڑ عمر عورت جس کا تعارف امداد نے اپنی بیوی کی حیثیت سے کروایا۔ خشک میوے اور قہوے کی پیالیوں سے بھری تشتری ان کے درمیان رکھ کر خود کہیں غائب ہو چکی تھی۔ مسکین صورت وہ عورت البتہ جانے سے پہلے مدقوق چہرے پر مسکراہٹ لا کر انہیں سلام کرنا نہیں بھولی تھی۔

وہ گاؤں سویا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ہر ایک شخص متحرک ہونے کے باوجود ساکت ہا نظر آتا تھا۔ ان کی آپس میں بات چیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ جیسے جادو کے ذریعے مجسموں میں جان ڈال دی گئی ہو۔ ازبک امداد سے ابتدائی تعارف میں مصروف تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ارتضیٰ نے مکان کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

پتھر کی بنیادوں پر لکڑی کی دیواریں اور چھت بنا کر دو کمرے تعمیر کیے گئے تھے۔ آگے برآمدے کی زمین کو اونچا کر کے ایک کونے میں باورچی خانہ بنا دیا گیا تھا۔ برآمدے کو لکڑی کی باڑھ نے گھیر رکھا تھا۔ اور وہ اس وقت لکڑی کی بھدی بینچوں پر ایک دائرے کی صورت میں بیٹھے تھے۔ اونچائی سے دوسرے مکانوں کی چھتیں واضح نظر آ رہی تھیں۔

''مجھے بہت خوشی ہے ناصر صاحب کے بچے مجھ سے ملنے آئے۔'' امداد حسین نے قہوے کی مختصر پیالی کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے کہا۔ سیاہ شلوار قمیص میں ملبوس کندھوں پر بھوری شال ڈالے وہ پچاس تا پچپن کے قریب رہا ہوگا۔

سیاہ دراز بال الجھی لٹوں کی صورت میں کاندھوں پر بکھرے تھے۔ ہاتھوں کی ہر انگلی قیمتی پتھر جڑی انگوٹھیوں سے مزین تھی۔

ربیعہ کی تمام دلچسپی کا محور وہ انگوٹھیاں تھیں۔

''ناصر انکل کے متعلق علم ہوا کہ وہ آپ کے اچھے دوستوں میں سے تھے۔ اپنے ذاتی معاملات میں آپ سے مدد بھی لیا کرتے تھے۔ بس یہ علم ہوتے ہی ہم فوراً یہاں آ گئے۔ جن حالات میں ان کی موت ہوئی، وہ تو آپ کو علم ہوگا ہی۔'' ازبک نے امداد کے تاثرات کو بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ وہ اپنے تایا اور اس شخص کے تعلقات کی صحیح نوعیت سے آگاہ نہیں تھا۔ غیر محتاط گفتگو ان کے گلے بھی پڑ سکتی تھی۔

''ازبک صاحب، آپ کو کیا لگتا ہے یہ گاؤں میں ساری عورتیں کیوں ہیں۔ یہاں کے مرد کہاں ہیں؟'' امداد حسین نے اچانک پوچھا۔

اس کی نظریں دور سے پانی بھر کر لاتی ایک عورت اور بچے پر جمی تھیں۔

''مم..... میں کیسے بتا سکتا ہوں۔'' ازبک اس اچانک سوال سے گڑبڑا گیا۔ اس نے مدد طلب نگاہوں سے شفاعت کو دیکھا... جو تیزی سے خشک میوہ کم کر رہا تھا۔

''وہ سب شکار پر نہیں جاتے۔ شکار تو بس سیزن میں

www.pakistanipoint.com

ہوتا [illegible] اں [illegible] [illegible] لگا رکھی ہے۔''
[illegible] آگے بڑھایا تو سخت
[illegible]
[illegible] ہمارے مرد۔ ان پتھروں کی تلاش، [illegible] اس وجہ سے اکثر گھر سے باہر رہتے [illegible]

اس نے قہوہ کا گھونٹ لیا۔

''بہت اچھی بات ہے۔ مگر اس سے انکل کی یہاں آمد کا کیا تعلق ہے؟'' ارتضیٰ کے چہرے پر الجھن تھی۔ جبکہ ربیعہ اپنی جگہ سے اٹھ کر پانی لاتی عورت اور بچے کے پاس پہنچ چلی تھی۔ اور اب ان سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہی تھی۔ سر پر گھڑے سنبھالے چلتی عورت اب ان کے کافی نزدیک پہنچ چکی تھی۔ اور وہ دیکھ سکتے تھے کہ وہ عورت نہیں بلکہ ایک نوعمر لڑکی تھی۔ دراز قد اور چہرے پر جمی سنجیدگی کی وجہ سے وہ عمر سے بڑی معلوم ہوتی تھی۔ ایک چھوٹا سا بچہ اس کی ٹانگوں سے لپٹا ساتھ ساتھ چلا آ رہا تھا۔ دالان کی سیڑھیاں چڑھنے پر پختہ عمر عورت اچانک کہیں سے نمودار ہوئی اور اس کے ہاتھ سے گھڑے تھام لیے۔

لڑکی کی نگاہ ان پر پڑ چکی تھی مگر ان کے سامنے آنے کے بجائے وہ اندر کہیں غائب ہوگئی۔

''آپ کے انکل یہاں اسی سلسلے میں آتے تھے۔ وہ ان چٹانوں میں گھومتے رہتے تھے۔ اس طرح کئی بار انہیں قیمتی پتھر ملے۔ مگر انہیں بیچنا ان کا کام نہیں تھا۔ وہ تو سیلانی تھے۔ وہ بس ان جگہوں تک ہماری رہنمائی کرتے۔ اور خود نئی چیزوں کی کھوج میں نکل جاتے۔ اور آخر کار یہی کھوج ان کی بے وقت موت کا سبب بن گئی۔'' اس نے ٹھہر ٹھہر کر بات مکمل کی اور پھر سے اسی جانب گھورنے لگا جہاں ربیعہ بچے اور لڑکی سمیت اوجھل ہوئی تھی۔ شاید اسے اس طرح اجنبیوں کا اپنے خاندان میں گھلنا ملنا پسند نہیں آیا تھا۔

اس کی نگاہیں بھانپ کر ارتضیٰ ربیعہ کو بلانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

ازبک نے کچھ سوچ کر جیب سے ایک کاغذ نکالا۔ امداد حسین کی باتوں سے ابھی تک وہ کسی خاص نتیجے تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ سوائے اس کے کہ ناصر حسین جانے انجانے میں کسی قیمتی چیز تک جا پہنچا تھا اور وہی راز اس کی موت کی وجہ بنا۔

''آپ اس کے متعلق کچھ جانتے ہیں؟'' اس نے کاغذ امداد حسین کے سامنے لہرایا۔

کاغذ دیکھ کر امداد حسین کا چونکنا ازبک نے واضح طور پر محسوس کیا تھا۔

وہ خاموشی سے یک ٹک اس کاغذ کو دیکھتا رہا۔ پھر دور کسی نادیدہ نقطے کو گھورنے لگا۔ جیسے خیالات کو ذہن میں مجتمع کر رہا ہو۔

''صاحب آپ جس زمین پر بیٹھے ہو۔ ادھر بہت صدیوں سے لوگ آباد ہیں۔ الگ الگ مذہب پر چلنے والے۔ ادھر پیچھے پہاڑوں میں۔'' اس نے ہاتھ سے اونچائی پر اشارہ کیا۔

''ادھر جوگی بستے ہیں۔ صدیوں سے اپنے دین پر ہیں۔ اپنے خدا ہیں ان کے۔ ان کے لیے قربانی کرتے ہیں۔ اور مارنے سے پہلے یہی نشان سے جانور کو داغتے ہیں خبیث! ظالم۔'' اس نے نفرت سے زمین پر تھوکا۔

ازبک سن سا بیٹھا رہا۔ یہ نقش اس نے ڈائری سے دیکھ کر نقل کیا تھا۔ اس کے لیے یقین کرنا مشکل تھا کہ اکیسویں صدی میں کوئی شخص انسانوں کی قربانی دے سکتا ہے۔

وہ اس بات پر یقین نہیں کر سکتا تھا۔ کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے سر جھٹک کر اس خوفناک خیال کو ذہن سے جھٹکا۔

ایک چھوٹا سا بچہ کہیں سے نمودار ہو کر کھلکھلاتا ہوا اب امداد حسین کے گھٹنوں پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ امداد حسین نے آواز لگائی اور اس کی بیوی کسی اندرونی کمرے سے نمودار ہوئی اور چیل کی طرح جھپٹ کر بچے کو اندر لے گئی۔ صاف ظاہر تھا امداد حسین اکلوتے بیٹے اور بیٹی کو بھی زیادہ سر چڑھانے کا قائل نہیں تھا۔

ربیعہ اور ارتضیٰ دور سے آتی نظر آئیں تو اس نے شکر ادا کیا کہ وہ گفتگو کے اس موقع پر موجود نہیں تھیں۔

شفاعت حسین بھی ہاتھ روکے سنجیدہ سا بیٹھا تھا۔ اس نے تمام گفتگو کے دوران ایک بار بھی دخل نہیں دیا تھا۔ وہ کسی طرح امداد حسین سے مرعوب سا محسوس ہوتا تھا۔

واپسی کا سفر پہلے کی طرح خوشگوار نہیں تھا۔ سب اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔

امداد حسین سے ملی معلومات نے ازبک کو کچھ اور الجھا دیا تھا۔

ربیعہ اور ارتضیٰ اپنی گفتگو میں مگن تھیں۔ ربیعہ جوش و خروش سے لڑکی سے ہونے والی گفتگو کا خلاصہ ارتضیٰ کے کانوں میں انڈیل رہی تھی۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

''صاحب جی! آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔ یہ آدمی جھوٹ بولتا ہے۔ صاحب جی اس کے اتنے پرانے دوست تھے اور آپ نے اس کا رویہ دیکھا تھا۔ کوئی یوں ملتا ہے مرحوم دوست کے بچوں سے؟ یہ پہلے بھی اِدھر گھر میں آتا تھا۔ مگر بی بی جی کو پسند نہیں تھا۔'' شفاعت کی امداد حسین کے لیے پوشیدہ ناپسندیدگی اب واضح ہو رہی تھی۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ اس دور میں بھی کیا کوئی ایسا قبیلہ موجود ہے!.. جو انسانی قربانی پر یقین رکھتا ہو۔'' ازبک کی آواز غیر ارادی طور پر بلند ہوئی تھی نتیجتاً دونوں لڑکیاں فوراً اس کی جانب متوجہ ہوگئیں۔

''کون کرتا ہے انسانی قربانی؟'' ارتضی نے پوچھا۔

''یہی امداد حسین کہہ رہا تھا اگر تمہاری ساتھی لڑکی فوراً واپس نہ آئی تو ہمارے قبیلے میں انسانی قربانی کا رواج ہے۔'' ازبک نے سنجیدگی سے جواب دیا تو ربیعہ کا منہ کھل گیا۔

''تمہارا مطلب ہے یہ آدم خور ہیں؟'' اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

جواباً ارتضی کا ایک زوردار دھموکا اسے پیٹھ پر سہنا پڑا۔

''تم سچ بتاؤ یہ ڈگریاں کتنے کُلچے بیچ کر حاصل کی ہیں؟'' اس نے ربیعہ کو گھورا۔

''اور تم!''

اس نے ازبک کی جانب دیکھا مگر وہ کہیں اور متوجہ تھا۔ ارتضی نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا۔ دور ایک چٹان پر کوئی موجود تھا۔ گہرے لباس میں ملبوس وہ انہی کو دیکھ رہا تھا۔ ازبک کو بس چند لمحے لگے تھے اس شخص کو اپنا متعاقب سمجھنے کا یقین حاصل کرنے میں۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ وہ سرپٹ ایک جانب دوڑ پڑا تھا۔ بقیہ تینوں کے پاس اس کے پیچھے جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

☆☆☆

وہ کافی دیر سے ایک ہی پوزیشن میں بیٹھا تھا۔ ان چاروں شہریوں کو گاؤں کی سمت گئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ گولی چلانے کے بعد وہ بس تھوڑی دیر کو چٹان سے نیچے اتر گیا تھا۔

مگر وہیں موجود رہا تھا۔ دوپہر کی تیز دھوپ میں ہُڈ والی جیکٹ پہنے وہ ضرور سب کی توجہ کا مرکز بن جاتا اگر وہاں کوئی موجود ہوتا۔

اس نے گھڑی دیکھی۔ تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ کوئی اور ہوتا تو اب تک ایک پوزیشن میں بیٹھے بیٹھے تھک چکا ہوتا۔ مگر وہ تاحال تازہ دم تھا۔ کسی شکاری درندے کی طرح وہ گھنٹوں ایک ہی پوزیشن میں بیٹھ سکتا تھا۔ اسے اس کام کی مشق تھی۔ نگاہ اسی جانب جمی تھی جہاں سے شہریوں کو واپس پلٹنا تھا۔

دور اونچی سی تنگ پگڈنڈی پر کچھ سیاہ دھبے نمودار ہوئے تو اس نے رائفل پر نصب دوربین کو آنکھ کے نزدیک لا کر دیکھا۔ وہی تھے۔ وہ جلدی سے کچھ پیچھے کو کھسک گیا۔ صبح گولی چلانے کے بعد اسے یقین تھا کہ یہ لوگ سرپٹ گھر کی جانب بھاگیں گے۔

مگر وہ اس کی توقع سے زیادہ باہمت ثابت ہوئے۔ یا شاید بے وقوف۔

ان کی حماقت بھری بہادری کا وہ پہلے سے ہی قائل تھا۔ اسے اس سے پہلے ماری جانے والی بوڑھی عورت کے تاثرات یاد آئے۔ اس کے ہاتھ میں سانپ کی پٹاری دیکھ کر عورت کے چہرے پر جو تاثرات ابھرے تھے، وہ اسے یاد رہ گئے تھے۔ وہ بہت حیران ہوئی تھی۔ اس نے پاس رکھی چھوٹی سی بوتل سے پانی کا گھونٹ لیا۔ ''اگر شوہر کے انتقال کے بعد گھر چھوڑ جاتی تو ماری نہ جاتی مگر یہ ضدی لوگ۔'' اس نے پھر سے دوربین سے دیکھا۔

اگلے حکم تک وہ ان پر نظر رکھنے کا پابند تھا۔

اس نے رائفل دوبارہ کندھے سے لٹکالی اور جیب میں ہوتی تھرتھراہٹ کی جانب متوجہ ہوا۔ فون پر کسی کی کال تھی۔

نمبر دیکھ کر اس نے فوراً کال ریسیو کی۔ نئے احکامات سنے اور خاموشی سے کال کاٹ دی۔ وہ عادتاً کم گو تھا اور اس کی یہ عادت اسے کام دینے والوں کی نظر میں فائدہ مند بناتی تھی۔

فون جیب میں رکھ کر اس نے ایک الوداعی نگاہ شہری مسافروں پر ڈالی۔ جب اسے ایک اور نقطہ اسی پگڈنڈی سے نیچے اترتا دکھائی دیا۔

''یہ کون ہے؟'' وہ بڑبڑایا اور دوربین دوبارہ آنکھ سے لگالی۔

بڑا سا لہراتا دوپٹا لمبی سی قمیص اور گھیر دار شلوار۔ یہ تو طے تھا وہ کوئی عورت ہے مگر گاؤں سے اس طرف نکلنے والی یہ کون ہو سکتی ہے۔ اس نے عورت کے نزدیک آنے کا انتظار کیا۔ اور چونک اٹھا۔

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

"امداد حسین کی بیٹی۔ اس وقت؟ شہریوں کے پیچھے؟" اس نے کچھ غور کیا۔ بات سمجھ میں آنے والی نہیں تھی۔ بہرحال یہ اس کا مسئلہ نہیں تھا۔ جو کام اسے دیا گیا، وہ پورا ہو چکا تھا مگر امداد حسین کی بیٹی کی جاسوسی میں وہ ایک بات نظرانداز کر گیا تھا۔ شہری مسافر اس کے بہت نزدیک پہنچ چکے تھے جب اس نے رائفل کی دوربین آنکھ سے ہٹائی۔ ان میں موجود نوجوان سر اونچا کیے چٹانوں کی جانب ہی متوجہ تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ پیچھے ہٹتا نوجوان پاگلوں کی طرح اس کی جانب دوڑ پڑا۔

وہ ایک پل کو گھبرا گیا تھا۔ اگر نوجوان سے اس کا سامنا ہوتا تو وہ اس شہری لڑکے پر بھاری پڑتا اور فی الوقت اسے ان سے بھڑنے کے احکامات نہیں ملے تھے۔ لہٰذا تصادم سے بچنے کا واحد راستہ وہی تھا جو اس نے اپنایا۔ یعنی فرار۔ وہ پھرتی سے ایک چٹان سے دوسری پر قلانچیں بھرتا پل بھر میں دور نکلتا چلا گیا۔ اس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا کہ ازبک اس کے پیچھے ہے یا نہیں۔

☆☆☆

وہ اونچے نیچے پتھروں پر مسلسل اس سیاہ لباس والے کے پیچھے تھا۔ تیزی سے دوڑتے ہوئے اس کی سانس پھول رہی تھی۔ جبکہ اگلا شخص اس سے بھاری جسامت کے باوجود تیز رفتاری سے نکلا جا رہا تھا۔ کوئی وقت جاتا تھا کہ وہ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا جب قدرت کو ازبک کی اس مشقت پر رحم آیا اور اچانک اس کے پیر کے نیچے سے پتھر پھسلے۔ وہ دھپ کی آواز سے نزدیکی چٹان سے ٹکرایا اور وہیں ڈھیر ہو گیا۔

ازبک ہانپتا ہوا اس کے نزدیک پہنچا۔
اس کی سانس دھونکنی کے مانند چل رہی تھی۔

"کون ہو تم؟" وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر گہرے سانس لیتے ہوئے بولا۔

"[illegible] بھاگے کیوں؟" وہ ابھی تک چٹان [illegible] پرخوف تھا۔

[illegible] بے تحاشا جھریاں تھیں مگر آواز مضبوط اور لہجہ صاف تھا۔ وہ پیروں تک سیاہ لبادے میں ملبوس تھا۔

"صاحب آپ میرے پیچھے بھاگے تو میں ڈر گیا۔ یہاں لوگ ہم سے نفرت کرتے ہیں۔ ڈرتے بھی ہیں۔ مجھے لگا تم کہیں مجھے نقصان نہ پہنچا دو۔" وہ رک رک کر بولا۔

"کیوں؟ کیوں ڈرتے ہیں؟" ربیعہ کی آواز ابھری۔ وہ بھی ہانپتی کانپتی وہاں آ پہنچی تھیں۔

سچی محبت

ایک لڑکا، لڑکی کو بہت چاہتا تھا اور اس سے محبت کر بیٹھا تھا۔ اس نے لڑکی کو پروپوز کیا لیکن لڑکی بولی۔ "تمہارے مہینے کی پاکٹ منی میرا روز کا خرچہ ہے۔" لیکن لڑکا پھر بھی اسے چاہتا رہا۔

دس سال بعد وہ لڑکا ایک شاپنگ مال میں تھا۔ اچانک اسے وہی لڑکی نظر آئی۔ لڑکی اسے بولی۔ "میرا شوہر ایک بڑی کمپنی میں جاب کرتا ہے۔ اس کی تنخواہ چالیس ہزار ہے۔ میں خوش ہوں۔ یہ سن کر لڑکے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کچھ دیر بعد اس لڑکی کا شوہر آیا۔ لڑکے کو دیکھ کر بولا۔

"سر! آپ یہاں؟" پھر اپنی بیوی سے کہا۔ "یہ میری کمپنی کے مالک ہیں اور ایک سال میں 15 کروڑ کا منافع ہوتا ہے۔ سر ایک لڑکی سے محبت کرتے تھے لیکن انہیں نہیں ملی۔ اس لیے اب تک شادی نہیں کی۔"

بھکر سے دانش نواز کا چٹکلا

"ہم... سپیرے جو ہیں۔" بوڑھا جھجکا۔ "اور بھی ایک بات ہے۔ مگر تم لوگ چونکہ شہر سے آئے ہو تو میں بتا دیتا ہوں۔ شہر والے اس بات کو اہمیت نہیں دیتے نا۔"

"آخر بات کیا ہے؟" ارتضیٰ جھنجلائی۔

"ہم مسلمان نہیں ہیں۔" بوڑھے نے پٹاری کھولی۔

"تو؟ کیا فرق پڑتا ہے۔ یہاں بہت سے لوگ غیر مسلم ہیں۔"

"یہ جادو ٹونا کرتے ہیں سر جی۔ وہی، وہی جس کے بارے میں امداد حسین نے بتایا تھا۔" شفاعت کی خوفزدہ آواز ابھری۔

اس نے کہا تو ازبک کے کان میں تھا مگر سر پر جٹاؤں جیسے بالوں والے بوڑھے نے بغور سنا تھا۔

"یہ جھوٹ ہے۔ ہم کوئی جادو نہیں کرتے۔ اپنے ہی بڑے بزرگ، علم والے لوگوں کے پیچھے چلتے ہیں، سانپ بچھو پکڑ کر اس کا زہر نکال کر دوا بناتے ہیں۔ اپنی محنت کی روزی کماتے ہیں۔" بوڑھا اس بے بنیاد الزام پر تڑپ اٹھا تھا۔

اس کی سانپ بچھو والی بات پر ازبک کا دھیان اس کی کمر سے لٹکی سانپوں کی پٹاری پر گیا۔ جسے ایک رسی کی مدد

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

سے کندھے سے لٹکایا گیا تھا۔

''تم نے بے سبب ہمیں اتنا بھگایا چاچا! ویسے ایک بات تو بتاؤ۔'' ازبک کو اچانک کچھ یاد آیا تھا۔

''تمہاری عمر کتنی ہے؟'' وہ ایک پتھر پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ اس کی دیکھا دیکھی باقیوں نے بھی نشست سنبھال لی۔

بوڑھا ان کا دوستانہ انداز دیکھ کر کافی سنبھل چکا تھا۔

''بابو! ہم دیہاتی عمر کا حساب نہیں رکھتے۔ مگر انگریز یہیں تھا جب میری شادی ہوئی تھی۔'' بوڑھا مسکرایا تو تمباکو کے نشانات سے بھرے دانت نظر آنے لگے۔

بوڑھے کی عمر سن کر ان کی آنکھیں پھیل گئیں اس لحاظ سے تو وہ بوڑھا تقریباً ناصر حسین سے بھی طویل العمر تھا۔

''چاچا! آپ نے ادھر اپنی بستی میں ایک سیلانی کو دیکھا؟ وہ بھی آپ ہی کی عمر کے تھے۔ اُدھر اس مکان میں رہتے تھے۔'' ازبک نے ہاتھ سے اپنی رہائش گاہ کی جانب اشارہ کیا۔

بوڑھے نے چونک کر ازبک کو دیکھا۔

''تم ناصر حسین کی بات کر رہے ہو؟ تم لوگ انہیں جانتے ہو؟''

اس کے سوال حیران کن تھے۔ امداد حسین کے بقول ناصر حسین کی موت اسی سپیرا بستی کے لوگوں کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ تاہم امداد حسین کے اس بیان کو انہوں نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی مگر بوڑھے کی باتوں سے لگتا تھا، وہ ناصر حسین سے واقف تھا۔

''چاچا! وہ ہمارے انکل تھے مگر پچھلے سال وہ اس دنیا سے گزر گئے۔'' ازبک نے بغور بوڑھے کی جانب دیکھتے ہوئے اسے مطلع کیا۔ وہ اس کے تاثرات سے اس کے بیان کی حقیقت کھوجنا چاہتا تھا۔

بوڑھے کے چہرے پر افسردگی چھا گئی۔

''میں جانتا ہوں۔ وہ مجھ سے ملنے آیا کرتا تھا۔ بہت اچھا انسان تھا۔ امیروں والی کوئی بُری عادت نہیں تھی اس میں..... انسان کو انسان سمجھتا تھا۔ ایسے ہی ہمارے ساتھ زمین پر بیٹھ جاتا تھا جیسے تم بیٹھے ہو۔'' بوڑھے نے مسکرا کر جھلملاتی آنکھوں سے ان لوگوں کو دیکھا۔ یہ کسی قاتل کی آنکھیں نہیں ہوسکتیں، ارتضیٰ نے اس کی جانب دیکھا۔

''وہ تمہارے پاس کیوں آتے تھے چچا؟ پتھر دکھانے؟''

''پتھر؟'' بوڑھے نے حیرت سے شفاعت کو دیکھا۔

''کون سے پتھر۔ وہ جڑی بوٹیوں اور سانپ بچھو کے بارے میں کچھ لکھتا تھا اپنے پاس۔ ادھر ہمارا کام بھی یہی ہے۔ اس زہر اور بوٹیوں کے ملاپ سے ہم دوائیں بناتے ہیں۔ وہ اس کو شہر میں دیتا تھا۔ نہ جانے کس کو۔ ایک دوا اسے بہت پسند آئی تھی۔ اتنی کہ ایک بار وہ ایک انگریز کو بھی لایا تھا میرے پاس، کیا نام تھا اچھا سا۔'' بوڑھے نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

''ہاں شمٹ۔ بین شمٹ۔ وہ بہت خوش ہوا تھا ہمارے غاروں میں بنے گھر دیکھ کر۔ بولا یہ صدیوں پرانے ریت رواج ہیں۔ ہم نے کہا ہاں یہ سچ ہے۔'' بوڑھے کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں اس ذکر سے۔ وہ یقیناً اپنے رسم رواج پر فخر کرتا تھا۔

''وہ ہم سے ..... کچھ خاص نسل کے بچھو کا زہر خریدنا چاہتا تھا۔ جو دوا ہم نے بنائی، اس میں بھی بچھو کا زہر تھا۔ شاید وہ اس کو بڑے پیمانے پر بنانا چاہتا تھا۔ ہم سے پوچھتا تھا کیسے بنائی۔ کس بچھو کا کتنا زہر اور کس بوٹی کا کتنا عرق۔ کون سی بوٹی کس جگہ سے اکھیڑی۔ یہ سب ہم کیسے بتاتے۔ پھر نہ جانے کیا ہوا جو وہ اچانک واپس چلا گیا۔ اور پھر ناصر حسین بھی روٹھ گیا۔'' بوڑھے نے ایک گہری سانس لی۔

''یہ نشان پہچانتے ہیں آپ؟'' ازبک نے بغور سنتے ہوئے جیب سے وہی کاغذ نکالا جس پر ناصر حسین کی لاش کی گردن ملنے والا نشان چھپا تھا۔

بوڑھے نے کاغذ ہاتھ میں لے کر غور سے دیکھا۔ پھر ازبک کو دیکھا۔ وہ چاروں دم سادھے بوڑھے کے جواب کے منتظر تھے۔

''تم لوگ جانتے ہو میرا ناصر حسین سے کیسے سامنا ہوا؟'' بوڑھا کچھ دیر کی خاموشی کے بعد لب کشا ہوا۔

''وہ گھر جس میں تم لوگ رہتے ہو، ہمارے پُرکھوں کی عبادت گاہ ہے۔ ہم اسے کبھی آباد نہیں کر سکے۔ تب ہم نے وہاں سے اپنے بزرگوں کی مورتیاں ہٹالیں۔ مگر میں کبھی اس بات کو قبول نہیں کر سکا کہ صدیوں سے ہمارا قبیلہ جس جگہ کا مالک تھا، وہ اب ہماری نہیں رہی۔'' وہ خاموش ہو کر کمر سے لٹکتی پٹاری کو چیک کرنے لگا۔ اس میں موجود سانپ بے چین ہونے لگا تھا۔

''یہ آج ہی پکڑا ہے۔'' اس نے پٹاری لہرائی۔

''یہ ابھی عادی نہیں پٹارے میں رہنے کا۔'' ازبک جلدی سے دور ہٹا۔ شفاعت بھی دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ آج پکڑا گیا مطلب اس میں سے زہر نہیں نکالا گیا تھا۔

''پھر کیا ہوا تھا چاچا؟'' ربیعہ نے موضوع بدلنے

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

ے ڈر سے جلدی سے لقمہ دیا۔

"میں اس گھر کی تعمیر کے درمیان وہاں گھس جاتا اور یکھتا کہ وہ لوگ وہاں کیا توڑ پھوڑ کر رہے ہیں۔ ایسے ہی ک دن مزدوروں کے جانے کے بعد میں وہاں پہنچا اور صر حسین نے مجھے پکڑ لیا۔" بوڑھا مسکرایا۔

"کیا کمال آدمی تھا وہ بھی۔ اس نے مجھے بٹھایا اور ائے پلائی۔ وہ بہت مہربانی سے پیش آیا۔ تب میں نے بھی سے ایک تحفہ دیا۔ اس عبادت گاہ کا ایک راز، جو اگر میں نہ تا تو وہ شاید ہی جان پاتا۔" بوڑھے کا انداز فخریہ تھا۔

"کیا راز ہے ایسا؟ میں سب راز جانتا ہوں۔ وائے بدروح کے اِدھر اور کوئی راز نہیں ہے۔" شفاعت کو کہاں گوارا تھا کوئی مکان کے متعلق اس سے زیادہ باخبری کا ظاہرہ کرے۔

"آہ بدروح۔" بوڑھے نے تمباکو تھوکا۔

"وہ بدروح تم خود ہو سکتے ہو لڑکے۔ وہ پاک جگہ ہے۔ جہاں صدیوں سے قربانی ہوتی رہی۔ آج بھی ہوتی گر ہمارا قبیلہ اتنا ہی بڑا ہوتا۔ مگر ہمیں فخر ہے ہم نے اپنے زرگوں کی روایات کو بھلایا نہیں۔"

"یہ نشان۔" بوڑھے نے ازبک کے ہاتھ میں تھامے کاغذ کی جانب اشارہ کیا۔

"یہ ہمارے مقدس نشان کی نقل ہے۔ بھونڈی نقل..... ہم قربانی سے پہلے جانوروں کو جس نشان سے داغتے ہیں، وہ اسی طرح نظر آتا ہے مگر یہ نہیں۔"

"ہم کیسے مان لیں تم سچ کہہ رہے ہو؟" شفاعت کی زبان کا قفل کھل چکا تھا۔

"مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟" بوڑھا غرایا ساتھ ہی ایک ہاتھ پوٹلی کی جانب بڑھایا تو شفاعت گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔

بوڑھے نے مگر محض ایک ہاتھ سے پوٹلی کو تھپتھپانے پر اکتفا کیا تھا۔ ارتضٰی نے مسکراہٹ چھپانے کو ایک ہاتھ منہ پر رکھ لیا۔ ربیعہ البتہ کھل کر مسکرائی۔

"یعنی رامائن پوری سن لی۔ مگر راون کون ہے معلوم نہ ہو سکا۔" ازبک نے سر کی پشت تھپتھپائی۔

بوڑھا خاموشی سے انہیں دیکھتا رہا۔

"آپ نہیں جانتے انکل کی موت کے متعلق کچھ؟"

"نہیں! تم لوگ اس کے کاغذات میں کھوج کرو۔ شاید کچھ مل جائے۔ وہ ہر وقت کچھ لکھتا رہتا تھا۔ جب اس انگریز کو ساتھ لایا۔ تب بھی اسے ہر وقت کاغذ دکھاتا رہتا تھا۔ مجھ [illegible] بچھو اور سانپ کا نام اور زہر کی مقدار اور جڑی بوٹیوں کی مقدار اور نام بھی پوچھتا تھا۔ بھلا اس میں کیا فائدہ ہے۔" بوڑھے نے جیب ٹٹول کر تمباکو کی تھیلی باہر نکالی... اور ناصر حسین کی بیوقوفی پر مسکرایا۔

"اف میرے خدا! کیا پہیلیاں ہیں۔ اتنا کچھ جان کر بھی ہم کچھ نہیں جانتے۔ ہر ایک ہزاروں باتیں کرتا ہے مگر کس کام کی۔ اور ہاں۔" وہ اچانک بولی۔ "وہ راز کیا تھا؟"

"وہ میں نہیں بتاؤں گا۔" بوڑھے نے تمباکو چباتے ہوئے اطمینان سے کہا۔ "تم لوگ خود بھی کچھ محنت کرو۔" اس نے پوٹلی احتیاط سے جیب میں رکھ لی۔

"اونہہ۔" ربیعہ نے غصے سے ہنکارا بھرا۔

"چاچا! اگر آپ سے دوبارہ ملنا ہو تو؟" ازبک نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

"تو یہیں بیٹھ جانا روز۔ دو دن، تین دن میں میرا یہاں سے گزر ہوتا ہے۔" بوڑھے نے فیاضی سے کہا تو ازبک کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر ارتضٰی کے منہ سے ہنسی کا فوارہ ابل پڑا۔

"چلیں؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ ہاتھ جھاڑتا اٹھ کھڑا ہوا۔

بوڑھے سے ملی معلومات امداد حسین کی باتوں سے بالکل متضاد تھیں۔ اب انہیں اس معمے کو بھی حل کرنا تھا۔ مگر اب ان کے پاس ایک نیا نام تھا بین شمٹ۔ یعنی کہانی کچھ نہ کچھ آگے بڑھی تھی۔ ناصر حسین نے نہ جانے کتنے معاملوں میں پیر اُلجھا رکھے تھے۔

دوپہر کا سورج سہ پہر کی جانب بڑھنے لگا تھا۔ ان کے قدموں میں تیزی آگئی۔ اب گھر جا کر انہیں ناصر حسین کے کاغذات کے علاوہ مکان کا چپّا چپّا کھنگالنا تھا۔ آخر وہ راز کیا تھا۔ اس بات سے بے خبر کہ مکان میں ایک سرپرائز ان کا منتظر ہے۔

☆☆☆

سب سے پہلے ارتضٰی نے اندر قدم رکھا تھا۔

اور تیزی سے اندر گھستی چلی گئی۔ مگر برآمدے میں ہی اسے رک جانا پڑا تھا۔ اسے دروازے پر یوں رکتے دیکھ کر وہ تیزی سے آگے بڑھے۔ اور اسی کے انداز میں ٹھٹک کر رک گئے۔

ہال میں موجود ڈائننگ چیئر پر بیٹھی وہ زور زور سے ہل رہی تھی۔ جیسے کسی تکلیف میں ہو۔ آگے پیچھے ہچکولے

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

لیتے ہوئے اس نے دانت مضبوطی سے بھینچ رکھے تھے۔ سب سے پہلے ربیعہ کو ہوش آیا۔

وہ تیزی سے آگے بڑھی۔ ''تم ٹھیک ہو امینہ؟'' اس نے کرسی پر زور زور سے ہچکولے کھاتی لڑکی کا کندھا تھام لیا۔ وہ لڑکی کوئی اور نہیں بلکہ امداد حسین کی بیٹی تھی۔

امینہ نے ربیعہ کو دیکھا مگر نگاہوں میں کوئی تاثر نہیں تھا۔ لڑکی کے ساتھ نہ جانے کیا واقعہ پیش آیا تھا جو یوں گم صم تھی۔

''تم ٹھیک ہو؟'' اب کے ارتضیٰ نے پوچھا۔

اچانک اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں اور پھر جیسے وہ پھٹ پڑی۔ نہ جانے کب سے وہ یہاں بیٹھی اپنی ذہنی کشمکش سے نبرد آزما تھی۔ اب راستہ ملا تو لاوا بہہ نکلا تھا۔

''اِدھر سے بھاگ جاؤ بی بی وہ آپ کو مار ڈالے گا۔'' وہ اب ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

''کون مار ڈالے گا؟ کس کی بات کر رہی ہو؟'' ربیعہ نے اُلجھن بھرے انداز میں اسے دیکھا۔

ازبک اور شفاعت خاموشی سے دور کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔ یہ صورت حال ان کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

''امداد حسین۔ وہ شخص شیطان ہے۔'' لڑکی چلائی۔

ربیعہ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ جبکہ شفاعت اثبات میں سر ہلانے لگا۔

''وہ تمہارا باپ ہے۔'' ارتضیٰ نے اسے ملامتی نگاہ سے دیکھا۔

''نہیں ہے، نہیں ہے۔ وہ میرا باپ نہیں ہے۔'' اس نے زور زور سے انکار میں سر ہلایا۔ اس پر ہذیانی کیفیت طاری تھی۔

اس کی ذہنی حالت اس سے کسی سوال جواب کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ ارتضیٰ نے شفاعت کو پانی لانے کا اشارہ کیا تو وہ خاموشی سے کچن میں چلا گیا۔

''کیا بات ہے۔'' ازبک نے بالوں میں انگلیاں پھنسائیں۔ سرپرائز پر سرپرائز۔ اسے کہتے ہیں سر منڈاتے ہی اولے پڑنا بلکہ تابڑ توڑ برسنا۔

لڑکی پانی پی کر اب کچھ پُرسکون تھی مگر بار بار دروازے کی جانب دیکھتی تھی۔

''صاحب! وہ میرا باپ نہیں ہے۔ میرا سوتیلا باپ ہے۔ بلکہ وہ تو باپ کہلانے کے لائق ہی نہیں۔''

لڑکی نے زمین کو گھورتے ہوئے بات مکمل کی۔ اس کے انداز میں عجیب سا تنفر تھا، اس کا لہجہ صاف نہیں تھا مگر اپنا مافی الضمیر سمجھا ہی لیتی تھی۔

''ٹھیک ہے وہ تمہارا باپ نہیں مگر تم اس سے خوفزدہ کیوں ہو۔ ہم سے زیادہ، وہ تمہارے لیے قابلِ اعتبار ہونا چاہیے۔'' ارتضیٰ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''آپ اُسے نہیں جانتے۔ وہ بھروسے کے قابل نہیں ہے۔ میں نے بہت سوچا ہے۔ آپ کو بتاؤں یا نہیں مگر اب برداشت کرنا مشکل ہے۔ ماں نے کہا میں آپ کو بتا دوں۔ اور آپ سے مدد مانگوں۔ ورنہ اب وہ مجھے کسی کے ہاتھ بیچ ڈالے گا۔'' لڑکی نے بے ربط انداز میں بات مکمل کی تو چاروں نے اُلجھن بھرے انداز میں ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہے؟'' ربیعہ نے ارتضیٰ کو دیکھا۔ جواباً اس نے کندھے اُچکا دیے۔

''دیکھو بی بی! تم کو جو بھی کہنا ہے، صاف صاف کہو۔ صاحب لوگ پہلے ہی پریشان ہیں۔'' شفاعت نے آگے بڑھ کر کچھ جھڑک کر کہا۔ تو ازبک نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔ لڑکی کو دھکا نا اسے مزید اپنے خول میں سمٹنے پر مجبور کر دیتا۔

وہ کرسی کھسکا کر اس کے نزدیک جا بیٹھا۔

''دیکھو! تمہیں جو بھی مسئلہ ہے، ہمیں کھل کر بتاؤ۔ وعدہ کرتے ہیں۔ جو کچھ ہو سکا تمہارے لیے ضرور کریں گے اور یہ بھی امید رکھو کہ ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔'' ازبک نے نرم لہجے میں اسے امید دلائی۔ اس کا لہجہ کسی کے دل میں بھی امید کی شمع روشن کر سکتا تھا۔ یہ تو ایک چھوٹے سے گاؤں کی سادہ سی لڑکی تھی۔ اس نے بے یقین نظریں اوپر اٹھائیں۔ تمام چہرے مہربان تھے۔ کسی نگاہ میں اس کے لیے بیزاری نہیں تھی۔

اس نے آنسوؤں سے تر چہرہ دوپٹے کے پلّو سے پونچھا اور ٹھہر ٹھہر کر اپنے اوپر ہوئے ظلم کی داستان سنانی شروع کر دی۔ اس کے ایک ایک لفظ کا زہر ان کی سماعتوں میں اتر کر، رگوں میں خون کی روانی سست کر رہا تھا۔

وہ محض تین سال کی تھی جب اس کے باپ کا انتقال ہوا۔ دس سال کی عمر میں اس کے نانا نے امداد حسین کو بطور داماد پسند کر لیا۔

اس کو ماں کے رخصت ہونے کا دکھ تو تھا مگر اصل مسئلہ تب شروع ہوا جب اس کے نانا کا انتقال ہوا۔

دس سال کی امینہ سوتیلے باپ کی بربریت کا تب سے شکار تھی اور غضب یہ تھا کہ اس معاملے میں تمام گاؤں اندھا

www.paksociety.com

بہرہ بن چکا تھا۔

اس بات کے تو وہ خود بھی عینی شاہد تھے۔ گاؤں کے باسی ایسے تھے جیسے زندہ لاشیں ہوں۔ شاید جب لوگ ظلم پر آواز اٹھانا چھوڑ دیں تو ان کے اندر سے مُردوں کی سی سڑاند اٹھنے لگتی ہے۔

ایک بن بیاہی لڑکی بچے کو جنم دیتی ہے اور تمام گاؤں ل کے بے حسی سے اس کا تماشا دیکھتا ہے۔

ہال کمرے میں موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ کسی جرم کا علم رکھنا اور اس جرم کے کسی متاثرہ فریق سے ملنا دو نگ کیفیات کو جنم دیتا ہے۔ اعصاب کو شل کر دیتا ہے۔

''مجھے یقین نہیں آتا۔ کوئی باپ ایسا کر سکتا ہے۔ تمہاری ماں نے اُسے مار کیوں نہ ڈالا؟'' ارتضٰی نے دانت پیسے اس کا بس چلتا تو امداد حسین کو اسی وقت جان سے مار ڈالتی۔

امینہ نے نظر اٹھا کر اس کو دیکھا۔ اور اس کی ایک نگاہ کی بے بسی میں ارتضٰی کے تمام سوالات کے جوابات تھے۔ ہاں صدیوں سے جاری مظالم کا نوحہ تھا۔ دارالحکومت سے کچھ دور ایک بستی میں اندھیر نگری کا چوپٹ راج تھا اور وہ حکمرانوں کی بیٹی تھی۔ جب وہ اس قدر بے خبر تھی تو اور کسی سے کیا شکوہ۔

ارتضٰی کے تمام اعتراضات وہیں دم توڑ گئے۔

''میں تو اس کے لیے مفت کا بوجھ تھی مگر وہ تو دوستوں کو بھی پیٹھ میں خنجر گھونپ سکتا ہے۔ جیسے آپ کے بڑے صاحب کے ساتھ کیا۔'' امینہ نے سر جھکائے جھکائے کہا۔ اسے نہیں معلوم تھا اس کی یہ خبر ان تینوں کے لیے کیسا دھماکے دار انکشاف ثابت ہوئی ہے۔ ازبک نے جھٹکے سے جھکا ہوا سر اٹھایا۔

اگر لڑکی واقعی سچی تھی تو ناصر حسین کا قاتل ان کی دسترس میں تھا۔ ہر مرحلہ حل ہونے کے قریب تھا شاید۔

''کیا انکل کی موت میں واقعی امداد حسین کا ہاتھ ہے؟'' ازبک نے پوچھا اس کے لہجے میں لرزش در آئی تھی۔

''صرف ہاتھ نہیں ہے۔'' لڑکی نے گھبرا کر دروازے کو دیکھا۔ جو ہوا سے ذرا سا ہلا تھا۔

''امداد حسین نے انہیں خود اپنے ہاتھوں سے مارا تھا۔'' مارا تھا بولتے ہوئے وہ جھجکی تھی۔ کسی کو یہ بتانا کہ اس کے عزیز کی موت کس طرح ہوئی، ایک دشوار عمل تھا۔

''وہ اُن سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ کچھ کاغذ اور دوا۔ نہیں معلوم کیا، مگر بڑے صاحب نے نہیں بتایا۔ وہ اُن کو خنجر سے زخم دیتے تھے۔ پھر پوچھتے تھے۔ مگر صاحب نے نہیں بتایا۔ اس سے پہلے ہی گزر گئے۔'' اب اس کی آنکھوں میں خوف تھا۔ اس نے شاید یہ سوچا کہ کہیں امداد حسین کے گناہوں کی سزا اسے نہ ملے۔ آخر وہ سوتیلی ہی سہی مگر اس کی بیٹی تھی۔

''تم نے خود دیکھا تھا؟ اس کو اس طرح کرتے۔'' ارتضٰی نے پوچھا۔ اس کا چہرہ غصے اور درد و غم کے ملے جلے تاثرات کی آماجگاہ بن گیا تھا۔

''ہاں جی۔ خود دیکھا تھا۔ وہ کسی سے ڈرتا نہیں ہے۔ یہاں سب اس کے رشتے دار ہیں۔ باقی دوست۔ وہ مجھے بھی لے جائے گا۔ مجھے کہیں چھپا لیجیے۔'' وہ پھر گڑگڑائی۔

''یہ سچ کہتی ہے اس سے بقیہ سوال جواب بعد میں کیے جا سکتے ہیں۔ پہلے اسے کہیں چھپانا ہوگا۔'' ربیعہ نے کہا۔

''اگر وہ یہاں آ گئے تو؟'' شفاعت نے پوچھا۔

''ہم اس کے وجود سے ہی انکار کر دیں گے۔ اگر وہ یہاں آئے۔ یہ انکل کی موت کی گواہ ہے۔ اسے جانے نہیں دے سکتے۔''

ارتضٰی وہیں کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ پے در پے انکشافات سے اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ وہ وہیں کرسی پر بیٹھ گئی۔ ربیعہ نے ایک نظر اس کا اُترا ہوا چہرہ دیکھا اور ہمدردی سے اسے دیکھتی باہر نکل گئی۔ وہ ارتضٰی کی اپنی پھپھی اور چچا سے اٹیچ منٹ سے واقف تھی۔ صدمہ اسے بھی تھا مگر وہ چیزوں کو زیادہ دیر سوچتے رہنے کی قائل نہیں تھی۔

ارتضٰی کچھ دیر یونہی کرسی پر بیٹھی پیر ہلاتی رہی پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ازبک اور شفاعت لڑکی کے متعلق کسی بحث میں اُلجھے ہوئے تھے۔

ارتضٰی انہیں غائب دماغی کے عالم میں دیکھ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں کچھ اور ہی کھچڑی پک رہی تھی۔ اسے بوڑھے سپیرے کی بات یاد آئی، جو اس نے مکان کے متعلق کہی تھی۔ پھر بین شمٹ نامی شخص کا خیال آیا۔ اور ذہن میں کچھ کلک سا ہوا۔ وہ شخص غیر ملکی تھا اور پاکستان میں غائب ہو گیا تو یقیناً اس کی پاکستان آمد کے متعلق کچھ معلومات ضرور مل جاتیں۔

وہ بے خیالی میں برآمدے میں رکھی کرسی کو تک رہی تھی جب اسے کرسی ہلتی نظر آئی۔

سورج غروب ہو رہا تھا اور برآمدے میں اندھیرا چھا رہا تھا۔ شفاعت نے روشنی نہیں کی تھی۔

وہ ہنوز مباحثے میں مگن تھا۔ اس کے خیال میں لڑکی پر

Waqar Azeem www.pakistanipoint.com

اندھا بھروسا کرنا غلط تھا۔ ہوسکتا ہے وہ وہاں سے کچھ غلط کر کے فرار ہوئی ہو۔ اس موقع پر وہ امداد حسین سے نفرت کو پسِ پشت رکھے اس کی حمایت پر کمر بستہ تھا۔ از بک پُرسکون رہتے ہوئے اس کے اعتراضات کے جوابات دے رہا تھا۔ تاکہ وہ لڑکی کی رہائش کا مناسب بندوبست کرے اور اس سے بے وجہ کی عداوت نہ پالے۔

ارتضیٰ نے باہر نکل کر دیکھا ابھی یہاں سے ربیعہ گزری تھی۔ شاید وہ برآمدے میں موجود ہوتی مگر برآمدہ خالی تھا۔ اس نے نظر گھمائی اور ایک گہری سانس لی۔ وہ ایک چھوٹی سی کُتیا تھی۔ جو کرسی کے اردگرد منڈلا رہی تھی۔ شاید شمشاد کی پالتو تھی جو اس کے بعد بھی اس کی کرسی کے گرد منڈلاتی رہتی تھی۔ اس نے جانور کو باہر ہشکار کر دروازہ بند کیا اور کرسی پر آبیٹھی۔ انٹرنیٹ پر بین شمٹ کا نام لکھنے سے مختلف صفحات کھل گئے۔ وہ ایک بڑے ادارے کا عہدیدار تھا۔ مختلف کمپنیوں کا مالک اور شیئر ہولڈر، یہ خاندان جرمنی کے دولت مند ترین افراد میں شمار ہوتا تھا۔ زیادہ جدوجہد کے بنا فوراً ہی مطلوبہ خبر اسے نظر آگئی۔

جرمن سرمایہ کار ڈاکٹر بین شمٹ کی آمد اور پُراسرار غیاب۔

خبر کے مطابق ڈاکٹر بین شمٹ مختلف بیماریوں کے لیے ادویات اور ویکسین بنانے کے ادارے سے وابستہ تھے۔ ان کی تحقیق کے مطابق اس خطے میں کچھ ایسے جانور پائے جاتے تھے جن کے زہر سے کینسر کا علاج ممکن تھا۔ ان کے ادارے نے جو آخری اطلاعات جاری کی تھیں، وہ ڈاکٹر شمٹ کی کینسر کے علاج میں معجزانہ پیش رفت کے متعلق تھیں۔ ان کے مطابق کچھ مقامی لوگوں سے رابطے کے بعد ادارہ اس قابل ہو جاتا کہ اس دوا کو بڑے پیمانے پر کینسر کے مریضوں کے لیے استعمال کیا جاتا۔ مگر پھر کچھ سالوں پہلے اچانک ڈاکٹر کی جانب سے رابطے کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ دوا بنانے کی کوشش اس کے بعد بھی جاری رہی۔ مگر ڈاکٹر کے پاس کچھ ایسی معلومات تھیں جن کے بنا وہ تاحال کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ افواہوں کے مطابق مخالف دواساز کمپنیاں اس کے غیاب میں ملوث ہو سکتی تھیں۔ سالوں کی تلاش بسیار کے باوجود تاحال ڈاکٹر کی کوئی خبر نہ مل سکی تھی۔

وہ پڑھتی گئی مگر مزید کچھ نہ مل سکا۔

اس نے فون رکھ دیا۔ دماغ میں سوچ بچار کے نئے در وا ہو گئے تھے۔ کہانی کے مختلف ٹکڑے ایک ایک کر کے جڑنے لگے تھے۔ مگر ابھی بھی کچھ غائب تھا۔ پزل کے ٹکڑے نامکمل تھے۔

ایک جرمن ناصر حسین سے ملتا ہے۔ دونوں کی دلچسپیوں میں زہریلے جاندار ایک مشترک شے تھے۔ جبکہ بین بھی دواؤں کے لیے اسی کی تلاش میں تھا۔ یہاں دونوں کا مقصد ایک تھا تو اُلجھن کہاں تھی؟ اور ناصر حسین سے کیا پوچھا جا رہا تھا۔ جس کے لیے امداد حسین کو انہیں بہیمانہ طریقے سے تشدد کا نشانہ بنانا پڑا۔ اس سب میں امداد حسین کا پُراسرار کردار بھی ایک سوالیہ نشان تھا اور اب یہ لڑکی ایک نئی کہانی کے ساتھ حاضر تھی۔

اس نے سر تھام لیا۔

”جو بھی ہوا اب پولیس ہی سب دیکھے گی۔“ اس نے پیر سمیٹے تاکہ کمرے میں جا کر اپنی تازہ کارکردگی سے بقیہ کو آگاہ کیا جاسکے۔ اسی وقت اسے دیوار پر تحریک کا احساس ہوا۔

طویل برآمدے کو چھت میں لگے لیمپ کے علاوہ تھوڑے فاصلے سے لگائے گئے برقی آرائشی لیمپ کی بھی روشنی میسر تھی مگر گھر کے باہر شام سے چھائے بادلوں کی تاریکی میں ستارے تک معدوم تھے۔

اس نے آنکھیں چندھیا کر بغور دیکھنے کی کوشش کی مگر زیادہ دیر کی مشقت سے بچ گئی۔ دیوار پر حرکت کرتا وجود کسی بڑے سے بلّے کی طرح صحن میں آکودا تھا۔ ارتضیٰ کی آنکھیں خوف سے پوری طرح کھل گئیں۔ اس ہُڈ میں چھپے چہرے کو وہ کیسے بھول سکتی تھی۔ معمول سے کچھ زیادہ دراز قد شخص کے جسم پر خاکستری جیکٹ چھوٹی محسوس ہوتی تھی۔ مگر اسے شاید اس بات کی پروا نہیں تھی۔ ہُڈ کو وہ چہرہ پوشیدہ رکھنے کے لیے استعمال کرتا تھا اور اس میں پوری طرح کامیاب تھا۔

ارتضیٰ نے منہ پر ہاتھ رکھ کر چیخ کو بمشکل روکا تھا۔ اس کے باوجود اس کی آواز معمول سے بلند تھی۔

”کون ہو تم؟“

ہُڈ بردار جواب دینے کے بجائے... دروازے کی جانب پلٹا اور کنڈی کھول دی۔ فوراً ہی دو مزید ہتھیار بدست اندر داخل ہوئے۔ جن میں جٹاؤں جیسے بالوں والے امداد حسین کو وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ دوسرا اس کا کوئی پستہ قد گٹھے ہوئے جسم کا حواری ہوسکتا تھا۔ جو بلّی کی طرح چمکتی آنکھوں سے پورے گھر میں نظر گھما رہا تھا۔

”کیا چاہتے ہو تم لوگ؟“ ارتضیٰ نے اپنا سوال

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

ملک بھر میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ملنے میں اگر دشواری ہے تو مندرجہ ذیل نمبرز پر ہمارے نمائندوں سے رابطہ کیجیے۔

کراچی	03002680248	گجرات	03016215229	منڈی بہاؤالدین	03460827027
لاہور	03004009578	وزیرآباد	03456892591	سیالکوٹ	0524568440
ملتان	03006301461	لالہ موسیٰ	03216203640	میرپور AK	03460397119
حیدرآباد	03213060477	خان پور	03337472654	اٹک سٹی	057210003
سرگودھا	03447475344	کوہاٹ	03325465062	دیپالپور	03004059957
پشاور	03005930230	ساہیوال	03446804050	لیہ	03002373988
کوئٹہ	03337805247	پاک پتن	0300694678	قصبہ ڈنگہ	03083360600
فیصل آباد	03006698022	مظفرآباد	03469616224	عارف والا	03008758799
راولپنڈی	03335205014	بورے والہ	03347193958	لورالائی	03023844266
نواب شاہ	03003223414	وہاڑی	03136844650	کوٹلہ ارب علی خان	03016299433
سکھر	03009313528	تونسہ شریف	03346712400	جلالپور پیروالا	03338303131
رحیم یارخان	03009672096	ڈیرہ غازی خان	03336481953	ہری پور	03321905703
بہاولپور	0622730455	بہاولنگر	03336320766	چکوال	03348761952
گوجرانوالہ	03316667828	بنوں شہر	03329776400	وہوا	03346383400
جہلم	03235777931	رائے ونڈ	03004719056	حافظ آباد	03006885976
سیالکوٹ	03008711949	ہڑپہ	03317400678	کوہاٹ	03325465062
جھنگ	0477626420	ڈیرہ اسماعیل خان	03349738040	ایبٹ آباد	0992335847
بھکر	03337979701	چشتیاں	03348761952	پتوکی	03454678832
منڈی بہاؤالدین	0331-7619788	منچن آباد	0301-7681279	مانسہرہ	0333-5021421
ڈسکہ	0300-9463975	سمبڑیال	0333-8604306	کوٹ رادھا کشن	03004992290
		حجرہ شاہ مقیم	03006969881		

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی فون: 35895313

E-mail:jdpgroup@hotmail.com

دوسرے طریقے سے دہرایا۔ اب کے مخاطب امداد حسین تھا۔

اس کی نگاہوں کا مرکز ازبک اور شفاعت تھے۔ جو ارتضیٰ کی چیخ سن کر اس کے پیچھے آ کھڑے ہوئے تھے۔ اسے معلوم تھا یہاں اگر کوئی مشکل پیدا کرسکتا ہے تو وہ یہی دو ہیں۔

وہ چند قدم آگے بڑھا۔ ارتضیٰ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے ہونٹ مسکرانے کے انداز میں بھنچ گئے۔

امداد حسین کو دیکھ کر امینہ نے دروازے کے پیچھے چھپنے کی کوشش کی تھی مگر اس کی تیز نگاہیں اسے کھوج چکی تھیں۔ اس کے سخت گیر چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ارتضیٰ کو وہ مسکراہٹ کسی بھیڑیے سے مشابہ محسوس ہوئی تھی۔

''بہت تیزی دکھائی یہاں پہنچنے میں۔ کیوں؟ کیا لگتے ہیں یہ تمہارے؟'' اس کے لہجے میں تپش تھی۔

''یہ تو کچھ نہیں لگتے۔ جو لگتے ہیں اُن کی وجہ سے آج یہاں ہوں۔'' امینہ نے نفرت سے ہونٹ کیڑے۔

''بہتر ہوتا تجھے اپنے گھر میں پالنے کے بجائے اسی وقت کسی کے ہاتھ بیچ دیتا۔ تو آج یوں دشمنوں کے ساتھ کھڑی ہو کر آنکھیں نہ دکھا رہی ہوتی۔'' وہ غرایا۔ نفرت سے اس کا گندمی چہرہ تاریک ہو رہا تھا۔

''ہاں تم ایسا ضرور کرتے۔ مگر میری صورت میں تو تمہیں مالِ مفت مل رہا تھا۔ کیسے جانے دیتے۔'' وہ نہ جانے کب سے دل میں نفرت کا لاوا لیے بیٹھی تھی۔ جو آج کمزور سے سہارے کو سامنے پا کر بندھ توڑ کر باہر نکل آیا تھا۔ ارتضیٰ نے ازبک کو دیکھا۔ وہ بھی خاموشی سے امداد حسین اور امینہ کی بات چیت سن رہا تھا۔ جو ہرگز کوئی معمول کی گفتگو نہیں تھی۔ وہ کھلے لفظوں میں اپنے سوتیلے باپ پر جو الزام لگا رہی تھی۔ اس کے بعد اس شخص سے ان کی نفرت میں شدید اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ شخص اپنی ہی سوتیلی بیٹی کا جنسی استحصال کرتا رہا تھا۔

امداد حسین کا ظرف یہیں تک بس ہوا۔ اس نے گن سیدھی کر لی اور غصے میں آگے بڑھا۔ تاکہ اسی وقت اس ناخلف لڑکی کا کام تمام کر دیا جائے۔ مگر شفاعت حسین چوکنا تھا۔ اس نے فوراً لڑکی کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ اب ضروری تھا کہ اس گفتگو کو یہیں روک دیا جاتا۔

''امداد حسین! یہ تم لوگوں کا ذاتی مسئلہ ہے مگر جو یہ لڑکی بتا رہی ہے۔ اس کے بعد یہ تو ناممکن ہے کہ تم اسے آرام سے یہاں سے لے جاؤ گے۔ اس کے الزامات سنگین ہیں۔ اور میں اس بات کو یقینی بناؤں گا کہ تم ہلکے میں چھوٹنے نہ پاؤ۔'' ازبک نے نرم مگر حتمی لہجے میں کہا تھا۔ اور سرد و گرم چشیدہ امداد حسین کو اس کے لہجے میں موجود سکون کی تہ میں آتش فشانی تپش محسوس ہوئی تھی۔ وہ آنکھیں چندھیائے بغور اس کی بات سنتا رہا۔ اور پھر ایک نظر امینہ کو دیکھا۔ شاید تول رہا تھا کہ اس لڑکی کے لیے اپنی مکمل زندگی داؤ پر لگائی جاسکتی ہے یا نہیں۔ اور پھر زندگی کا پلڑا بھاری نکلا۔ زندگی رہتی تو امینائیں بہت۔

''میری طرف سے جہنم میں جائے۔ یہ اور اس کی ماں مگر میں اس کو اپنا بیٹا نہیں دوں گا۔ اسے یہ بھول جائے۔ اگر اس کے لیے وہاں آئی تو اس کی ٹانگیں چیر دوں گا۔'' اس کے لہجے میں اس جواری کی سی کھسیاہٹ تھی جو اپنے حواریوں کے سامنے ایک بڑا داؤ ہار گیا ہو۔

اس نے بات مکمل کی اور ارتضیٰ کو لگا اسے وہیں الٹی آجائے گی۔ اس نے اپنی طویل زندگی میں اس جیسا شخص نہیں دیکھا تھا جو اتنے دھڑلے سے اپنی سیاہ کاریوں کا نہ صرف اعتراف بلکہ دفاع بھی کر رہا ہو۔ اس نے امداد حسین کے چہرے سے نگاہ ہٹالی۔ تاکہ چہرے پر موجود نفرت راز نہ کھول دے۔

''تو پھر ٹھیک ہے۔ اب تم لوگ یہاں سے جاسکتے ہو۔ اور دوبارہ اس طرف کا رخ نہ کرنا۔'' ازبک نے سنجیدگی سے کہا تو ایک بے اختیار قہقہہ امداد حسین کے حلق سے آزاد ہوا۔ اس کا ساتھی کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی محض اس کا ساتھ دینے کو ہنسنے لگا تھا۔

''کیا بات ہے صاحب! یا تم بیوقوف ہو یا ہمیں سمجھتے ہو۔ یہ لڑکی اتنی دیر سے جو راگ الاپ رہی ہے، تو کیا ہم یہ سمجھیں کہ اس نے تمہیں ناصر حسین اور اس کی بڑھیا کی موت کے متعلق کچھ نہیں بتایا ہوگا؟'' امداد حسین کے انداز میں تمسخر تھا۔ ازبک نے دانت بھینچ لیے۔ وہ ان کی توقع سے زیادہ چالاک تھا۔ اس نے دانستہ اس وقت ناصر حسین کی موت کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ وہ اس شخص پر مضبوط ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا۔ اس نے لفظ بڑھیا پر شاید دھیان ہی نہیں دیا تھا، مگر ارتضیٰ نے سب سنا تھا اور بمشکل اپنے آنسوؤں کو روکا تھا۔ اس شخص کے جرائم کی فہرست طویل ہوتی جا رہی تھی۔

''دیکھو صاحب! ہم ہیں کرائے کے لوگ۔ یہ کام ہے کسی اور کا۔ کسی ایسے کا، جس کا بھائی اس گھر کے مالک کے ساتھ تھا اور غائب ہو گیا۔ کیسے؟ کہاں؟ کوئی نہیں

www.paksitanipoint.com

جانتا ۔ اب اسے بھائی بھی چاہیے اور وہ نسخہ بھی جس کے لیے وہ اِدھر آیا تھا۔'' اس نے گن کو اب لاٹھی کی طرح زمین پر رکھ کر اس سے ٹیک لگا لی۔ جیسے یقین ہو کہ سامنے کھڑے شیر مزاحمت کا یارا نہیں رکھتے۔

''ناصر حسین نے اس سے رقم ہڑپ لی اور اس کو وہ نسخہ نہیں دیا جس کا ان کے بیچ سودا طے ہو گیا تھا۔ اسے وہ سرکار کو دینا تھا تاکہ سستی دوا سب کو ملے۔ سوچو ذرا! کروڑوں کا نسخہ مفت میں بانٹیں گے۔ ہے نا بے عقلی۔ بس ادھر ہی دونوں کا اختلاف ہوا۔ اور بین شمٹ صاحب کہیں غائب ہو گیا۔

''ادھر جرمنی میں پال شمٹ صاحب کو لگتا ہے تمہارا انکل اس کو غائب کرنے میں ملوث ہے۔ بس اسی وجہ سے مجھے انہیں مارنا پڑا۔ یہ جرمن بڑے اوکھے لوگ ہیں۔ ورنہ میرا کیا ذاتی مسئلہ۔ رہتے دونوں میاں بیوی سکون سے۔ بس امانت حق دار کے حوالے کر کے۔'' اس نے تمسخرانہ انداز میں صفائی دی۔ اس کے لہجے میں کوئی افسوس نہیں تھا۔ درحقیقت وہ ان کے زخم کُرید رہا تھا۔

مقصد ازبک کو چڑانا تھا۔ وہ خاموشی سے دانت بھینچے اس کی بکواس سن رہے تھے۔

''اب وہ مرتے مرتے مر گیا مگر نسخہ نہیں دیا۔ ایک بیماری کا علاج قبر میں لے گیا۔ کیسا آدمی تھا؟ تمہارا تایا۔'' اس نے مصنوعی افسوس سے ازبک کو دیکھا۔

''میں یہ ماننے کو تیار نہیں کہ انکل نے اس سے پیسے لیے ہوں گے۔ انہیں رقم کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ یہ بات تم جانتے ہو۔ یہ تمہارے ہاتھوں کے تنگینے اس بات کے گواہ ہیں۔ ہاں باقی بات ٹھیک ہو سکتی ہے۔'' ارتضیٰ بول اٹھی۔

''چلو ایسا ہی سہی۔ اب تم ہم کو وہ نسخہ دے دو۔ میں چلا جاتا ہوں۔'' اس نے اطمینان سے کہا تو تینوں نے اُلجھن بھری نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

''ہمارے پاس کوئی نسخہ نہیں ہے۔''

''دیکھ لو صاحب! نہیں ہے تو ڈھونڈو۔ اپنے انکل کے کاغذات میں ڈھونڈو۔ تمہاری آنٹی نے موقع دیا ہوتا تو ہم ڈھونڈ لیتے۔ مجھے کوئی جلدی نہیں۔ ہم اِدھر بیٹھ جاتے ہیں۔'' اس کا سنجیدہ چہرہ اختتام پر پھر مزاحیہ رنگ اختیار کر گیا۔ وہ اس صورت حال سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

''انکل کی ٹیبل پر کوئی کاغذات نہیں تھے۔'' ارتضیٰ نے ازبک کو مخاطب کیا۔

''مجھے لگتا ہے، میں جانتا ہوں جی! صاحب کے کاغذات کہاں ہیں۔'' شفاعت کے جھجک کر بولنے پر سب اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔

ازبک کی آنکھوں میں اجازت پا کر وہ تیزی سے ایک جانب دوڑ گیا۔ امداد حسین کا ساتھی اس کے پیچھے لپکا مگر وہ فوراً ہی واپس آ گیا تھا۔ ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے۔

ارتضیٰ کو ربیعہ کا خیال آیا۔ وہ کافی دیر سے غائب تھی۔ شاید انہیں دیکھ کر کہیں چھپ چکی ہے۔ اس نے سوچا۔ اس کا ان سے پوشیدہ رہنا ایک لحاظ سے بہتر ہی تھا۔

شفاعت نے کاغذات کا پلندا ازبک کے ہاتھ میں تھمایا تو اس نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

''یہ کاغذات کے لیے اتنا بکھیڑا؟''

''ہاں جی یہی ہیں۔'' شفاعت کے لہجے میں کھسیاہٹ تھی۔

''میں نے ردّی سمجھ کر انہیں ٹین کے خالی ڈبوں میں رکھ دیا تھا۔

ازبک نے خاموشی سے پلندے کو دیکھا تھا۔ کچھ کہنے سے گریز کرتے ہوئے اسے امداد حسین کی جانب بڑھا دیا۔

امداد حسین نے پلندا اس کے ہاتھ سے لیا اور اسے کھولا۔

اس کے چہرے کا رنگ وہ پلندا دیکھ کر بدل گیا تھا۔

''کیا تم مذاق کر رہے ہو؟ یہ ہیں وہ کاغذات۔ ہم تمہیں بیوقوف نظر آتے ہیں؟'' وہ ایک دم بھڑک اٹھا تھا۔

''اپنے تایا کی موت کے بعد تو تمہیں کچھ گڑبڑ کا خیال بھی نہیں آنا چاہیے تھا۔ مگر تم کتے کی دم۔'' اس کے چہرے کے گمبھیر تاثرات میں سفاکی کی آمیزش سے وہ کسی خونخوار درندے سے مشابہ محسوس ہونے لگا تھا۔

امداد کے الفاظ تے ہڈبردار کو جیسے مہمیز کر دیا۔ اس نے اچانک گن ازبک کی جانب تان لی۔ اینہ کی ہلکی سی چیخ بلند ہوئی۔ شفاعت بے چین ہو کر آگے بڑھا۔ ماحول میں یک دم سناٹا طاری ہو گیا تھا۔

امداد حسین کچھ دیر نفرت انگیز نگاہوں سے انہیں گھورتا رہا۔ پھر ہاتھ سے کچھ اشارہ کیا۔ اس کے سخت ہاتھوں میں پھنسی انگوٹھیاں جگمگائیں اور فوراً ہی دونوں بدمعاش حرکت میں آ گئے۔ وہ یہ کسی طرح ماننے کو تیار نہیں تھا کہ ناصر حسین نے اپنے بچوں کو اتنے اہم راز سے بے خبر رکھا ہوگا۔ ان کے ارادے خطرناک تھے۔

جیکٹ پوش کی جیب میں نائلون کی رسیاں موجود تھیں

Babar Azeem www.pakistanipoint.com

یعنی وہ پہلے ہی ممکنہ ناکامی کا سوچ کر آئے تھے۔ یا پھر معلومات کے حصول کے بعد انہیں مارنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ جو بھی تھا، وہ فی الحال ان کے رحم و کرم پر تھے۔ اس دور دراز اجنبی جگہ پر کون تھا جو اُن کی مدد کو آتا۔

انہوں نے جیکٹ کی جیب میں ٹھونسی گئی رسیاں برآمد کیں اور ان کی جانب بڑھے۔

وہ چاروں حیران تھے۔ جن لوگوں کو وہ معمولی بدمعاش سمجھتے رہے تھے آج انہی کے ہاتھوں مارے جانے والے تھے۔ ازبک اور شفاعت نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی مگر نہتے ہاتھوں سے ہتھیار بدستوں کا مقابلہ ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ ازبک کو جکڑنے کے لیے امداد حسین کافی تھا۔ وہ اپنی گردن اس کے شکنجے میں دیے بے بسی سے شفاعت کو ان کے قابو میں آتے دیکھتا رہا۔

جیکٹ والا بدمعاش اس وقت شفاعت کو زخمی کر کے باندھنے کے بعد ازبک سے نبرد آزما تھا۔ جب دروازہ ایک زوردار آواز سے کھلا تھا۔

☆☆☆

رات ایک پُرہنگامہ مصروفیت میں گزارنے کے بعد وہ صبح کسی وقت فارغ ہو سکے تھے۔ شفاعت سر پر پٹی باندھے، دردکش گولیاں لیے زوردار خراٹے لے رہا تھا۔ اسے پستہ قد بدمعاش نے سر پر بندوق کا بٹ مار کر زخمی کیا تھا۔

دروازہ تقریباً توڑ کر اندر آنے والی پولیس تھی جسے چھت پر سگنلز کی تلاش میں بھٹکتی ربیعہ نے اسی وقت کال کی تھی۔ جب امداد اینڈ کمپنی اندر داخل ہوئی تھی۔

مگر انہیں پہنچتے پہنچتے اتنا وقت لگ گیا کہ کچھ اور دیر ہو جاتی تو ان کی میتیں سمیٹنی پڑتیں۔

اس پر بھی وہ ایس ایچ او مُصر تھا کہ اس کے جلدی پہنچ جانے پر یقیناً اس کی ترقی پکی ہے۔ آخر اس نے بڑے بڑے عہدیداروں کے بچے یقینی موت کا شکار ہونے سے بچائے تھے۔ اس کے علاوہ ایک سابقہ آفیسر اور اس کی بیوی کے قتل میں ملوث بدمعاشوں کا ٹولا بھی گرفتار کیا تھا۔

جاتے جاتے وہ وضاحت سے جتا گیا کہ اگر ربیعہ اپنے والد کے عہدے کا حوالہ نہ دیتی تو شاید وہ اس قدر جلدی نہ پہنچ پاتے۔

اور اس کی جلدی پر شفاعت نے اسے وضاحت سے سمجھایا کہ اگر ان بڑے بڑے عہدیداروں کو یہ معلوم ہو گیا کہ ان کے بچے مرنے کے قریب تھے جب پولیس وہاں پہنچی تو اس کی نوکری بھی جا سکتی ہے۔ اس بات پر وہ شفاعت کو کچھ ناقابلِ اشاعت الفاظ بڑبڑاتا ہوا مجرموں کو گاڑی میں بھر کر لے گیا۔

اور اب وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھے خشک میوہ ٹونگ رہے تھے۔ ربیعہ چائے بنا لائی تھی۔ اور اب کپ ہاتھ میں لیے اسے گھور رہی تھی۔ امینہ البتہ کافی خوش تھی۔ اس نے تو صرف آزادی چاہی تھی۔ امداد حسین کی گرفتاری نے اس کے جلتے دل پر پھوار ڈالی تھی۔ ان تینوں کے بیانات لینے کے بعد مشکل تھا کہ امداد حسین زندگی میں جیل سے باہر آپاتا۔

ارتضیٰ خاموشی سے گھٹنوں پر ہاتھ باندھے سوچ میں گم تھی۔

”ربیعہ کو لگتا ہے صدمہ لگ گیا ہے۔“ ازبک نے خوبانی اٹھاتے ہوئے ربیعہ کو چھیڑا۔

وہ کافی دیر سے خاموش تھی۔ چونکی پھر بات سمجھ کر مسکرانے لگی۔

”میں سوچ رہی ہوں انسان جب یہ سوچتا ہے کہ وہ اب دنیا کو سمجھنے لگا ہے۔ تب ہی دنیا اسے چونکا دیتی ہے۔ ہم جن لوگوں کے ساتھ ہمیشہ رہتے ہیں انہیں بھی نہیں جانتے۔“

اس نے دور آسمان پر اُڑتے پرندوں کو دیکھا۔

شفاعت اس کی بات سن کر ہنسنے لگا۔

ربیعہ نے ناگواری سے اسے گھورا۔

”تم کیوں ہنسنے لگے؟“

”بی بی جی! جو نظر آتا ہے، اس کے پیچھے دیکھنا چاہیے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب جو بظاہر نظر آتا ہے۔ حقیقت میں کچھ اور ہو سکتا ہے۔“ ازبک نے وضاحت کی۔

”ہمم۔“ اس نے ہنکارا بھرا۔ وہ ابھی بھی کچھ سوچ رہی تھی۔

”دراصل میں نے رات کچھ دیکھا تھا مگر اس وقت بتانے کا وقت نہیں تھا۔“ اس نے سرسری لہجے میں کہا۔

”کیا دیکھا؟“ ارتضیٰ نے رخ اس کی جانب کر لیا۔ وہ ابھی تک اپنے انکل اور آنٹی کی اندوہناک موت کے سانحے سے شاک میں تھی۔

”میرے ساتھ چلو۔“ وہ اچانک ہاتھ جھاڑتی کھڑی ہو گئی۔ اس کا انداز پُراسرار سا تھا۔

Waqar Azeem
www.pakistanipoint.com

وہ سب آگے پیچھے چلتے چھت پر پہنچ گئے۔ ربیعہ رہنمائی کا فریضہ سرانجام دے رہی تھی۔ ایک کونے میں پہنچ کر وہ رک گئی۔ کونا بظاہر باقی چھت کا حصہ تھا مگر وہاں ایک جھری سی تھی۔ جو اسے بقیہ چھت سے علیحدہ کر رہی تھی۔

''یہ دن میں واضح ہے۔ مگر رات میں اسے دیکھنا ناممکن تھا۔ اس کی دریافت کو بس اتفاق ہی سمجھو۔ جب میں سگنلز کے لیے تمام چھت پر گھوم رہی تھی۔ تب پیر رکھنے سے یہ ہلنے لگا۔'' اس نے ایک الگ سے لگے مربع سلیب کی جانب اشارہ کیا۔

اور پھر اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنی جانب دھکیلا تو وہ سرکتا ہوا چھت کے باقی حصے میں پیوست ہو گیا۔ وہ ایک چور دروازہ تھا۔ اور گھر کے عقبی حصے میں ایک دیوار کے ذریعے اس حصے کو الگ کیا گیا تھا۔ یوں ایک لمبائی کے رخ طویل کمرا وجود میں آیا تھا۔ ان کی حیرتوں کا چکر ابھی تھما نہیں تھا۔ ایک زینہ نیچے اندھیرے میں مدغم ہو رہا تھا۔

''یہ جگہ ہمارے کمروں کے پیچھے واقع ہے۔ اندر چلو۔'' وہ نیچے اترتے ہوئے بولی۔ ارتضیٰ نے اسے حیرت سے دیکھا۔ اسے یقین کرنا مشکل تھا کہ وہ رات کے وقت اس جگہ اکیلی اتری ہوگی۔ وہ جوں جوں نیچے اتر رہے تھے۔ سیلن اور بُو بڑھتی جا رہی تھی مگر اس کے ساتھ ایک اور عجیب سی آواز۔ ارتضیٰ نے بغور سنا۔ یہ وہی آواز تھی۔ بانسری کی آواز جیسے کئی افراد ایک ساتھ بانسری بجا رہے ہوں۔

اور پھر انہیں ایک حیرت انگیز منظر نظر آیا۔ وہ جغرافیائی تبدیلیوں سے بنا قدرت کا ایک حیرت انگیز شاہ کار تھا۔

تہ خانے کی ایک دیوار اینٹوں سے جبکہ دوسری پہاڑ کو تراش کر بنائی گئی تھی۔ اسی دیوار میں مسلسل ماحولیاتی تبدیلیوں نے ایک قدرتی ساز تشکیل دے دیا تھا۔ دیوار میں لائن سے کئی سوراخ اوپر نیچے بن چکے تھے۔ جن سے گزرتی ہوائیں جب پُرشور ہوتیں تو ایک ساز کا سا رنگ اختیار کر لیتی تھیں۔ چٹان کے اوپر کسی چشمے سے آتا پانی ان سوراخوں سے ہوتا ہوا زمین میں جذب ہو رہا تھا۔ بارشوں میں یہ پانی سوراخوں کی چوڑائی کو کم اور زیادہ کر کے نت نئی طرز تشکیل دیتا تھا۔

''تو یہ ہے وہ قدرتی ساز۔'' ارتضیٰ نے سحرزدہ سی ہو کر گیلی سرد دیوار کو چھوا۔

''جب برسات ہوتی ہوگی تو پانی اور تیز ہوائیں مل کر کیا خوبصورت آہنگ بناتی ہوں گی۔'' وہ حیرت زدہ دہیں رک چکی تھی۔

''نیچے آؤ۔ یہاں کچھ ہے۔'' آخری سیڑھی کھڑے ازبک کی آواز اسے کسی کنویں سے آتی محسو ہوئی۔

وہ تیزی سے نیچے اتری۔ وہ سب ایک جتھا بنا آخری زینے پر موجود تھے۔

اس کے نزدیک پہنچنے پر ربیعہ نے ایک جانب کرا اسے راستہ دیا۔ گھپ اندھیرے سے مانوس ہونے بینائی کو کچھ وقت لگتا ہے۔ نگاہ نے اندھیرے میں چیز پہچاننا شروع کیا تو اس کا سر غیر ارادی طور پر چاروں ط گھومنے لگا۔ اس نے آخر میں پیروں کی جانب نگاہ کی اور کے لبوں سے برآمد ہونے والی چیخ بے ساختہ اور شدید اسے ربیعہ کے مضبوط اعصاب پر حیرت ہوئی۔

جہاں وہ کھڑی تھی عین اسی جگہ ایک مردہ استرا فرما تھا۔

وہ اس کے پیروں کے پاس کھڑی بغور اس کے کو دیکھ رہی تھی۔ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا وہ شخص کئی پہلے یقیناً ایک زندہ سانس لیتا وجود رہا ہوگا۔ مگر کسی نا کے نتیجے میں اب اس سیاہ سوٹ کے جھولتے چیتھڑوں ملبوس وہ ایک ڈھانچا تھا۔

''تم ڈر گئیں؟'' ربیعہ اطمینان سے بولی۔

''تم نہیں ڈری تھیں؟'' ارتضیٰ کی آواز میں تھی۔

''نہیں۔'' اس نے اطمینان سے جھوٹ بولا کیسے بتا سکتی تھی کہ جب اس نے پہلی مرتبہ موبائل کی میں اس ڈھانچے کو دیکھا تھا تو اپنی ہذیانی چیخوں کو کس سے روکا تھا۔ ازبک بھی سکتے میں تھا۔ اس نے ہمیشہ مم اناٹومی کی کلاسوں میں دیکھے تھے۔ پہلی مرتبہ غیر طریقے سے مارا گیا کوئی شخص اس کے سامنے آیا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''کیا نہیں کون؟ اور اس کا جواب ہے، شا شٹ کی باقیات۔'' ربیعہ نے سر کھجایا۔

''کیا، کیا اسے انکل نے مارا ہوگا؟'' ارتضیٰ لہجے میں بے یقینی تھی۔

''ضروری نہیں۔ یہ کوئی حادثہ بھی ہو سکتا ہے اس بات کا امکان کافی زیادہ ہے کہ ایسا ہوا ہو۔ ہو انکل کے پاس والی جڑی بوٹیوں اور سانپوں کے ز

Waqar Azeem www.paksociety.com

سے بنی دوا کا فارمولا ہو۔ جیسا اس سپیرے نے بتایا کہ وہ سب لکھتے تھے۔ مشکل کسی دوا کے اجزائے ترکیبی معلوم کرنا نہیں ہوتا۔ وہ کسی لیب سے معلوم ہوسکتا تھا۔ مگر ان کی مقدار فرق لاتی ہے۔ اور جڑی بوٹیوں سے بنی دوا میں تو کئی عوامل کام کرتے ہیں۔ ویسے بھی اس دوا کو ٹیسٹ نہیں کیا گیا تھا، یہ محض ایک مفروضہ ہوسکتا ہے۔ یا واقعی وہ دوا کام کرتی ہو۔ وہ کوئی سائنسدان تو نہیں تھے۔ مگر قدرت چاہے تو کسی سے کوئی بھی کام لے سکتی ہے۔ یہ شخص کیا نام بتایا تھا امداد حسین نے؟ پال شمٹ وہ اتنا لالچی ہے۔ تو اس کا بھائی کیا کم ہوگا۔ یقیناً اس نے انکل سے زبردستی یہ فارمولا وصول کرنے کی کوشش کی ہوگی۔''

''اب کیا آپ پولیس کو بتائیں گے؟'' یہ شفاعت تھا۔

''کبھی نہیں۔ اس بات کو یہیں بھول جاؤ۔ دوبارہ کوئی اس کا ذکر تک نہیں کرے گا۔ جب تک ہم زندہ ہیں تب تک تو نہیں۔'' ازبک کا انداز حتمی تھا۔

''کم از کم یہ بہتر تدفین کا مستحق تو ہے۔'' ربیعہ کے انداز میں افسوس تھا۔

''جو ہمارے لیے ممکن نہیں مگر میرے پاس ایک بہتر آئیڈیا ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''ہم انکل کے آدھے ادھورے کاغذات انہیں بھجوا سکتے ہیں۔ یقیناً انہیں بھائی کی لاش سے زیادہ کاغذات کے ملنے کی خوشی ہوگی۔'' اس نے ایک آنکھ دبا کر، تائیدی انداز میں سب کو دیکھا۔ اس کے انداز میں محسوس کی جانے والی شرارت تھی۔ اور اثبات سب کے چہروں پر لکھا تھا۔

انہوں نے باہر نکل کر سلیب دوبارہ برابر کردی اور بین شمٹ اپنی ناتمام حسرتوں کے ساتھ دوبارہ اس وسیع قبر میں قید ہوگیا۔ دوبارہ باہر نکلنے کا انتظار لیے۔

ربیعہ ہنستے اور ایک دوسرے کا مذاق اڑاتے ارتضیٰ اور ازبک کو دیکھ کر حیرت میں مبتلا تھی۔ شاید یہ سچ ہے کہ مشکل حالات میں پنپنے والی دوستی لازوال ہوتی ہے۔

☆☆☆

وہ اس وقت بستر میں تھا جب فون کی بیل بجنا شروع ہوئی اور لگاتار بجتی چلی گئی۔ اس نے فون اٹھا کر نمبر دیکھا۔ یہ اس کی سیکریٹری تھی۔ لیون کو یقین تھا اس کی تربیت یافتہ سیکریٹری کبھی بنا کسی ایمرجنسی کے، اسے اس وقت جگانے کی کوشش نہیں کرسکتی۔ اس نے فوراً فون وصول کیا۔

''ہیلو۔'' وہ لیٹے لیٹے بولا۔

''جناب! ایک پارسل آج دفتر کے پتے پر پہنچا ہے۔ مجھے لگتا ہے آپ کو اسے فوراً دیکھنے کی ضرورت ہے۔'' وہ محتاط انداز میں بولی تھی مگر وہ اس کا لہجہ پہچانتا تھا۔ وہ جوش میں تھی۔ اس نے جس مشرقی ملک کا نام لیا۔ وہ اندازہ کرسکتا تھا کہ پارسل کس کی جانب سے ہوگا۔ امداد حسین نے اپنا کام کردیا تھا۔ لیون اپنی پہلی جاب میں سرخ رو رہا تھا۔

اس نے فخر سے سوچا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''ٹھیک ہے۔ اسے فوراً میرے پاس بھجوا دو۔ میں انتظار نہیں کرسکتا۔''

اس نے پال کو کال کرنے کے بارے میں سوچا مگر پھر ارادہ ترک کردیا۔

آفس سے پارسل آنے تک وہ ناشتا کرکے تیار ہو چکا تھا۔

پہلی ہی گھنٹی پر ملازم نے پارسل وصول کیا اور مؤدب انداز میں اس کے سامنے رکھ کر خود کہیں اوجھل ہوگیا۔

اس نے پارسل پر پتا دیکھا۔ اس کا اندازہ درست تھا۔

اس نے احتیاط سے پارسل کھولا۔

کاغذات باہر نکالے اور انہیں دیکھ کر ساکت سا ہو گیا۔ اس کا سفید چہرہ دھیرے دھیرے سرخ ہونے لگا۔ وہ ہاتھوں میں تھامے کاغذات کے اس ڈھیر کی جانب متوجہ تھا۔ جو کبھی ڈائری کہلانے کا سزاوار رہا ہوگا۔

مگر اب ایک مٹی اور سیاہی کا ڈھیر محسوس ہوتا تھا۔

کافی عرصے سے کھلے آسمان تلے پڑے، کاغذات کے ابتدائی صفحات دھل کر صاف ہوچکے تھے۔ باقی مٹی سے رنگ بدل چکے تھے۔ البتہ درمیانی صفحات قابلِ مطالعہ تھے۔

اس نے انہیں دیکھا۔ وہ بلاشبہ ان کا مطلوبہ مواد تھا مگر ناکا۔۔ جو اس میں ۔۔ تھا۔ وہ سب پہلے سے جانتے تھے۔

اس نے پلندے کا رول بنایا اور پوری قوت سے سامنے دیوار پر دے مارا۔ میز پر رکھی چیزیں تہس نہس کردیں۔ ملازم ہراساں انداز میں دروازے پر کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ جو عملاً اپنے بال نوچ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ پال کو فون کرکے جیمز نامی شخص سے رابطہ کرنے کی ہدایت کررہا تھا۔ تاکہ اس انگریز فرم سے معاہدہ باعزت طور سے ختم کیا جاسکے۔ یہ اُس کی عملی زندگی کا پہلا کام تھا جو مکمل ہونے کے باوجود ناکام رہا تھا۔ مگر اس ملک کے لوگوں سے آئندہ ہونے والے تمام معاملات برابری کی بنیاد پر کرنے کا سبق دے گیا تھا۔

❖❖❖

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com